مواعظ

دارالعلوم ماٹلی والا

جلد: سوم

❋ خطبات ❋

(حضرت مولانا مفتی) اقبال بن محمد ٹنکاروی صاحب

(مہتمم و شیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ)

❋ تصحیح و تنقیح ❋

مولانا ذاکر صاحب پارکھیتی

(استاذ: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

❋ مرتب ❋

مولانا قاری ذاکر صاحب ولنوی

(خادم التجوید والقرأت: دارالعلوم ماٹلی والا)

تفصیلات

نام کتاب : مواعظ دارالعلوم ماٹلی والا (جلد ۳)

خطبات : حضرت مولانا مفتی اقبال بن محمد ٹنکاروی (دامت برکاتہم)
(شیخ الحدیث و مہتمم دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

تصحیح و تنقیح : مولانا ذاکر صاحب پارکھیتی
(استاذ: دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا)

مرتب : مولانا قاری ذاکر صاحب ولنوی
(خادم التجوید والقرأت: دارالعلوم ماٹلی والا)

صفحات : ۴۶۵

سن طباعت : ۱۴۴۷ھ مطابق ۲۰۲۵ء

ملنے کا پتہ

مکتبہ : ابوبکر ربیع بن صبیح بصری
دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا
عیدگاہ روڈ، بھروچ، گجرات، انڈیا۔ ۳۹۲۰۰۱

اجمالی فہرست

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	حدیث شریف کی ضرورت واہمیت	۳۴
۲	حدیث شریف کا انکار، ہوا پرستی ویورپ سے مرعوبیت	۴۷
۳	آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعدد ازواج کی حکمت	۶۱
۴	حضرت عائشہؓ سے کم عمری میں شادی کی حکمتیں	۷۶
۵	تقدیر پر ایمان؛ سکون کا ذریعہ	۹۲
۶	عفو ودرگذر کی فضیلت	۱۱۰
۷	صلہ رحمی کی اہمیت	۱۲۵
۸	پردہ اور حجاب کا ثبوت قرآن وحدیث اور سماجیات کی روشنی میں	۱۴۱
۹	مصائب وآلام میں رجوع الی اللہ تعالیٰ	۱۵۴
۱۰	آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان عظیم دین اور علم وعقل کا رشتہ	۱۶۵
۱۱	دُنیا کی حقیقت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نظر میں	۱۸۵
۱۲	محرم الحرام اور عظمت صحابہؓ	۲۰۰
۱۳	سورۂ نور کی روشنی میں سماجی زندگی کے اُصول	۲۱۳
۱۴	مسلمانوں کی کثرت آبادی کا پروپیگنڈہ اور قرآنی احکام	۲۲۲
۱۵	آپسی سرگوشی کے اصول وآداب	۲۳۶
۱۶	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور کرسمس کی تاریخ	۲۵۱

۱۷	پڑوسیوں کے حقوق وآداب	۲۶۲
۱۸	غیبت اور چغل خوری کے نقصانات	۲۷۵
۱۹	دین ودنیا کا اجتماع؛ دین محمدی کا اختصاص	۲۸۹
۲۰	غصہ کے نقصانات اور صبر کی فضیلت	۳۰۹
۲۱	عقل، نقل اور سند کے اعتبار سے اسلام کی صداقت	۳۲۴
۲۲	تفسیر سورۂ نحل، سورۂ کہف اور حالت حاضرہ	۳۳۹
۲۳	جرائم کی کثرت کا اسلامی حل	۳۵۲
۲۴	حسد کی قباحت ومذمت	۳۶۷
۲۵	وقف کی اہمیت اور وقف بورڈ کی ذمہ داریاں	۳۷۹
۲۶	وقف ایکٹ، وقف بورڈ اور وقف ٹربیونل پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات	۳۹۲
۲۷	زلزلے کے اسباب اور علاج نبوی	۴۰۴
۲۸	۲۶ جنوری کا پیغام ہندوستانیوں کے نام	۴۱۵
۲۹	خداوند قدوس کے قوانین اور U.C.C انسانی قانون میں فرق	۴۳۰
۳۰	دولہا دلہن کے حقوق اور ذمہ داریاں	۴۴۳
۳۱	تفسیر سورۂ یٰس شریف	۴۵۳

تفصیلی فہرست

نمبر	عناوین	صفحہ
۱	عرض مرتب	۳۱
	(۱) حدیث شریف کی ضرورت واھمیت	
۲	سنت وحدیث؛ رہنمائی کا روشن چراغ	۳۵
۳	انبیاء کی زندگی: صراطِ مستقیم کی عملی تفسیر	۳۵
۴	اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: قیامت تک انسانیت کی کامل رہنمائی	۳۶
۵	احادیث کی حفاظت؛ اللہ کا وعدہ اور دشمنوں پر حجت	۳۸
۶	تحقیق کے اصول؛ قرآن کریم سے فنِ اسماء الرجال تک	۳۸
۷	احادیث کی سند؛ اعتماد کی بے مثال تاریخ	۴۰
۸	اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر ایمان نامکمل	۴۱
۹	قول سے بڑھ کر عمل کا سبق	۴۲
۱۰	وحی کی حفاظت اور محدثین کا کردار	۴۳
۱۱	بزرگوں کے ملفوظات نہیں، اصل رہبر صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات	۴۴
۱۲	دین ودنیا کا کامل دستور	۴۵
	(۲) حدیث شریف کا انکار، ھواپرستی ویورپ سے مرعوبیت	
۱۳	اطاعت اور ترک کا معیار	۴۷
۱۴	قرآن اور حدیث کا رشتہ	۴۸
۱۵	حدیث کے بغیر قرآن کی تشریح نامکمل	۴۸
۱۶	معراج سے امت تک: نماز کا عملی تحفہ	۴۹

۱۷	امت کی تربیت کرنے والے روحانی والد	۵۰
۱۸	سنت چھوڑو گے تو امت بکھر جائے گی	۵۱
۱۹	نماز میں سنت، باقی زندگی میں غیروں کی پیروی؟	۵۲
۲۰	حدیث کا قلعہ؛ محدثین کی جاں نثار محنت	۵۳
۲۱	حافظے کا کمال یا اللہ کا انعام؟	۵۴
۲۲	سنتِ نبوی ﷺ: دین کی عمارت کا آہنی ڈھانچہ	۵۴
۲۳	قرآن اور حدیث؛ ہدایت کے دو ستون	۵۵
۲۴	علماء متکلمین کی خدمات اور عقل کی حقیقت	۵۶
۲۵	کائنات کا معلم؛ اللہ رب العزت	۵۶
۲۶	سنت سے دوری: سکونِ قلب کا زوال	۵۷
۲۷	انسان کا تھوڑا علم، رب کا لامحدود علم	۵۸
۲۸	سکونِ قلب کا راز؛ ذکرِ الٰہی	۵۹
۲۹	سنت کے بغیر محبت کا دعویٰ ادھورا	۶۰
	(۳) آپ ﷺ کی تعدد ازواج کی حکمت	
۳۰	پرانی سازش، نیا وار	۶۱
۳۱	اللہ پاک کا منتخب کردہ گھرانہ	۶۲
۳۲	تعددِ ازواج کا مسئلہ؛ اعتراضات اور حقیقت	۶۳
۳۳	چار بیویوں کی حد اور عدل کی شرط	۶۴
۳۴	ازواجِ مطہرات ؓ کی معرفت، ایمان کی حفاظت	۶۵
۳۵	ازدواجی زندگی کا پہلا اور سب سے طویل دور	۶۵
۳۶	حضرت سودہ ؓ کا انتخاب اور نکاح	۶۶

۳۷	غزوات کے شہداء کی بیوگان اور سماجی ضرورت	۶۷
۳۸	حضرت حفصہؓ سے نکاح	۶۸
۳۹	نکاحِ ام سلمہؓ سے امت کے لیے سبق	۶۹
۴۰	حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح نجاشی کے توسط سے	۷۰
۴۱	حضرت میمونہؓ سے نکاح	۷۰
۴۲	حضرت زینب بنت خزیمہ اور حضرت زینب بنت جحش سے نکاح	۷۱
۴۳	حضرت جویریہؓ کا نکاح اور قبیلے کی نجات	۷۱
۴۴	حضرت صفیہؓ سے نکاح؛ بین المذاہب تعلقات	۷۲
۴۵	مخالفین کے اعتراضات کا واضح جواب	۷۳
۴۶	نکاحِ رسول ﷺ: سماجی اور دینی پہلو	۷۳
۴۷	محبتِ رسول ﷺ کا تقاضا: علم اور اطاعت	۷۴
(۴) **حضرت عائشہؓ سے کم عمری میں شادی کی حکمتیں**		
۴۸	ازدواجی پہلو بھی نبوی سیرت کا حصہ	۷۷
۴۹	گھر کی زندگی، صداقت کی سب سے بڑی دلیل	۷۸
۵۰	حضرت عائشہؓ سے نکاح؛ تعلیم و تعلم کی حکمت	۷۹
۵۱	اطاعتِ وحی اور عملی اسوہ	۸۰
۵۲	کم عمری کی شادی: مذاہب اور تاریخ کی روشنی میں	۸۱
۵۳	ایمان والے کا رویہ: اعتراض نہیں، اتباع	۸۲
۵۴	گھریلو زندگی سے متعلق رہنمائی کا سرچشمہ	۸۲
۵۵	کبار صحابہؓ کا علمی رجوع حضرت عائشہؓ کی طرف	۸۳
۵۶	علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے	۸۵

۵۷	حضرت ام سلمہؓ کا صلح حدیبیہ کے نازک موقع پر حکمت بھرا مشورہ	۸۵
۵۸	حضرت ابوبکر صدیقؓ کا اعتماد	۸۶
۵۹	دنیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ؟ حضرت عائشہؓ کا فیصلہ	۸۶
۶۰	مسواک اور وفات کا بابرکت منظر	۸۷
۶۱	حضرت عائشہؓ کی باری کی خصوصیات	۸۸
۶۲	اللہ کے فیصلوں میں پوشیدہ حکمتیں	۸۸
۶۳	یقینِ کامل ہی مومن کی پہچان	۸۹
۶۴	سنتِ نبوی سے غفلت اور موجودہ اعتراضات	۹۰
	(۵) تقدیر پر ایمان؛ سکون کا ذریعہ	
۶۵	کائنات کا نظام اور عقیدۂ تقدیر	۹۲
۶۶	رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ اور ایمان کی حقیقت	۹۳
۶۷	اگر مگر اور کاش سے بچو	۹۳
۶۸	انسان، تقدیر اور اللہ کی مشیت	۹۴
۶۹	راضیۃ مرضیۃ؛ محبتِ الٰہی کا راز	۹۹
۷۰	مصیبت میں صبر، دل میں تسلیم	۱۰۱
۷۱	اعمال میں انسان کی آزادی	۱۰۲
۷۲	تفویض امور اور اللہ پر بھروسہ	۱۰۳
۷۳	تقدیر اور تدبیر کا امتزاج	۱۰۳
۷۴	صحابہ کی قربانیاں اور اللہ کی رضا	۱۰۴
۷۵	حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ	۱۰۴
۷۶	انسانی تدبیر بمقابلہ تقدیر	۱۰۵

۷۷	بندے کو رب سے جوڑنے والا سہارا	۱۰۶
۷۸	خیر وشر، دونوں اللہ کی طرف سے	۱۰۷
۷۹	اللہ سے عافیت مانگو، عذاب نہیں	۱۰۸
۸۰	نہ محرومی پر مایوسی، نہ نعمت پر غرور	۱۰۸
	(۶) عفو ودرگذر کی فضیلت	
۸۱	عفو ودرگزر؛ امن وسکون کی قرآنی اور نبوی کنجی	۱۱۱
۸۲	قرآن کے آگے رک جانا؛ حضرت عمرؓ کا وصف	۱۱۲
۸۳	انتقام نہیں، معافی؛ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا روشن باب	۱۱۳
۸۴	معافی کی طاقت اور دلوں کی تبدیلی	۱۱۴
۸۵	مصائب وپتھروں کے جواب میں ہدایت کی دعا	۱۱۴
۸۶	طائف کی دعا سے بھروچ کی سرزمین تک	۱۱۵
۸۷	غصے پر قابو؛ نبی ﷺ کی پسندیدہ صفت	۱۱۵
۸۸	تکبر کی جڑ کاٹ دو، دلوں میں سکون بودو	۱۱۶
۸۹	برداشت: انبیاء کا وصف، مومن کا زیور	۱۱۷
۹۰	تہمت کے زخم پر عفو کا مرہم	۱۱۷
۹۱	ایمان کی بنیاد پر خیر خواہی اور نفع بخشی کی تعلیم	۱۱۸
۹۲	کسی کے لیے آسانی بنو، اللہ تمہارے لیے آسانی بنائے گا	۱۱۹
۹۳	پیاسے کتے کو پانی پلانے کے سبب مغفرت	۱۲۰
۹۴	رحمتِ الٰہی اور آسانی پیدا کرنے والے تاجر کا واقعہ	۱۲۱
۹۵	حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نرمی اور شفقت کا واقعہ	۱۲۳
۹۶	حضرت جنید بغدادیؒ کی دریا کنارے دعا	۱۲۳

۹۷	معاف کرو، بھول جاؤ، سکون پاؤ	۱۲۴
	(۷) صلہ رحمی کی اہمیت	
۹۸	رشتوں کو جوڑو، دلوں کو جیتو	۱۲۵
۹۹	رشتہ داری کا حق؛ قرآن کی نظر میں	۱۲۶
۱۰۰	رشتہ داری؛ اللہ پاک کی رحمت کا عکس	۱۲۷
۱۰۱	دین کی دعوت اور رشتہ داری کی اہمیت	۱۲۸
۱۰۲	رشتہ داروں کی بدسلوکی اور اللہ کی حفاظت کا وعدہ	۱۲۹
۱۰۳	جوڑنے والا جنت کا حق دار، کاٹنے والا محروم	۱۳۰
۱۰۴	ماں باپ کا حق: قرآن وسنت کی روشنی میں	۱۳۰
۱۰۵	تو اور تیرا مال، سب والدین کے لیے	۱۳۱
۱۰۶	والد کے دوست کا حق	۱۳۲
۱۰۷	ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور اولاد میں عدل	۱۳۲
۱۰۸	والدین کی خدمت اور اسلام کا پیغام	۱۳۳
۱۰۹	حضرت خدیجہؓ کی زبان سے نبی ﷺ کے اخلاق کا اعتراف	۱۳۴
۱۱۰	ماں سے حسنِ سلوک کا بے مثال نمونہ	۱۳۴
۱۱۱	صلہ رحمی؛ آزاد کرنے سے بڑھ کر اجر کا عمل	۱۳۵
۱۱۲	رشتہ داروں پر خرچ؛ ایک عمل اور دو انعام	۱۳۵
۱۱۳	رشتہ داری کی پہلی اینٹ؛ والدین کا احترام	۱۳۶
۱۱۴	نبوی تعلیم اور خاندانی وفا کا تقاضا	۱۳۶
۱۱۵	قرابت کا حق: باغِ بیرحاء سے فتح مکہ تک	۱۳۷
۱۱۶	رحم؛ عرشِ الٰہی کے سائے تلے	۱۳۸

۱۱۷	حقِ وراثت: صلہ رحمی کی اصل کسوٹی	۱۳۹
(۸) پردہ اور حجاب کا ثبوت قرآن وحدیث اور سماجیات کی روشنی میں		
۱۱۸	حجاب کے معاملے میں غلط فہمیاں اور گمراہ کن بیانیے	۱۴۲
۱۱۹	عدمِ تحفظ اور بے پردگی	۱۴۲
۱۲۰	پاکیزہ سماج کا اسلامی تصور	۱۴۳
۱۲۱	احکامِ پردہ؛ وحی کی روشنی میں	۱۴۳
۱۲۲	میڈیا کے شبہات اور قرآنی جواب	۱۴۴
۱۲۳	دعویٰ حفاظت کا، مخالفت پردے کی	۱۴۵
۱۲۴	شیطانی نظریات اور فطری انسانی اقدار	۱۴۶
۱۲۵	قرآن کی روشنی میں حیا کی چمکتی مثالیں	۱۴۶
۱۲۶	جنت سے زمین تک؛ لباس اور حیا کا پہلا سبق	۱۴۷
۱۲۷	پردہ؛ دین کی چاروں بنیادوں سے ثابت شرعی حکم	۱۴۸
۱۲۸	جب ''حیا'' رخصت ہوجائے تو فتنہ عام ہوجاتا ہے	۱۴۹
۱۲۹	پردے کی پامالی اور اجتماعی نقصان	۱۵۰
۱۳۰	حدودِ الٰہی سے انحراف، خسارے کا سودا	۱۵۰
۱۳۱	جب یورپ نے پردے میں اسلام کی جھلک دیکھی	۱۵۱
۱۳۲	غزوۂ بدر میں وفائے عہد کی روشن مثال	۱۵۲
۱۳۳	قرآنی پردہ؛ برکتوں کا سبب، فتنوں سے حفاظت	۱۵۳
(۹) مصائب و آلام میں رجوع الی اللہ تعالی		
۱۳۴	زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ایمان کا امتحان	۱۵۴

۱۳۵	راحت اور آزمائش میں بندے کا رویہ	۱۵۵
۱۳۶	آزمائش عارضی ہے، صبر پر دائمی اجر	۱۵۶
۱۳۷	ہر چیز کا خزانہ اللہ کے پاس ہے	۱۵۷
۱۳۸	ساڑھے نوسو سال کی محنت اور قوم کا انکار	۱۵۷
۱۳۹	اختیار اللہ کا، انحصار بندے کا	۱۵۸
۱۴۰	اللہ کا حکم آئے تو کوئی پناہ گاہ کام نہیں آتی	۱۵۹
۱۴۱	مومن کی تکلیف؛ مغفرت کا ذریعہ	۱۶۰
۱۴۲	مصیبت کا حل: توبہ ورجوع الی اللہ	۱۶۱
۱۴۳	گناہ جہاں بھی ہوں، پکڑ یقینی ہے	۱۶۳
۱۴۴	عاجزی، معافی اور اللہ کی حفاظت	۱۶۴
(۱۰) آپ ﷺ کا احسان عظیم دین اور علم و عقل کا رشتہ		
۱۴۵	علم وفہم سے جڑا ہوا دین	۱۶۶
۱۴۶	انسانیت سے دوبارہ آسمانی ربط	۱۶۶
۱۴۷	جاہل قوم میں علم کا آغاز	۱۶۷
۱۴۸	براہِ راست ربانی علم	۱۶۸
۱۴۹	غارِ حرا سے اٹھنے والی روشنی	۱۶۹
۱۵۰	یورپ کا ظلمت بھرا زمانہ؛ تحقیق کے بدلے سزا	۱۷۲
۱۵۱	قرآن وحدیث کی نگاہ میں علم کا بلند مقام	۱۷۳
۱۵۲	اندلس کا کتب خانہ اور یورپ کی علمی پسماندگی	۱۷۵
۱۵۳	قرآن کریم کا تقاضا؛ سوچو، سمجھو اور بیدار ہو جاؤ	۱۷۵
۱۵۴	علم کو عام کرنے والا پہلا نظام	۱۷۷

۱۵۵	اندلس سے یورپ تک؛ علم کی امانت اور اس کی خیانت	۱۷۸
۱۵۶	خواص سے عوام تک، علم کی مساوی تقسیم	۱۷۸
۱۵۷	آغازِ انسانیت سے علم کی تکمیل تک	۱۷۹
۱۵۸	چرچ کی علم دشمنی، تاریخ کا سیاہ باب	۱۸۰
۱۵۹	نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم وحکمت کا سرچشمہ	۱۸۰
۱۶۰	عبادت کا عموم، علم اور بندگی کی آزادی	۱۸۱
۱۶۱	توحید؛ سائنسی ترقی کی بنیاد	۱۸۱
(۱۱) دُنیا کی حقیقت شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی نظر میں		
۱۶۲	محفوظ پیغام، تا قیامت ہدایت	۱۸۶
۱۶۳	ہر دور میں اٹھنے والی حق کی جماعت	۱۸۶
۱۶۴	نام نہیں، سیرت اپنائیں	۱۸۷
۱۶۵	پاکیزہ نسب اور حلال لقمے کا فیض	۱۸۸
۱۶۶	بغداد کا سنہری دور اور شیخ عبد القادر جیلانیؒ کی علمی سفر کی ابتدا	۱۸۹
۱۶۷	علم کی طلب سے بغداد کی مسندِ تدریس تک	۱۸۹
۱۶۸	مادیت کے طوفان میں روحانیت کا چراغ	۱۹۰
۱۶۹	مادیت سے معنویت تک	۱۹۱
۱۷۰	مردہ دلوں کی مسیحائی	۱۹۱
۱۷۱	شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ	۱۹۲
۱۷۲	دل؛ محبتِ الٰہی کا مرکز اور آزمائش کا میدان	۱۹۳
۱۷۳	محبتِ الٰہی بمقابلہ محبتِ دنیا	۱۹۳
۱۷۴	ظاہری حسن کی حقیقت اور اصل کامیابی	۱۹۴

۱۷۵	مایوسی کے بعد رحمتِ الٰہی	۱۹۵
۱۷۶	دنیا کی زندگی ایک عارضی سایہ	۱۹۶
۱۷۷	دنیا کی مثال کھیتی کی مانند	۱۹۶
۱۷۸	شاہ عبدالقادرؒ کی امانت داری اور ڈاکوؤں کی توبہ	۱۹۷
۱۷۹	خاص بندوں کے خاص امتحانات	۱۹۸
۱۸۰	حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی دعوت اور آج کا سبق	۱۹۸
۱۸۱	فتنوں کے دور میں اولیاء کرام کی خدمات	۱۹۹
	(۱۲) محرم الحرام اور عظمت صحابہؓ	
۱۸۲	محرم کی برکتیں اور روزۂ عاشورہ	۲۰۱
۱۸۳	ماضی کا محاسبہ، مستقبل کی تیاری	۲۰۱
۱۸۴	وقت کی قدر اور نجات کی چار بنیادیں	۲۰۲
۱۸۵	صحابہ کرامؓ پر اللہ کی رضا اور ایمان کی محبت	۲۰۲
۱۸۶	صلح حدیبیہ؛ نام ونسبت کی قربانی اور اللہ کی طرف سے اعزاز	۲۰۳
۱۸۷	صحابہ کرامؓ؛ دن کے مجاہد، رات کے عابد	۲۰۴
۱۸۸	اللہ کے برگزیدہ اور دین کے حاملین	۲۰۵
۱۸۹	نبی آخر الزماں ﷺ کی فریاد اور صحابہؓ کی عظمت	۲۰۵
۱۹۰	صحابہ کرامؓ کی عظمت اور قرآنی سند	۲۰۶
۱۹۱	صحابہ کرامؓ کی فضیلت؛ ایمان کا حصہ	۲۰۷
۱۹۲	نبی کریم ﷺ کی صحبت پر اعتراض؛ ایک خطرناک رویہ	۲۰۷
۱۹۳	اللہ کا منتخب کردہ گروہ؛ صحابہ کرامؓ	۲۰۸
۱۹۴	عداوت نہیں، محبت کرو	۲۰۹

۱۹۵	محبتِ حسینؓ ایمان کا حصہ، بدظنی ایمان کا زیاں	۲۱۰
۱۹۶	ایمان کی کھیتی کے خوشبودار پودے	۲۱۱
(۱۳) **سورۂ نور کی روشنی میں سماجی زندگی کے اصول**		
۱۹۷	گھر سے سماج تک؛ قرآن کی رہنمائی	۲۱۳
۱۹۸	اسلامی معاشرے کی بنیاد اور منافقین کی سازش	۲۱۴
۱۹۹	مرد وعورت کے لیے الگ الگ قرآنی ہدایات	۲۱۴
۲۰۰	نگاہوں کی حفاظت اور استئذان کی حکمت	۲۱۵
۲۰۱	گھروں میں داخلے کے قرآنی آداب	۲۱۵
۲۰۲	سماجی برائیوں سے اجتناب	۲۱۶
۲۰۳	عورتوں کے لیے قرآنی ہدایات: نگاہ، عصمت اور پردہ	۲۱۷
۲۰۴	زمانۂ جاہلیت کی رسم اور اسلام کی روشن تعلیم	۲۱۷
۲۰۵	فحاشی کی ترویج پر قرآنی تنبیہ	۲۱۸
۲۰۶	غیر اسلامی رسومات اور نکاح کی مشکلات	۲۱۹
۲۰۷	دل کا نور کہاں سے آتا ہے؟	۲۲۰
(۱۴) **مسلمانوں کی کثرت آبادی کا پروپیگنڈہ اور قرآنی احکام**		
۲۰۸	انسان اور اس کی اولاد؛ رزق کے امتحان میں	۲۲۲
۲۰۹	رزق کا انتظام؛ مستقر اور مستودع اللہ کے علم میں	۲۲۳
۲۱۰	آبادی کا پروپیگنڈہ اور حقیقت	۲۲۴
۲۱۱	ضبطِ ولادت اور قرآن مجید کا نقطۂ نظر	۲۲۵
۲۱۲	کائنات کی مخلوقات اور رزق کی تقسیم	۲۲۵
۲۱۳	سائنسی ترقی اور مالتھس کی پیش گوئی کا رد	۲۲۶

۲۱۴	چین کی ایک بچہ پالیسی اور اس کے نتائج	۲۲۷
۲۱۵	آبادی کا خوف یا وسائل کی غلط تقسیم؟	۲۲۷
۲۱۶	دجالی قوتوں کا عالمی معاشی جال	۲۲۸
۲۱۷	مصنوعی قحط اور حقیقت کا آئینہ	۲۲۸
۲۱۸	ماں کے پیٹ سے دنیا تک؛ روزی کا الٰہی نظام	۲۲۹
۲۱۹	تقویٰ اور نماز؛ برکتِ رزق کے اسباب	۲۳۰
۲۲۰	قتلِ اولاد کی حرمت: قدیم جاہلیت سے جدید سائنس تک	۲۳۱
۲۲۱	روزی کے اسباب اور کمزوروں کی برکت	۲۳۱
۲۲۲	روزی کی فکر: ایمان اور بے ایمانی کا فرق	۲۳۲
۲۲۳	مسلم سماج میں داخل ہوتا باطل نظریہ	۲۳۳
۲۲۴	اسلامی تصورِ معیشت میں عورت کا مقام	۲۳۳
۲۲۵	اولاد کی روزی اور ایمان کا عقیدہ	۲۳۴
۲۲۶	Demand and Supply کا اصل نظام اللہ کے ہاتھ میں	۲۳۴
	(۱۵) آپسی سرگوشی کے اصول و آداب	
۲۲۷	انس و محبت کا فطری جذبہ اور اس کی حدود	۲۳۷
۲۲۸	مدینہ منورہ میں سرگوشیوں کی حقیقت	۲۳۸
۲۲۹	سرگوشی بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں	۲۳۸
۲۳۰	مرنے کے بعد حساب	۲۳۹
۲۳۱	جائز سرگوشی کی تین صورتیں	۲۴۰
۲۳۲	میثاقِ مدینہ اور یہود کی سازشیں	۲۴۱
۲۳۳	آج کے دور کی معصیتِ رسول ﷺ کیا ہے؟	۲۴۱

۲۴۴	موت؛ ایک اٹل حقیقت	۲۴۲
۲۴۵	عبادتیں بمقابلہ حقوق العباد	۲۴۲
۲۴۶	تکبر کی حقیقت اور نفس کی اصلاح	۲۴۴
۲۴۷	آگ اور مٹی: برتری کا جھوٹا معیار	۲۴۵
۲۴۸	اپنی اصلاح کرو، دوسروں کے عیب نہ ٹٹولو	۲۴۵
۲۴۹	چھوٹی باتیں، بڑے جھگڑے	۲۴۶
۲۵۰	صدقہ کے وسیع معنی اور نیت کی اہمیت	۲۴۷
۲۵۱	سماجی رنجشوں کا اصل مرض: تکبر	۲۴۸
۲۵۲	تکبر سے نجات کا راستہ	۲۴۹
	(۱۶) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور کرسمس کی تاریخ	
۲۵۳	قسطنطین اور کرسمس کا آغاز	۲۵۲
۲۵۴	شیطان کی تدبیریں اور دین کی تحریف	۲۵۳
۲۵۵	قرآن کی روشنی میں حضرت مریمؑ و حضرت عیسیٰ علیہ السلام	۲۵۴
۲۵۶	ماں کی گود سے پہلی صدا: اِنِّی عَبْدُ اللہ	۲۵۴
۲۵۷	قتل و صلیب کا دعویٰ اور قرآن کی تردید	۲۵۵
۲۵۸	ہجرتِ حبشہ اور نجاشی کے دربار میں حق کی گواہی	۲۵۶
۲۵۹	بدعات کا فتنہ اور سنت کا اٹھ جانا	۲۵۹
۲۶۰	تین میں ایک اور ایک میں تین کی حقیقت	۲۵۹
۲۶۱	سنت کی پیروی اور حفاظت	۲۶۰
۲۶۲	قرآن کی روشنی میں عقیدہ اور عمل	۲۶۰

(۱۷) پڑوسیوں کے حقوق و آداب		
۲۵۳	سلوکِ حسنہ اور ایمان	۲۶۳
۲۵۴	پڑوسی کے تین درجے اور ان کے حقوق	۲۶۴
۲۵۵	روزمرہ جھگڑوں کی اصل بنیاد	۲۶۵
۲۵۶	جبرئیلؑ کی مسلسل تاکید	۲۶۵
۲۵۷	صرف ہمسائیگی نہیں بلکہ امتحان	۲۶۶
۲۵۸	حقِ شفعہ: مکان بیچنے کا اسلامی اصول	۲۶۶
۲۵۹	ایذاء سے عفو تک: ایک صحابیؓ کا ایمان افروز واقعہ	۲۶۷
۲۶۰	چھوٹے تحفے، بڑے رشتے	۲۶۸
۲۶۱	قرآنی دعا اور نبوی تربیت کی روشنی میں اجتماعی زندگی	۲۶۸
۲۶۲	حقوق کا نظام: اللہ پاک سے بندے تک	۲۶۹
۲۶۳	تکبر اور اَنا: تعلقات کی سب سے بڑی رکاوٹ	۲۷۱
۲۶۴	اچھے اخلاق سے دل جیتنے کا راستہ	۲۷۲
۲۶۵	اخلاق و ایثار سے سجا ہوا محلہ	۲۷۳
(۱۸) غیبت اور چغل خوری کے نقصانات		
۲۶۶	امن وسکون کا ضامن دین	۲۷۵
۲۶۷	جلد بازی نہیں، تحقیق ہی نجات کا راستہ	۲۷۶
۲۶۸	چغلی اور عیب جوئی؛ معاشرتی زہر	۲۷۶
۲۶۹	دورُخے پن کی قرآنی وعید اور نبوی تنبیہ	۲۷۷
۲۷۰	چھوٹی سمجھی جانے والی بڑی غلطیاں	۲۷۸
۲۷۱	عبادات کے ساتھ اخلاقی گناہوں سے اجتناب کی ضرورت	۲۷۸

۲۷۲	نیکیاں دوسروں کے نام اور گناہ اپنے دامن میں	۲۷۹
۲۷۳	زبان کی آفت اور حقوق العباد کی سنگینی	۲۷۹
۲۷۴	نامۂ اعمال کا محفوظ ریکارڈ	۲۸۰
۲۷۵	زبان کی لغزش اور اس کے بھیانک نتائج	۲۸۲
۲۷۶	مردہ بھائی کا گوشت کھانے جیسا گھناؤنا عمل	۲۸۲
۲۷۷	صحابہ کا تبصرہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم	۲۸۳
۲۷۸	نیکیوں کا سب سے بڑا ضیاع	۲۸۴
۲۷۹	عبداللہ ابن اُبی کی سازش اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت	۲۸۵
۲۸۰	اصلاح کے لیے جھوٹ کی اجازت	۲۸۶
۲۸۱	ضرورت کے وقت حق بات بیان کرنے کی گنجائش	۲۸۶
۲۸۲	مشورے میں امانت داری اور خوش اخلاقی	۲۸۷
۲۸۳	نیکیاں ضائع کرنے والا عمل	۲۸۸
	(۱۹) دین و دنیا کا اجتماع؛ دین محمدی کا اختصاص	
۲۸۴	اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قوموں کا اپنے بڑوں کا احترام	۲۸۹
۲۸۵	کامل رہنما اور حقیقی نمونۂ حیات	۲۹۰
۲۸۶	نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کی قرآنی تعلیم	۲۹۰
۲۸۷	نورِ قرآن اور رحمت محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	۲۹۱
۲۸۸	توحید کی تعلیم اور مخلوق سے بے خوفی	۲۹۲
۲۸۹	خوفِ خدا کے پیکر، مخلوق پر غالب	۲۹۲
۲۹۰	انسانی عظمت اور احترام کا اعلان	۲۹۳
۲۹۱	خوف ووہم سے نجات	۲۹۴

۲۹۲	دین ودنیا کا توازن	۲۹۴
۲۹۳	بادشاہی اور بندگی کا امتزاج	۲۹۵
۲۹۴	نماز جمعہ اور رزق	۲۹۶
۲۹۵	اسباب اور اصل رازق	۲۹۷
۲۹۶	جائز خواہش پر بھی اجر	۲۹۷
۲۹۷	مال ووراثت میں اعتدال	۲۹۸
۲۹۸	نیت کے ساتھ محبت بھی عبادت	۲۹۸
۲۹۹	دین کو رہبانیت اور دنیا کو بے دینی بنا دینے کا انجام	۲۹۸
۳۰۰	فصل کے بجائے وصل	۳۰۰
۳۰۱	پوری زندگی عبادت اور کائنات عبادت گاہ	۳۰۱
۳۰۲	حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت	۳۰۲
۳۰۳	مشقت میں اعتدال	۳۰۴
۳۰۴	دلوں کا سکون ذکرِ الٰہی میں	۳۰۵
۳۰۵	سنت سے دوری، زوال کی وجہ	۳۰۶
۳۰۶	سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: انسانیت کی رہائی کا پیغام	۳۰۷
	(۲۰) غصہ کے نقصانات اور صبر کی فضیلت	
۳۰۷	غصہ ضبط کرنا، ایمان کی علامت	۳۰۹
۳۰۸	اخلاقِ زین العابدینؒ؛ قرآن کا عملی نمونہ	۳۱۰
۳۰۹	امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عفو درگزر	۳۱۱
۳۱۰	سخت مزاجی نہیں، نرم خوئی ایمان کی شان	۳۱۲
۳۱۱	قیادت اور ضبطِ نفس؛ حضرت عمرؓ کا نمونہ	۳۱۳

۳۱۲	غصہ بگاڑتا ہے، حلم سنوارتا ہے	۳۱۴
۳۱۳	نبوی نصیحت	۳۱۴
۳۱۴	غصے کی کیفیت اور اس کے نقصانات	۳۱۵
۳۱۵	غصے کی اقسام اور اصل بہادری	۳۱۵
۳۱۶	انبیاء علیہم السلام کی حکمت بھری روش	۳۱۶
۳۱۷	حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ	۳۱۶
۳۱۸	فتنے سے بچنے کا طریقہ	۳۱۷
۳۱۹	خاموشی کا کمال اور نجات	۳۱۸
۳۲۰	زبان کی لغزش، زندگی کا پچھتاوا	۳۱۹
۳۲۱	معافی؛ سکون کی کنجی	۳۱۹
۳۲۲	ذات کے لیے معافی، دین کے لیے غیرت	۳۲۰
۳۲۳	صبر کے نتائج اور اللہ کی نعمتیں	۳۲۱
۳۲۴	رحمۃ للعالمین کی بعثت کا مقصد	۳۲۱
۳۲۵	غصہ بجھانے کے نبوی طریقے	۳۲۲
۳۲۶	غصہ؛ شیطان کا وار، صبر؛ ایمان کا ہتھیار	۳۲۲
	(۲۱) عقل ، نقل اور سند کے اعتبار سے اسلام کی صداقت	
۳۲۷	نزولِ قرآن کی سندِ آسمانی	۳۲۴
۳۲۸	قرآن اور حدیث - ایک ہی سرچشمہ	۳۲۵
۳۲۹	شرک کرنے والوں کے لیے کھلا سوال	۳۲۶
۳۳۰	علم کی تبدیلی اور وحی کا استحکام	۳۲۷
۳۳۱	یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِم - قرآن کا اعلانِ تحریف	۳۲۸

۳۳۲	اظہارِ حق اور بائبل سے قرآن تک	۳۲۹
۳۳۳	انسانی کلام کی کمزور بنیاد	۳۲۹
۳۳۴	سیکولرازم کا کھوکھلا دعویٰ	۳۳۰
۳۳۵	انجیل نویس اور حضرت عیسیٰؑ کی عدم ملاقات	۳۳۰
۳۳۶	مذہب کے سچا ہونے کی تین بنیادیں	۳۳۰
۳۳۷	''دَحو'' کا مفہوم اور حقیقت	۳۳۱
۳۳۸	شرک پر آسمان وزمین کا احتجاج	۳۳۲
۳۳۹	قرآن کا اعجاز؛ تاریخ کی سچائی کو محفوظ رکھنا	۳۳۲
۳۴۰	اسلام میں رسالت اور غیر مسلموں کا اوتار کا تصور	۳۳۳
۳۴۱	قدیم انسانوں کا اعتراض اور آج کی سائنس کا جواب	۳۳۴
۳۴۲	قرآن کی گفتگو؛ انسان نہیں، خالق کائنات کی آواز	۳۳۵
۳۴۳	اسلامی علوم میں سند کی غیر معمولی اہمیت	۳۳۵
۳۴۴	حدیث کے راستے کا درخت اور علم کی امانت	۳۳۶
۳۴۵	ہدایت کا زندہ اور ابدی سرچشمہ	۳۳۷
۳۴۶	قرآن وحدیث؛ زندگی کا سہارا ونجات کا ذریعہ	۳۳۷
	(۲۲) تفسیر سورۂ نحل، سورۂ کھف اور حالت حاضرہ	
۳۴۷	سورۃ الرعد کا سبق آموز پیغام	۳۴۰
۳۴۸	اصحابِ کہف اور حق وباطل کا پیغام	۳۴۰
۳۴۹	باطل کی جھاگ، حق کی پائیداری	۳۴۰
۳۵۰	خالص اور کھوٹے کی تمیز	۳۴۱
۳۵۱	پیاسے کی مثال اور ایمان کی حقیقت	۳۴۲

۳۵۲	وحی، نعمتیں اور قدرتِ خداوندی	۳۴۲
۳۵۳	شہد-فطری الہام اور شفا کا خزانہ	۳۴۳
۳۵۴	مومن کی زندگی کا منشور	۳۴۴
۳۵۵	احسان کی حقیقت اور بندگی کا شعور	۳۴۵
۳۵۶	رشتہ جوڑو، برائی چھوڑو	۳۴۶
۳۵۷	معراج سے دجال تک؛ قرآن کی ہدایت اور ڈھال	۳۴۶
۳۵۸	ایمان پر حملے کی مختلف صورتیں	۳۴۷
۳۵۹	ثابت قدمی کی زندہ مثال	۳۴۸
۳۶۰	ایمان کا لازوال سبق	۳۴۹
۳۶۱	اصحابِ کہف کی نیند؛ اللہ کی قدرت کا کرشمہ	۳۵۰
۳۶۲	ایمان والوں کے قدموں پر جھکتی فطرت	۳۵۱
	(۲۳) جرائم کی کثرت کا اسلامی حل	
۳۶۳	اللہ پاک کا خوف؛ برائی سے روکنے کی ڈھال	۳۵۳
۳۶۴	جاہلیت کی برائیاں اور نبی ﷺ کی اصلاحی محنت	۳۵۴
۳۶۵	زنا سے بچانے کا نبوی اسلوب	۳۵۴
۳۶۶	اللہ کا خوف-لوگوں کا اصل کیمرہ	۳۵۶
۳۶۷	دنیا کی عدالت نہیں، آخرت کی پکڑ کا خوف	۳۵۶
۳۶۸	دنیاوی ٹیکنالوجی نہیں، تقویٰ ہی اصل تحفظ ہے	۳۵۷
۳۶۹	بےخوف مجرم اور بےبس قانون	۳۵۸
۳۷۰	عدل کی شفافیت؛ حضرت عمرؓ کی دوراندیشی	۳۵۹
۳۷۱	اسلامی ضابطے؛ برائی سے پہلے اسباب کاٹ دو	۳۵۹

۳۷۲	انسانی تاریخ کا پہلا قتل اور پہلا قانون	۳۶۰
۳۷۳	جرم کا سدباب اور سزا کا تعین	۳۶۱
۳۷۴	عبادت اور معاشرت؛ گناہوں سے بچاؤ کے دوستون	۳۶۱
۳۷۵	مرحوم شاہ فیصل کا امریکہ میں تاریخی جواب	۳۶۲
۳۷۶	عدل اور توازن کا نظام	۳۶۳
۳۷۷	سود نفرت بڑھاتا ہے، زکوٰۃ محبت پیدا کرتی ہے	۳۶۳
۳۷۸	مال کی گردش اور قرآن کا قانون	۳۶۳
۳۷۹	اللہ کی عطا اور منع پر کسی کا اختیار نہیں	۳۶۴
۳۸۰	مظلوم کی بے چینی اور انتقام کی آگ	۳۶۴
۳۸۱	دیت اور قصاص کا عادلانہ اختیار	۳۶۵
۳۸۲	تقویٰ اور خوفِ الٰہی سے مضبوط معاشرہ	۳۶۵
۳۸۳	انسانی معاشرے کا بگاڑ اور گناہوں کی آندھی	۳۶۶
	(۲۴) حسد کی قباحت و مذمت	
۳۸۴	اہلِ ایمان کا شیوہ؛ قربانی اور ایثار	۳۶۸
۳۸۵	حسد کی اصل بیماری؛ نعمت نہ دیکھ پانا	۳۶۹
۳۸۶	اللہ کے فیصلوں پر ناراضگی	۳۶۹
۳۸۷	نعمت چھپاؤ، حسد سے بچو	۳۷۰
۳۸۸	نعمت کا تذکرہ شکر بنے، فخر نہیں	۳۷۰
۳۸۹	حسد نعمت چھیننا چاہتا ہے، رب نعمت بڑھاتا ہے	۳۷۱
۳۹۰	انسان کی تدبیر اور رب کی تقدیر	۳۷۲
۳۹۱	دل کی پاکیزگی اور سچی دعا	۳۷۳

۳۹۲	دل کی صفائی؛ جنت کا راستہ	۳۷۴
۳۹۳	اللہ کی عطا نا قابلِ زوال	۳۷۵
۳۹۴	ظالم بھی مظلوم: حاسد کی بے سکونی	۳۷۶
۳۹۵	ترقی، مقابلہ اور دل کا امتحان	۳۷۷
۳۹۶	سماج کی کڑواہٹ	۳۷۷
۳۹۷	صحبت کا اثر اور دل کی راحت	۳۷۸
۳۹۸	مال آزمائش ہے، کامیابی کا معیار نہیں	۳۷۸
	(۲۵) وقف کی اہمیت اور وقف بورڈ کی ذمہ داریاں	
۳۹۹	کامل نیکی کا راز؛ قربانی اور انفاق	۳۷۹
۴۰۰	زندگی کے بعد ثواب کا جاری خزانہ	۳۸۰
۴۰۱	شیطان کا خوف اور رب کا وعدہ	۳۸۱
۴۰۲	اسلامی اوقاف کا سنہری ماڈل	۳۸۱
۴۰۳	باغِ ابوطلحہؓ؛ کامل نیکی کا عملی نمونہ	۳۸۲
۴۰۴	وقف کا مفہوم اور موجودہ چیلنجز	۳۸۳
۴۰۵	گنگا جمنی تہذیب اور وقف کا کردار	۳۸۴
۴۰۶	شیر شاہ سوری اور وقف کی تاریخی مثال	۳۸۴
۴۰۷	حضرت عثمانؓ کا عظیم ایثار اور کنویں کی خریداری	۳۸۵
۴۰۸	وقف ایکٹ کی قانونی حیثیت	۳۸۶
۴۰۹	قوانین میں تبدیلی: ہماری کوتاہیوں کا نتیجہ	۳۸۷
۴۱۰	وقف کی جائیداد کا تحفظ- وقت کی اہم ضرورت	۳۸۸
۴۱۱	ملکیت نہیں، حفاظت	۳۸۹

۴۱۲	وقف اور صدقہ میں فرق	۳۸۹
۴۱۳	صحابہ کرامؓ اور وقف کی عظیم روایت	۳۹۰
۴۱۴	وقف میں تأبید اور تسلسل کی شرط	۳۹۱
	(۲۶) وقف ایکٹ، وقف بورڈ اور وقف ٹربیونل پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات	
۴۱۵	دنیا کی حقیقت: بارش سے خاک تک	۳۹۲
۴۱۶	عارضی رونقیں اور باقی رہنے والی نیکی	۳۹۳
۴۱۷	دنیا کی ناپائیدار حقیقت	۳۹۳
۴۱۸	دائمی نفع بخش اعمال	۳۹۴
۴۱۸	نیکی کا صحیح معیار	۳۹۵
۴۱۹	وقف کی برکتیں انسانوں سے پرندوں تک	۳۹۶
۴۲۰	اوقاف کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں	۳۹۶
۴۲۱	وقف کی نگرانی کا نظام	۳۹۷
۴۲۲	چیریٹی کمشنر سے وقف بورڈ تک کا سفر	۳۹۸
۴۲۳	پروسیجر اور قانون کے تحت تنازعات کا حل	۳۹۹
۴۲۴	ہجرت کے بعد جائیدادوں کی حقیقت	۳۹۹
۴۲۵	وقف بورڈ کے اختیارات پر اعتراض اور حقیقت	۴۰۰
۴۲۶	صرف نیت نہیں، قبضہ بھی چھوڑنا ضروری	۴۰۱
۴۲۷	متولی اور علماء کے لیے ضروری آگاہی	۴۰۱
۴۲۸	کوتاہیاں ہمارے اپنے دامن میں	۴۰۱
۴۲۹	نئے قوانین اور اوقاف کا مستقبل	۴۰۲

۴۳۰	دینی امانت اور مسلمانوں کی ذمہ داری	۴۰۳
	(۲۷) زلزلے کے اسباب اور علاج نبوی	
۴۳۱	نصیحت یا غفلت کا پردہ؟	۴۰۵
۴۳۲	غفلت کی نیند اور اچانک گرفت	۴۰۵
۴۳۳	پچھلی قومیں آئینہ، ہمارے لئے تنبیہ	۴۰۶
۴۳۴	قدرتی اسباب اور اعمالِ انسانی کا تعلق	۴۰۷
۴۳۵	پندرہ علامات؛ امت کے لئے تنبیہ	۴۰۷
۴۳۶	قیامت کا منظر	۴۰۸
۴۳۷	زمین کا خاموش فرش قیامت کے دن بولے گا	۴۰۹
۴۳۸	سائنس کے اندازے اور اللہ کا فیصلہ	۴۰۹
۴۳۹	نبوت کی دلیل معجزہ، ولایت کی دلیل تقویٰ واتباع شریعت	۴۱۰
۴۴۰	حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ	۴۱۰
۴۴۱	قدرتِ الٰہی کی جھلک	۴۱۱
۴۴۲	گناہوں کا پھیلاؤ اور زمین کا لرزنا	۴۱۱
۴۴۳	زمین کا پھٹنا اور قرآن کی پیشین گوئی	۴۱۲
۴۴۴	حضرت عمرؓ کے دور کا زلزلہ اور عدل کا اثر	۴۱۲
۴۴۵	آزمائشوں کے پسِ پردہ حکمت	۴۱۳
۴۴۶	توبہ واستغفار کا سہارا	۴۱۳
	(۲۸) ۲۶ جنوری کا پیغام ہندوستانیوں کے نام	
۴۴۷	آزادی سے آئین تک کا سفر	۴۱۵
۴۴۸	شیخ الہندؒ اور دیوبند کی تحریکِ حریت	۴۱۶

۴۴۹	ہر مذہب، ہر طبقے کے لیے مساوی حقوق	۴۲۰
۴۵۰	جے ہند اور ترنگا؛ قربانیوں کی یادگار	۴۲۱
۴۵۱	قربانی سے قانون تک؛ مسلمانوں کا تاریخی کردار	۴۲۲
۴۵۲	وشوگرو بننے کی کنجی	۴۲۳
۴۵۳	خدمتِ خلق کا پہلا چراغ	۴۲۳
۴۵۴	انسان آزاد پیدا ہوا ہے؛ حضرت عمرؓ کا اعلان	۴۲۴
۴۵۵	اسلام کا منشور انسانیت اور دستورِ ہند	۴۲۵
۴۵۶	اسلام کے پیغامِ حریت کا عملی نمونہ	۴۲۵
۴۵۷	سب انسان برابر: اصل فضیلت تقویٰ میں ہے	۴۲۶
۴۵۸	آج کے بچے، کل کے معمارِ وطن	۴۲۷
۴۵۹	اجتماعی کوشش ہی کامیابی کی ضمانت	۴۲۷
(۲۹) **خداوند قدوس کے قوانین اور U.C.C انسانی قانون میں فرق**		
۴۶۰	حضرت آدمؑ سے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک شریعت کا تسلسل	۴۳۱
۴۶۱	فوجداری احکام کا تسلسل	۴۳۲
۴۶۲	خیر کے سفیر اور شر کے روکنے والے	۴۳۲
۴۶۳	زندگی کی سمت متعین کرنے والا نظام	۴۳۳
۴۶۴	خودساختہ پابندیاں اور انکارِ فطرت	۴۳۳
۴۶۵	انبیاء کی تعلیمات کا جامع پیکج	۴۳۴
۴۶۶	رہنمائی کا ابدی چراغ	۴۳۵
۴۶۷	سنتِ نبوی کے تحفظ کی تاریخ ساز محنتیں	۴۳۵
۴۶۸	ملک میں اٹھائے جانے والے مسائل اور مسلمانوں کا امتحان	۴۳۷

۴۶۹	یونیفارم سول کوڈ (U.C.C) کا چیلنج اور رہنما اصول	۴۳۸
۴۷۰	دفعہ ۴۴ اور مذہبی آزادی کے درمیان تضاد	۴۳۸
۴۷۱	سیاسی مقاصد اور مذہبی معاملات	۴۳۹
۴۷۲	شریعت کی سہولتیں اور ہماری لاعلمی	۴۴۰
۴۷۳	قانونی شعور کے ساتھ دین کی پاسبانی	۴۴۱
	(۳۰) دولھا دلھن کے حقوق اور ذمہ داریاں	
۴۷۴	فرد، خاندان اور سماج کی بنیاد	۴۴۳
۴۷۵	زبان اور نفس کی حفاظت پر جنت کی ضمانت	۴۴۴
۴۷۶	ذمہ داری ادا کرو، حق اللہ سے مانگو	۴۴۵
۴۷۷	ازدواجی زندگی کا امتحان؛ بیٹی بھی ہماری، بہو بھی ہماری	۴۴۵
۴۷۸	اسلام میں مرد و عورت کے حقوق کا توازن	۴۴۶
۴۷۹	صدیق اکبرؓ اور نیک عورتیں: جنت کے مہمانِ خاص	۴۴۷
۴۸۰	گھریلو نزاعات کا قرآنی حل	۴۴۸
۴۸۱	گھر کی وفاداری سے ایمان کی وفاداری تک	۴۴۹
۴۸۲	اسلامی تربیت بمقابلہ مغربی بے راہ روی	۴۴۹
۴۸۳	اسلام میں اولاد کی پرورش کی اہمیت اور اجر	۴۵۰
۴۸۴	چھوٹی چھوٹی باتوں سے سماج میں خیر و عافیت	۴۵۱
	(۳۱) تفسیر سورۂ یس شریف	
۴۸۵	قرآن کا دل اور آخرت کی یاد دہانی	۴۵۳
۴۸۶	آخرت کا یقین: نیکی کا محرک اور گناہ سے بچاؤ	۴۵۴
۴۸۷	قرآن کے خاص الفاظ: انسان کے لیے چیلنج	۴۵۵

۴۸۸	انبیاء کے قصے اور تذکیر بأیام اللہ	۴۵۵
۴۸۹	گذشتہ امتوں کی بربادی اور آج کا انسان	۴۵۶
۴۹۰	انبیاء کی بے غرض دعوت اور حبیب نجّار کا ایمان	۴۵۷
۴۹۱	زندگی کی ابتدا سے شکر گزاری تک	۴۵۹
۴۹۲	حافظ ابن کثیرؒ کی مثال: لومڑی اور زمین سے سبق	۴۶۰
۴۹۳	آخرت کی یاد؛ انسان کو گناہ سے روکنے والی اصل قوت	۴۶۰
۴۹۴	اللہ پاک کی حاضری کو مدنظر رکھیں	۴۶۱
۴۹۵	جنت کی خوشخبری اور قوم کی فکر	۴۶۲
۴۹۶	خشک زمین سے سرسبز کھیت تک: انسان کی زندگی کا آئینہ	۴۶۲
۴۹۷	کائنات کا دقیق انتظام	۴۶۳
۴۹۸	بوسیدہ ہڈی اور حیاتِ نو کا پیغام	۴۶۳

عرض مرتب

الحمدلله بنعمته تتم الصالحات، والصلوٰة والسلام علی سید المرسلین محمد و اٰله و صحبه و من والاه.

اللہ رب العزت کا بے پایاں شکر واحسان ہے کہ استاذ مکرم شیخ الحدیث حضرت مولانا مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی دامت فیوضہم کے کتاب وسنت سے معمور پر مغز اصلاحی بیانات کو تحریری شکل میں مرتب کرنے کا سلسلہ رواں دواں ہے، اس کی پہلی دوجلدیں منظر عام پر آچکی ہیں، الحمدللہ انہیں علمی دنیا میں پذیرائی حاصل ہوئی، اب اس سلسلے کی تیسری جلد بھی بتوفیق الٰہی اہل علم کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

حضرت مفتی صاحب کے بیانات کی سب سے نمایاں خصوصیات یہ ہے کہ آپ زیادہ تر قرآنی آیات اور احادیث مبارکہ کو بنیاد بنا کر گفتگو فرماتے ہیں، ان کے خطابات میں آیات قرآنیہ اور احادیث نبویہ کے دلائل کثرت سے پیش کیے جاتے ہیں، جس سے سامعین کو یہ پیغام (message) پہونچانا مقصود ہوتا ہے کہ نصیحت صرف ذاتی رائی نہیں؛ بلکہ خالصتاً دین اسلام کے اصل مأخذات (Original Sources) پر مبنی ہے، یہ ہی انداز واسلوب حضرت کے مواعظ کو علمی اور روحانی اعتبار سے زیادہ مؤثر اور نافع بناتا ہے۔ **بارك الله فيه و كثر الله امثاله.**

اس موقع پر یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ محترم مولانا ذاکر صاحب پارکھیتی سلمہ (استاذ جامعۂ ہٰذا) کا اس میں کافی تعاون شامل حال رہا، محترم موصوف نے کمپوزنگ کے جمیع امور کی انجام دہی کے ساتھ ساتھ بڑی عرق ریزی اور دیانت داری سے بعض مقامات پر الفاظ کی تصحیح اور جملوں کی ترتیب میں مناسب تبدیلی کر کے بہترین قالب (Finest mold) میں

ڈھالا؛ تاکہ عبارت مزید سہل، رواں اور عام فہم ہوجائے، مگر اصل مفہوم و مدعا بعینہ وہی رکھا گیا کہ اصل بیانات کی روح اور اثر انگیزی برقرار رہے تاکہ قاری کو مطالعہ کے درمیان وہی تاثیر حاصل ہو جو سامعین کو براہ راست (Directly) سننے کے وقت نصیب ہوتی ہے۔ مزید برآں ذیلی عناوین (Subheadings) بھی جناب موصوف ہی کی عمدہ کاوش ہے۔

تشکر وامتنان:

اولاً حق سبحانہ وتعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں، جس نے اپنے اس نحیف وناتواں بندے کے حصہ میں اتنی بڑی سعادت مقدر فرمائی، اسی سے دعا ہے کہ وہ اسے قبول فرمالے، آمین۔

ثانیاً حضرت الاستاذ (صاحب خطبات) معروف عالم وفقیہ حضرت مولانا مفتی اقبال صاحب ٹنکاروی دامت برکاتہم (مہتمم وشیخ الحدیث دارالعلوم اسلامیہ عربیہ ماٹلی والا، بھروچ) کا صمیم قلب سے ممنون ومشکور ہوں کہ حضرت والا نے احقر کی نااہلیت کے باوجود اپنے بیانات کو تحریری شکل دینے کی اجازت مرحمت فرما کر ذرہ نوازی فرمائی۔ فجزاهم الله تعالىٰ أحسن الجزاء. آمین!

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی - منت شناس ازو کہ بخدمت بداشت

اسی طرح بیانات کو تحریری شکل دیتے وقت بعض طلبۂ عزیز کا جو تعاون رہا، وہ قابل تحسین ہے، چند طلبۂ عزیز کے اسماء قابل ذکر ہیں:

(۱) شہاب کھنڈالی	متعلم عربی/۷	جامعۂ ہٰذا
(۲) شہباز دھنیاوی	//	//
(۳) انس پریجوی	//	//
(۴) یاسین آچھودی	//	//
(۵) ساہل بھڑکودروی	متعلم عربی/۵	//
(۶) محمد پالن پوری	متعلم عربی/۶	//

(۷) اسامہ کچھی متعلم عربی/۶ //

(۸) ثناءاللہ آمودی // //

رب کریم تمام کو دنیا و آخرت میں سرخ روئی عطا فرمائے اور مزید خدمات دین کے مواقع میسر فرمائے، آمین۔

اسی طرح پروف ریڈنگ کے جمیع امور کی انجام دہی کے لیے استاذ محترم حضرت مولانا مفتی عبدالرشید صاحب منوبری (استاذ: تدریب الافتاء جامعۂ ہٰذا) کا تہِ دل سے شکر گذار ہوں کہ ان تمام حضرات نے اپنا قیمتی وقت فارغ کیا اور آخری مرحلہ تک تصحیح و مراجعت کا کام بہت ہی تن دہی سے انجام دیا۔ اسی طرح مولانا عبداللہ صاحب لاجپوری (استاذ: تخصص فی الحدیث جامعۂ ہٰذا) کا بے حد ممنون و مشکور ہوں کہ جناب موصوف نے مواعظ کے درمیان ذکر کردہ احادیث نبویہ کی تخریج فرمائی۔ فجزاھم اللہ خیرا احسن الجزاء فی الدارین. آمین!

● یہ کتاب اکتیس (۳۱) خطبات پر مشتمل ہے، ان شاء اللہ اس کی چوتھی جلد بھی بہت جلد منظر عام پر آئے گی۔

اخیر میں دعا ہے کہ رب تبارک وتعالیٰ اس کتاب کو قبول فرمائے، اس کے نفع کو عام و تام فرمائے اور حضرت الاستاذ (صاحب خطبات) کی محنتوں کو قبول فرمائے اور ہم تمام کو ان سے اکتساب فیض کی توفیق عطا فرما کر ہم سب کے لیے اس کتاب کو صدقۂ جاریہ بنائے، آمین بحرمۃ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔

العارض: ذاکر بن عبداللہ ولنوی

خادم التجوید والقرأت: دارالعلوم ماٹلی والا

بھروچ، گجرات

مؤرخہ: ۹/جمادی الثانی/۱۴۴۷

مطابق: ۱/دسمبر/۲۰۲۵ء بروز پیر

(۱)

حدیث شریف کی ضرورت و اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ و الْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِیُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰہِ ط (نساء: ۶۴)

وقال تعالیٰ: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ (احزاب: ۲۱)

وقال تعالیٰ: وَمَنْ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰہُ عَلَیْہِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیْقِیْنَ وَالشُّھَدَآءِ وَالصّٰلِحِیْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیْقًا ﴿۶۹﴾ (نساء: ۶۹)

وَقَالَ النَّبِیّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لا یُؤمنُ أحدُکم حتی یکونَ ھَوَاہُ تبعًا لما جِئتُ بِہِ. (شرح السنۃ: کتاب الایمان، باب رد البدع والاھواء)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للّٰہ رب العالمین.

محترم ومکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! جن آیاتِ مبارکہ کی میں نے ابھی آپ کے سامنے تلاوت کی ہے، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک ذات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت

ہونے والی تمام چیزوں کی اہمیت اور ضرورت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

سنت وحدیث؛ رہنمائی کا روشن چراغ:

ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارے لیے یہ سمجھنا نہایت ضروری ہے کہ زندگی گزارنے کا اصل طریقہ ہمیں نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مبارک زبان سے نکلے ہوئے ملفوظات، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی زندگی سے ہی ملتا ہے۔ چاہے وہ عقائد کے مسائل ہوں یا موت تک پیش آنے والے معاملات؛ نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی عملی زندگی میں ہر پہلو کو ہمارے سامنے واضح فرما دیا، اگر سماجی زندگی کی بات ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے ساتھ کس طرح کا برتاؤ فرمایا؟ اگر تجارتی زندگی ہو تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کاروبار کس انداز سے کیا؟ اور روزمرہ کے دیگر معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کس طرح عمل فرمایا؟ اسی طرح ایک اور پہلو یہ بھی ہے کہ اگر صحابۂ کرامؓ سے کوئی عمل سرزد ہوا اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر نکیر نہیں فرمائی، بلکہ اسے برقرار رکھا، تو وہ بھی دین کا حصہ بن گیا، ان تینوں پہلوؤں کے مجموعے کو سنت اور حدیث کہا جاتا ہے؛ اگرچہ محدثین نے سنت اور حدیث میں کچھ فنی فرق بیان کیا ہے، لیکن عام مسلمانوں کے لیے بس اتنی بات سمجھ لینا کافی ہے کہ سنت انہی تین چیزوں پر مشتمل ہے: (۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات، (۲) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی زندگی، جس میں اخلاق و کردار سمیت تمام امور شامل ہیں، اور (۳) وہ افعال جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی موجودگی میں یا علم ہونے کے باوجود برقرار رکھا اور ان پر انکار نہیں فرمایا، یہی سب احادیث اور سنن کہلاتی ہیں۔

انبیاء کی زندگی؛ صراطِ مستقیم کی عملی تفسیر:

دوستو اور بزرگو! سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ خود قرآنِ کریم نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی کتنی بڑی اہمیت بیان فرمائی ہے، اور ایک مسلمان و مؤمن کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کے متعلق کیا عقیدہ اور کیا علم رکھنا ضروری ہے، جب تک یہ حقیقت سمجھ

میں نہ آئے، ایمان کامل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام پر کتابیں نازل فرمائیں؛ لیکن نبیوں کی تعداد کے مقابلے میں کتابوں کی تعداد بہت کم رکھی، ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء کرام علیہم السلام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمائے گئے، لیکن ان میں جو کتابیں لے کر آئے، ان کی تعداد زیادہ سے زیادہ تین سو سے کچھ اوپر ہے، یہ کتنا بڑا فرق ہے کہ نبیوں کی تعداد لاکھ سے زیادہ اور کتابیں صرف چند سو! یہ فرق اس حقیقت کی واضح دلیل ہے کہ کتابوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کے لیے خود نبی کی زندگی کو جاننا ضروری ہے۔ قرآنِ کریم کی آیت کا صحیح مطلب وہی نبی بتاتے ہیں جن پر وہ نازل ہوئی، جب اللہ تعالیٰ کسی واقعہ کے سلسلہ میں حکم نازل فرماتے یا اخلاقیات کی کوئی ہدایت دیتے، تو وہ نبی اپنی عملی زندگی میں اس حکم کو کس طرح برتتے، یہی اصل رہنمائی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کتابیں کم رکھی اور انبیاء کی عملی زندگی کو لوگوں کے سامنے زیادہ کھولا۔

ہم روزانہ سورۂ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں: ''اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝'' کہ اے اللہ! ہمیں سیدھے راستے کی رہنمائی عطا فرما اور پھر وضاحت کے ساتھ فرمایا گیا: ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ'' ان لوگوں کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا۔ اس کے بعد کہا گیا: ''غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝'' نہ ان کا راستہ جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان کا جو گمراہ ہو گئے۔ غور کیجیے! یہاں سیدھے راستے کو براہِ راست ''قرآن کا راستہ'' نہیں کہا گیا، بلکہ اسے ان لوگوں کا راستہ قرار دیا گیا جن پر اللہ کا انعام ہوا؛ یعنی انبیاء اور صلحاء کی عملی زندگی ہی صراطِ مستقیم ہے۔

اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؛ قیامت تک انسانیت کی کامل رہنمائی:

پچھلے انبیاء کرامؑ کے زمانے میں بھی جب کتابیں نازل ہوئیں، تو ساتھ ہی نبی کی زندگی عملی نمونہ کے طور پر موجود تھی؛ لیکن فرق یہ ہوا کہ پچھلی امتوں نے اپنے نبیوں کی زندگی کو محفوظ نہ رکھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی غیبی تدبیر بھی تھی اور ان قوموں کی اپنی سستی اور بدعملی بھی، اس کے نتیجے

میں آج اگر کوئی یہودی اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی کو اپنانا چاہے تو نہیں اپنا سکتا، کیونکہ اس کے پاس محفوظ ذرائع ہی نہیں ہیں جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کس موقع پر کیا عمل کیا اور کیا حکم دیا۔ یہی حال ایک عیسائی کا بھی ہے؛ اس کے پاس بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی عملی زندگی محفوظ شکل میں موجود نہیں ہے۔

ایک بڑے عیسائی عالم اور فاضل پادری، ڈاکٹر جارلس انڈرس، انسائکلو پیڈیا برٹانیکا میں اپنے ایک مقالے میں خود اعتراف کرتے ہیں کہ میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی تلاش کرنے میں صرف کر دیا، مختلف کتابوں کا مطالعہ کیا، لوگوں سے ملاقاتیں کیں، لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے صرف پچاس دن کے حالات ہی محفوظ کر سکا، وہ بھی غیر مستند واسطوں کے ذریعے۔ اس کے مقابلے میں ہمارے پاس نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے تمام پہلو مکمل طور پر محفوظ ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اعلان فرمایا ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ '' (احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ یہ اللہ پاک کا کھلا دعویٰ ہے کہ قیامت تک آنے والے انسانوں کے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی کامل نمونہ اور آئیڈیل ہے، چاہے زمانہ بدلے، انسانی سوچیں بدلیں، سائنس وٹیکنالوجی نئی سے نئی شکل میں آئے اور مسائل کثرت سے پیدا ہوں، قرآن کریم نے عمومی اعلان فرمادیا ہے کہ اے انسانو! تمہارے لیے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی ہی راہِ عمل اور کامل نمونہ ہے۔ آج چودہ سو سال بعد کا انسان بھی اسی طرح اسوۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پابند ہے، جس طرح غزوۂ خندق کے موقع پر صحابہ کرام کو یہ حکم دیا گیا تھا۔ اسی طرح ایک اور مقام پر فرمایا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ '' (ممتحنہ:۶) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی تمہارے لیے ہر پہلو میں بہترین مثال ہے۔ یہ قرآن کا پہلا اعلان اور دعویٰ ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمایا گیا کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث، آپ کی عملی زندگی کے ایک ایک پہلو اور طریقوں کو محفوظ رکھیں گے، تاکہ قیامت تک

آنے والا ہر انسان اصل دین پر عمل کر سکے اور اس میں کوئی غلط چیز شامل نہ ہونے پائے۔

احادیث کی حفاظت؛ اللہ کا وعدہ اور دشمنوں پر حجت:

اسی آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک عظیم چیلنج بھی بیان فرمایا ہے، جب ایک طرف یہ اعلان ہو رہا ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کی زندگی قیامت تک کے انسانوں کے لیے کامل نمونہ ہے، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہر زمانے کے حالات چاہے وہ فرد کی نجی زندگی سے تعلق رکھتے ہوں، یا سماجی زندگی سے، یا پوری امت اور انسانیت کے اجتماعی معاملات سے؛ ہر حالت میں نبیٔ کریم ﷺ کی زندگی کو نمونہ اور رہنما بنایا جائے اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی اعلان فرمایا کہ جب ہم نے آپ ﷺ کی عملی زندگی کو اسوہ اور معیار بنایا ہے تو ہم اسے ہر طرح کی رکاوٹوں سے محفوظ بھی رکھیں گے، یقیناً تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ ہر دور میں کچھ لوگ ایسے پیدا ہوئے جو احادیثِ مبارکہ کی اہمیت کو کم کرنے، امت کے دلوں سے ان کی قدر کو نکالنے اور نبی ﷺ کی ذاتِ گرامی پر اعتراضات اٹھانے کی کوشش کرتے رہے، ایسے لوگ کبھی غلط روایتیں وضع کرتے اور کبھی شکوک و شبہات پھیلاتے۔ خاص طور پر پچھلے تین سو برس سے مستشرقین کی ایک بڑی جماعت مستقل اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو آئیڈیل اور نمونہ ماننے کے تصور کو ختم کر دیا جائے اور حدیث پر مختلف طریقوں سے اعتراضات کیے جائیں؛ لیکن اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے، جس طرح پہلی اور دوسری صدی میں اللہ پاک نے آپ ﷺ کی روایتوں کو بااعتماد اور معتبر لوگوں کے ذریعے محفوظ کروا دیا، اسی طرح ان رواۃ کی زندگیاں بھی ایسی محفوظ اور روشن رکھیں کہ آج تک ان پر کسی قسم کا داغ نہیں لگایا جا سکا۔

تحقیق کے اصول؛ قرآن کریم سے فنِ اسماء الرجال تک:

جرمنی کا ایک بہت بڑا اسکالر جس کا نام Springer ہے، وہ کہتا ہے کہ میں نے تاریخ میں ایک عجوبہ دیکھا کہ ایک شخصیت کی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے ایک پورا علم ''فنِ اسماء الرجال'' وجود میں آیا یعنی لوگوں کی چھان بین، تحقیق اور جانچ کا ایک مستقل فن۔ یہی وجہ ہے

کہ میں آگے چل کر یہ بات عرض کروں گا کہ تاریخ (History) کس طرح لکھی جائے اور کن سندوں کا اعتبار کیا جائے، دنیا کو سب سے پہلے یہ اصول اور یہ علم مسلمانوں نے دیا، مسلمانوں نے حدیث شریف کے علم کو بنیاد بنا کر اصول اور ضابطے بنائے کہ کسی خبر کو کس طرح قبول کیا جائے اور کس طرح آگے منتقل کیا جائے، اور پھر انہی اصولوں کی روشنی میں مسلمانوں نے تاریخ لکھی۔ آج وہ قومیں جو اپنے آپ کو ریسرچ اور تحقیق کے میدان کا سردار سمجھتی ہیں، یہ بات نہیں جانتیں کہ تحقیق کے یہ اصول سب سے پہلے مسلمانوں نے دیے۔ آج جب کوئی شخص PHD کر لیتا ہے اور کسی فن کا ماہر (Specialist) کہلاتا ہے تو لوگ اس کی ہر بات کو حرفِ آخر مان لیتے ہیں۔ لیکن تحقیق کے اصل اور مضبوط اصول وہ ہیں جو قرآن اور حدیث سے نکلے۔

قرآنِ کریم نے خود اصول بیان فرمایا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ۝۶'' (حجرات:۶) اے ایمان والو! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لے کر آئے تو تحقیق کر لو۔ یہ اصول محض ایک سماجی ہدایت نہیں بلکہ ایک مستقل ضابطہ ہے۔ صحابۂ کرامؓ نے اس کو لیا، محدثین نے اسے بنیاد بنایا اور پھر ''اصولِ حدیث'' کے نام سے ایک عظیم علم وجود میں آیا، اس علم کے اصول اتنے پختہ ہیں کہ آج بھی دنیا ان پر حیران ہے، اور اسپر نگر یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمانوں نے ایک علم کو وجود دیا۔ اسی کی روشنی میں محدثین نے تقریباً چار لاکھ افراد کی زندگیوں کو محفوظ کر دیا؛ وہ کہاں پیدا ہوئے؟ کس سے علم حاصل کیا؟ ان کی نجی زندگی کیسی تھی؟ سماجی تعلقات کیسے تھے؟ ان سے کس نے پڑھا؟ ان کا اخلاق اور کردار کیسا تھا؟ یہ سب کچھ محفوظ کر کے کتابوں میں جمع کر دیا گیا، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جب بھی کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ بات روایت کی ہے، تو یہ جاننا لازمی ہے کہ وہ کس ذریعہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچا ہے؟ اور اس واسطے کی حقیقت کیا ہے؟ اس کے اساتذہ کون تھے؟ اس کی پیدائش کب ہوئی اور وفات کب ہوئی؟ تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ اس نے واقعی اپنے شیخ کو پایا

بھی یا نہیں۔ یہ احتیاط اور باریک بینی صرف اور صرف نبیٔ اکرم ﷺ کی زندگی اور احادیث کو محفوظ رکھنے کے لیے کی گئی۔

احادیث کی سند؛ اعتماد کی بے مثال تاریخ:

دوستو اور بزرگو! یہ احادیث جو آج میرے اور آپ تک پہنچی ہیں، یہ محض چند اوراق نہیں بلکہ لاکھوں انسانوں کی راتوں کی بیداریوں، دنوں کی محنتوں اور ایک ملک سے دوسرے ملک کے طویل سفر کے بعد ہم تک صحیح سند کے ساتھ پہنچی ہیں۔ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ اور امام دارمیؒ کے سفرنامے دیکھیے! ایک ایک حدیث کے لیے انہوں نے کتنے لمبے سفر کیے۔ آج ایک مستقل کتاب ''اطلس الحدیث'' کے نام سے موجود ہے، جس میں ان تمام مقامات کا نقشہ موجود ہے جن کا ذکر احادیث میں آتا ہے، اور ساتھ ہی یہ بھی کہ محدثین نے ان مقامات پر جا کر کس کس سے حدیث روایت کی۔ اسی حقیقت کو جرمن اسکالر Springer نے چند الفاظ میں یوں بیان کیا کہ تاریخِ حدیث کی پوری بنیاد ہی یہ ہے کہ چار لاکھ انسانوں کی زندگیاں اس لیے محفوظ کر دی گئیں کہ وہ اپنی بات کو نبی اکرم ﷺ سے منسوب کرتے تھے۔ یعنی جب کوئی یہ کہتا کہ قال رسول اللہ ﷺ، تو یہ معمولی بات نہ تھی، ہر راوی کے بارے میں تحقیق کی گئی کہ وہ کون ہے؟ اس نے کس سے روایت لی؟ اس کی زندگی، کردار اور سچائی کیسی ہے؟ یہی وجہ ہے کہ لاکھوں افراد کی سوانح اور حالات آج بھی ہمارے پاس محفوظ ہیں۔ یاد رکھیے! دنیا میں ہزاروں ناول لکھے گئے، لاکھوں تحقیقی کتابیں اور ریسرچ رپورٹس سامنے آئیں، سائنس میں بڑے بڑے نظریات پیش کیے گئے، لیکن وہاں دھوکہ دہی اور غلط بیانی کی مثالیں بھی عام ملتی ہیں، ڈارون کے نظریات کس طرح دنیا پر مسلط کیے گئے، یہ الگ تاریخ ہے؛ لیکن حدیث کا معاملہ ان سب سے جدا ہے، جب کوئی کہتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا، یا یہ روایت امام بخاریؒ یا امام مسلمؒ نے ذکر فرمائی، تو اس کے پیچھے ایک مضبوط اور معتبر سلسلۂ سند موجود ہوتا ہے۔ مصنفین نے کس سے سنا، انہوں نے کن کتابوں سے نقل کیا، کس استاد سے روایت لی،

سب کچھ وضاحت کے ساتھ درج ہے، یہی وجہ ہے کہ حدیث کا ایک ایک جملہ پوری انسانیت کے لیے اعتماد اور روشنی کا سرچشمہ ہے۔

اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بغیر ایمان نامکمل:

دوستو اور بزرگو! میں آپ کے سامنے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کی اہمیت بیان کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں ان کا مقام کیا ہے، جن آیاتِ مبارکہ کی تلاوت کی گئی، ان میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ '' (نساء:۶۴) ہم نے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اس لیے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے جو حکم فرمایا، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہی ہم تک پہنچایا اور چونکہ یہ دین قیامت تک باقی رہنے والا ہے، اس لیے اعلان کیا گیا کہ تمہارے لیے آئیڈیل اور نمونہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہے، ایسا نمونہ جس میں تمہاری زندگی کے ہر مسئلے کا حل موجود ہے؛ چاہے وہ عملی زندگی سے ہو یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور ارشادات سے۔ یہ کتنا بڑا انعام ہے جو اللہ نے اس امت کو عطا فرمایا۔ اسی لیے قرآن کے پانچویں پارے میں فرمایا: جب بھی تمہارے درمیان کوئی جھگڑا یا مسئلہ پیش آئے، تو اس کا حل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں تلاش کرو۔ اور پھر فرمایا: ''وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ﴿۶۵﴾ '' (نساء:۶۵) جب تمہارے درمیان اختلاف ہو تو اسے پورے شرحِ صدر اور تسلیم کے ساتھ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فیصلے کے سپرد کر دو۔ آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ مسلمان آپس میں لڑ رہے ہیں، عدالتوں اور کچہریوں میں لاکھوں مقدمے لٹکے ہوئے ہیں؛ حالانکہ اللہ نے صاف فرمایا کہ اگر تم اپنے مسائل کا حل چاہتے ہو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو نمونہ بنا لو، تمہارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ پھر قرآن کی ایک اور آیت میں فرمایا: ''وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ﴿۳۶﴾'' (احزاب:۳۶) کسی مسلمان مرد یا عورت کے لیے جائز نہیں کہ جب اللہ اور اس کے رسول کوئی فیصلہ فرما دیں تو وہ اس کے خلاف

کوئی اور راستہ اختیار کریں اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے، وہ کھلی گمراہی میں جا پڑا۔ یہ اس لیے ہے کہ اللہ کا فیصلہ ہی اصل عدل اور انصاف ہے، دنیا کے انسان لالچ اور خوف میں آکر انصاف سے ہٹ جاتے ہیں، لیکن اللہ احکم الحاکمین ہے؛ نہ اسے کسی کا خوف ہے اور نہ ہی کسی سے لالچ۔ اسی لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول و عمل کے ذریعہ دنیا کو جو عدل اور انصاف دیا گیا وہ کامل اور بے مثال ہے۔ چنانچہ سورۂ نساء میں ایک یہودی اور منافق کے قصے کو ذکر کر کے بتایا گیا کہ حقیقی عدل کس طرح قائم ہوتا ہے۔

قول سے بڑھ کر عمل کا سبق:

زندگی دراصل زندگی سے بنتی ہے، کتاب کے اوراق پر لکھی ہوئی باتوں سے زندگی نہیں بنتی۔ اصل اثر تب ہوتا ہے جب انسان اپنی آنکھوں سے عمل کو دیکھے۔ صحابۂ کرامؓ نے صرف ''اقیموا الصلوٰۃ'' نہیں پڑھا تھا، بلکہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رات کی نمازوں کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہوتے اور دعائیں مانگتے تو آپ کے سینہ مبارک سے ایسی آواز آتی ''أزیز کأزیز المرجل'' (سنن نسائی: کتاب السھو، باب البکاء فی الصلاۃ) جیسے ہانڈی ابلنے کی آواز ہو۔ یہ اللہ کا خوف، خشیت اور گہرا تعلق مع اللہ کا وہ منظر تھا جس نے صحابہ کے دلوں کو بدل دیا۔ اسی طرح دنیا کی بے وقعتی کتاب میں پڑھ کر نہیں، بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل میں دیکھی گئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوئے، جماعت کھڑی ہوگئی، مگر آپ فوراً حجرے میں واپس تشریف لے گئے، وجہ یہ تھی کہ رات کو کچھ تھوڑا سا سونا آیا تھا جو مسکینوں اور محتاجوں کو دینے سے رہ گیا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے صدقہ کر دیا اور پھر واپس نماز کے لیے آگئے۔ (بخاری: کتاب الاذان، باب من صلی بالناس فذکر حاجۃ فتخطاھم) یہ منظر امت کو یہ سکھانے کے لیے تھا کہ دنیا کی محبت دل میں ذرا برابر بھی نہ ہونی چاہئے، حتیٰ کہ نماز میں خیال آئے تو پہلے صدقہ کر کے مطمئن ہو جانا چاہئے۔

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو دعائیں سکھائیں۔ قرآن کی آیات اور اپنی زبان

مبارک سے ایسی دعائیں بتلائیں جو آج تک ہمارے لیے روشنی کا ذریعہ ہیں، مگر دعائیں صرف الفاظ کی تعلیم نہیں، بلکہ ان کی کیفیت بھی آپ ﷺ نے عملاً دکھائی۔ بدر کے میدان میں رات بھر دعائیں مانگتے ہوئے آپ ﷺ کی کیفیت کیا تھی! روایت میں ہے کہ آپ درخواست کررہے ہیں: ''اللّٰهمَّ إنَّك إنْ تُهلِك هذهِ العِصابةَ مِن أهلِ الإسلامِ، لا تُعبَدْ في الأرضِ'' (مسلم: کتاب الجهاد و السیر، باب الامداد بالملائکة فی غزوة بدر..، بخاری: کتاب الجهاد و السیر، باب ما قیل فی درع النبی ﷺ) اے اللہ! اگر یہ چھوٹی سی جماعت (تین سو تیرہ افراد) ختم ہوگئی تو پھر زمین پر تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ یہ جملے اتنے سوز اور درد کے ساتھ نکلے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ کو عرض کرنا پڑا: ''حسبك يا رسول الله!'' اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ آپ کے لیے کافی ہیں، آپ اتنا اپنے آپ کو امت کے لیے مت پگھلایئے۔ عرفات کے میدان میں آپ ﷺ نے جو دعائیں مانگیں وہ بھی حدیث کی کتابوں میں سند کے ساتھ منقول ہیں تاکہ امت جان لے کہ دعا کس طرح مانگی جاتی ہے۔ آج کے دور میں مختلف دعائیں اور وظائف سوشل میڈیا پر گھومتے ہیں، فلاں پڑھو، فلاں وظیفہ کرو، مگر اصل تو وہ دعائیں ہیں جو رسول اللہ ﷺ نے سکھائی ہیں، اگر کوئی دعا سنت سے سند کے ساتھ ثابت ہے تو وہ قبولیت کا ذریعہ ہے، لیکن اگر کسی بزرگ نے بنا سند اپنی طرف سے کہہ دی تو اس میں وہ تاثیر کبھی نہیں ہوسکتی جو نبی اکرم ﷺ سے منقول دعاؤں میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں نے امت کو سنت سے ثابت دعاؤں سے ہٹا کر غیر ثابت شدہ اذکار اور وظائف کی طرف مائل کرنے کی کوشش کی۔

وحی کی حفاظت اور محدثین کا کردار:

یاد رکھیں! یہود و نصاریٰ کے پاس آج اپنے نبیوں کی صحیح زندگی کا نقشہ موجود نہیں رہا، اس کی اصل وجہ میں پہلے اشارہ کرچکا ہوں؛ لیکن قرآن کریم کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمایا: ''اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝'' (حجر:۹) ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل فرمایا ہے اور

ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب قرآن کی حفاظت فرمائی تو ساتھ ہی احادیث مبارکہ کی حفاظت کا بھی انتظام فرمادیا؛ اس لئے کہ قرآن میں اصول اور قواعد بیان ہوئے ہیں، مگر ان پر عمل کیسے کرنا ہے، یہ ہمیں جنابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمل سے دکھایا، جس طرح قرآن محفوظ ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے حدیثوں کو بھی محفوظ فرمادیا، لاکھوں انسانوں نے اپنی زندگیاں قربان کیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں لمبے لمبے سفر کیے، بھوک پیاس برداشت کی، گرمی سردی جھیلی، تاکہ ایک ایک روایت کو محفوظ کیا جاسکے، اس قربانی کے بعد آج یہ دین ہمیں صحیح اور محفوظ شکل میں ملا ہے؛ لہٰذا ضروری ہے کہ ہم ان محدثین کی قربانیوں کا لحاظ رکھیں جنہوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایتوں کو پرکھ کر صحیح اور غلط کا فرق واضح کیا۔

تاریخ میں آتا ہے کہ ایک مسلمان خلیفہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا: میں نے اتنی حدیثیں گھڑ لی ہیں۔ وہ گویا دین کو شک میں ڈالنا چاہتا تھا، خلیفہ وقت نے جواب دیا: ہمارے پاس یحییٰ بن معین، امام احمد بن حنبل اور ایسے جلیل القدر محدثین موجود ہیں جو تیری گھڑی ہوئی باتوں کو چھانٹ کر ایک ایک روایت کو چھلنی سے گزاریں گے اور امت کے سامنے صرف صحیح حدیث ہی پیش کریں گے۔ دوستو! یہ وہ عظیم قربانیاں ہیں جن کی بدولت آج ہمارے پاس قرآن وحدیث اپنی اصل اور محفوظ شکل میں موجود ہیں، دنیا کی کسی اور قوم کے پاس اپنے مذہب کے بارے میں ایسی ضمانت اور ایسی حفاظت موجود نہیں۔

بزرگوں کے ملفوظات نہیں، اصل رہبر صرف رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات:

یہود اور نصاریٰ نے اپنے نبی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کو محفوظ نہیں رکھا، آج ان کے پاس اپنے نبی کا وہ عملی نمونہ موجود نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت بھی تھی کہ وہ انبیاء اپنے اپنے زمانے اور علاقے کے لئے بھیجے گئے تھے، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیامت تک کے لئے اور ساری انسانیت کے لئے نبی ہیں، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کو محفوظ رکھا، اور دنیا کو آپ کی سیرت سے اوجھل نہیں ہونے دیا، ماقبل امتوں نے جب اپنے نبی کی زندگی

محفوظ نہ رکھی تو نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے نبی کو بھول گئے اور اپنے بزرگوں کے ملفوظات کو یاد کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو نبی کی اصل سیرت سے محروم کر دیا؛ لیکن اسلام میں یہ اصول ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ کوئی بڑا سے بڑا عالم، عابد، قطب یا غوث بھی اپنے آپ کو معصوم نہیں کہہ سکتا؛ حتی کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، جنہیں صحبتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دولت نصیب ہوئی، ان کے بارے میں بھی محدثین نے فرمایا ہے کہ وہ محفوظ تو ہیں مگر معصوم نہیں، کیونکہ عصمت صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات کے ساتھ خاص ہے۔ اسی لئے قرآن مجید نے اعلان کیا کہ اگر زندگی کو نمونہ بنانا ہے تو صرف ایک ہی ذات ہے جو کامل نمونہ ہے، اور وہ ہیں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ اگر ہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے ہٹ کر اپنے بزرگوں کے اقوال یا ملفوظات پر چلنے لگیں گے، تو ہم بدعت یا شرک میں مبتلا ہو جائیں گے اور اصل سنت تک نہیں پہنچ پائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

خلاف پیمبر کسے رہ گزید — کہ ہرگز بہ منزل نہ خواہد رسید
ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقے کے خلاف راستہ اختیار کرے گا وہ کبھی اپنی منزل تک نہیں پہنچے گا، لہٰذا اگر منزل کعبہ ہے تو وہی راستہ اختیار کرو جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کیا، اگر کوئی دوسرا راستہ اپناؤ گے تو منزل تک نہیں پہنچ سکو گے، اس لئے آئیڈیل اور کامل نمونہ صرف اور صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہے اور اللہ تعالیٰ نے اسی کو قیامت تک محفوظ فرمایا ہے۔

دین و دنیا کا کامل دستور:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات میں بہترین نمونہ ہے۔ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کوئی بات فرماتے، وہ بھی ہمارے لئے نمونہ ہے؛ جب کوئی عمل کرتے، وہ بھی نمونہ ہے؛ حتیٰ کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کوئی عمل ہو رہا ہوتا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے منع نہ فرماتے، تو وہ بھی ہمارے

لئے نمونہ بن جاتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بیان کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں مدینہ منورہ میں ایک خاص قسم کا کاروبار ہوتا تھا جسے اسلامی اصطلاح میں ''بیع سلم'' کہا جاتا ہے، دیہاتوں میں آج بھی کسان یا چھوٹے تاجر ایسا کرتے ہیں کہ اپنی فصل یا تیار ہونے والا سامان ابھی مکمل نہ ہوا ہو؛ لیکن وہ کسی بڑے تاجر سے پہلے ہی پیسے لے لیتے ہیں، گویا چیز ابھی موجود نہیں، کھیت میں فصل ابھی کچی ہے، یا فیکٹری میں مال ابھی تیاری کے مراحل میں ہے، مگر سودا پہلے ہی طے ہو جاتا ہے۔ عام حالات میں ''مجہول چیز'' یعنی غیر موجود شیئ کا سودا کرنے سے حدیث میں منع کیا گیا ہے، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کی ضرورت کو دیکھتے ہوئے اس بیع سلم کی اجازت مرحمت فرمائی، صحابی فرماتے ہیں کہ ہم مدینہ میں بیع سلم کیا کرتے تھے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا علم تھا، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے منع نہیں فرمایا، (بخاری: کتاب السلم، باب السلم فی کیل معلوم) یہ بھی حدیث بن گئی اور امت کے لئے رہنمائی کا ذریعہ قرار پایا۔ یہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت کا اعجاز کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک قول، ایک ایک عمل اور حتیٰ کہ ایک ایک سکوت کو بھی اللہ تعالیٰ نے امت کے لئے ہدایت کا چراغ بنا دیا۔

دوستو اور بزرگو! ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتوں کا کیا مقام ہے؟ اللہ تعالیٰ خود قرآن میں فرماتے ہیں: ''صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ'' ان لوگوں کا راستہ جن پر تو نے انعام فرمایا۔ غور کیجئے! یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ ''قرآن کا سیدھا راستہ''، بلکہ یہ بتایا گیا کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا راستہ ہی سیدھا راستہ ہے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے صرف کتاب نہیں بھیجی بلکہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کو عملی زندگی کا مکمل نمونہ بنا کر بھیجا، تاکہ دین محض الفاظ تک محدود نہ رہے بلکہ عملی زندگی کے ساتھ جڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں سنتوں کو سمجھنے اور انہیں دین کا ایک اہم حصہ مان کر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲)

حدیث شریف کا انکار، ہوا پرستی و یورپ سے مرعوبیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ (حشر:۷)

وقال تعالیٰ: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ (نساء:۱۰۵)

وَقَالَ النَّبِيّ صَلَّى اللّٰہ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: لا يُؤْمِنُ أحدُكم حتى أَكُونَ أَحَبَّ إليه مِن وَالِدِه، ووَلَدِه، والناس أجمعين. (صحيح البخاری: كتاب الايمان،، باب حب الرسول من الايمان)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للّٰہ رب العالمین.

اطاعت اور ترک کا معیار:

معزز و مکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! گذشتہ جمعہ ہم نے اس بات پر گفتگو کی تھی کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ کی کیا اہمیت ہے، امت کو اس کی کتنی ضرورت ہے اور درحقیقت پوری انسانیت کو اس کی کس قدر حاجت ہے، آج بھی جو آیاتِ مبارکہ میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے صاف صاف ارشاد فرمایا ہے: ''مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ '' (حشر:۷) اللہ

کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں جو کچھ عطا کریں اسے مضبوطی کے ساتھ تھام لو، اور جس چیز سے روک دیں اس سے رک جاؤ۔

قرآن اور حدیث کا رشتہ:

حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ ایک روایت بیان فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدن پر ٹیٹو بنوانے، آنکھوں کی پلکوں کو مصنوعی طور پر درست کروانے اور دانتوں میں فاصلہ ڈال کر انہیں چوڑا کرنے سے منع فرمایا، یہ سب اس وقت (جاہلیت) کی فیشن تھی، آج بھی مختلف ناموں سے یہی چیزیں کی جاتی ہیں؛ جیسے گُدوانا، ٹیٹو اور اسی قسم کی دوسری خرافات۔ جب حضرت ابن مسعودؓ نے لوگوں کو اس سے روکا تو ایک عورت، جس کا نام اُم یعقوبیہ تھا، کہنے لگی: میں نے پورا قرآن پڑھ لیا ہے لیکن مجھے کہیں بھی گدوانے یا دانتوں میں فاصلہ کرنے کی ممانعت نہیں ملی، تو آپ یہ بات کہاں سے کہتے ہیں؟ حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: کیا تم نے پورا قرآن اول سے آخر تک پڑھ لیا ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں! حضرت ابن مسعودؓ نے فرمایا: تو کیا تمہیں یہ آیت نظر نہیں آئی؟ ''مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۗ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ'' (حشر:۷) (صحیح البخاری: کتاب اللباس، باب المتنمصات) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہیں جو چیز عطا فرمائیں اسے لے لو اور جس سے روکیں اس سے رک جاؤ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان چیزوں سے روکا ہے اور میں تمہیں روک رہا ہوں۔ حقیقت میں یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے روکنا نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے روکنا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں صاف فرمایا گیا ہے: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝'' (نجم: ۳، ۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، وہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ کی وحی کے مطابق کہتے ہیں۔

حدیث کے بغیر قرآن کی تشریح نامکمل:

دوستو اور بزرگو! آج کے دور کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ لوگ سنت کی مخالفت کرتے ہیں، اور بعض تو سنت کے نام پر بھی اپنی خواہشات پوری کرنا چاہتے ہیں، اپنی

چاہتوں، اپنے ارادوں اور اپنے دل کی تمناؤں کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں، ایسے موقع پر رسول اکرم ﷺ کی وہ روایتیں سامنے رکھنا لازمی ہیں جن کے بغیر قرآن کریم کی تفسیر مکمل نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ'' (نساء:۱۰۵) ہم نے آپ پر یہ کتاب نازل کی ہے بالکل حق کے ساتھ تاکہ آپ اس کے ذریعے لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔ ایک اور مقام پر فرمایا: ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ'' (نحل:۴۴) آپ لوگوں کے سامنے وضاحت کریں کہ ان پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے، اس کا مطلب کیا ہے۔ یہ اس لیے کہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارکہ اور آپ کے ارشادات قرآن کریم کی اصل تفسیر اور تشریح ہیں، کوئی بھی مسلمان قرآن پر ایمان رکھتا ہے، اس کا ایمان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک وہ رسول اللہ ﷺ کی وضاحتوں اور ارشادات کو بھی اپنے ایمان کا حصہ نہ بنائے؛ لہٰذا جس طرح قرآن پر ایمان لانا ضروری ہے، اسی طرح ان احادیث اور سنتوں پر ایمان رکھنا اور انہیں اپنی زندگی کا اسوہ اور نمونہ بنانا بھی ضروری ہے۔ قرآن نے اصول اور قوانین عطا کیے اور انہیں عملی زندگی میں ڈھالنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کو ہمارے سامنے رکھا۔

معراج سے امت تک؛ نماز کا عملی تحفہ:

قرآنِ کریم میں حکم آیا: ''اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ'' نماز قائم کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ نماز کس طریقے سے پڑھی جائے؟ اگر صرف یہی آیت نازل ہوتی تو ہر شخص اپنی مرضی کے مطابق الگ الگ نماز پڑھتا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے امت کو متحد اور ایک طریقے پر جمع کرنے کے لیے رسول اکرم ﷺ کو عملی طور پر نماز سکھلائی۔ آپ ﷺ معراج پر تشریف لے گئے جہاں سے نماز کا عظیم تحفہ ملا، معراج کے دوسرے دن حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور ہر نماز کو اس کے اول وقت میں نبی ﷺ کے ساتھ ادا کیا، پھر اگلے دن آئے اور ہر نماز کو اس کے آخری وقت میں پڑھا۔ اس کے بعد حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا: یہ دونوں وقت تمہاری امت

کے لیے ہیں، ظہر کے اول سے آخری وقت تک، (ابو داود: کتاب الصلوٰۃ، باب ما جاء فی المواقیت)
اسی طرح باقی نمازوں کے اوقات، ان کے درمیان جب چاہو نماز پڑھ سکتے ہو، یوں یہ نمازیں پریکٹیکل طور پر نبی اکرم ﷺ کو سکھائی گئیں اور امت کو عملاً طریقہ بتایا گیا۔

امت کی تربیت کرنے والے روحانی والد:

حضرت سلمان فارسیؓ سے ایک مشرک نے طنز کرتے ہوئے کہا: تمہارے نبی تو عجب ہیں، تمہیں پیشاب پاخانے کا طریقہ بھی سکھاتے ہیں، اس نے یہ بات جہالت اور تمسخر کے طور پر کہی، کیونکہ اسے انبیائے سابقین کی سیرت اور ان کی تعلیمات کا علم نہ تھا۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے نہایت حکمت اور وقار کے ساتھ جواب دیا۔ فرمایا: ہاں! ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں ہر چیز سکھائی ہے؛ حتیٰ کہ قضائے حاجت کے آداب بھی۔ اس کے بعد حضرت سلمان فارسیؓ نے وہ تعلیمات ذکر فرمائیں جو صحیح مسلم میں آئی ہیں کہ حضور ﷺ نے ہمیں منع فرمایا کہ ہم قضائے حاجت کے وقت قبلہ رخ ہوں، یا دائیں ہاتھ سے استنجا کریں، یا تین پتھروں سے کم پر اکتفا کریں، یا گندگی اور ہڈی سے استنجا کریں۔ (مسلم: کتاب الطھارۃ، باب الاستطابۃ)
یہ واقعہ دراصل اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات صرف بڑے بڑے احکام تک محدود نہیں، بلکہ انسانی زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو تک پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ تو ایک مثال ہے کہ آقا ﷺ نے باریک سے باریک امور تک ہماری رہنمائی فرمائی۔ اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے یوں بیان فرمایا: ''اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ'' (احزاب: ۶) نبی مؤمنین کے لیے ان کی اپنی جانوں سے زیادہ قریب اور محبوب ہیں۔
نبی ﷺ مومن کے لیے اس درجے کی شفقت رکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ ان کی تعلیمات اور تربیت بھی ایسی ہی ہمہ گیر اور مکمل ہے۔ جیسے ایک باپ اپنی اولاد کی اصلاح کرتا ہے، اسے تہذیب و سلیقہ سکھاتا ہے، کھانے پینے کا ادب بتاتا ہے، لباس پہننے کا صحیح طریقہ سمجھاتا ہے، اسی طرح نبی کریم ﷺ نے ہمیں دین و دنیا کے ہر گوشے کی تعلیم دی۔ چھوٹی سے چھوٹی

ضرورت اور بڑے سے بڑا معاملہ، ہر چیز کو عملاً سمجھایا۔

سنت چھوڑو گے تو امت بکھر جائے گی:

دوستو اور بزرگو! یہ اللہ پاک کا کتنا بڑا کرم ہے کہ اس نے ہمیں ایسی شریعت عطا فرمائی جس میں ہر چیز واضح اور محفوظ ہے۔ ایک بہت بڑے مسلمان اسکالر کسی محدث کے پاس گئے اور کہنے لگے: یہ جو احادیث ہیں، یہ آپ ﷺ سے آپ تک کیسے پہنچیں؟ ممکن ہے کہ ان میں بہت سی باتیں غلط ہوگئی ہوں! گویا انہوں نے حدیث پر اعتراض کیا۔ محدث نے بڑے حکمت بھرے انداز میں جواب دیا: آپ نماز کس طرح پڑھیں گے؟ قرآن میں تو صرف یہ ہے: ''اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ'' نماز قائم کرو، لیکن نماز کیسے پڑھنی ہے؟ اوقات کا ذکر ہے، فضیلت کا ذکر ہے، مگر قیام، رکوع، سجدہ، قعدہ، رکعتوں کی ترتیب، کون سی رکعت میں کیا پڑھنا ہے، کس طرح ہاتھ اٹھانا ہے، کس طرح بیٹھنا ہے، یہ سب کچھ کہاں سے ملے گا؟ اگر آپ نبی اکرم ﷺ کی روایت کو درمیان سے کاٹ دیں تو پھر قرآن کی اس آیت سے نماز کا طریقہ کیسے سیکھیں گے؟ نبی اکرم ﷺ نے اپنے عمل سے امت کو نماز سکھائی، معراج سے تحفہ ملا، پھر حضرت جبرئیلؑ آئے اور اول و آخر وقت میں آپ ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی، اور اسی ترتیب سے امت کو نماز ملی۔ چودہ سو سال کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ امت اسی طریقے پر نماز ادا کر رہی ہے، اختلاف صرف جزوی مسائل میں ہے جیسے رفع یدین کرنا یا نہ کرنا، جو کہ ''افضل'' اور ''غیر افضل'' کا معاملہ ہے؛ لیکن نماز کی اصل بنیاد، اس کا جوہر، ہر دور میں ایک ہی رہا ہے اور قیامت تک ایک ہی رہے گا۔ وہ اسکالر خاموش ہوگیا۔ محدث نے فرمایا: تم ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سکھائے ہوئے طریقے کو رد کرتے ہو اور دوسری طرف جو طریقہ خود اختیار کرو گے، وہ کہاں سے آئے گا؟ نبی ﷺ تو صاحبِ وحی تھے، اسی لیے انہوں نے ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا، اگر نبی ﷺ کے طریقے کو چھوڑ دیا جائے تو ہر شخص اپنی عقل کے مطابق نماز بنائے گا اور امت میں اختلافات کی انتہا ہو جائے گی؛ لیکن یہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا

احسان ہے کہ سنت اور حدیث کے ذریعے امت کو ایک ہی راستے پر جمع کر دیا۔

نماز میں سنت، باقی زندگی میں غیروں کی پیروی؟

دوستو اور بزرگو! یہ اللہ کا کتنا بڑا فضل ہے کہ غیر مسلم دنیا سے بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہیں اللہ نے ایمان کی دولت عطا کی۔ یورپ کے ایک بڑے اسکالر تھے، محمد اسد صاحب جو ماہرِ نفسیات بھی تھے، اللہ نے انہیں ہدایت دی تو انہوں نے اسلام قبول کیا اور پھر ایک کتاب لکھی: اسلام دوراہے پر۔ وہ فرماتے ہیں: قرآن نے کہا ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ''(احزاب:۲۱) تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ جناب محمد اسد صاحب کہتے ہیں: مسلمانوں نے نماز میں تو نبی ﷺ کی سنت کو اپنایا، لیکن تجارت، معاشرت، سماجی زندگی اور حتیٰ کہ لباس و عادات میں سنت کو چھوڑ دیا، آج مسلمان نوجوان اپنے بال اور کپڑے ایسے بناتے ہیں جیسے جانوروں کی مشابہت اختیار کر رہے ہوں۔ یہ رویہ اُس تعلیم کے سراسر خلاف ہے جسے نبی اکرم ﷺ نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے امت کو سکھایا۔ وہ مزید کہتے ہیں: قرآن یہ نہیں کہتا کہ صرف نماز میں نبی ﷺ کی اتباع کرو اور باقی زندگی میں دوسروں کی پیروی کرو؛ بلکہ فرمایا گیا: ''مَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ''(حشر:۷) یعنی نبی ﷺ جو کچھ عطا کریں علم ہو یا عمل، معاشرتی رہنمائی ہو یا سماجی اصول، سب کو اپناؤ۔

گذشتہ تین سو سال سے یورپ کے مستشرقین جناب نبی اکرم ﷺ کی احادیث کو اپنا نشانہ بنا رہے ہیں؛ جناب محمد اسد صاحب واضح کرتے ہیں کہ یورپ اپنی خواہشات اور مادیت میں بے لگام ہے، وہاں نہ زندگی کا مقصد ہے، نہ کوئی جامع تعلیم؛ لیکن تمہیں تو وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ملا ہے جس نے پیشاب پاخانے کے آداب سے لے کر موت تک کے سارے مسائل سنت و حدیث کے ذریعے واضح کر دیے۔ پھر اگر امتِ مسلمہ اپنی روش غیر مسلموں سے لے گی اور سنت کو چھوڑ دے گی، تو یہ کھلا نقصان ہے، اسی لیے قرآن نے حجۃ

الوداع کے موقع پر اعلان کیا: ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ '' (مائدہ:۳) آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ '' (آل عمران:۸۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اور آپ کی سنت ہی اللہ کے نزدیک قابلِ قبول ہے۔ محمد اسد صاحب خبردار کرتے ہیں کہ جتنا مسلمان احادیث وسنت سے دور ہوتے جائیں گے، اتنا ہی شیطانی طاقتوں کے قریب ہو جائیں گے۔ اس لیے کامیابی صرف اسی میں ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی عبادت سے لے کر تجارت، معاشرت اور اخلاق تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر گزاریں۔

حدیث کا قلعہ؛ محدثین کی جاں نثار محنت:

اتفاق یہ ہوا کہ پہلی صدی ہجری کے بعد محدثین کرام نے احادیث کو محفوظ کر کے کتابی شکل میں امت تک پہنچانا شروع کیا اور خاص طور پر منصور کے دور میں، مسلمانوں کا سامنا ایران اور روم کی تہذیب وثقافت سے ہوا، وہاں فلسفہ، منطق اور عقل پرستی کا زور تھا، اور ساتھ ہی دین سے بیزاری اور خواہش پرستی کے اثرات بھی نمایاں تھے، ان قوموں کے نظریات سے جب مسلمانوں کا سابقہ پڑا تو مختلف قسم کے اعتراضات اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر کیے جانے لگے۔ اس موقع پر محدثین اور علماء متکلمین میدان میں آئے، کچھ لوگ وہ بھی تھے جن کے پاس علم کم تھا مگر جذبہ زیادہ تھا، وہ باطل نظریات کا جواب دینا چاہتے تھے، مگر آہستہ آہستہ وہ خود بھی عقل پرستی کی راہ پر چلنے لگے، ایسے نازک دور میں اللہ تعالیٰ نے حدیث کے عظیم ذخیرے کی حفاظت فرمائی۔ امام احمد بن حنبلؒ، امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام نسائیؒ اور دیگر جلیل القدر محدثین نے اپنی زندگیاں اس خدمت کے لیے وقف کر دیں۔ انہوں نے لاکھوں احادیث کو جمع کیا، پرکھا، چھانا، اور سند کے اصولوں پر جانچ کر کے امت کے سامنے صحیح روایتوں کو پیش کیا۔ یہی نہیں، بلکہ اگر کسی نے جھوٹی روایتیں گھڑیں اور انہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب کیا، تو ان محدثین نے انہیں بھی ''موضوعات'' (منگھڑت احادیث) کے عنوان سے

الگ جمع کر دیا تا کہ امت دھوکے میں نہ پڑے اور پہچان لے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کے ارشادات نہیں ہیں۔ یوں اللہ نے اپنے دین کو ہر طرح کی ملاوٹ سے محفوظ کر دیا۔

حافظے کا کمال یا اللہ کا انعام؟

دوستو اور بزرگو! امام بخاریؒ کا امتحان لینے کے لیے کچھ لوگوں نے ایک چال چلی، انہوں نے دس آدمیوں کو تیار کیا، ہر ایک کو امام بخاریؒ کے سامنے دس دس حدیثیں سنانی تھیں، اور یہ سب حدیثیں جان بوجھ کر غلط سند اور ترتیب کے ساتھ سنائی گئیں، یوں کل سو غلط حدیثیں امام بخاریؒ کے سامنے پڑھ دی گئیں۔ امتحان کا مقصد یہ تھا کہ دیکھا جائے امام بخاریؒ ان غلط روایتوں کا کیا جواب دیتے ہیں، امام بخاریؒ نے بڑے سکون کے ساتھ فرمایا: سب سے پہلے میں تمہاری سنائی ہوئی روایتوں کو اسی طرح دہراتا ہوں جیسے تم نے سنائی ہیں، پھر انہوں نے ایک ایک حدیث کو بالکل اسی طرح دہرا دیا جیسے وہ غلط پڑھی گئی تھی، اور ہر ایک کی سند اور عبارت میں جو گڑبڑ تھی اسے واضح کر کے بیان کیا۔ اس کے بعد فرمایا: اب میں ان سب روایتوں کو صحیح سند اور درست الفاظ کے ساتھ بیان کرتا ہوں اور پھر ایک ایک کر کے سو حدیثیں صحیح سند اور الفاظ کے ساتھ بیان فرما دیں۔ (تاریخ بغداد: ذکر عقد البخاری مجلس التحدیث ببغداد، ۲/۲۰) دوستو! غلط کو یاد رکھنا اور ساتھ ہی صحیح کو پہچان کر الگ کر دینا کتنا مشکل ہے! مگر یہ اللہ کا کرم تھا کہ امام بخاریؒ جیسے محدثین کو ایسا قوی حافظہ عطا فرمایا کہ انہوں نے امت تک صرف وہی بات پہنچائی جو واقعی رسول اللہ ﷺ سے ثابت تھی۔

سنتِ نبوی؛ دین کی عمارت کا آہنی ڈھانچہ:

دوستو اور بزرگو! یورپ کے مشہور نومسلم اسکالر محمد اسد صاحب اسلام میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک نہایت اہم بات کہی، وہ فرماتے ہیں کہ اسلام ایک مکمل عمارت ہے، اور سنت نبوی ﷺ اس عمارت کا وہ لوہے کا اسٹرکچر اور آہنی بنیاد ہے جس پر پوری عمارت کھڑی ہے، اگر اس بنیاد کو نکال دیا جائے یا اسے کمزور کر دیا جائے تو پوری عمارت ختم ہو جائے گی اور دین

تاش کے پتوں کی طرح بکھر کر رہ جائے گا۔ یہ بصیرت اللہ تعالیٰ نے ایک نومسلم کو عطا فرمائی، جس نے اسلام قبول کرنے کے بعد عرب ملکوں میں مسلمانوں کی زندگیوں کو قریب سے دیکھا، وہاں کے حالات دیکھ کر انہوں نے کہا کہ مسلمانوں میں جو بے دینی پھیل رہی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ یورپ کی تہذیب اور کلچر سے مرعوب ہو گئے ہیں، ان کے طریقے کو اپناتے ہیں اور اپنی اصل سنت سے غافل ہو چکے ہیں۔ محمد اسد صاحب کہتے ہیں: دین کی ہر ضرورت رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتا دی، یہی اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ''(احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ یہ اعزاز کسی اور نبی کو نہیں دیا گیا۔ کیوں؟ کیونکہ پچھلی امتیں اپنی کتابوں کو محفوظ نہ رکھ سکیں، جیسا کہ قرآن خود فرماتا ہے: ''بِمَا اسْتُحْفِظُوْا مِنْ كِتٰبِ اللّٰهِ ''(مائدہ: ۴۴) انہیں اللہ کی کتاب کو محفوظ رکھنا تھا مگر وہ نہ رکھ سکے اور اس میں ردوبدل کر بیٹھے۔

قرآن اور حدیث؛ ہدایت کے دو ستون:

اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے، چودہ سو سال سے یہ اعلان اپنی جگہ قائم ہے: '' قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ ''(اسراء:۸۸) اے نبی! کہہ دو، اگر تمام انسان اور جنات جمع ہو جائیں کہ اس قرآن جیسا کلام لے آئیں، تو وہ ہرگز اس جیسا نہیں لا سکیں گے۔ چودہ سو سال میں بہت کوششیں ہوئیں، اور آج بھی ''فرقان الحق'' کے نام سے انٹرنیٹ پر قرآن کریم کو بگاڑ کر پیش کرنے کی سازش کی گئی؛ لیکن اللہ پاک نے قرآن کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر بار یہ دھوکے ناکام ہوتے ہیں۔ یاد رکھیں! قرآن کریم کے صرف الفاظ ہی محفوظ نہیں، بلکہ اس کے معانی اور اس کی صحیح تشریح بھی محفوظ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ کو اس کتاب کا محافظ بنا کر بھیجا۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا: ''لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ (نحل) ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ''(قیامہ:۱۹) ''اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ ''(نساء:۱۰۵) یعنی رسول اللہ ﷺ قرآن کے

محافظ ہیں، آپ ﷺ نے نہ صرف قرآن کے الفاظ کی حفاظت فرمائی بلکہ اس کے معانی اور مقصد کی بھی حفاظت کی اور یہی حفاظت ہمیں نبی اکرم ﷺ کی احادیث کی طرف متوجہ کرتی ہے، کیونکہ قرآن اور حدیث مل کر دین کو مکمل کرتے ہیں۔

علماء متکلمین کی خدمات اور عقل کی حقیقت:

ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جو احادیث مبارکہ اور دین پر اعتراضات کرتا تھا، ان کے جواب کے لئے ''معتزلہ'' کے نام سے ایک جماعت کھڑی ہوئی، مگر وہ دین کا مکمل علم نہیں رکھتے تھے، بس کچھ عقل پرست لوگ تھے، اس لئے انہوں نے عقلی، منطقی اور فلسفی انداز میں جوابات دینا شروع کئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ایسے علماء متکلمین پیدا فرمائے جو عقل اور دین دونوں کا صحیح توازن رکھتے تھے، ان میں حضرت امام ابوالحسن اشعریؒ، امام ابومنصور ماتریدیؒ، امام غزالیؒ اور حافظ ابن تیمیہؒ جیسے جلیل القدر بزرگ شامل ہیں، انہوں نے اپنے اپنے زمانے میں انسانی عقل پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ انسان کی عقل ناقص اور ادھوری ہے، آج ہم اپنی عملی زندگی میں بھی یہی مشاہدہ کرتے ہیں کہ جتنا لوگ دین سے اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات سے دور ہو رہے ہیں، اتنی ہی دنیا پریشان اور بے قرار ہے، موجودہ جدید دور میں انسان کے پاس ہر سہولت، ہر ٹیکنالوجی اور ہر وسیلہ موجود ہے، لیکن دل کے سکون سے محروم ہے۔ اہل یورپ سائنسی ترقی کے باوجود اپنے سماجی مسائل حل نہ کر سکے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ وہ اوپر آسمان کے ستاروں کو تلاش کرنے کے لئے دوڑ بھاگ میں لگا ہوا ہے، مگر اپنی ذات سے غافل ہے۔ انسان اب بھی اس بنیادی سوال کا جواب نہیں ڈھونڈ سکا کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں؟ کس مقصد کے لئے پیدا کیا گیا ہے؟ اور میری زندگی کا اصل مقصد کیا ہے؟

کائنات کا معلم؛ اللہ رب العزت:

دوستو اور بزرگو! تمام انبیاء علیہم السلام نے سب سے پہلے یہ دعوت دی ''وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾'' (ذاریات:۵۶) ہم نے جن وانس کو صرف اپنی عبادت کے

لیے پیدا کیا ہے۔اور دوسری طرف اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾ ''(اسراء:۸۵) تمہیں علم بہت ہی کم دیا گیا ہے۔جب مشرکین نے نبی کریم ﷺ سے پوچھا کہ روح کیا چیز ہے؟ تو اللہ نے فرمایا: ''قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ'' روح میرے رب کے حکم سے ہے۔

دوستو! غور کرو، چیونٹی اور شہد کی مکھی جیسی چھوٹی چھوٹی مخلوقات پر۔حضرت مفتی شفیع صاحبؒ فرماتے ہیں کہ چیونٹی جب گیہوں کا دانہ اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے اس کو توڑ دیتی ہے تاکہ وہ اگ نہ سکے اور صرف اس کی غذا بن جائے۔بھلا یہ عقل اور سمجھ کس نے دی؟ شہد کی مکھی؛ چھتہ کس نظم و ضبط کے ساتھ بناتی ہے؟ یہ کس نے سکھایا؟ قرآن میں ہے: '' وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ نُسْقِيْكُمْ مِّمَّا فِيْ بُطُوْنِهٖ مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ ﴿۶۶﴾ ''(نحل:۶۶) تمہارے لیے چوپایوں میں بھی بڑی نشانی ہے، ہم ان کے پیٹوں کے درمیان گوبر اور خون سے تمہیں خالص دودھ پلاتے ہیں جو پینے والوں کے لیے خوشگوار ہے۔یہ کس کا نظام ہے؟ وہی خداوند قدوس جس نے چھوٹی سے چھوٹی مخلوق کو سمجھ عطا کی اور ساری کائنات کے نظام کو اپنے اختیار میں رکھا؛ یہاں تک کہ یورپ کے سائنسدان بھی ماننے پر مجبور ہیں کہ یہ شعور مخلوق کا اپنا نہیں، بلکہ باہر سے کوئی طاقت ہے جو انہیں یہ عقل عطا کر رہی ہے۔اور جناب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: وہ طاقت اللہ کی ذات ہے جو تمام کائنات کے نظام کو چلا رہی ہے۔

سنت سے دوری؛ سکونِ قلب کا زوال:

دوستو اور بزرگو! آج یورپ میں طلاق کی کثرت ہے، بیوی کے تعلقات صبح سے شام تک بدل جاتے ہیں، خاندان ٹوٹ رہے ہیں، رشتے بکھر رہے ہیں۔ہندوستان کا روزانہ کا اخبار اٹھا لیجیے، میڈیا دیکھ لیجیے، ہر جگہ یہی حال ہے۔یہ سب کیا ہے؟ یہ وہی نتیجہ ہے جب انسانیت جناب نبی اکرم ﷺ کے طریقوں سے دور ہو جائے۔پھر زندگی میں بے چینی اور بے قراری چھا جاتی ہے، دلوں میں سکون باقی نہیں رہتا۔قرآن ہمیں خبردار کرتا ہے: ''وَلَا

تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ '' (حشر:۱۹) ان لوگوں جیسے مت ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا، تو اللہ نے انہیں ان کا آپ بھلا دیا۔ ایسے لوگ اپنی بے چینی کا سبب بھی نہیں جانتے کہ دل میں اتنی بے قراری کیوں ہے اور اس کا علاج کیا ہے۔ اللہ پاک نے فرمایا: '' قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ '' آپ فرما دیجئے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے یعنی سکون اور قرار بھی اللہ ہی کے حکم اور نظام سے ہے۔ کائنات کو دیکھو! جب اللہ نے آسمان و زمین کو حکم دیا تو انہوں نے کہا: '' قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۝۱۱ '' (فصلت:۱۱) ہم فرماں برداری کرتے ہوئے حاضر ہیں۔ مولانا رومیؒ فرماتے ہیں: یہ بادل، یہ چاند، یہ ستارے اور یہ ساری کائنات تیرے لیے تو بے جان ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ سب زندہ ہیں، اس کی بات کو سمجھتے ہیں اور غیر شعوری طور پر اس کے حکم کے مطابق اپنا نظام چلاتے ہیں۔

انسان کا تھوڑا علم، رب کا لامحدود علم:

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ انسان کو فرماتے ہیں: '' وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝۸۵ '' (اسراء:۸۵) تمہیں علم میں سے جو دیا گیا ہے وہ بہت تھوڑا ہے۔ آج کی سائنس بھی اس حقیقت کو مان رہی ہے، بڑے بڑے سائنسدان خود لکھتے ہیں کہ انسانی عقل محدود ہے، انسان کی زندگی کو دیکھو: بچہ پیدا ہوتا ہے، پھر تعلیم حاصل کرتا ہے، بیس پچیس سال کی عمر میں کچھ کمال حاصل کرتا ہے، تیس سال کے بعد ملازمت یا معاش کے میدان میں بڑھتا ہے، اور پچاس کے بعد کمزوریاں شروع ہو جاتی ہیں، عقل کا یہ دائرہ بہت تنگ ہے، یہ ساری کائنات کو سمجھنے کے لیے کافی نہیں۔ شیخ سعدیؒ نے فرمایا:

نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن — کہ جاہا سپر باید انداختن

ہر جگہ عقل کے گھوڑے نہیں دوڑتے، کہیں نہ کہیں تو رکنا پڑتا ہے، انسان کبھی عقل سے بات کرتا ہے اور کبھی دل سے۔ اپنی اولاد کے ساتھ وہ عقل کے بجائے محبت اور جذبات سے پیش آتا ہے، بیٹا گستاخی کر دیتا ہے، بیوی سخت کلامی کر دیتی ہے؛ مگر شوہر معاف کر دیتا ہے،

یہی جذبہ اللہ نے مخلوقات میں بھی رکھا۔ شیر اپنے بچوں کے ساتھ نرمی کرتا ہے، گھوڑا اپنے بچے کو اپنے ہی پیر سے بچاتا ہے، جانور اپنے بچوں سے محبت کرتے ہیں، حالانکہ باقی مخلوقات کے ساتھ ان کا رویہ بالکل مختلف ہوتا ہے، یہ سب کچھ کس نے سکھایا؟ یہ عقل، یہ شعور، یہ تمیز اللہ ہی نے عطا کی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ یاد دلاتے ہیں: ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا﴿۸۵﴾'' (اسراء:۸۵) اے انسان! تمہیں علم میں سے جو دیا گیا ہے، وہ بہت تھوڑا ہے۔

سکونِ قلب کا راز: ذکرِ الٰہی:

دوستو اور بزرگو! سائنس نے ترقی کی، دنیا کے ظاہر کو تو بہت کچھ دیا، مادی سہولتیں، نئی ایجادات، آرام دہ زندگی کے وسائل، مگر حضرتِ انسان کو اندر سے کیا دیا؟ دل کی دنیا کے لیے کیا دیا؟ آج انسان کے پاس سب کچھ ہے، لیکن دل دھندلا اور بے چین ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: '' اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴿۲۸﴾'' (رعد:۲۸) خبردار! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔

دوستو! سوچو، سوویت یونین کا صدر، جو زندگی بھر کمیونزم اور لادینیت کی تبلیغ کرتا رہا، مرنے کے وقت ''اللہ اللہ'' کر رہا تھا، کسی نے کہا: آپ تو خدا کو مانتے ہی نہیں، پھر یہ الفاظ زبان پر کیوں ہیں؟ اس نے جواب دیا: ہاں، میں آج بھی کمیونسٹ ہوں، مگر اس لفظ کو دہرانے میں مجھے ایک لذت ملتی ہے، میرے دل کو سکون ملتا ہے، اگر ایک اللہ کا منکر اللہ کے ذکر سے سکون پاتا ہے، تو سوچو! ہم جو ایمان والے ہیں، نمازوں اور عبادتوں میں مشغول رہتے ہیں، اللہ نے ہمیں کتنا بڑا سکون عطا فرمایا ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوا۔ دنیا میں ہزاروں مسائل اور غم ہیں، کوئی بھی ان سے خالی نہیں۔ شاعر نے کہا:

دریں دنیا کسے بے غم نہ باشد اگر باشد بنی آدم نہ باشد

اس دنیا میں کوئی غم سے خالی نہیں، اگر ہو تو وہ بنی آدم ہی نہ ہو۔ لیکن مؤمن ان غموں کو سہتے ہوئے یہ کہتا ہے: ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ﴿۱۵۶﴾'' (بقرہ:۱۵۶) ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی

طرف لوٹنے والے ہیں، یہی ایمان دل کو سکون دیتا ہے۔

سنت کے بغیر محبت کا دعویٰ ادھورا:

دوستو اور بزرگو! یہ احادیث مبارکہ ہمارے پاس امانت ہیں، انہیں سنبھالنا اور اپنی زندگی کا حصہ بنانا ضروری ہے، اس لیے لازم ہے کہ ہم اپنے آقائے مدنی ﷺ کی سنتوں پر عمل کریں، آپ کے لباس اور آپ کی چال پر چلنے کو اپنا شرف سمجھیں۔ حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں:

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی کیں رہ تو میروی بترکستان است

اے اعرابی! مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ تک نہیں پہنچ سکے گا، کیونکہ تیرا راستہ ہی ترکستان کی طرف جا رہا ہے۔ یعنی جو شخص سنتِ نبوی ﷺ سے ہٹ کر اپنی چاہت کے راستے پر ہے، وہ حضور ﷺ تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ محض محبت کے دعوے کافی نہیں۔ امام شافعیؒ کے اشعار بھی یہی سبق دیتے ہیں: اگر رسول اللہ ﷺ سے محبت ہے تو وہ صرف زبان کے الفاظ میں نہیں، بلکہ آپ کی چال ڈھال اور سنتوں کی پیروی میں جھلکنی چاہیے۔ اگر سنت کی پیروی نہیں تو محبت کا دعویٰ کھوکھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مجھے، آپ کو اور پوری امت کو نبی اکرم ﷺ کی سنتوں کی صحیح قدر دانی، اس کی اہمیت کا شعور اور اپنی زندگی میں اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۳)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعدد ازواج کی حکمت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

عَسٰی رَبُّہٗٓ اِنْ طَلَّقَکُنَّ اَنْ یُّبْدِلَہٗٓ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْکُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓئِبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓئِحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّاَبْکَارًا ۝۵ (تحریم:۵)

وقال تعالیٰ: وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰی وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً اَوْ مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳ (نساء:۳)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للہ رب العالمین.

پرانی سازش، نیا وار:

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! گذشتہ دنوں ایک عورت نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پرائیویٹ زندگی، بالخصوص آپ کی ازواجِ مطہرات جو ہم ایمان والوں کی مائیں ہیں، ان کے متعلق نہایت غلط اور بے ہودہ باتیں کیں؛ لیکن یاد رکھیے! یہ کوئی پہلا حملہ نہیں ہے۔ اس سے پہلے بھی یورپ کے بعض گمراہ

لوگ بارہا آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی اور آپ کی ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کی زندگیوں پر کیچڑ اچھالتے رہے ہیں، وہی پرانی سازش ہے جو ہر دور میں ایمان والوں کے دلوں کو زخمی کرنے کے لیے کی جاتی رہی ہے۔ مگر الحمدللہ! تاریخ گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر بار اپنے محبوب نبی ﷺ اور اہلِ بیت کی عزت کو بلند فرمایا ہے اور امتِ مسلمہ کو ان اعتراضات کا جواب دینے کی توفیق دی ہے۔

اللہ پاک کا منتخب کردہ گھرانہ:

کلامِ پاک کی وہ آیات جو ابھی آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی گئیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے گھرانے کی عورتوں کے اوصاف اور ان کے بلند مقام کو خود اپنی طرف سے بیان فرمایا۔ ارشاد ہوا: ''عَسٰى رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ يُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَيْرًا مِّنْكُنَّ '' (تحریم:۵) اگر نبی ﷺ تمہیں طلاق دے دیں تو اللہ تمہیں اس سے بہتر بیویاں عطا فرمائے گا؛ گویا نبی کے گھر میں رہنے والی عورتیں عام عورتوں کی طرح نہیں بلکہ سماج اور سوسائٹی میں سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل ہوتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ ''(احزاب:۳۲) اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ پھر اللہ نے مزید تاکید فرمائی: اپنے گھروں میں ٹھہری رہو اور جاہلیتِ اولیٰ کی طرح اپنی زینت کو ظاہر نہ کرو۔ اس کے بعد ان کی فضیلت کو بیان فرمایا: ''اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ۚ ''(احزاب:۳۳) یقیناً اللہ چاہتا ہے کہ اے اہلِ بیت! تم سے ہر قسم کی ناپاکی کو دور کر دے اور تمہیں پوری طرح پاک کر دے، یہی نہیں بلکہ جب منافقین نے ام المؤمنین سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگائی، تو اللہ تعالیٰ نے خود ان کی براءت کا اعلان فرمایا اور اصولی ضابطہ بتلا دیا: ''اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ ''(نور:۲۶) گندی عورتیں گندے مردوں کے لیے ہیں اور پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لیے۔ یوں اللہ تعالیٰ

نے قرآن میں صاف صاف بتادیا کہ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات سماج میں سب سے افضل اور سب سے پاکیزہ خواتین ہیں، اور یہ انتخاب اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے کیا ہے۔

تعددِ ازواج کا مسئلہ؛ اعتراضات اور حقیقت:

محترم حضرات! میں آپ کے سامنے سب سے پہلے اس اعتراض کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں جو ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کے بارے میں کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلا اعتراض یہی ہے کہ اسلام نے ایک سے زیادہ شادیوں کی اجازت کیوں دی؟ پھر دوسرا اعتراض یہ اٹھایا جاتا ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے متعدد نکاح کیوں فرمائے، خصوصاً حضرت عائشہ صدیقہؓ کے نکاح اور ان کی عمر کے حوالے سے مختلف اشکالات پیش کیے جاتے ہیں، اس سلسلہ میں سب سے پہلے ہمیں یہ سمجھنا چاہئے کہ اسلامی شریعت میں ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کا جواز کوئی انوکھا حکم نہیں ہے؛ بلکہ پچھلی شریعتوں میں بھی یہ جائز اور رائج رہا ہے، اگر یہود اور نصاریٰ ہمارے نبی کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی پر اعتراض کریں تو ان سے کہا جائے کہ اپنی مذہبی کتابیں کھول کر دیکھ لو، بائبل میں واضح طور پر حضرت سلیمانؑ اور حضرت داؤدؑ کے نکاح میں متعدد عورتوں کا ذکر موجود ہے۔ اسی طرح دیگر انبیاء بنی اسرائیل کے متعلق بھی یہی ملتا ہے۔ اسی طرح اس ملک میں جہاں ہم اور آپ رہتے ہیں، اگر ہمارے غیر مسلم بھائی ایک سے زیادہ شادیوں پر اعتراض کریں تو ان سے کہا جائے کہ آپ اپنی مذہبی کتابیں یعنی وید اور منوسمرتی دیکھ لیجئے، ان میں ایک سے زیادہ شادیوں کا حکم موجود ہے، بلکہ عملی طور پر جن شخصیتوں کو آپ بڑا مانتے ہیں، ان کی اپنی زندگیوں میں متعدد شادیاں اور باندیاں موجود رہی ہیں، مثال کے طور پر شری کرشن کا ذکر سب جانتے ہیں کہ ان کے ساتھ کئی باندیاں اور کئی داسیاں تھیں۔ منوسمرتی میں تو یہ بھی مذکور ہے کہ کس عمر میں شادی کی جائے، گویا ایک سے زیادہ نکاح پر اعتراض صرف اسلام پر کرنا علمی انصاف نہیں ہے؛ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اسے ایک ضابطے اور عدل کے اصول کے ساتھ رکھا، تاکہ نہ سماج میں بگاڑ ہو اور نہ عورتوں کے حقوق ضائع ہوں۔

چار بیویوں کی حد اور عدل کی شرط:

محترم حضرات! سب سے پہلے یہ مسئلہ سمجھ لیجیے کہ اسلام میں ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کو کیوں جائز رکھا گیا؟ اور اس سے پہلے کی امتوں اور زمانۂ جاہلیت میں کیا رواج تھے؟ اس وقت کے انسانی سماج اور معاشرت کا حال یہ تھا کہ نکاح کے بارے میں کوئی ضابطہ موجود نہ تھا، کوئی شخص دو عورتوں سے نکاح کرتا، کوئی چار سے، کوئی دس سے، بلکہ بعض کے نکاح میں بیس بیویاں تک موجود ہوتیں، اور ان عورتوں کے حقوق کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں قرآن کریم نے آکر سب سے پہلے حد مقرر کی اور فرمایا: ''فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ○ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً'' نکاح کرو دو سے، تین سے یا چار سے؛ لیکن اگر ڈر ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے تو صرف ایک بیوی پر اکتفا کرو۔ یہ آیت نازل فرما کر اسلام نے نکاح کو چار عورتوں تک محدود کر دیا اور اس کے ساتھ عدل و انصاف کی شرط لگائی، گویا تعددِ ازواج کی اجازت کسی خواہش نفس کی بنیاد پر نہیں بلکہ عدل، ذمہ داری اور معاشرتی ضرورت کی بنیاد پر ہے۔ پھر یہ پس منظر بھی سمجھ لیجیے کہ اس وقت یتیم بچیوں کے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا، اگر وہ مالدار ہوتیں تو رشتہ دار محض دولت پر قبضہ کرنے کے لیے ان سے شادی کر لیتے، اور اگر وہ غریب اور بے جمال ہوتیں تو انہیں نظر انداز کر دیا جاتا۔ قرآن کریم نے اسی ظلم کو ختم کرنے کے لیے فرمایا کہ اگر اپنے خاندان کی یتیم بچیوں سے شادی کے سلسلے میں تمہیں رکاوٹیں ہیں تو کوئی بات نہیں، اللہ نے اور بھی بہت سی مومن عورتیں تمہارے لیے حلال کی ہیں، یوں اسلام سے پہلے جہاں نہ یہودیت میں، نہ عیسائیت میں، نہ ہندو دھرم کی ویدوں میں اور نہ ہی منوسمرتی میں نکاح کی کوئی حد مقرر تھی، وہاں قرآن کریم نے آکر عدل کے ساتھ چار بیویوں تک کا حکم دیا اور معاشرت کو ایک منظم اصول پر قائم کر دیا۔

جہاں تک نبی اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کا تعلق ہے، تو اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے خصوصی احکام نازل فرمائے، جیسا کہ سورۃ الاحزاب میں ارشاد فرمایا: تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ

مِنْهُنَّ وَتُؤْوِيْٓ اِلَيْكَ مَنْ تَشَآءُ ط ''اور مزید فرمایا: ''لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَآءُ مِنْۢ بَعْدُ وَلَآ اَنْ تَبَدَّلَ بِهِنَّ مِنْ اَزْوَاجٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكَ حُسْنُهُنَّ اِلَّا مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ ط '' (احزاب:۵۲) یہ سب اللہ کے نبی ﷺ کے مقامِ نبوت اور مخصوص ذمہ داریوں کی وجہ سے تھا؛ لہٰذا آج اگر کوئی ۱۴۰۰ سال پہلے کے اس اصول پر اعتراض کرتا ہے تو اسے یہ سمجھنا ہوگا کہ اسلام نے اس وقت کی بگڑی ہوئی معاشرت کو درست کیا اور ایک متوازن اور منصفانہ ضابطہ دیا۔

ازواجِ مطہرات ؓ کی معرفت، ایمان کی حفاظت:

محترم حضرات! سوال یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کب اور کس وقت ایک سے زیادہ شادیاں کیں؟ آپ ﷺ کی پوری حیاتِ مبارکہ ہمارے سامنے ہے، کوئی پہلو چھپا ہوا نہیں ہے، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج ہمارے نوجوان، ہمارے بچے اور اسٹوڈنٹس کو کھلاڑیوں کے نام یاد ہیں، فلمی اداکاروں کے نام یاد ہیں؛ لیکن اپنے پیارے نبی ﷺ کی زندگی کے اس پہلو سے واقف نہیں ہیں، حالانکہ یہ وہ پہلو ہے جو سماج اور سوسائٹی کی اصلاح سے جڑا ہوا ہے۔ آپ ﷺ کی ازواجِ مطہرات کتنی تھیں؟ آپ نے کس وقت نکاح فرمایا؟ یہ سوالات ہمارے ایمان اور عقیدے کا حصہ ہیں۔ یورپ کے مستشرقین جب اعتراضات کرتے ہیں تو ہماری نوجوان نسل پریشان ہوجاتی ہے، حالانکہ ایک مسلمان کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ وہ اپنے نبی ﷺ کی سیرت کے ان پہلوؤں کو اچھی طرح جانے اور ان حقائق سے واقف ہو، ایمان کی حفاظت اسی وقت ممکن ہے جب ہم رسول اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا گہرا مطالعہ کریں اور آپ کی سنتوں کو اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔

ازدواجی زندگی کا پہلا اور سب سے طویل دور:

محترم حضرات! آج میں آپ کے سامنے یہ مسئلہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ رسول اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کتنی تھیں اور آپ ﷺ نے کب کب ان سے نکاح فرمایا؟ سب سے پہلے جان لیجیے کہ آپ ﷺ کی عمر جب ۲۵ سال ہوئی، اس وقت آپ نے حضرت

خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا، حضرت خدیجہؓ اس وقت ایک معزز اور مالدار بیوہ تھیں، جن کی عمر ۴۰ سال تھی اور آپ ﷺ سے ۱۵ سال بڑی تھیں، ان کے دو شوہر اس سے پہلے وفات پا چکے تھے۔ آپ ﷺ کی ایک تجارتی سفر میں حضرت خدیجہؓ کے ساتھ شراکت ہوئی، اس سفر میں حضرت خدیجہؓ کے خادم میسرہ بھی ساتھ تھے، انہوں نے واپسی پر حضرت خدیجہؓ سے عرض کیا کہ میں نے اس نوجوان میں بڑی برکتیں دیکھی ہیں، ان کے اخلاق، ان کی دیانت اور ان کا کردار بے مثال ہے، راستے میں بادلوں کا سایہ بھی ان پر دیکھا، اگر آپ نکاح کرنا چاہیں تو یہ سب سے بہترین شخصیت ہیں۔

حضرت خدیجہؓ نے خود نکاح کی پیش کش کی اور یوں ایک ۴۰ سالہ بیوہ خاتون کا نکاح ایک ۲۵ سالہ خوبصورت اور عین شباب کے نوجوان کے ساتھ ہوا، یہ بات غور طلب ہے کہ اگر آپ ﷺ دنیا کے عام رواج کے مطابق چاہتے تو اپنے ہم عمر کنواری لڑکی کا انتخاب کرتے؛ لیکن آپ ﷺ نے ایک بیوہ اور عمر میں بڑی خاتون سے نکاح فرمایا۔ حضرت خدیجہؓ سے آپ ﷺ کی ساری اولاد ہوئی، سوائے حضرت ابراہیمؓ کے۔ آپ ﷺ نے اپنی پوری جوانی کے قیمتی ۲۵ سال حضرت خدیجہؓ کے ساتھ وفاداری اور محبت میں گزارے۔ آپ ﷺ کی عمر جب ۵۰ سال ہوئی تو حضرت خدیجہؓ کا انتقال ہوگیا۔ یعنی نبوت کے دسویں سال، جبکہ آپ ﷺ کو نبوت ۴۰ برس کی عمر میں ملی تھی، یہ حقیقت ہمیں بتاتی ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی زندگی کا ابتدائی اور سب سے طویل ازدواجی دور صرف ایک بیوی کے ساتھ گزرا اور وہ بھی ایک بیوہ، عمر میں بڑی خاتون۔

حضرت سودہؓ کا انتخاب اور نکاح:

محترم حضرات! جب حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تو اس وقت حضرت فاطمہؓ اور دیگر بچیاں ابھی کم عمر تھیں، گھر میں ان کی پرورش اور تربیت کی ذمہ داری بھی تھی اور ساتھ ہی آپ ﷺ پر نبوت کی بھاری ذمہ داریاں بھی تھیں، ایسے وقت میں ایک صحابیہ

حضرت خولہؓ آپ ﷺ کے پاس آئیں اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ پر تو دین کی خدمت کا بھی بوجھ ہے اور گھر میں بچیوں کی دیکھ بھال کا بھی تقاضا ہے، بہتر یہ ہے کہ آپ کسی عورت سے نکاح فرمالیں تاکہ یہ ذمہ داریاں آسانی سے ادا ہوسکیں۔ حضرت خولہؓ نے اس موقع پر دو نام تجویز کیے: ایک حضرت سودہؓ کا اور دوسرا حضرت عائشہؓ کا، آپ ﷺ نے سب سے پہلے حضرت سودہؓ سے نکاح فرمایا۔ حضرت سودہؓ بیوہ تھیں، ان کے شوہر ایک مخلص مسلمان تھے جو ہجرت کے بعد وفات پاچکے تھے۔ حضرت سودہؓ کی عمر اس وقت تقریباً ۵۰ سال تھی، وہ بڑے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں، مگر ان کے گھر والے ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ حضرت سودہؓ کی شخصیت اور عمر کو دیکھتے ہوئے یہ بات واضح تھی کہ وہ نبی اکرم ﷺ کی بچیوں کی تربیت اور گھریلو ذمہ داریوں میں آپ ﷺ کا بھرپور ساتھ دے سکیں گی، یہی وجہ تھی کہ آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح ہوا، لیکن ان کی رخصتی ہجرت کے بعد دوسرے سال ہوئی، یعنی تین سال بعد۔ حضرت عائشہؓ کی شادی کے حوالے سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان کی وضاحت ان شاء اللہ آئندہ بیان کی جائے گی۔

غزوات کے شہداء کی بیوگان اور سماجی ضرورت:

محترم حضرات! آج کل سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے کتنی عورتوں سے نکاح فرمایا؟ تو اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے پہلے ۵۰ سال صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے ساتھ گزارے، پھر حضرت سودہؓ سے نکاح ہوا، اس کے بعد حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نکاح ہوا، جب آپ ﷺ کی عمر ۵۴ سال تھی، آپ ﷺ کی کل عمر ۶۳ سال تھی۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپ ﷺ نے حضرت خدیجہؓ سے نکاح فرمایا، جو اس وقت ۴۰ سال کی عمر میں تھیں۔ نبوت ۴۰ سال کی عمر میں ملی اور پھر ۵۰ سال کی عمر تک آپ ﷺ کے نکاح میں صرف حضرت خدیجہؓ ہی رہیں۔ اس کے بعد ہی آپ ﷺ نے ایک سے زیادہ نکاح کیے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے

اجازت دی کہ ایک مرد دو، تین یا چار بیویوں تک رکھ سکتا ہے، بشرطِ عدل۔ یہ آیت آپ ﷺ پر نازل ہوئی۔ زندگی کے ۵۸ ویں سال میں آپ ﷺ کے نکاح میں چار بیویاں موجود تھیں۔ پھر ۵۸ سے ۶۳ سال تک کے درمیان آپ ﷺ کے نکاح میں چار سے زیادہ ازواج آئیں، اور انتقال کے وقت آپ ﷺ کی ۹ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن زندہ تھیں، جبکہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ اور زینب بنت خزیمہ ؓ کا انتقال پہلے ہو چکا تھا۔ یوں مجموعی طور پر آپ ﷺ کی گیارہ شادیاں ہوئیں، یہ بھی سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ۵۴ ویں سال کے بعد کے زمانے میں غزوات ہوئے، غزوۂ بدر میں کئی صحابہ شہید ہوئے، اور غزوۂ احد میں تو ۷۰ جانثار صحابہ نے جامِ شہادت نوش کیا، اس کے نتیجے میں مدینہ کی بہت سی خواتین بیوہ ہو گئیں، رسول اکرم ﷺ کو ان خواتین کی فکر تھی، جن کے شوہروں نے دین کے لیے جانیں قربان کیں۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو حکم دیا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور تعلق رکھنے والی بیوہ خواتین سے نکاح کر لیں تا کہ ان کی کفالت اور عزت محفوظ رہے اور پھر خود بھی ان اصولوں پر عمل کرتے ہوئے کئی نکاح فرمائے۔ یہ حکمت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ ﷺ کی شادیاں خواہشات کی بنیاد پر نہیں بلکہ امت کی اجتماعی ضرورتوں اور سماجی مسائل کے حل کے لیے تھیں۔

حضرت حفصہ ؓ سے نکاح:

محترم حضرات! ۵۴ برس کے بعد نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں حضرت حفصہ ؓ آئیں، جو حضرت عمر فاروق ؓ کی صاحبزادی تھیں، یوں یہ سعادت حاصل کرنے والی دو بیٹیاں وہ ہوئیں جو اسلام کے دو عظیم صحابہ کی تھیں؛ ایک طرف حضرت ابوبکر صدیق ؓ کی صاحبزادی حضرت عائشہ ؓ، اور دوسری طرف حضرت عمر ؓ کی صاحبزادی حضرت حفصہ ؓ۔ یہ دونوں جلیل القدر صحابہ اپنی پوری زندگی اللہ کے نبی ﷺ پر قربان کر چکے تھے، حضرت حفصہ ؓ کے شوہر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد میں شریک تھے اور اسی دوران اللہ کی راہ میں شہید ہو گئے، شوہر کی وفات کے بعد حضرت عمر ؓ کو بیٹی کے نکاح کی فکر ہوئی، انہوں نے پہلے حضرت عثمان ؓ کو پیغام دیا، لیکن

انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ اس وقت مجھے شادی کی ضرورت نہیں۔ پھر حضرت ابوبکر صدیقؓ کو پیغام بھیجا مگر انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، کیونکہ ایک مجلس میں رسول اکرم ﷺ نے خود حضرت حفصہؓ کا ذکر فرمایا تھا اور حضرت ابوبکرؓ اس راز کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ (بخاري: كتاب النكاح، باب عرض الإنسان ابنته أو اخته على أهل الخير) پھر نبی اکرم ﷺ نے حضرت حفصہؓ سے نکاح فرمایا۔ یوں وہ بھی امہات المؤمنین میں شامل ہوئیں۔ یہ بھی ایک عظیم حقیقت ہے کہ رسول اکرم ﷺ کی گیارہ ازواج میں سے دس وہ تھیں جو بیوہ تھیں یا پہلے شادی شدہ تھیں۔ اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کے نکاح خواہشات کی بنیاد پر نہیں بلکہ امت کی ضرورتوں اور سماجی مصلحتوں کے تحت تھے۔

نکاحِ ام سلمہؓ سے امت کے لیے سبق:

محترم حضرات! اس کے بعد نبی اکرم ﷺ کے نکاح میں حضرت ام سلمہؓ آئیں، یہ عظیم خاتون دو ہجرتوں کی سعادت حاصل کرنے والی تھیں؛ پہلے حبشہ کی طرف اور پھر مدینہ کی طرف۔ ان کے شوہر حضرت ابوسلمہؓ دین کے بڑے خادم اور وفادار ساتھی تھے، مگر اللہ کی راہ میں خدمات کے بعد ان کا انتقال ہو گیا، حضرت ام سلمہؓ کے چھوٹے چھوٹے بچے تھے اور وہ سخت پریشانی میں تھیں۔ نبی اکرم ﷺ کو جب معلوم ہوا کہ حضرت ام سلمہؓ اپنے یتیم بچوں کے ساتھ مشکلات میں ہیں تو آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، اس نکاح کا مقصد دنیاوی لذت نہیں بلکہ ان یتیم بچوں کی پرورش اور بیوہ ماں کی دلجوئی تھی۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت ام سلمہؓ کا ایک بیٹا چھوٹا تھا، جو کھانے میں آپ ﷺ کے ساتھ بیٹھا کرتا، وہ خود بیان کرتا ہے کہ میں کھانے کے دوران اپنا ہاتھ ادھر ادھر مار رہا تھا تو رسول اکرم ﷺ نے نہایت شفقت سے مجھے سکھایا: بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرو، داہنے ہاتھ سے کھاؤ اور اپنے سامنے سے کھاؤ، (بخاری: كتاب الاطعمة، باب التسمية على الطعام والاكل باليمين) دوسروں کے سامنے سے نہ کھاؤ۔ یہ منظر ہمیں یہ سبق دیتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے نہ صرف بیوہ عورت کی

دلجوئی کی بلکہ اس کے بچوں کی تعلیم وتربیت کو بھی اپنی ذمہ داری سمجھا۔ حضرت ابوسلمہؓ نے دین کے لیے قربانی دی تھی، اور نبی کریم ﷺ نے اس قربانی کا صلہ ان کے اہلِ خانہ کی کفالت اور سرپرستی کی صورت میں دیا۔

حضرت ام حبیبہؓ سے نکاح نجاشی کے توسط سے:

اسی طرح دوسری ازواج مطہرات میں سے حضرت ام حبیبہؓ ہیں، یہ ابوسفیان کی بیٹی تھیں، جو مکہ میں آپ ﷺ کے خلاف جنگوں کے بڑے سردار تھے؛ لیکن ان کی بیٹی ایمان لے آئیں اور ہجرت کر کے حبشہ چلی گئیں، اس وقت نجاشی بادشاہ ایمان لا چکے تھے اور مسلمانوں کو پناہ دے رہے تھے۔ حضرت ام حبیبہؓ کے شوہر بھی ان کے ساتھ حبشہ گئے تھے، لیکن وہاں جا کر وہ نصرانی (عیسائی) ہو گئے۔ یوں ام حبیبہؓ ایک اجنبی سرزمین میں بالکل تنہا اور بے سہارا رہ گئیں، جب یہ خبر رسول اللہ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے نجاشی کے توسط سے نکاح کا پیغام بھیجا۔ نجاشی نے نکاح کرایا اور اس کا خطبہ خود پڑھا۔ یوں حضرت ام حبیبہؓ کا نکاح رسول اللہ ﷺ سے حبشہ ہی میں ہوا، اس کے بعد وہ مدینہ منورہ تشریف لے آئیں اور آپ ﷺ کے گھرانے کا حصہ بن گئیں۔

حضرت میمونہؓ سے نکاح:

حضرت میمونہؓ کے شوہر کا بھی انتقال ہو چکا تھا اور وہ نجد کے علاقے کی رہنے والی تھیں، آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، حضرت میمونہؓ دراصل حضرت عباسؓ کی سالی تھیں، حضرت عباسؓ نے خود آپ ﷺ کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ یارسول اللہ! آپ میمونہؓ سے نکاح فرمالیجیے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے شادی فرمائی، جب مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف سفر کیا جاتا ہے تو راستے میں مسجد عائشہ کے قریب، مکہ سے آگے ایک مقام پر جو آج کل سڑک کے بائیں جانب بارڈر کے قریب واقع ہے اس کو ''سَرِف'' کہتے ہیں، وہاں حضرت میمونہؓ کی قبر مبارک موجود ہے۔ وہ پہلے اپنے شوہر کے ساتھ نجد میں رہتی تھیں، اور ان کے انتقال کے

بعد حضرت عباسؓ کے مشورے اور سفارش پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے نکاح فرمایا۔

حضرت زینب بنت خزیمہ اور حضرت زینب بنت جحش سے نکاح:

حضرت زینبؓ دو ہیں: ایک حضرت زینب بنت خزیمہؓ اور دوسری حضرت زینب بنت جحشؓ۔ حضرت زینب بنت خزیمہؓ کے شوہر انتقال کر گئے تھے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے نکاح فرمایا۔ جبکہ حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح سب سے پہلے حضرت زیدؓ سے ہوا تھا، میاں بیوی کے درمیان ناچاقی پیدا ہوگئی اور بالآخر جدائی ہوگئی۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ مِّنْهَا وَطَرًا زَوَّجْنٰكَهَا لِكَيْ لَا يَكُوْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ حَرَجٌ فِيْٓ اَزْوَاجِ اَدْعِيَآئِهِمْ اِذَا قَضَوْا مِنْهُنَّ وَطَرًا ۭ '' (احزاب:۳۷) پھر جب زیدؓ نے اس سے تعلق ختم کرلیا تو ہم نے اس کا نکاح آپ سے کر دیا، تاکہ مومنوں کے لیے اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں (سے نکاح کرنے) میں کوئی تنگی نہ رہے، جب وہ ان سے تعلق ختم کر چکے ہوں۔ یہ نکاح صرف ایک ازدواجی رشتہ نہ تھا بلکہ ایک باطل جاہلی عقیدے کی تردید بھی تھا، اس وقت یہ عقیدہ عام تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح ہے اور اس کی مطلقہ بیوی سے نکاح جائز نہیں۔ قرآن نے اس نظریے کو رد فرمایا اور صاف حکم دیا: '' اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ '' (احزاب:۵) انہیں ان کے باپوں کے نام سے پکارو، انہیں اپنے نام سے مت پکارو۔ اسی پس منظر میں حضرت زینب بنت جحشؓ کا نکاح ہوا، اور اس نکاح کو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنی طرف سے منعقد فرمایا، اسی وجہ سے حضرت زینبؓ فخر سے دیگر ازواجِ مطہرات سے کہا کرتی تھیں کہ تم سب کا نکاح تو زمین پر ہوا ہے، جبکہ میرا نکاح آسمان پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔ (صحیح البخاری: کتاب التوحید، باب وکان عرشہ علی الماء)

حضرت جویریہؓ کا نکاح اور قبیلے کی نجات:

حضرت جویریہؓ کا تعلق مدینہ اور مکہ کے درمیان آباد قبیلۂ بنی مصطلق سے تھا، ان کے والد اس قبیلے کے سردار تھے اور انہوں نے مسلمانوں کے خلاف شرارت کی، جس کے نتیجے میں

مسلمانوں کا لشکر کامیاب ہوا اور متعدد مرد وعورت قید ہوکر آئے، انہی میں سردار کی بیٹی حضرت جویریہؓ بھی تھیں، صحابہ کرامؓ نے حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ قبیلے کے سردار کی بیٹی ہیں، اگر آپ ان سے نکاح فرمالیں تو یہ ان کے لیے باعث عزت ہوگا؛ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت جویریہؓ سے نکاح فرمایا۔ اس نکاح کا پہلا فائدہ یہ ہوا کہ بنی مصطلق کے تقریباً تین سو گھرانے جو قیدی بنائے گئے تھے، ان سب کو آزاد کردیا گیا، صحابہ کرامؓ نے کہا: جب یہ اللہ کے رسول ﷺ کے گھرانے میں آگئیں تو ہم ان کے خاندان کے لوگوں کو قید میں نہیں رکھ سکتے، اس طرح پورا قبیلہ آزاد ہوگیا۔ اسی لیے حضرت عائشہؓ فرمایا کرتی تھیں: حضرت جویریہؓ اپنے خاندان کے لیے سب سے زیادہ بابرکت ثابت ہوئیں (مسند احمد: رقم: ۲۶۳۶۵)، کیونکہ ان کی وجہ سے سینکڑوں مرد وعورت آزاد ہوئے، ان کے والد شکست کے بعد بھاگ گئے تھے، مگر جب بیٹی کی خبر ملی تو لینے کے لیے واپس آئے؛ لیکن حضرت جویریہؓ نے صاف فرمادیا: اب میں آپ کے ساتھ نہیں جاؤں گی، میں اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ ہی رہوں گی، بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے بھی نوازا اور وہ ساری زندگی حضور اکرم ﷺ کے نکاح میں رہیں۔

حضرت صفیہؓ سے نکاح؛ بین المذاہب تعلقات:

حضرت صفیہؓ یہودی قبیلے کے سردار حیی ابن اخطب کی صاحبزادی تھیں، جب خیبر فتح ہوا تو وہ بھی قید ہوکر آئیں اور تقسیم میں ایک صحابی کے حصے میں آئیں۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یہ یہودی سردار کی بیٹی اور سردار کی بیوی ہیں، جن کے شوہر بھی جنگ خیبر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ حضرت صفیہؓ کا تعلق ایک بڑے خاندان سے تھا اور وہ حضرت ہارونؑ کی نسل سے تھیں؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ان سے نکاح فرمایا، اس نکاح کے نتیجے میں یہودی قبیلوں میں گہرا اثر پڑا اور انہوں نے اس تعلق کو خوش دلی سے قبول کیا۔ اس طرح دو بڑے خاندانوں اور شاہی گھرانوں کی بیٹیاں اسلام میں داخل ہوئیں اور آپ ﷺ نے ان کی دلجوئی فرمائی۔

مخالفین کے اعتراضات کا واضح جواب:

حاصل یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی زندگی کے پچاس (۵۰) سال تک صرف ایک ہی عورت حضرت خدیجہؓ کے ساتھ گزاری، پھر چون (۵۴) برس کی عمر تک دو بیویوں کے ساتھ رہے، اور جب آپ ﷺ کی عمر اٹھاون (۵۸) برس ہوئی تو چار سے زیادہ ازواج مطہرات نکاح میں آئیں، ان میں حضرت عائشہ صدیقہؓ کے علاوہ سب کی سب یا تو بیوہ تھیں یا مطلقہ، جنہیں شوہروں نے طلاق دے دی تھی؛ لیکن اکثریت بیوہ خواتین کی تھی۔ یہ نبی کریم ﷺ کی ازدواجی زندگی کا پورا پس منظر ہے، جو انتہائی تقویٰ، پاکیزگی اور طہارت کے ساتھ گزری۔

اب غور کیجیے کہ مکہ کے مشرکین نے آپ ﷺ پر ہزاروں قسم کے اعتراضات کیے؛ کسی نے آپ کو ساحر کہا، کسی نے شاعر کہا، کسی نے مجنون کہا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس کا ذکر فرمایا: ''مَآ اَنۡتَ بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ بِمَجۡنُوۡنٍ ۚ﴿۲﴾'' (قلم:۲) آپ تو اپنے رب کے فضل سے ہرگز مجنون نہیں ہیں۔ مکہ کے لوگ ہر چھوٹی بڑی بات پر اعتراض کرنے کے درپے تھے، لیکن اگر ایک سے زیادہ شادی کرنا واقعی ناجائز یا معیوب سمجھا جاتا تو یقیناً وہ اس پر سب سے پہلے حملہ کرتے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ سے نکاح کا معاملہ بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے ان سے شادی فرمائی، لیکن نہ مشرکین نے، نہ منافقین نے، نہ یہود و نصاریٰ نے، اُس زمانے میں کسی نے اس پر اعتراض نہیں کیا؛ حالانکہ یہ وہی لوگ تھے جو حضور ﷺ کی ہر بات پر دشمن کی نگاہ سے دیکھتے تھے، مگر آپ ﷺ کی ایک سے زیادہ شادیوں یا حضرت عائشہؓ سے کم عمری میں نکاح پر کسی نے اشکال نہ اٹھایا۔

نکاحِ رسول ﷺ؛ سماجی اور دینی پہلو:

دوستو اور بزرگو! یاد رکھیں کہ اللہ کے نبی کو ماننے کے بعد ان کی اطاعت فرض ہو جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں، اپنی خواہش سے نہیں کرتے بلکہ جیسا کہ قرآن کہتا ہے: ''اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ يُّوۡحٰى ۙ﴿۴﴾'' (نجم:۴) یہ سب کچھ اللہ کی وحی کے تحت ہوتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ پر جو

اعتراضات کیے جاتے ہیں، ان پر ان شاء اللہ آئندہ جمعہ کو گفتگو ہوگی۔ فی الحال یہ سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی زندگی کو نہایت پاکیزہ اور باحیا رکھا، آپ ﷺ شرم وحیا کے پیکر تھے، جس طرح ایک شرمیلی لڑکی گھر کے اندر حیا کی چادر اوڑھ کر رہتی ہے، اس سے بھی بڑھ کر رسول اکرم ﷺ میں شرم وحیا پائی جاتی تھی۔ (صحیح البخاری: کتاب الادب، باب الحیاء) اگر (نعوذ باللہ) آپ ﷺ میں خواہش پرستی کا پہلو ہوتا تو وہ جوانی میں ظاہر ہوتا، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی ازدواجی زندگی کے فیصلے ہمیشہ اللہ کے حکم کے تابع رہ کر کئے۔ بڑے بڑے قبیلوں کے سردار اپنی بیٹیاں پیش کرتے لیکن آپ ﷺ نے کبھی اپنی خواہش کے مطابق انتخاب نہیں کیا، بلکہ جو حکم آیا اسی پر عمل کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک عورت حاضر ہو کر کہنے لگی: ''وَهَبْتُ لَكَ من نَفْسِي'' (صحیح البخاری: کتاب الوکالۃ، باب وکالۃ المرأۃ الامام فی النکاح) میں اپنی ذات آپ کو ہبہ کرتی ہوں، مگر آپ ﷺ نے اپنی مرضی سے فیصلہ نہیں فرمایا۔ جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا حکم آیا، اسی کے مطابق عمل کیا۔ اسی لئے آپ ﷺ کی بیشتر بیویاں بیوہ تھیں، کیونکہ ان نکاحوں کے پیچھے حکمتیں تھیں: معیشت کے مسائل، سماجی مسائل اور دعوتِ دین کی مصلحتیں۔ آپ ﷺ داعی تھے اور چاہتے تھے کہ دین زیادہ سے زیادہ پھیلے، اس لئے مختلف قبائل سے رشتہ قائم فرمایا۔ حضرت میمونہؓ سے نکاح کے نتیجے میں نجد کے لوگ قریب آئے۔ حضرت صفیہؓ سے نکاح کے ذریعے یہودیوں کے دل نرم ہوئے۔ حضرت جویریہؓ کے نکاح کی وجہ سے قبیلہ بنی مصطلق اور دوسرے علاقوں کے لوگ قریب آئے۔ یہ سب نکاح ذاتی خواہش نہیں تھے بلکہ دین کی مصلحت، دعوت کی وسعت اور اللہ کے حکم کے مطابق تھے۔ یہ واقعات سیرت کی معتبر کتابوں اور حدیث کے ذخیرے میں واضح طور پر موجود ہیں۔

محبتِ رسول ﷺ کا تقاضا: علم اور اطاعت:

اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ کو کتنی اعلیٰ صفات سے یاد فرماتے ہیں۔ ازواجِ مطہرات کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے: ''اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ﴿۳۳﴾'' (احزاب: ۳۳)

اے اہلِ بیت! اللہ نے تمہیں پاکیزہ بنایا اور خوب پاکیزہ کیا۔ دوستو اور بزرگو! ہمیں چاہئے کہ ہم اپنے نبی ﷺ کے دفاع اور ان کی سیرت کے تحفظ کے لئے خود سیرتِ نبوی ﷺ کا مطالعہ کریں، اور اپنی زندگیوں کو اس عملی نمونے کے مطابق ڈھالیں جو اللہ کے رسول ﷺ نے ہمارے سامنے رکھا۔ اگر نبی ﷺ سے محبت ہے تو یاد رکھیں کہ محبت کا تقاضا اطاعت ہے، اور اطاعت سے پہلے علم ضروری ہے، اگر کوئی نبی اکرم ﷺ کی پاکیزہ زندگی پر اعتراض کرے تو ہمیں چاہئے کہ سنجیدگی، متانت اور عقلی دلائل سے جواب دیں۔ ساتھ ہی ان کے اپنے مذہب کی کتابوں اور ان کے بڑوں کی عملی زندگی کے حوالے دے کر حقیقت واضح کریں۔ خود بھی اس بات پر اطمینان ہونا چاہئے تاکہ دل میں شک نہ آئے۔ یقین مانیے! نبی ﷺ کے بارے میں کوئی غلط بات سننا کسی مومن کے لئے ناقابلِ برداشت ہے؛ لیکن اصل جواب صرف زبان سے نہیں بلکہ عمل سے دینا ہے۔ ہمیں اپنی عملی زندگی میں، خاص طور پر اپنی عورتوں کے ساتھ حسنِ سلوک کر کے یہ دکھانا ہوگا کہ اسلام عورتوں کے ساتھ کس قدر عدل، رحمت اور محبت کا درس دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں ہم سنتے اور کہتے ہیں، ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۴)

حضرت عائشہؓ سے کم عمری میں شادی کی حکمتیں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾ وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

(احزاب:۲۸،۲۹)

وَقَالَ النَّبِیّ صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: لا یُؤْمِنُ أحدُکم حتی أَکُونَ أَحَبَّ إلیه مِن والِدِه، وولَدِه، والناس أجمعین. (صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للّٰہ رب العالمین.

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! گذشتہ جمعہ میں نے آپ حضرات کے سامنے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات، امہات المؤمنین کے سلسلے میں گفتگو کی تھی، میں نے بتایا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ ایک بیوہ عورت، حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ کے ساتھ گزارا، جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پندرہ برس بڑی تھیں،

آپ ﷺ کی ازدواجی زندگی کے ابتدائی ۲۵ برس صرف انہی کے ساتھ بسر ہوئے اور پھر ۵۰ برس کی عمر تک آپ ﷺ کے نکاح میں صرف حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ ہی رہیں، اس کے بعد دوسری ازواجِ مطہرات سے نکاح ہوا۔

آج کی مجلس میں اسی موضوع کے ایک اور پہلو پر روشنی ڈالنی ہے، مستشرقین یعنی یورپ کے وہ لوگ جو اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کر کے اس میں اعتراضات کرتے ہیں، حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے نکاح کے مسئلے کو چھیڑتے آئے ہیں۔ بخاری شریف کی روایت ہے کہ حضرت عائشہ ؓ خود فرماتی ہیں: چھ برس کی عمر میں میرا نکاح ہوا اور نو برس کی عمر میں رخصتی ہوئی، اور انہوں نے اس کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔(صحیح البخاری: کتاب مناقب الانصار، باب تزویج النبی ﷺ عائشۃ) بعض ایمان والے بھائیوں کو بھی اس روایت پر اشکال ہوا اور انہوں نے کوشش کی کہ حضرت عائشہ ؓ کی عمر زیادہ ثابت کی جائے؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ بخاری، مسلم اور دیگر معتبر کتبِ حدیث کی روایات، نیز خود حضرت عائشہ ؓ کے واقعات، سب یہی بتاتے ہیں کہ انہی عمروں میں نکاح اور رخصتی ہوئی۔

ازدواجی پہلو بھی نبوی سیرت کا حصہ:

اب سوال یہ ہے کہ جب ۱۴۰۰ سال کے بعد یہ سوال اٹھایا جاتا ہے تو کیا کسی سماج اور سوسائٹی میں ۱۴۰۰ سال پہلے پیش آنے والے معاملات کو آج کے ماحول، سوچ اور قوانین کی روشنی میں پرکھا جا سکتا ہے؟ ہمارے زمانے کے اعتبار سے بسا اوقات کچھ چیزیں اشکال بن جاتی ہیں، اس کے جواب میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ میں نے آپ حضرات کے سامنے جو قرآن کریم کی آیت تلاوت کی، اس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ یعنی جس شخص کا اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ہو، اس کے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں کامل نمونہ ہے۔ آپ کے بعد قیامت تک کوئی نبی نہیں آنے والا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے

آپ ﷺ کی زندگی کو ساری انسانیت کے لیے کامل اسوہ اور آئیڈیل قرار دیا، رسول اکرم ﷺ نے ہمیں کھیتی باڑی کے اصول سکھائے، ملازمت اور مزدوری کے قواعد بتائے، حتیٰ کہ کسی کو ملازم رکھنے کے آداب تک تعلیم فرمائے۔ یہ سب مسائل انسانی زندگی میں کبھی کبھار پیش آتے ہیں، مگر شادی بیاہ کا مسئلہ ایسا ہے کہ یہ ہر انسان کے لیے زندگی کا لازمی حصہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے چاہا کہ رسول اللہ ﷺ کی ازدواجی زندگی بھی پوری طرح سامنے آجائے، تاکہ قیامت تک انسانیت ہر مرحلے پر آپ ﷺ کی زندگی سے رہنمائی حاصل کر سکے، یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی خلوت یعنی تنہائی کی زندگی بھی امت کے سامنے ہے اور جلوت یعنی مجمع اور مجلس کی زندگی بھی۔

گھر کی زندگی، صداقت کی سب سے بڑی دلیل:

ایک یورپی مصنف، جو آپ ﷺ کی سیرت پڑھ کر ایمان لائے، ان سے پوچھا گیا کہ آپ نے کس بنیاد پر اسلام قبول کیا؟ انہوں نے جواب دیا کہ نبی اکرم ﷺ کی سچائی کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ سب سے پہلے آپ پر ایمان لانے والی آپ کی اپنی اہلیہ محترمہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ تھیں، انسانی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی شوہر کے ہر حال کو سب سے بہتر جانتی ہے، باہر کے لوگ تو ظاہری باتوں سے متاثر ہو سکتے ہیں، مگر بیوی گھر کے اندر کے حالات سے واقف ہوتی ہے، گرمی سردی، مالداری وغریبی، میاں بیوی کے تعلقات، بچوں کی پرورش اور سماج وسوسائٹی کے مسائل ان سب کا سامنا سب سے زیادہ بیوی کو ہوتا ہے، ایسے مواقع پر شوہر کا حقیقی کردار سب سے پہلے بیوی ہی کے سامنے آتا ہے؛ چنانچہ یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سب سے پہلے آپ ﷺ کی صداقت پر ایمان لانے والی آپ کی بیوی تھیں۔

غارِ حرا میں جب سب سے پہلی وحی نازل ہوئی اور آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو آپ گھبراہٹ کے عالم میں فرمانے لگے: ''زملونی! زملونی!'' مجھے اوڑھا دو، مجھے اوڑھا دو۔ اس وقت حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ نے تسلی دی اور فرمایا: اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے

گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، کمزوروں کی مدد کرتے ہیں، بے سہارا اور محتاجوں کا سہارا بنتے ہیں اور مظلوموں کو ان کا حق دلاتے ہیں، (صحیح البخاری: باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ) یہ سب نبوت سے پہلے کا حال تھا۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ نبی کریم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ازل ہی سے نبی بنایا تھا۔

حضرت آدمؑ کے قصے میں آتا ہے کہ جب انہوں نے توبہ کی اور دعا میں نبی کریم ﷺ کا وسیلہ پیش کیا تو اللہ تعالیٰ نے پوچھا: اے آدم! تمہیں محمد ﷺ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا؟ حضرت آدمؑ نے عرض کیا: ''میں نے عرش پر لکھا ہوا دیکھا: **لا إله إلا الله محمد رسول الله**، تو میں سمجھ گیا کہ جس ہستی کا نام آپ نے اپنے نام کے ساتھ رکھا ہے، وہ یقیناً آپ کے نزدیک سب سے زیادہ برگزیدہ ہیں۔ (مستدرک للحاکم: ۲/ ۶۷۲، رقم: ۴۲۲۸)

الغرض یہ بات واضح ہے کہ آپ ﷺ کی گھریلو زندگی اور پرائیویٹ لائف ایسی تھی کہ جس میں ذرہ برابر بھی عیب نہ تھا، عام انسان اپنی بیوی سے بھی کچھ باتیں چھپاتا ہے، مگر اللہ کے نبی ﷺ کی زندگی ایسی پاکیزہ تھی کہ سب سے پہلے آپ کی اپنی اہلیہ نے آپ کی صداقت کی گواہی دی۔

حضرت عائشہ ؓ سے نکاح؛ تعلیم و تعلم کی حکمت:

خیر! چالیس سال کی عمر میں اللہ پاک نے آپ ﷺ کو نبوت عطا فرمائی، حضرت خدیجۃ الکبریٰ ؓ پندرہ برس تک آپ ﷺ کے ساتھ رہیں، اس دوران انہوں نے آپ ﷺ کی زندگی کے وہ تمام حالات و معاملات اپنی آنکھوں سے دیکھے، جو نبوت سے پہلے بھی پیش آئے اور نبوت کے بعد بھی۔ حضرت خدیجہ ؓ نے ہر مرحلے میں آپ ﷺ کا ساتھ دیا؛ لیکن اب ضرورت تھی کہ آپ ﷺ کے ساتھ ایک ایسی زوجہ ہوں جو آپ ﷺ کی تعلیمات کو قریب سے سیکھ کر امت تک منتقل کرے، کیونکہ حضرت خدیجہ ؓ پہلے بھی دوسرے نکاح کر چکی تھیں، اس مقصد کے لیے آپ ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ سے اس عمر میں نکاح

فرمایا تا کہ وہ گھر میں رہ کر علمِ نبوی کو محفوظ کریں اور امت تک پہنچائیں۔

اطاعتِ وحی اور عملی اسوہ:

آپ ﷺ کے پاس مختلف وفود آیا کرتے اور اسلام کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے، سوالات کرتے اور مسائل پوچھتے۔ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا آپ ﷺ پر جو احسان ہے، اس کا اعتراف خود رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ سب کا بدلہ میں نے دنیا ہی میں دے دیا، البتہ ابوبکر کے احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ خود عطا فرمائیں گے، (ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ، رقم: ۳۶۶۱) اگر آپ ﷺ حضرت ابوبکر ؓ کو بدلے میں روپیہ پیسہ یا کوئی بڑا عہدہ عطا فرماتے تو یہ ان کے لیے کوئی خاص شرف نہ ہوتا، سب سے بڑا شرف اور سب سے عظیم کرامت یہی تھی کہ آپ ﷺ نے ان کی صاحبزادی حضرت عائشہ ؓ کو اپنے نکاح میں قبول فرمایا، اور یہ اللہ پاک کی طرف سے خاص اشارہ تھا۔

قرآن کریم نے پچھلے انبیائے کرام کے واقعات ذکر کیے ہیں، حضرت آدم ؑ سے لغزش ہوئی تو انہوں نے توبہ کی، حضرت ابراہیم ؑ نے خواب دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں: ''قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ'' (صافات: ۱۶۵) حضرت یوسف ؑ کا قصہ بیان فرمایا، اور حضرت مریم ؑ کا واقعہ بھی ذکر ہوا، اگر ایک عیسائی سے پوچھا جائے کہ کیا اللہ پاک کسی شخص کو زندہ آسمان پر اٹھا سکتے ہیں؟ تو وہ بھی مانے گا کہ حضرت عیسیٰ ؑ آسمان پر اٹھائے گئے، اسی طرح حضرت مریم ؓ کے ساتھ جو غیر معمولی معاملہ پیش آیا، وہ اللہ کے حکم سے ہوا۔ حضرت ابراہیم ؑ کے خواب پر قربانی کا واقعہ پیش آیا، تو یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور ارادے سے تھا، اسی طرح رسول اکرم ﷺ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: '' وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ '' (نجم: ۳، ۴) کہ آپ ﷺ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں فرماتے، بلکہ جو کچھ کہتے ہیں وہ اللہ کی وحی ہوتی ہے؛ چنانچہ حضرت خدیجہ ؓ، حضرت عائشہ ؓ اور حضرت زینب ؓ سے نکاح بھی اللہ کے حکم اور وحی کی بنیاد پر تھا۔ آپ ﷺ کی پوری حیاتِ طیبہ گواہ ہے کہ ۵۸ برس کی عمر تک

آپ ﷺ کے نکاح میں چار سے کم ازواج رہیں، آخری پانچ سال (۵۸ سے ۶۳ سال کی عمر میں) اللہ کے حکم سے متعدد نکاح فرمائے، یہ بھی واضح دلیل ہے کہ جو شخصیت اپنی جوانی میں ایک بڑی عمر کی بیوہ خاتون کے ساتھ پچیس برس گزار دیتی ہے، وہ کبھی اپنی خواہش یا شہوت کی بنیاد پر نکاح نہیں کرسکتی اور جہاں تک حضرت عائشہ ؓ سے نکاح کا معاملہ ہے تو سائنسی اور طبی ماہرین اس بات کو مانتے ہیں کہ لڑکی نو سال کی عمر میں بالغ ہوسکتی ہے، اس کے علاوہ کئی انبیاء کرام ؑ کی زندگیوں میں بھی اسی طرح کے غیر معمولی واقعات پیش آئے، جو اللہ کے حکم سے تھے۔

کم عمری کی شادی؛ مذاہب اور تاریخ کی روشنی میں:

ہم جس ملک میں رہتے ہیں، یہاں ہمارے غیر مسلم بھائی اپنے مذہبی پیشواؤں اور اوتاروں کو بڑا مقام دیتے ہیں، اگر ان کی سیرت اور مذہبی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے، تو منوسمرتی اور دیگر ہندو دھرم گرنتھوں میں صاف طور پر ذکر ملتا ہے کہ چھ (۶) سال کی عمر میں شادیاں ہو جاتی تھیں، اور نو (۹) سال سے پہلے رخصتی بھی عمل میں آتی تھی، حتیٰ کہ ایک انگریز مصنف نے مختلف مذاہب پر کتاب لکھی اور اس میں حوالوں کے ساتھ یہ لکھا کہ چھ سال سے بھی کم عمر میں یہاں شادیاں ہوئیں۔ پھر یہی نہیں، بعض اوتاروں کے متعلق آتا ہے کہ ان کی شادیاں کم عمری میں ہی ہوئیں اور بعض جگہ بہن بھائیوں کے درمیان نکاح کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر کم عمری کی شادی پر اعتراض کیا جاتا ہے، تو سب سے پہلے یہ اعتراض ان کے اپنے مذہبی رہنماؤں اور پیشواؤں پر ہونا چاہیے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہ ؓ سے نکاح مکہ مکرمہ میں فرمایا، لیکن رخصتی مدینہ منورہ میں ہوئی، مکہ کے مشرکین تو آپ ﷺ کے سخت ترین دشمن تھے، وہ ہر صحیح بات کو بھی بگاڑ کر پیش کرتے، آپ ﷺ پر شاعر، ساحر اور مجنون جیسے الزامات لگاتے؛ لیکن کبھی کسی مشرک، منافق یا دشمن نے یہ اعتراض نہیں اٹھایا کہ آپ ﷺ نے نو سالہ بچی سے نکاح کیوں کیا، تاریخ کے ریکارڈ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ یہ اعتراض تو صرف گزشتہ

دوسو برس سے انگریز مستشرقین نے شرارت کے طور پر کھڑا کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت کا معاشرہ، مذہبی تعلیمات، حتیٰ کہ میڈیکل سائنس تک یہ بات واضح کرتی ہے کہ نو سال کی عمر میں بلوغت ممکن ہے اور شادی فطری امر تھا؛ لہٰذا ہم یہ نہیں کہتے کہ حضور ﷺ کو ان اوتاروں یا پیشواؤں کے ساتھ تشبیہ دی جائے، بلکہ صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اگر آج کوئی اعتراض کرتا ہے تو اسے اپنی مذہبی کتابیں کھول کر دیکھ لینی چاہئے، پھر حقیقت خود بخود واضح ہوجائے گی۔

ایمان والے کا رویہ؛ اعتراض نہیں، اتباع:

اصل حقیقت تو یہی ہے جیسا کہ رسول اللہ ﷺ کی روایت میں آئی ہے: ''لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ، وَوَلَدِهِ، وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ'' (صحیح البخاری: کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان) تم میں سے کوئی شخص اُس وقت تک کامل مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے سب سے زیادہ محبت نہ کرے؛ اپنے والد سے بھی زیادہ، اپنی اولاد سے بھی زیادہ، اور تمام لوگوں سے بڑھ کر؛ لہٰذا ہمارا ایمان اور یقین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو بھی حکم ہے اُس کے پیچھے اُس کی بے پایاں حکمتیں اور مصالح کارفرما ہیں، اگرچہ دنیا میں اور بھی کم عمر بچیاں موجود تھیں، اور کئی لوگوں نے نکاح کی پیش کش بھی کی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو صرف حضرت عائشہ ؓ کے ساتھ نکاح کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ کسی انسانی خواہش کا معاملہ نہیں تھا بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کا حکم اور اُس کی حکمت تھی۔ ہمارا اصل کام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کو دل سے تسلیم کریں، کیونکہ نبی ﷺ جو شریعت لے کر آئے ہیں وہ سراسر حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ انسان چاہے اُس کی حکمت کو پوری طرح سمجھے یا نہ سمجھے، لیکن یہ بات یقینی ہے کہ اُس میں بھلائی ہی بھلائی ہے۔

گھریلو زندگی سے متعلق رہنمائی کا سرچشمہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت عائشہ ؓ سے نبی کریم ﷺ کا یہ نکاح فرمایا؛ تو اس کے بے شمار نتائج اور حکمتیں ظاہر ہوئیں، سب سے بڑی بات یہ سامنے آئی کہ گھریلو معاملات اور

نجی مسائل میں امت کو رہنمائی ملے، اکثر نوجوان اپنی ذاتی اور پرائیویٹ لائف سے متعلق مسائل پوچھنے میں شرماتے ہیں، دل میں ہچکچاہٹ محسوس کرتے ہیں کہ اگر یہ سوال کروں گا تو مفتی صاحب کیا سوچیں گے؟ لیکن ازواج مطہرات ؓ کے ذریعے یہ تمام مسائل کھل کر سامنے آئے اور امت کے لیے آسانی پیدا ہوئی، مثال کے طور پر حضرت ام سلمہ ؓ نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! کیا عورتوں کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ اور سب سے پہلے حضرت اُمِّ سلمہ ؓ نے عرض کیا: اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں فرمایا ہے کہ وہ احکام بیان کرنے یا مثال دینے میں شرم محسوس نہیں کرتے: ''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ط '' (بقرہ:۲۶) بے شک اللہ اس بات سے نہیں شرماتے کہ مچھر یا اس سے بھی چھوٹی (مخلوق) کی مثال بیان کریں۔ جب مشرکین نے اعتراض کیا کہ یہ کیسی مثالیں ہیں، مچھر، بچھو اور مکڑی جیسی حقیر مخلوق کا ذکر قرآن میں کیوں؟ تو اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ ان مثالوں کے بیان کرنے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ اسی پس منظر میں حضرت اُمِّ سلمہ ؓ نے ایک نازک مسئلہ حضور ﷺ سے دریافت کیا۔ نبی کریم ﷺ نے جواب میں فرمایا: جی ہاں! اور اسی کی وجہ سے بچہ اپنی ماں سے مشابہت اختیار کرتا ہے۔ (صحیح البخاری: کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم) یہی وہ نکتہ ہے جسے سمجھانا ہے کہ اس طرح کے نجی اور باریک مسائل بیوی اپنے شوہر سے پوچھ سکتی ہے، لیکن کوئی اجنبی عورت براہِ راست نہیں پوچھ سکتی، اسی طرح مرد حضرات بھی ایسے معاملات میں براہِ راست سوال کرنے سے ہچکچاتے ہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے یہ حکمت رکھی کہ ان سوالات اور مسائل کو ازواج مطہرات ؓ کے واسطے سے امت تک پہنچایا جائے۔

کبار صحابہ ؓ کا علمی رجوع حضرت عائشہ ؓ کی طرف:

حضرت عائشہ صدیقہ ؓ نے ۲۲۱۰ / احادیث نبی کریم ﷺ سے روایت فرمائیں، حضرت ابوہریرہ ؓ اور حضرت انس ؓ کے بعد سب سے زیادہ احادیث بیان کرنے والی راویہ حضرت عائشہ ؓ ہیں، آپ ؓ حضور ﷺ کے قریب رہتیں، لوگ مسائل پوچھتے اور گفتگو کرتے تو

آپ ؓ ان باتوں کو ضبط فرمالیتیں اور امت تک پہنچاتیں۔ایک مثال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر ؓ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جب کوئی شخص فوت ہوتا ہے اور اس کے رشتہ دار اس پر روتے ہیں تو وہ عذاب میں مبتلا ہوتا ہے، حضرت عائشہ ؓ نے جب یہ روایت سنی تو وضاحت فرمائی کہ اصل مطلب یہ ہے: اگر میت گناہ کی حالت میں گیا ہے تو وہ عذاب میں ہے، ورنہ رشتہ داروں کے رونے سے اس کو کوئی نقصان یا فائدہ نہیں، (صحیح البخاری: کتاب المغازی، باب قتل ابی جھل) یوں حضرت عائشہ ؓ نے امت کے لیے حدیث کی حکمت اور صحیح مراد بیان فرمائی۔آپ ؓ کے ذریعے بہت سے وہ مسائل امت تک پہنچے جو گھریلو زندگی اور عورتوں کے مخصوص معاملات سے تعلق رکھتے تھے، اور جنہیں دوسرے لوگ پوچھنے میں حجاب محسوس کرتے۔

حضور ﷺ کے وصال کے بعد حضرت عائشہ ؓ تقریباً ۴۸ برس تک زندہ رہیں، اس دوران آپ ؓ نے دونسلوں کو علم پہنچایا، صحابہ کرام ؓ کو بھی اور تابعین کو بھی۔ بڑے بڑے صحابہ ؓ، حتی کہ حضرت عمر فاروق ؓ اور حضرت علی ؓ جیسے جلیل القدر حضرات بھی مشکل مسائل میں حضرت عائشہ ؓ کے پاس رجوع کرتے اور آپ ؓ ان کے جوابات دیتیں۔آپ ؓ نہ صرف رسول اللہ ﷺ سے سنی ہوئی باتیں نقل کرتیں بلکہ خود بھی ایک مفتیہ تھیں، اور بے شمار فقہی مسائل میں آپ ؓ سے رہنمائی لی جاتی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کے بارے میں فرمایا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ''(احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔یہ خطاب صرف مردوں کے لیے نہیں، بلکہ پوری انسانیت کے لیے ہے؛ اسی لیے فرمایا ''وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ''(سبا:۲۸) اور ہم نے آپ کو تمام انسانوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔اگر حضرت عائشہ ؓ کے ذریعے یہ احادیث اور گھریلو زندگی کے پہلو امت تک نہ پہنچتے تو سیرتِ نبوی ﷺ نامکمل رہتی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے یہ سب کچھ امت تک پہنچایا، تاکہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی،

خلوت وجلوت، گھر و باہر سب کچھ قیامت تک کے انسانوں کے لیے کامل نمونہ بن جائے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ کی رائے:

علامہ سید سلیمان ندویؒ نے بھی اپنی تقاریر میں فرمایا کہ حضور ﷺ کی سیرت میں ہمیں باپ کا بیٹی کے ساتھ حسنِ سلوک بھی نظر آتا ہے، ایک نبی کا اپنی امت کے ساتھ شفقت و تربیت کا انداز بھی، اور عدالتی وتعزیری معاملات میں عدل وانصاف کی روشن مثالیں بھی۔ یہی وہ کامل آئیڈیل ہے جو اللہ نے کائنات میں صرف نبی کریم ﷺ کو بنایا، اور قیامت تک کے لیے آپ ﷺ ہی انسانیت کے واحد رہنما اور مقتدا ہیں۔

حضرت ام سلمہ ؓ کا صلح حدیبیہ کے نازک موقع پر حکمت بھرا مشورہ:

اللہ پاک نے گھریلو اور داخلی مسائل امت تک پہنچانے کا ذریعہ بھی امہات المؤمنین کو بنایا۔ حضرت اُم سلمہ ؓ سے تین سو سے زیادہ روایتیں مروی ہیں، صلح حدیبیہ کے موقع پر جب آپ ﷺ نے صحابہ کو حکم دیا کہ اس سال عمرہ نہیں ہوگا اور ہر ایک اپنا سر منڈوالے، تو اللہ کے گھر کی محرومی کا غم اس قدر شدید تھا کہ صحابہ فی الفور عمل نہ کر سکے۔ آپ ﷺ بار بار خیمے سے باہر آتے اور اندر تشریف لے جاتے، دل بے چین تھا۔ حضرت اُم سلمہ ؓ نے نبی کریم ﷺ کی یہ کیفیت دیکھی اور عرض کیا: یارسول اللہ! آپ باہر نکلیں، کرسی پر بیٹھ جائیں اور اپنے حجام کو بلوا کر اپنے سر کے بال منڈوا لیجیے، جب صحابہ نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ عملاً بال منڈوا رہے ہیں تو سب سمجھ گئے کہ اس سال عمرہ نہیں ہے، پھر سب نے یکے بعد دیگرے بال منڈوانے شروع کر دیے، یہاں تک کہ راوی کہتے ہیں: ''**حتی کاد بعضُهم یقتلُ بعضًا غمًّا**'' (صحیح البخاری: کتاب الشروط، باب الشروط فی الجهاد والمصالحة مع اهل الحرب) ایسا لگتا تھا کہ شدتِ جذبات میں ایک دوسرے کے سر کاٹ ڈالیں گے، حالانکہ وہ صرف استرے سے بال کاٹ رہے تھے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ گھریلو مشورہ بھی کتنا قیمتی اور بابرکت ہوتا ہے، اور ازواجِ مطہرات ؓ نے امت کی رہنمائی میں کس طرح کردار ادا کیا۔

حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا اعتماد:

اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کا معاملہ ہے، بخاری شریف میں ان کا اپنا بیان موجود ہے کہ میری کمسنی میں نکاح ہوا، پھر میں بیمار ہوگئی، صحت یاب ہونے کے بعد میری والدہ نے اپنی خیرخواہی کے ساتھ مجھے رخصت کیا۔ (صحیح البخاری: کتاب فضائل الصحابۃ، باب: تزویج النبی عائشۃ) غور کیجیے! کون سا باپ ہوگا جو اپنی صغیرہ بیٹی کو کسی ایسے نکاح میں دے جس میں خیر اور برکت نہ ہو؟ یہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کامل اعتماد تھا کہ اپنی بیٹی کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کیا، یوں ازواجِ مطہرات ؓ کے ذریعے امت کو وہ رہنمائی اور دینی بصیرت ملی، جو مرد وعورت دونوں کے لیے قیامت تک مشعلِ راہ ہے۔

دنیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ؟ حضرت عائشہ ؓ کا فیصلہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے دوسری آیت میں ارشاد فرمایا: ''یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ'' (احزاب:۲۸) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ اپنی بیویوں سے کہہ دیجیے: ''وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ'' (احزاب:۲۹) اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو چاہتی ہو تو تمہارا معاملہ دوسرا ہے۔ خیبر کی فتح کے بعد جب مال ودولت میں کچھ کشادگی ہوئی، تو ازواجِ مطہرات ؓ نے اپنے نفقہ اور خرچ میں کچھ زیادتی کی درخواست کی، اس موقع پر اللہ رب العزت نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم فرمایا کہ اپنی ازواج سے فرما دیجیے: 'تُرِدْنَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا وَزِیْنَتَهَا فَتَعَالَیْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِیْلًا ﴿۲۸﴾'' اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ! میں تمہیں خوش اسلوبی سے رخصت کر دوں گا؛ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول کو چاہتی ہو تو پھر صبر کے ساتھ رہو، تمہارے لیے آخرت میں بڑا اجر ہے۔ یہ آیت جب نازل ہوئی تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کو بلا کر یہ بات ارشاد فرمائی اور ساتھ ہی کہا: جلدی میں فیصلہ نہ کرنا، اپنے والدین سے مشورہ کر لینا، حضرت عائشہ ؓ نے نہایت حکمت اور پختہ عقیدت کے ساتھ جواب دیا: یارسول اللہ! یہ وہ معاملہ نہیں ہے جس میں میں

اپنے والدین سے مشورہ کروں۔ آپ میرے سرتاج ہیں، میں دنیا کی سختیوں کو برداشت کر لوں گی، لیکن آپ کو کبھی نہیں چھوڑ سکتی۔ (صحیح البخاری: کتاب التفسیر، باب قولہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ) یہ حضرت عائشہ ؓ کی عقل وفہم اور پختگی تھی کہ کم عمری کے باوجود انہوں نے سب سے پہلے اپنی رضا کا اظہار کیا اور فرمایا: مشورہ لینے کی ضرورت ہی نہیں، میرا فیصلہ یہی ہے کہ میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہوں گی، یوں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے بائیسویں پارے میں ازواج مطہرات ؓ کی فضیلتوں کو بیان فرمایا اور یہ واضح کر دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویاں محض بیویاں نہیں، بلکہ امہات المؤمنین ہیں، جنہیں دنیا اور آخرت دونوں میں بلند مرتبہ عطا کیا گیا ہے۔

مسواک اور وفات کا بابرکت منظر:

اللہ کے نبی ﷺ جب دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو اس کا منظر حضرت عائشہ ؓ یوں بیان فرماتی ہیں کہ آپ ﷺ نے میرے آغوش (گود) میں اپنا سر رکھا ہوا تھا، اتنے میں میرے بھائی عبدالرحمٰن بن ابی بکر ہاتھ میں مسواک لیے اندر آئے۔ آپ ﷺ ان کی طرف دیکھنے لگے، میں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا میں یہ مسواک آپ کے لیے لے لوں؟ آپ ﷺ نے اشارے سے ہاں فرمایا، میں نے پوچھا: کیا میں اسے نرم کر دوں؟ آپ ﷺ نے پھر ہاں میں اشارہ فرمایا؛ چنانچہ میں نے مسواک کو چبا کر نرم کیا اور آپ ﷺ کو دے دی، اسی وجہ سے حضرت عائشہ ؓ فخر اور شکر کے طور پر فرمایا کرتی تھیں: اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ فضیلت بخشی کہ آپ ﷺ کی آخری گھڑیاں میری گود میں گزریں، آپ کی وفات میرے حجرے میں، میری باری کے دن، اور میرے سینے اور ہنسلی کے درمیان ہوئی؛ بلکہ اللہ نے میرے لعاب کو آپ کے لعاب کے ساتھ ملا دیا۔ (صحیح البخاری: کتاب المغازی، باب مرض النبی ﷺ ووفاته) خیر! یہ وہ عظیم سعادت ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت عائشہ ؓ کو عطا فرمائی، جسے وہ ہمیشہ بطور شکر وفخر یاد کرتی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کی باری کی خصوصیات:

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم حضرت عائشہؓ کی باری کے دن ہی ہدیے پیش کرتے تھے، اور آسمان سے وحیٔ الٰہی کا نزول بھی انہی دنوں میں ہوتا تھا جب حضرت عائشہؓ کی باری ہوتی، حضرت عائشہؓ نے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دنیا سے رخصتی کے بعد اپنے ۴۸ سالہ حیات میں نہ صرف دونسلوں (صحابہ اور تابعین) کو علم پہنچایا، بلکہ آج ہم تک بھی وہ تمام احادیث اور تعلیمات منتقل ہوئیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایات امت کے لیے ایک عظیم سرمایہ ہیں۔ علامہ حافظ جلال الدین سیوطیؒ نے ایک مستقل کتاب ''عین الاصابه فی استدراک عائشه علی الصحابه'' تالیف فرمائی، جس میں ان مسائل کو جمع کیا گیا ہے جن پر صحابۂ کرام کو اشکال ہوا اور حضرت عائشہؓ نے ان کی وضاحت واصلاح کی۔ اسی طرح مولانا سید سلیمان ندویؒ نے سیرت عائشہؓ کے نام سے ایک قیمتی کتاب لکھی، جس کے آخر میں حضرت عائشہؓ کے علمی وفقہی کارناموں کا جامع خلاصہ بھی پیش کیا۔ یوں حضرت عائشہ صدیقہؓ کی علمی اور فقہی خدمات نے امت کو بے مثال رہنمائی عطا کی اور آج بھی آپؓ کی روایتیں اور تعلیمات ہماری دینی زندگی کا روشن چراغ ہیں۔

اللہ کے فیصلوں میں پوشیدہ حکمتیں:

تو اللہ پاک کی کیا حکمتیں ہیں، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے، جیسے حضرت یوسفؑ کو کنویں سے نکال کر عزیز مصر بنایا گیا، حضرت ابراہیمؑ اپنے بیٹے کو زمین پر لٹا کر چھری چلاتے ہیں مگر وہ نہیں چلتی، اور پھر اللہ پاک کی طرف سے حکم ہوتا ہے: ''قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا'' (صافات:۱۰۵) اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کے تکوینی امور ہیں، اسی طرح حضرت عائشہؓ سے جو نکاح فرمایا گیا، اس کے پیچھے بھی اللہ پاک کی بڑی حکمتیں تھیں اور دیگر ازواج مطہراتؓ سے نکاح کے پیچھے بھی حکمتیں پوشیدہ تھیں، جن کا ذکر آپ گذشتہ جمعہ میں سن چکے ہیں، ان میں سے اکثر عورتیں بیوہ تھیں، ان کے شوہر دنیا سے رخصت ہو گئے تھے، ان کے بال بچوں کی ذمہ داریاں باقی تھیں۔ حضرت اُم سلمہؓ اپنی اولاد کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس

آئیں اور آپ ﷺ نے نہ صرف ان کی سرپرستی فرمائی بلکہ ان کی اولاد کی تربیت بھی کی۔ یہ تمام باتیں اس حقیقت پر شاہد ہیں کہ حضرت عائشہ صدیقہ ؓ سے جو نکاح ہوا، وہ بھی اللہ کی حکمت کے تحت تھا اور طبی اعتبار سے بھی یہ وہی عمر تھی جس میں نکاح ممکن ہے۔ ائمہ حدیث نے بھی اس کی تائید میں واقعات ذکر فرمائے ہیں۔ امام بخاریؒ نے کئی واقعات نقل کیے ہیں، امام شافعیؒ نے ذکر کیا ہے کہ ۲۱ سال کی ایک عورت نانی بن گئی تھی، امام بخاریؒ نے ۱۸ سال کی عمر کی عورت کا ذکر کیا، اور محدث دارقطنیؒ نے بھی اسی طرح کے واقعات بیان کیے ہیں۔ یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ اس زمانے کے اعتبار سے یہ معمول کی بات تھی۔ البتہ یہ یاد رکھا جائے کہ حضور اکرم ﷺ کا نکاح ایک ہی کنواری لڑکی، حضرت عائشہ ؓ سے ہوا، باقی تمام ازواج یا تو بیوہ تھیں یا مطلقہ اور بڑی عمر کی تھیں۔ اس لیے آپ ﷺ پر نعوذ باللہ خواہش پرستی کا الزام لگانا سراسر باطل ہے۔ وہ نبی جنہوں نے اپنی عین جوانی کے زمانے میں غارِ حرا کی تنہائیوں میں دن گزارے، اور حضرت خدیجہ ؓ کھانا لے کر آتی تھیں، وہ اپنی خواہشات کو اللہ کے حکم کے آگے جھکانے والے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی پوری زندگی کے ۵۰ سال ایک بیوہ عورت حضرت خدیجہ ؓ کے ساتھ گزارے۔

یقینِ کامل ہی مومن کی پہچان:

دوستو اور بزرگو! یہ تمام باتیں جاننا اس لیے ضروری ہے کہ اگر ہمارے دل میں ذرا سا بھی وسوسہ آ گیا تو ایمان سے نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ کے کسی فیصلے یا عمل پر اگر ہم مطمئن نہ ہوئے تو یقین جانیے کہ دنیا و آخرت دونوں میں خسارہ ہے، جب ہم نے نبی ﷺ کو مان لیا تو پھر ہمارا رویہ صرف یہ ہونا چاہیے کہ آمَنَّا وَ صَدَّقْنَا، صحابہ کرام ؓ کا حال یہ تھا کہ جب کوئی بات کہی جاتی تو وہ سرِ تسلیم خم کر دیتے، حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے جب مشرکین نے کہا کہ تمہارے دوست تو عجیب باتیں کرتے ہیں، رات کے تھوڑے حصے میں معراج پر چلے گئے اور ساتوں آسمان کی سیر کر آئے؛ تو حضرت ابوبکر ؓ نے جواب دیا کہ ہمیں تو روزانہ جنت اور جہنم کی

خبریں دی جاتی ہیں، روزانہ آسمان سے وحی نازل ہوتی ہے، اگر آج یہ بات کہی گئی تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں، اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضر ہوئے اور پورا واقعہ سنایا جو کفار کے ساتھ پیش آیا تھا تو آپ ﷺ نے حضرت ابوبکر کو صدیق کا لقب دیا، اسی وقت سے آپ کا ''صدیق'' لقب پڑ گیا۔ (سیرۃ ابن ھشام: ذکر الاسراء والمعراج، ۱/۳۹۸) ایک سچے مومن کا کام یہی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی باتوں کو دل سے قبول کرے۔ ساتھ ہی ہمارے غیر مسلم بھائیوں کو بھی سنجیدگی، حکمت اور نرمی کے ساتھ سمجھایا جائے کہ اصل حقیقت کیا ہے۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ آج خود مسلمان بھی سیرتِ نبوی ﷺ سے پوری طرح واقف نہیں، جب کہ غیر مسلمین انہی پہلوؤں پر اعتراضات کرتے ہیں، اس لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کے نبی ﷺ کی سیرت کو پڑھیں، سمجھیں اور دوسروں تک پہنچائیں۔ اللہ پاک نے خود اعلان فرمایا: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ '' (مائدہ: ۳) آج کے دن ہم نے تمہارے دین کو مکمل کر دیا؛ لہٰذا ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ اگر کوئی اس قسم کے اعتراضات کرے تو ہم پیار وحکمت سے جواب دیں، مسلمانوں کو بھی حقیقت سمجھائیں اور غیر مسلمین کے سامنے بھی وضاحت کریں۔ اکثر جب ان سے بات ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں: ہمیں تو معلوم ہی نہیں تھا! اس کا افسوس ہم پر ہے کہ ہم انہیں صحیح علم اور سیرتِ نبوی ﷺ کی روشنی پہنچا نہیں سکے۔

سنتِ نبوی سے غفلت اور موجودہ اعتراضات:

حقیقت یہ ہے کہ آج جو اعتراضات ہو رہے ہیں، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نبیٔ پاک ﷺ کی سنتوں کو چھوڑ دیا اور آپ کے طریقوں کو پسِ پشت ڈال دیا۔ جب بندے دین سے غافل ہو جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان پر حالات اور آزمائشیں نازل فرماتے ہیں تاکہ انہیں متنبہ کیا جائے، اللہ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اور ہمارے گھروں کی عورتوں کو حضرت عائشہ صدیقہ ؓ کے نمونے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، ہمیں دین کی طرف مائل کرے اور اس ملک

میں امن، سکون اور عافیت نازل فرمائے۔ یہ جو ہنگامی حالات وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں، دراصل انسانوں کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتے ہیں؛ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو کبھی ضائع نہیں کرتا جب وہ دین پر ثابت قدم رہیں۔ دوستو اور بزرگو! سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت کریں، اور محبت کا تقاضا یہی ہے کہ آپ کی زندگی کو اپنے لیے مکمل نمونہ بنائیں۔ حضرت حسان بن ثابت ؓ، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاعر ہیں، انہوں نے کیا خوب فرمایا:

خُلِقتَ مُبَرَّءً مِن كُلِّ عَيبٍ كَأَنَّكَ قَد خُلِقتَ كَما تَشاءُ

گویا آپ کو اللہ نے ویسا ہی بنایا جیسا آپ خود چاہتے تھے؛ لہٰذا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ذرہ برابر شک یا شبہ رکھنا ایمان کو خطرے میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کے ایمان کی حفاظت فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۵)

تقدیر پر ایمان؛ سکون کا ذریعہ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝۲۲ (حدید: ۵۷)

وقال تعالیٰ: وَمَآ اَصَابَکُمْ مِّنْ مُّصِیْبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتْ اَیْدِیْکُمْ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ۝۳۰ (شوریٰ: ۳۰)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للہ رب العالمین.

کائنات کا نظام اور عقیدۂ تقدیر:

محترم ومکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! میں نے جو آیاتِ مبارکہ آپ حضرات کے سامنے تلاوت کیں، ان میں ہمارے بنیادی عقائد میں سے ایک عظیم عقیدہ ''تقدیر پر ایمان'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہو رہی ہیں یا ہم میں سے ہر ایک کے ساتھ جو بھی معاملات پیش آ رہے ہیں، چاہے وہ ذاتی زندگی کے ہوں، معاشرتی ہوں، سماجی ہوں یا سیاسی، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے علم میں ہے۔ قرآن میں ارشاد فرمایا گیا: ''مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط'' زمین میں یا تمہاری جانوں میں جو بھی مصیبت آتی ہے وہ سب کچھ پہلے سے کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

پھر ایک اور جگہ فرمایا: ''اَللّٰهُ الَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط '' (طلاق:۱۲) اللہ نے سات آسمان اور سات زمین بنائے۔ اس کے بعد فرمایا: ''لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا '' تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی دو بڑی صفات یہاں ذکر کیں: صفتِ قدرت اور صفتِ علم یعنی کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب اللہ کے تصرف میں ہے، سب کچھ اس کے علم اور قدرت کے تحت ہے۔ قرآن کہتا ہے: ''وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ '' (انعام:۵۹) یعنی کوئی پتہ نہیں گرتا، اور نہ ہی زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ہے مگر اللہ اسے جانتا ہے۔ یہ ہے تقدیر پر ایمان، کہ ہر چیز اللہ کی قدرت اور علم میں ہے، اور اسی پر ہمارا عقیدہ مضبوط ہونا چاہیئے۔

رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ اور ایمان کی حقیقت:

اللہ تعالیٰ قرآن میں ارشاد فرماتے ہیں: ''فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَكِّمُوْكَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَهُمْ '' (اے پیغمبر!) تمہارے پروردگار کی قسم! یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ یہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تمہیں فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، '' ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا '' پھر جو فیصلہ تم فرماؤ اس پر دل میں کوئی تنگی نہ پائیں '' وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ﴿۶۵﴾ '' (نساء:۶۵) اور اپنے آپ کو مکمل اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کے سپرد کر دے۔ بندے کا اصل فریضہ یہ ہے کہ شریعتِ مطہرہ کے احکام کے مطابق اپنی زندگی گزارے۔ یہ دنیا، جسے قرآن نے ''متاعِ غرور'' (دھوکے کی دنیا) کہا ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کے ارادے اور اختیار کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوتا۔

اگر مگر اور کاش سے بچو:

اسی حقیقت کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں سمجھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وإنْ أَصابَكَ شَيءٌ، فلا تَقُلْ لو انی فعلت كانَ كَذا وَ كَذا '' جب تمہیں کوئی تکلیف یا

مصیبت پہنچے تو یہ نہ کہو کہ اگر میں ایسا کرتا تو یوں ہوتا یا اگر میں ویسا کرتا تو ایسا ہو جاتا۔ انسان دن رات اپنی تجارت، معاشرت اور دیگر معاملات میں محنت کرتا ہے، تدبیریں اختیار کرتا ہے، ہر ممکن کوشش کرتا ہے، لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ کوشش اپنی تکمیل کو نہیں پہنچتی۔ ایسے وقت میں یہ جملے زبان پر نہیں لانے چاہئے کہ ''اگر میں ایسا کرتا تو یوں ہو جاتا'' بلکہ جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وَلٰكِنْ قُلْ: قَدَّرَ اللهُ وما شاء'' (مسلم: کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز ....) یعنی یہ کہو کہ ''یہ اللہ کا مقدر فرمانا تھا۔'' یہی اصل عقیدہ ہے جسے ہمیں سمجھنا ہے۔

انسان، تقدیر اور اللہ کی مشیت:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ہمیں بتایا، تم میں سے ہر ایک کی تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس دن تک نطفے کی صورت میں ہوتی ہے، پھر اتنی ہی مدت تک وہ خون کا لوتھڑا بن جاتا ہے، پھر اتنے ہی عرصے میں گوشت کا ٹکڑا بن جاتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتا ہے، اور اسے حکم دیا جاتا ہے کہ چار باتیں لکھ دے: اس کا عمل، اس کی عمر، اس کا رزق، اور یہ کہ وہ نیک بخت ہوگا یا بدبخت۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! تم میں سے کوئی شخص جنتیوں کے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جنت کے قریب پہنچ جاتا ہے، پھر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے، اور وہ دوزخیوں کے عمل کرنے لگتا ہے، چنانچہ وہ دوزخ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور تم میں سے کوئی دوزخیوں کے عمل کرتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جہنم کے قریب پہنچ جاتا ہے، پھر تقدیر کا لکھا غالب آجاتا ہے، اور وہ جنتیوں کے عمل کرنے لگتا ہے، چنانچہ وہ جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ (صحیح البخاری: کتاب التوحید، باب: ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین)

دوستو اور بزرگو! اس حدیث میں تین بڑے سبق ہیں: پہلا سبق: اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کے رزق، عمر اور انجام کو لکھ دیا ہے۔ مگر یاد رکھیں اللہ نے ہمیں اختیار بھی دیا ہے کہ ہم نیکی کا راستہ چنیں یا برائی کا۔ اللہ نے کسی کو زبردستی گنہگار نہیں بنایا۔ ہم اپنی نیت اور عمل کے ذمہ دار

ہیں۔ دوسرا سبق: نیکی پر غرور مت کرو۔ کتنے لوگ عبادت کرتے کرتے آخر میں پھسل جاتے ہیں، اور کتنے گنہگار لوگ آخر میں توبہ کر کے جنت کے حق دار بن جاتے ہیں۔ اس لیے ہمیشہ اللہ سے استقامت مانگتے رہو۔ تیسرا سبق: کسی کو حقیر مت سمجھو۔ ہوسکتا ہے آج وہ گناہ میں ہو، مگر کل اللہ تعالی کی رحمت اسے ہدایت دے دے۔ اور ہوسکتا ہے آج ہم نیکی میں ہوں، مگر کل ہمیں غفلت لے ڈوبے۔

تقدیر پر ایمان کا مطلب یہ نہیں کہ کوشش چھوڑ دی جائے؛ بلکہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ نیکی کرے، اور انجام اللہ کے حوالے کر دے۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے دعا کی: اے میرے رب! مجھے اسلام پر موت دے، اور نیک بندوں میں شامل فرما دے۔ پس جو بندہ اپنی کوشش کے ساتھ اللہ کی رضا چاہتا ہے، اللہ اس کے لیے بھلائی کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ ایک جنازے میں موجود تھے۔ آپ ﷺ نے ایک لکڑی اٹھائی اور زمین پر اس سے لکیریں کھینچنے لگے۔ پھر فرمایا: تم میں سے کوئی نہیں مگر اس کا ٹھکانا جنت یا دوزخ میں پہلے سے لکھ دیا گیا ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! پھر کیا ہم اپنے لکھے ہوئے انجام پر بھروسہ کر کے عمل چھوڑ دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں، عمل کرتے رہو!'' **فكل ميسر لما خلق له اما من كان من اهل السعادة فييسر لعمل اهل السعادةواما من كان من اهل الشقاء فييسر لعمل اهل الشقاوة**'' (صحيح البخاری: كتاب التفسير، باب: فسنيسره للعسری) کیونکہ ہر شخص کو وہی عمل کرنے کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ جو نیک بخت ہے، اسے نیک عمل کی توفیق ملتی ہے، اور جو بدبخت ہے، اسے بدعملی کی راہ پر ڈال دیا جاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے سورۂ لیل کی کچھ آیات تلاوت فرمائی: پس جس نے (اللہ کی راہ میں) دیا، تقویٰ اختیار کیا اور بھلائی کی بات کی تصدیق کی، ہم اس کے لیے آسان راستہ آسان کر دیں گے، اور جس نے بخل کیا، بے نیازی اختیار کی اور بھلائی کو جھٹلایا، ہم اس کے لیے تنگی والا راستہ آسان کر دیں گے۔

دوستو اور بزرگو! یہ حدیث ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ عمل چھوڑنا تقدیر پر بھروسہ نہیں بلکہ غفلت ہے، اللہ پاک نے ہمیں اختیار دیا ہے، محنت کی طاقت دی ہے، اب ہم پر ہے کہ ہم کون سا راستہ چنتے ہیں نیکی کا یا بدی کا۔ جو شخص اللہ کے قریب ہونا چاہتا ہے، اللہ اس کے لیے نیکی کے راستے آسان کر دیتا ہے۔ اور جو خود بے نیازی اختیار کرتا ہے، اس کے لیے گمراہی کی راہ آسان ہو جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن نے فرمایا: جس نے دیا، تقویٰ اختیار کیا، اور بھلائی کی تصدیق کی، ہم اس کے لیے آسانی کا راستہ آسان کر دیتے ہیں۔

یہ خیال کہ بیماریاں خود بخود ایک سے دوسرے میں منتقل ہو جاتی ہیں۔ اسلام نے اس غلط عقیدے کی اصلاح فرمائی ہے، سول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''لا عدوی'' یعنی چھوت (متعدی ہونا) کوئی چیز نہیں۔ یہ سن کر ایک دیہاتی نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہم دیکھتے ہیں کہ ایک تندرست اونٹ جب کسی خارش زدہ اونٹ کے قریب جاتا ہے تو اسے بھی خارش لگ جاتی ہے؟ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''فمن أعدى الأول؟'' پہلے اونٹ کو خارش کس نے لگائی تھی؟ (صحیح البخاری: کتاب الطب، باب لا ھامۃ)

دوستو! اس جواب میں نہایت حکمت بھرا پیغام ہے! نبی ﷺ نے سمجھایا کہ پہلی بیماری اللہ کے حکم سے آئی تھی، کسی دوسرے اونٹ سے نہیں، پھر اللہ نے چاہا تو وہ بیماری دوسرے اونٹوں میں پھیل گئی، اور اگر اللہ نہ چاہتا تو وہ ہرگز منتقل نہ ہوتی۔ یعنی بیماری کا لگنا یا نہ لگنا اللہ کی تقدیر اور مشیت سے ہوتا ہے، نہ کہ محض ظاہری چھوت سے۔

موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کوئی بھی انسان انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن موت کا وقت، جگہ اور طریقہ سب اللہ کے فیصلے کے مطابق طے شدہ ہیں۔ ہم بھاگ کر بھی اس سے نہیں بچ سکتے، کیونکہ ہمارا انجام وہیں ہے جہاں اللہ نے لکھ دیا ہے۔

انسان کے ظاہر پر نظر ڈالیں تو وہ مضبوط، سمجھدار اور بااختیار نظر آتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا دل جو ایمان و نفاق کا مرکز ہے مکمل طور پر اللہ کے اختیار میں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے

فرمایا: ''إِنَّ قُلُوبَ بَنِي آدَمَ كُلَّهَا بَيْنَ إِصْبَعَيْنِ مِنْ أَصَابِعِ الرَّحْمٰنِ كَقَلْبٍ وَاحِدٍ، يُصَرِّفُهُ حَيْثُ يَشَاءُ.'' تمام بنی آدم کے دل رحمٰن کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جس طرح چاہے ان کو پھیر دیتا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی: ''اللّٰهُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوبِ، صَرِّفْ قُلُوبَنَا عَلَى طَاعَتِكَ.'' (مسلم: کتاب القدر، باب تصریف اللہ تعالیٰ القلوب کیف یشاء) اے دلوں کے حال کو پھیرنے والے رب! ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت پر جما دے۔ دوستو! مطلب یہ کہ ہدایت، ایمان اور استقامت کسی کے بس میں نہیں، یہ صرف اللہ کی توفیق سے ہے۔ دل کا بدل جانا لمحوں کا کام ہے۔ ایک لمحہ بندہ ایمان پر ہوتا ہے، اگلے لمحے غفلت میں ڈوب جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود سب سے کامل ایمان رکھنے کے، یہ دعا اکثر کیا کرتے تھے: ''يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ، ثَبِّتْ قَلْبِي عَلَى دِينِكَ.'' (ترمذی: ابواب القدر، باب ماجاء ان القلوب بین اصبعیی الرحمٰن) اے دلوں کو پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت رکھ۔

مطلب یہ کہ انسان کی زندگی، موت، رزق اور ٹھکانا سب اللہ کے فیصلے سے طے شدہ ہیں۔ انسان سمجھتا ہے کہ وہ خود چل رہا ہے، لیکن دراصل اللہ اپنی تقدیر کے ذریعے اسے اس منزل تک پہنچا رہا ہوتا ہے جہاں اس کا انجام لکھا گیا ہے۔ انسان دنیا بھر میں سفر کرے، شہروں سے گزرے، پہاڑوں، سمندروں، ملکوں سے پار کر جائے، لیکن جب اس کی روح قبض ہونے کا وقت آتا ہے، اللہ اس کے لیے وہی اسباب بنا دیتا ہے جو اسے اُس جگہ پہنچا دیں جہاں اس کی موت لکھی گئی ہے۔

دوستو! قرآنِ مجید ہمیں صرف قصے نہیں سناتا، بلکہ زندگی کے اصول اور ایمان کی بنیادیں سکھاتا ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ایسا ہے جو پوری زندگی کے فلسفے کو بیان کر دیتا ہے۔ جب ان کے بیٹے مصر جانے لگے تو وہ فرمانے لگے: ''يَا بَنِيَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَاحِدٍ وَادْخُلُوا مِنْ أَبْوَابٍ مُتَفَرِّقَةٍ، وَمَا أُغْنِي عَنكُم مِّنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ، وَعَلَيْهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُونَ.'' (سورۃ یوسف: ۶۷) اے

میرے بیٹو! ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا بلکہ الگ الگ دروازوں سے داخل ہونا، لیکن یاد رکھو! میں تمہیں اللہ کے فیصلے سے نہیں بچا سکتا، حکم تو صرف اللہ ہی کا ہے، میں نے اسی پر بھروسہ کیا ہے، اور بھروسہ کرنے والوں کو بھی اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

اس آیت میں زندگی کا ایک مکمل فلسفہ ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نبی تھے، اللہ پر کامل یقین رکھتے تھے، لیکن پھر بھی اپنے بیٹوں کو احتیاط کی نصیحت کی کہ ایک ہی دروازے سے داخل نہ ہونا تاکہ نظرِ بد یا حسد کا خطرہ نہ ہو۔ یہ تھی تدبیر یعنی ظاہری سبب اختیار کرنا۔ لیکن ساتھ ہی فوراً فرمایا: میں تمہیں اللہ کے فیصلے سے کچھ نہیں بچا سکتا۔ یعنی نبی نے سکھایا کہ تدبیر ایمان کے خلاف نہیں، مگر توکل کے بغیر ادھوری ہے۔ امام فخر الدین رازیؒ فرماتے ہیں: انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اسباب کو اختیار کرے، مگر دل میں یہ یقین رکھے کہ جو ہونا ہے وہ اللہ کے ارادے سے ہی ہوگا۔ کوئی تدبیر تقدیر کو بدل نہیں سکتی، مگر تدبیر ایمان کا حصہ ہے کیونکہ یہ اللہ کے دیے ہوئے اسباب کو اپنانا ہے۔

دوستو! زندگی کے سفر میں کبھی خوشی آتی ہے، کبھی غم، کبھی کامیابی، کبھی ناکامی یہ سب اللہ کی تدبیر اور تقدیر کا حصہ ہے۔ مومن وہ ہے جو ہر حال میں اللہ کی قضا پر راضی رہے، حضرت ابو ہریرہؓ فرمایا کرتے تھے: مجھے یہ کہنا بہت ناپسند ہے کہ اگر میں ایسا کرتا تو ایسا ہوتا، کیونکہ اس سے شیطان کے عمل کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ (مسلم: کتاب القدر، باب فی الامر بالقوۃ وترک العجز ....) حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے: مجھے یہ زیادہ پسند ہے کہ میں اپنے منہ میں آگ کا انگارہ رکھ لوں بجائے اس کے کہ میں یہ ''کاش'' والا جملہ کہوں۔ (معجم کبیر طبرانی: باب العین، خطبۃ ابن مسعود و من کلامہ، رقم: ۹۱۷۱) دوستو! یہ الفاظ محض ایک جملہ نہیں، بلکہ ایمان کے اصول ہیں۔ جب بندہ ماضی پر افسوس کرتے ہوئے کہتا ہے، کاش میں ایسا نہ کرتا، کاش میں وہاں نہ جاتا، کاش میں وہ بات نہ کہتا، تو دراصل وہ اللہ کی تقدیر پر عدمِ رضا ظاہر کر رہا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ اگر میں کچھ اور کرتا تو تقدیر بدل جاتی

حالانکہ تقدیر اللہ کے اختیار میں ہے، بندے کے نہیں۔

زندگی کے ہر موڑ پر انسان خوشی، غمی، کامیابی اور آزمائش سے گزرتا ہے، لیکن ایمان والے کے لیے ایک ہی اصول ہے: اللہ کا فیصلہ بہتر ہے، چاہے میری سمجھ میں نہ آئے، فرمایا: ''إذا قضى الله قضاء أحب أن يُرضى بقضائه'' جب اللہ کوئی فیصلہ فرماتا ہے، تو مجھے پسند ہے کہ بندہ اس کے فیصلے پر راضی رہے، دوستو! یہی ایمان کی حقیقت ہے۔ ایمان صرف زبان سے کلمہ پڑھنے کا نام نہیں، بلکہ دل سے اللہ کی قضا و قدر پر اعتماد اور رضا رکھنے کا نام ہے۔ جب بندہ خوشی میں شکر کرتا ہے، اور مصیبت میں بھی دل سے کہتا ہے: میرے رب کا فیصلہ بہتر ہے تو وہ اللہ کے نزدیک سب سے محبوب بندہ بن جاتا ہے۔

دوستو! تقدیر یعنی اللہ کا ازلی فیصلہ وہ راز ہے جس میں عقل رک جاتی ہے اور ایمان بولتا ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جسے سمجھنے میں پچھلی امتیں الجھ گئیں، اور اسی میں غلو اور جھگڑوں نے انہیں ہلاکت کے راستے پر ڈال دیا۔ حضرت ابو ہریرہؓ روایت کرتے ہیں: نبی کریم ﷺ ہمارے پاس تشریف لائے، اس وقت ہم تقدیر کے مسئلے پر بحث و مباحثہ کر رہے تھے۔ آپ ﷺ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا، پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم اسی چیز پر جھگڑ رہے ہو جس کے لیے مجھے بھیجا گیا ہے؟ تم سے پہلے لوگ بھی اسی بحث میں پڑ کر ہلاک ہو گئے! میں تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ اس مسئلے میں جھگڑا نہ کرو۔ (ترمذی: ابواب القدر، باب ماجاء فی التشدید فی الخوض فی القدر) دوستو! اس حدیث میں ایک بہت اہم پیغام ہے۔ نبی ﷺ نے تقدیر کے جھگڑوں پر ناراضی کا اظہار اس لیے فرمایا کہ یہ بحث بندے کو ایمان سے شک کی طرف لے جاتی ہے، کیونکہ تقدیر کا معاملہ اللہ کی حکمت، علم اور ارادہ سے تعلق رکھتا ہے اور انسان کی عقل، اللہ کے علم کی گہرائی کو سمجھنے سے عاجز ہے۔

راضیۃ مرضیۃ؛ محبتِ الٰہی کا راز:

ایمان کی جن بنیادوں پر ہماری زندگی قائم ہے ان میں سے ایک عظیم بنیاد تقدیر پر ایمان ہے، قرآن کریم اور احادیث مبارکہ میں بار بار اس حقیقت کو بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر

پر راضی رہنا ایک عظیم انعام ہے۔ سورۃ الفجر میں ارشاد ہے: ''يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝'' (فجر: ۲۷) اے اطمینان والی جان! حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب نیک اور پرہیزگار بندہ دنیا سے آخرت کی طرف جاتا ہے تو فرشتے اس کے پاس آکر کہتے ہیں: ''وَأَبشِري بروحٍ وريحانٍ، وربٍّ غيرِ غضبانَ'' (تفسیر ابن کثیر: سورۂ واقعہ) یعنی خوش ہو جاؤ جنت کی راحتوں اور نعمتوں کے ساتھ اور ایسے رب کے پاس جا رہے ہو جو تم پر غضبناک نہیں بلکہ رحمان ہے۔ اس کے بعد قرآن فرماتا ہے: ''ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ۝'' اپنے رب کی طرف لوٹ چل اس حال میں کہ تم اللہ کے فیصلوں پر راضی ہو، اور تمہارے اعمال پر اللہ تم سے راضی ہے۔ یہی اصل کامیابی ہے۔ ''راضیۃ'' یعنی بندہ اللہ کے فیصلوں پر راضی ہو اور ''مرضیۃ'' یعنی اللہ بندے کے اعمال پر راضی ہو جائے۔ پھر فرمایا: ''فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ'' (فجر: ۲۹-۳۰) یعنی میرے نیک بندوں کی صحبت اختیار کر اور میری جنت میں داخل ہو جا۔

اسی لیے قرآن نے تاکید کی: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَكُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ ۝'' (توبہ: ۱۱۹) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو۔ حضرت یوسفؑ نے بھی دعا کی: ''وَّاَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ ۝'' (یوسف: ۱۰۱) کہ اے رب! مجھے اپنے نیک اور صالح بندوں میں شامل فرما۔ حضرت سلیمانؑ فرماتے ہیں: ''وَاَدْخِلْنِيْ بِرَحْمَتِكَ فِيْ عِبٰدِكَ الصّٰلِحِيْنَ ۝'' (نمل: ۱۹) اور اپنی رحمت سے مجھے اپنے نیک بندوں میں شامل فرما لیجیے۔ یہ ''رضامندی'' کوئی معمولی چیز نہیں، بلکہ یہی مومن کی اصل پہچان ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ کے فیصلوں پر مطمئن اور شاکر رہے۔

دوستو اور بزرگو! تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ بندہ اپنی بھرپور تدبیریں کرے اور پھر نتیجے کو اللہ کے حوالے کر دے۔ اسی حقیقت کو نبی کریم ﷺ نے اس شخص کو سمجھایا جس نے اپنا اونٹ بغیر باندھے اللہ پر بھروسہ کرنے کی بات کی تھی۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''اعقلها وتوكل'' (ترمذی: ابواب صفة القيامة، رقم: ۲۵۱۷) یعنی پہلے اونٹ کو مضبوطی سے باندھ لو، پھر اللہ پر توکل

کرو۔ پس اسی تعلیم کی روشنی میں ہمیں چاہیے کہ قفل لگائیں، حفاظت کے اسباب اختیار کریں، دوا اور علاج کریں؛ مگر دل یہ یقین رکھے کہ انجام وہی ہوگا جو اللہ نے مقدر فرمایا ہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ روایت کرتی ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''من أحب لقاء الله أحب الله لقاءه، ومن كره لقاء الله كره الله لقاءه'' جو بندہ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو پسند فرماتے ہیں، اور جو اللہ کی ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند کرتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! انسان تو موت کے ذریعے ہی اللہ کی طرف جاتا ہے، اور فطری طور پر موت کو ناپسند کرتا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: مؤمن بندے کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کی خوشخبری سنائی جاتی ہے، لہٰذا وہ اللہ پاک سے ملاقات کو پسند کرتا ہے، اور کافر کو عذاب کی خبر دی جاتی ہے تو وہ اللہ پاک سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے۔ (صحیح البخاری: کتاب الرقاق، من احب لقاء اللہ احب اللہ لقاءہ) اسی لئے آپ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو اس روایت کے ذریعے سمجھایا کہ اصل کامیابی یہ ہے کہ اللہ کی محبت چاہی جائے، اور وہ محبت کیسے حاصل ہوتی ہے؟ یہی کہ انسان ''راضیۃ مرضیۃ'' ہو جائے۔ یعنی بندہ اپنے اوپر ہونے والے سارے فیصلوں پر دل سے راضی ہو، شریعت کے احکام پر مطمئن ہو، اعمالِ صالحہ پر سکون اور طمانینت محسوس کرے، اور رسول اللہ ﷺ کے فیصلے دل و جان سے تسلیم کرے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا'' اے بندو! رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ہی میں اللہ کی رضا ہے۔

مصیبت میں صبر، دل میں تسلیم:

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے پوچھا گیا کہ اللہ کی رضا کی نشانی کیا ہے؟ آپؒ نے فرمایا: یہ کہ اللہ اپنے فیصلوں پر تمہیں راضی کر دے، چاہے تکلیف جسمانی ہو، سماجی ہو یا دوسروں کی طرف سے کسی قسم کی اذیت اور مصیبت پہنچے، بندہ واویلا نہ کرے بلکہ صبر کے ساتھ اللہ کے فیصلے کو قبول کرے۔ دوا اور علاج کے بارے میں فرمایا: ''لكلِّ داءٍ دواءٌ فتداوَوا'' (سنن ابی

داود: کتاب الطب، باب فی الادویۃ المکروھۃ) ہر بیماری کے لیے اللہ نے شفا رکھی ہے، اس لئے علاج کرو؛ لیکن اگر علاج کے باوجود صحت نہ ملے اور بندہ دنیا سے رخصت ہوجائے تو اس پر بھی اللہ کی مرضی پر راضی رہو، کہ یہ اللہ کا فیصلہ تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے حضرت ابراہیمؓ اور ایک نواسے کے انتقال پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ ایک صحابی نے عرض کیا: یارسول اللہ! یہ کیا ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ان العین تدمع والقلب یحزن، ولا نقول الا ما یرضی ربنا'' (صحیح البخاری: کتاب الجنائز، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: انابك لمحزونون) آنکھ اشکبار ہے، دل رنجیدہ ہے، مگر لب پر وہی ہوگا جو پروردگار کو پسند ہے۔ یہی اصل ایمان ہے کہ انسان پر مشکلات اور غم ضرور آئیں گے، وقتی رنج اور آنسو بھی آئیں گے، لیکن دل میں یہ یقین اور نیت ہو کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہے۔ انسان تدبیر کرے، اسباب اختیار کرے، لیکن اگر تقدیر غالب آجائے اور نتیجہ توقع کے برعکس ہو تو بندہ ''کاش'' اور ''اگر'' کے جملے نہ کہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب بندہ کہتا ہے: اگر میں ایسا کرتا تو یوں ہوتا تو یہ دراصل تقدیر پر اعتراض ہے۔ مومن کا شیوہ یہ ہے کہ وہ کہے: ''قدّرَ اللہ وما شاء فعل'' اللہ نے مقدر فرمایا اور جو چاہا وہی کیا۔

اعمال میں انسان کی آزادی:

آپ کے سامنے سورۂ حدید کی جو آیت تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا '' ہماری پیدائش سے پہلے ہی یہ ساری چیزیں لکھی جا چکی ہیں اور وہ ہو کر رہنے والی ہیں، اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ پھر تو ہمارا کوئی اختیار ہی نہیں ہے، تو ایسا ہرگز نہیں ہے، ہم سب جانتے ہیں کہ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَہَدَیۡنٰہُ النَّجۡدَیۡنِ ۚ﴿۱۰﴾'' (حدید: ۱۰) ''ہم نے انسان کو خیر وشر، دونوں راستے بتا دیے۔ ہدایت کے لیے اللہ نے انبیائے کرام علیہم السلام کو بھیجا، اور گمراہی کی طرف بلانے کے لیے شیطانی طاقتیں سرگرم ہیں۔ اب انسان جتنے بھی گناہ

کرتا ہے، اپنے اختیار اور اپنی چاہت سے کرتا ہے؛ لہٰذا یہ آیت کریمہ ہمیں یہ سمجھاتی ہے کہ اگرچہ ''مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا'' کے مطابق انسان کی تخلیق سے پہلے ہی لوح محفوظ میں سب کچھ لکھا جا چکا ہے، مگر ہمیں نیکی اور برائی کا پورا اختیار دیا گیا ہے، اگر اختیار نہ ہوتا اور ہم محض مجبور ہوتے، تو بندہ یہ کہہ سکتا تھا کہ میں تو بے بس ہوں؛ لیکن تقدیر ہمیں یہ بتاتی ہے کہ راستہ ہمارے سامنے ہے، عمل ہمارا اپنا ہے، اور نتیجہ اللہ پاک کی مشیت اور فیصلے کے مطابق ہے، اس لیے بندے کا کام یہ ہے کہ نیکی کے راستے کو اختیار کرے اور اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھے۔

تفویض امور اور اللہ پر بھروسہ:

دوستو اور بزرگو! ہمارے اوپر جو حالات آتے ہیں، انسان دن رات اپنے سماجی مسائل میں گھرا رہتا ہے، باہر کی دنیا کے بھی ہزاروں مسائل سامنے آتے ہیں، ایسے موقع پر اسلام نے ہمیں ''تفویض'' سکھایا ہے، یعنی اللہ کے فیصلے کو مان لینا۔ انسان تدبیریں کرتا ہے: یہ کروں، وہ کروں، فلاں طریقہ اختیار کروں؛ لیکن جب نتیجہ سامنے آجائے تو پھر یہ ماننا چاہیے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فیصلہ تھا: ''مَاۤ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِيۡبَةٍ'' اللہ پاک نے دوسری جگہ فرمایا: ''فَبِمَا كَسَبَتۡ اَيۡدِيۡكُمۡ وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ ۝'' (شوریٰ: ۳۰) تم پر جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے، اور اللہ پاک تو بہت سے گناہوں کو معاف فرما دیتا ہے۔

تقدیر اور تدبیر کا امتزاج:

حضرت عمرؓ کے زمانے میں ملک شام میں طاعون پھیل گیا، صحابۂ کرام وہاں موجود تھے۔ حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ اور دوسرے صحابۂ کرامؓ نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ اس علاقے میں طاعون ہے؛ چنانچہ آپؓ رک گئے اور واپس جانے لگے، اس پر حضرت ابوعبیدہؓ نے کہا: ''أفراراً من قدر الله؟'' اے امیر المومنین! کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ''نعم، نفرّ من قدر الله إلى قدر الله'' ہاں! ہم اللہ کی ایک تقدیر سے نکل کر دوسری تقدیر کی طرف جا رہے ہیں۔ اسی دوران حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ

تشریف لائے اور انہوں نے روایت سنائی کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے: جب تم کسی علاقے میں ہو اور وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے باہر نہ نکلو، اور اگر باہر ہو تو وہاں داخل نہ ہو۔ (صحیح البخاری: کتاب الطب، باب مایذکر فی الطاعون) یوں حضرت عمرؓ نے بھی یہی بات واضح کی کہ وہاں رہنا ہو یا وہاں سے نکلنا، دونوں ہی اللہ کی تقدیر سے ہیں اور یہی مفہوم اس قول میں بیان ہوا: ''نفرّ من قدر اللہ إلی قدر اللہ'' یعنی ہم اللہ کی ایک تقدیر سے دوسری تقدیر کی طرف جاتے ہیں۔

صحابہ کی قربانیاں اور اللہ کی رضا:

دوستو اور بزرگو! اللہ کے نزدیک سب سے پسندیدہ عمل یہ ہے کہ بندہ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے۔ سورۂ فجر میں اللہ تعالیٰ نے دونوں پہلو بیان فرمائے ہیں، بندہ جب اپنے رب کے فیصلوں پر خوش اور مطمئن رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے لیے رضامندی کا پروانہ جاری ہوتا ہے۔ صحابۂ کرامؓ کی قربانیاں دیکھ لیجیے! سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان سب کا ذکر فرمایا اور آخر میں یہ عظیم جملہ ارشاد فرمایا: ''رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ'' اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ صحابۂ کرام نے ایمان کی خاطر اپنے رشتہ داروں کو چھوڑ دیا، اپنی کھیتی باڑی، تجارت اور گھر بار چھوڑ کر مدینہ منورہ ہجرت کی، یہ قربانی صرف اور صرف اللہ کی رضا کے لیے تھی؛ اسی لیے اللہ پاک نے انہیں یہ اعزاز دیا کہ ہمیشہ ان کے نام کے ساتھ کہا جاتا ہے: ''رضی اللہ عنہ'' اللہ تعالیٰ جس بندے کو یہ توفیق دے دے کہ وہ اللہ کے فیصلوں پر دل سے راضی ہو جائے، سمجھ لیجیے کہ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ یاد رکھیں! تقدیر کبھی بدلنے والی نہیں، لیکن اس پر راضی رہنے والا دل اللہ پاک کے ہاں سب سے زیادہ محبوب ہے۔

حضرت آدمؑ اور حضرت موسیٰؑ کا مکالمہ:

حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان ایک مکالمہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ بہتر جانتے ہیں کہ یہ گفت وشنید عالمِ ارواح میں کہاں اور کس کیفیت میں ہوئی، حضرت موسیٰ علیہ

السلام نے عرض کیا: اے ہمارے ابا! (حضرت آدم) آپ نے وہ چیز کیوں کھالی تھی جس سے آپ کو منع کیا گیا تھا؟ اسی کے نتیجے میں آپ کو جنت سے دنیا میں اتارا گیا، حضرت آدم علیہ السلام نے جواب دیا: کیا تم وہی موسیٰ نہیں ہو جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنی رسالت کے لیے منتخب فرمایا اور جن پر تورات نازل کی گئی؟ تو کیا تم نے اپنی تورات میں یہ نہیں پایا کہ یہ سب کچھ میری پیدائش سے پہلے ہی میرے مقدر میں لکھا جا چکا تھا؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا: ''ہاں!'' حدیث کے الفاظ ہیں: ''فَحَجَّ آدَمُ مُوسَى'' (صحیح البخاری: کتاب القدر، باب تحاج آدم وموسی عند اللہ) یعنی دلیل کے اعتبار سے حضرت آدمؑ، حضرت موسیٰؑ پر غالب آ گئے۔ مطلب یہ کہ میری پیدائش سے پہلے جو کچھ میرے لیے مقدر تھا، وہ ہو کر رہنا تھا، پھر آپ اس پر باز پرس کیوں کرتے ہیں؟ یہ بھی یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے پہلے ہی تورات، انجیل اور قرآن اپنی اصل شکل میں موجود تھے، البتہ نزول کے بعد بدقسمتی سے تورات اور انجیل میں لوگوں نے اپنی طرف سے تحریف کر دی، جبکہ قرآنِ کریم اللہ پاک کے وعدے کے مطابق قیامت تک ہر قسم کی تبدیلی اور بگاڑ سے محفوظ رہے گا۔

انسانی تدبیر بمقابلہ تقدیر:

دوستو اور بزرگو! ہم دیکھتے ہیں کہ آخرت کے معاملات میں تو اپنے آپ کو تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں؛ لیکن دنیاوی معاملات میں تقدیر پر راضی نہیں ہوتے، تدبیر اختیار کرنے کے بعد بھی اگر من چاہی چیز حاصل نہ ہو تو بہانے تراشتے ہیں، حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ جب کوئی کام کرو اور اس میں ناکامی ہو جائے تو یہ سمجھو کہ یہ اللہ پاک کی مرضی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾'' (قمر:۴۹) ہم نے ہر چیز کو ایک اندازے اور تقدیر کے مطابق پیدا کیا اور آگے فرمایا: ''وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾'' ہمارا حکم پلک جھپکنے کے برابر ہے، بلکہ اس سے بھی کم وقت میں فیصلے نافذ ہو جاتے ہیں۔ بندے کا کام صرف یہ ہے کہ اللہ کے فیصلوں پر راضی رہے، آپ خود جانتے ہیں، دنیا میں اگر شوہر کوئی کام کرے اور بیوی اس سے

ناراض ہو، یا بیوی کچھ کرے اور شوہر کو ناگوار گزرے، یا بیٹا کوئی کام کرے اور باپ اس سے راضی نہ ہو، تو اس اختلاف پر سب کو تکلیف پہنچتی ہے، یہ تو ایک انسان کا دوسرے انسان سے معاملہ ہے، حالانکہ انسان کا علم بھی محدود ہے، عقل بھی ناقص ہے اور اختیار بھی کمزور ہے؛ لیکن جب اللہ تعالیٰ خود فرماتا ہے کہ: ''وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا ۝'' (طلاق:۱۲) اللہ پاک ہی ہے جس نے سات آسمان اور سات زمینیں پیدا کیں اور اس کا علم ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے۔ تو جب بندہ یہ جان لیتا ہے کہ اللہ علیم بھی ہے اور قدیر بھی، تو پھر دنیا میں پیش آنے والے ہر مسئلے پر اس کے دل کو اطمینان اور سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

بندے کو رب سے جوڑنے والا سہارا:

دوستو اور بزرگو! تقدیر کا عقیدہ اتنا قیمتی خزانہ ہے کہ یہ بندے کو ہر بڑی سے بڑی تکلیف اور پریشانی کے وقت اللہ کی طرف جوڑ دیتا ہے، جب بندہ یہ سوچ لیتا ہے کہ میرے رب نے مجھے موت دی، میرے رب نے مجھے بیماری دی، میرے رب ہی کی طرف سے یہ سب کچھ آیا ہے تو دل کو سکون ملتا ہے۔ حضرت عمران بن حصینؓ کو دیکھ لیجیے! ۳۲ سال تک بستر پر پڑے رہے، پھوڑے اور پھنسیاں تھیں، جسم کمزور ہو گیا تھا؛ مگر جب بھی کوئی ان سے حال پوچھتا تو یہی فرماتے: الحمدللہ۔ اسی صبر اور رضا کے بدلے اللہ پاک کی طرف سے انہیں جنت کی بشارت دی گئی، کیونکہ جب بندہ اللہ کی طرف سے آنے والی آزمائش پر راضی رہتا ہے تو پھر اللہ پاک بھی اپنے بندے سے راضی ہو جاتا ہے، اور اس کے لیے خیر کے فیصلے مقدر کر دیے جاتے ہیں۔

بزرگوں نے لکھا ہے کہ حضرت رابعہ بصریہؒ جب قبر کے حوالے کی گئیں اور سوال ہوا: ''من ربك؟'' تیرا رب کون ہے؟ تو حضرت رابعہؒ نے جواب دیا: میں تو اپنے رب کو ماننے پر راضی ہوں، مگر ان سے پوچھیے کہ کیا وہ مجھے اپنی بندی مان کر راضی ہیں یا نہیں؟ یہ ہے اللہ پاک کے ساتھ تواضع، انکساری اور اپنے آپ کو اس کے فیصلوں کے حوالے کر دینا کہ بندہ ہر حال میں یہ سوچے: میرا رب مجھ سے راضی ہے یا نہیں؟

خیر وشر، دونوں اللہ کی طرف سے:

دوستو اور بزرگو! ہمارے بہت سے بھائی اپنی زندگیاں مختلف مسائل اور پریشانیوں میں گزار رہے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سمجھایا کہ بہت سی چیزیں جو ہمیں دکھ اور تکلیف معلوم ہوتی ہیں، درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہیں اور ان میں ہمارے لیے خیر چھپی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ'' (بقرہ:۲۱۶) اور اسی طرح فرمایا: وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ ''جو چیز تمہیں بظاہر ناپسند ہو اُس میں تمہارے لیے بھلائی ہوسکتی ہے اور جو چیز تم پسند کرتے ہو وہ تمہارے لیے نقصان ثابت ہو سکتی ہے؛ لہٰذا بندہ ہر حال میں راضی رہنے کی کیفیت اختیار کرے، اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو آزماتا ہے اور آزمائش میں رہنے والوں کو اپنی محبت کا درجہ ملتا ہے۔ اسی لئے حدیث میں ہے کہ ''إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ'' مومن کے لیے ہر صورت میں خیر ہے؛ چاہے کوئی چھوٹی سی خراش ہو یا بڑا دکھ، ہر تکلیف پر اللہ تعالیٰ اجر عطا فرماتا ہے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ولیس ذاك لأحد إلا للمؤمن'' (مسلم: کتاب الزهد والرقائق باب المؤمن امره كله خير) اور یہ خاص مقام مومن کو ہی ملتا ہے۔ کچھ لوگوں نے دنیاوی فلسفوں یا نظریات سے انسان کو تسلی دینے کی کوشش کی مثلاً نیا جنم، یا دیگر خیالات، مگر شریعتِ مطہرہ نے تقدیر کے مسئلے میں ہمیں سچائی بتائی: ''والقدر خيره وشره من الله تعالي'' خیر وشر دونوں اللہ ہی کی طرف سے ہیں، اور سب کچھ اللہ کے حکم اور رحمت میں ہے۔ جب بندہ اللہ کی طرف رجوع کر کے اس کے فیصلوں پر راضی ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندے سے راضی ہوتا ہے اور اس کے اعمال کا اجر دیتا ہے، یہ اجر دنیا میں بھی مل سکتا ہے اور مرنے کے بعد بھی۔ حدیث میں یہ بھی آیا کہ بعض نیک بندے اتنی خوش نصیبی اور اجر کی تمنا کریں گے کہ کاش دنیا میں انہیں اور بھی تکلیفیں مل جاتیں تاکہ اس کا اجر انہیں یہاں ملتا، (سنن ترمذی: ابواب الزهد عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم، رقم: ۲۴۰۲) مگر ایسی دعائیں ممنوع ہیں کیونکہ اصل راستہ صبر، تسلیم اور اللہ کی رضا ہے۔

اللہ سے عافیت مانگو، عذاب نہیں:

ایک صحابی نے دعا کی: ''اللهُمَّ إِنِّي أسأَلُك الصَّبرَ '' اے اللہ! میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں۔ بظاہر یہ مصیبتوں پر ثابت قدمی، اور آزمائشوں میں صبر کو مانگ رہا ہے، جب یہ بات نبی اکرم ﷺ کو معلوم ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''سل الله العافية'' (مسند احمد: رقم: ۲۲۰۱ ،ترمذی: ابواب الدعوات عن رسول الله ﷺ رقم: ۳۵۲۷) اللہ سے عافیت مانگو، مغفرت مانگو۔ آپ ﷺ نے سمجھایا کہ بندے کو اللہ سے اپنے گناہوں کا کفارہ مانگنے کے بجائے عافیت طلب کرنی چاہیے۔ ہاں! اگر اللہ اپنی طرف سے آزمائے تو وہ اور بات ہے، لیکن بندے کی دعا ہمیشہ عافیت اور مغفرت کے لیے ہونی چاہیے۔ اسی طرح آپ ﷺ نے ہمیں یہ بھی تعلیم دی کہ زندگی کے مسائل میں کسی گمراہ عقیدے والے، نجومی یا کاہن کے پاس جا کر اپنا مستقبل پوچھنا سخت منع ہے۔ حدیث میں آیا ہے: ''من أتى عرّافًا فسأله عن شيء لم تقبل له صلاة أربعين ليلة'' (مسلم: کتاب السلام، باب تحریم الکھانۃ واتیان الکھان) جو شخص کسی کاہن یا نجومی کے پاس جا کر تقدیر کے بارے میں پوچھے تو اس کی چالیس دن کی نماز قبول نہیں ہوگی۔ اور ایک روایت میں ہے: ''فقد كفر بما أنزل على محمد'' (مسند احمد، مسند ابی ھریرۃ، رقم: ۹۵۳۶) اس نے محمد ﷺ پر جو دین نازل ہوا، اس سے انکار کر دیا۔

دوستو اور بزرگو! یہ ہے تقدیر کا اصل سبق کہ بندہ اپنے معاملات اللہ کے سپرد کرے، اس پر بھروسہ کرے، اور عافیت و مغفرت کی دعا مانگے۔ تفویض اور تسلیم میں ہی راحت ہے۔

نہ محرومی پر مایوسی، نہ نعمت پر غرور:

پھر دیکھیے! سب سے بڑی حقیقت اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بیان فرمائی: '' مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ ''ایک تو فرمایا کہ نامۂ اعمال میں لکھا ہوا ہے '' اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ''اور یہ لکھنا '' اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۝۲۲'' (حدید: ۵۷) زمین میں یا تمہاری جانوں پر کوئی مصیبت نہیں آتی مگر یہ کہ وہ ایک کتاب (نامۂ

اعمال) میں پہلے سے لکھی ہوئی ہے، اور یہ سب اللہ کے لئے آسان ہے۔ پھر فرمایا: ''لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ''(حدید: ۲۳) تاکہ تم جو چیز کھو بیٹھو اس پر غم نہ کرو اور جو کچھ اللہ نے عطا کیا ہے اس پر اترا نہ جاؤ۔ خوشی کا اظہار ضرور کرو؛ لیکن تکبر کے ساتھ نہیں، کیونکہ تکبر بخل کو جنم دیتا ہے۔ اس لئے آگے آیت میں بخل کا ذکر بھی آیا۔ یہ آیت ہمیں دو بڑی تعلیمات دیتی ہے: تکلیف آئے تو اسے اللہ کی طرف نسبت کرو اور صبر کرو۔ راحت اور نعمت ملے تو اللہ ہی کا فضل سمجھو اور شکر ادا کرو، تکبر نہ کرو۔ یہی تقدیر پر ایمان ہے جو مومن کے دل کو سکون دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو تقدیر کے مسئلے پر کامل یقین عطا فرمائے اور اپنے ہر فیصلے پر راضی رہنے کی توفیق دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۶)

عفو و درگذر کی فضیلت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ و الْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۳۴ (فصلت: ۳۴)

وَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ: ارحموا من في الأرض يرحمكم من في السماء. (ترمذی: ابواب البر و الصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس)

صدق اللّٰہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمد للّٰہ رب العالمین.

محترم و مکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آپ حضرات کے سامنے قرآنِ پاک کی جس آیت کی تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں زندگی گزارنے کے اصول اور آداب سکھائے ہیں، انسان کو یہ زندگی چین، سکون اور امن و عافیت کے ساتھ گزارنی ہے، لڑائی جھگڑے، فتنے فساد اور آپس کی دشمنیوں سے بچنا ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم نے ہمیں زندگی گزارنے کا ایک بہترین اصول بتایا۔

عفو و درگزر؛ امن و سکون کی قرآنی اور نبوی کنجی:

اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ '' یعنی نیکی اور برائی، اچھا اور بُرا سلوک برابر نہیں ہو سکتے۔ دونوں کی اپنی اپنی خاصیت ہیں۔ پھر فرمایا: ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ '' کہ اگر کوئی پریشانی، کوئی مسئلہ، چاہے وہ ذاتی زندگی کا ہو، سماجی تعلقات کا ہو یا کاروباری معاملات کا پیش آئے تو انسان کو معافی اور درگزر کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ '' اچھے طریقے سے جواب دیا جائے، نرمی اور حسنِ سلوک سے معاملہ کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ '' (فصلت:۳۴) یعنی اگر تم معافی اور درگزر کا طریقہ اپناؤ گے تو تمہارا سخت ترین دشمن بھی ایسا بن جائے گا جیسے تمہارا قریبی اور مخلص دوست ہو، قرآنِ کریم نے ہمیں زندگی گزارنے کا یہ عظیم اصول سکھایا ہے۔

یہی سبق نبی اکرم ﷺ نے بھی اپنی احادیث مبارکہ میں بار بار سمجھایا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الراحمون یرحمهم الرحمن '' جو لوگ دنیا میں رحم کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرماتا ہے، پھر فرمایا: ''ارحموا من فی الارض، یرحمکم من فی السماء '' (ترمذی: ابواب البر و الصلة، باب ماجاء فی رحمة الناس) زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم فرمائے گا۔

اللہ تعالیٰ اپنے کلام میں اور نبی کریم ﷺ اپنے ارشادات میں ہمیں یہ نفسیاتی اور عملی تربیت دیتے ہیں کہ انسان تکلیف اور اذیت کے حالات میں بھی صبر، نرمی اور معافی کو اختیار کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ '' (شوریٰ: ۴۳) یعنی جو شخص صبر کرتا ہے اور معاف کر دیتا ہے، وہ بڑی ہمت اور مضبوط ارادے والا ہوتا ہے۔ معاف کرنا آسان نہیں، یہ دل کی بڑی وسعت اور پختگی کا کام ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ''إن الرفق لا یکون في شيء إلا زانه، و لا ینزع من شيء إلا شانه '' (مسلم: کتاب البر و الصلة، باب فضل الرفق) نرمی جس چیز میں ہو، اسے خوبصورت

بنا دیتی ہے، اور جس سے نرمی نکال لی جائے، وہ چیز بدصورت اور بے اثر ہو جاتی ہے۔

دوستو اور بزرگو! قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی صفات بیان فرمائی ہیں: وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ۝ (شوریٰ:۳۷) یعنی جب وہ غصے میں آتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں، درگزر کرتے ہیں۔

قرآن کے آگے رک جانا؛ حضرت عمرؓ کا وصف:

دوستو اور بزرگو! حضرت عمر بن خطابؓ، جو مسلمانوں کے جلیل القدر خلیفہ تھے، ان کے قریبی ساتھی حضرت حُرّؓ کثرت سے ان کی مجلس میں آتے جاتے تھے۔ ایک دن حضرت حُرّؓ کے چچا، عُیَینہ بن حصن، نے کہا کہ میں امیر المؤمنین سے کچھ بات کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت حُرّؓ نے سفارش کی تو حضرت عمرؓ نے اجازت دے دی۔ عُیَینہ بن حصن مجلس میں آئے تو بڑے رُکھے اور سخت انداز میں بات شروع کی، کہنے لگے:

تم مسلمانوں کے خلیفہ ہو، لیکن ہمارا خیال نہیں رکھتے! ہماری مالی مدد نہیں کرتے! اللہ نے تمہیں ذمہ داری دی ہے مگر تم اسے پورا نہیں کرتے! اس طرح اپنی دیہاتی زبان میں کئی تلخ جملے کہہ ڈالے۔ حضرت عمرؓ کو فطری طور پر غصہ آیا، مگر اسی وقت حضرت حُرّؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو حکم دیا ہے: ''خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ۝۱۹۹'' (اعراف:۱۹۹) (اے پیغمبر) درگزر کا رویہ اپناؤ، اور (لوگوں کو) نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں کی طرف دھیان نہ دو۔ یہ آیت سنتے ہی حضرت عمرؓ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا، آپ نے فوراً سکوت فرمایا اور اپنے جذبات پر قابو پا لیا۔ یہی آپ کا مشہور وصف تھا کہ ''کان وقافاً عند کتاب اللہ'' یعنی قرآن کا حکم سنتے ہی فوراً اس کے سامنے رک جانا اور عمل کرنا۔ (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب خذ العفو و امر بالعرف....)

آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ ہماری زندگیوں میں جتنے مسائل بگڑتے ہیں، ان کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم معاف نہیں کرتے، کسی نے کچھ کہہ دیا، یا کوئی غلطی ہو گئی، ہم فوراً بدلہ لینے پر

آمادہ ہوجاتے ہیں۔ زبان سے سخت باتیں نکلتی ہیں، بعض اوقات ہاتھا پائی تک نوبت آتی ہے، اور پھر معاملہ کورٹ کچہری تک پہنچ جاتا ہے، اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون ہو، امن ہو، تو ہمیں معافی اور درگزر کو اپنانا ہوگا۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں: دنیا کا نظام اللہ نے ایسا بنایا ہے کہ یہاں انبیاء کرامؑ کے ساتھ بھی بغیر کسی قصور کے دشمنیاں کی گئیں۔ قرآنِ کریم اور سیرتِ نبوی ﷺ میں بے شمار مثالیں موجود ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی معافی، درگزر اور نرمی سے بھری ہوئی تھی۔

انتقام نہیں، معافی؛ سیرتِ مصطفیٰ ﷺ کا روشن باب:

آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ ﷺ کو مکۃ المکرمہ میں تیرہ سال تک طرح طرح کی اذیتیں دی گئیں، اور مدینہ منورہ میں آٹھ سال تک دشمن آپ کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ سن ۸ ہجری میں جب مکہ مکرمہ فتح ہوا، یہ بیس، اکیس سال کا عرصہ تھا جس میں دشمنوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ انتہائی سخت رویہ اختیار کیا۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب کو معاف کر دیا، درگزر سے کام لیا، اور ہر ایک کے ساتھ رحمت اور شفقت کا معاملہ فرمایا۔ اللہ کے دین کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاد کیا، لیکن جب معاملہ اپنی ذات کا آیا تو ہمیشہ معافی اور درگزر کو ترجیح دی۔ پوری سیرتِ مبارکہ اس حقیقت سے بھری پڑی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمنوں کے ظلم وستم کے باوجود انہیں معاف فرمایا۔ یہی مکہ کے وہ دشمن تھے جنہوں نے بیس برس تک ستایا۔ کچھ لوگ ایسے بھی تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جب راستے سے گزرتے، جو سب کے لیے عام تھا، تو وہ راستہ بھی آپ کے لیے محفوظ نہ رہتا۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر ہے: ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِي جِيدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ ۝٥'' ابولہب کی بیوی، جو حقیقی چچی تھی، راستے میں کانٹے ڈالتی تھی تاکہ آپ کو تکلیف پہنچائے۔ دوسرے لوگ بھی طرح طرح سے اذیت دیتے، لیکن اللہ کے نبی ﷺ نے ہمیشہ معافی اور درگزر ہی کو اپنایا۔

معافی کی طاقت اور دلوں کی تبدیلی:

ہندہ، وہ عورت تھی جس نے آپ ﷺ کے چچا حضرت حمزہؓ کو شہید کرنے کا حکم دیا، وحشی، جس نے یہ عمل کیا، بعد میں ایمان لے آئے۔ یہی ہندہ، جس نے آپ کے چچا کے جسمِ مبارک کا مثلہ کرنے اور اعضاء کاٹنے کا حکم دیا تھا، بعد میں ایمان لائیں؛ لیکن آپ ﷺ نے کبھی ان کے سامنے یہ تذکرہ تک نہ کیا کہ میرے چچا کے ساتھ تم نے کیا بدسلوکی کی تھی، ہندہ ایمان لے آئیں اور حدیث شریف کی کتابوں میں آتا ہے کہ اس نے خود عرض کیا: آج سے پہلے، یعنی ایمان لانے سے پہلے، میرے دل میں آپ سے زیادہ دشمنی کسی سے نہ تھی، سب سے زیادہ بغض اور عداوت اگر مجھے کسی سے تھی تو وہ آپ ﷺ تھے، پھر انہوں نے کہا: لیکن آج کے بعد جتنی محبت اور تعلق میرے دل میں آپ کے لیے ہے، اتنا کسی کے لیے نہیں، (بخاری: کتاب الاحکام، باب من رأی للقاضی ان یحکم بعلمه فی امر الناس) یہ کیا چیز تھی؟ یہ معافی اور درگزر کی وہ روش تھی جو آپ ﷺ نے اختیار کی، جس نے دشمنوں کے دلوں کو بدل دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دل نرم فرمادیے، یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ''یعنی برائی کو بہترین انداز سے دفع کرو، تو اس کا نتیجہ قرآن پاک میں ارشاد فرمایا: '' فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ﴿۳۴﴾ '' کہ جس کے ساتھ تمہاری دشمنی ہے، وہ ایسا قریبی دوست بن جائے گا جو تمہاری تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے، تمہاری راحت کو اپنی راحت سمجھے، تو معلوم ہوا کہ حسنِ اخلاق کتنی بلند اور مؤثر چیز ہے، جو دشمن کو بھی مخلص دوست بنا دیتی ہے۔

مصائب و پتھروں کے جواب میں ہدایت کی دعا:

طائف کے بازاروں میں، آپ ﷺ کے ساتھ کیا کچھ نہ کیا گیا! آپ کو اذیت دی گئی، پتھر مارے گئے، اور جسمِ اطہر لہولہان ہوگیا، اسی حال میں جب آپ ایک باغ میں پناہ لیے ہوئے تھے، اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کے فرشتے (ملک الجبال) کو بھیجا۔ اس نے عرض کیا: اگر آپ حکم دیں تو میں ان دو پہاڑوں کے درمیان اس بستی کو کچل کر رکھ دوں، ہمیشہ کے

لیے مٹا دوں، لیکن رحمتِ عالم ﷺ نے فرمایا: نہیں! یہ لوگ مجھے نہیں پہچانتے، میری حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ پاک ان کی نسلوں میں ایسے لوگ پیدا فرمائے جو ایمان والے ہوں، جو اللہ کے دین کے لیے قربانیاں دیں۔ (بخاری: کتاب بدء الخلق، باب اذا قال احدکم آمین و الملائکۃ فی السماء) یہ ہے وہ شانِ رحمت جس نے پتھر مارنے والوں کے لیے بھی بددعا نہیں کی بلکہ نسلوں کی ہدایت کی دعا فرمائی۔

طائف کی دعا سے بھروچ کی سرزمین تک:

دوستو اور بزرگو! ہندوستان میں اسلام کی آمد محمد بن قاسم کے ذریعے ہوئی، اور یہ بھی طائف کے اسی قبیلہ ''بنوثقیف'' کے فرزند تھے۔ حجاج بن یوسف، جس نے محمد بن قاسم کو ہندوستان بھیجا، وہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا۔ آپ ﷺ کے دو صحابی، بحرین کے گورنر حضرت عثمانؓ جنہوں نے اپنے بھائی حضرت حکم بن ابی العاصؓ کو بھروچ بھیجا۔ تاریخ اور تفسیر کی کتب میں آتا ہے کہ سن ۱۵ ہجری سے ۲۰ ہجری کے درمیان، یعنی آپ ﷺ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد آٹھ سے دس سال کے اندر، بھروچ میں یہی قبیلہ بنوثقیف کے حضرات اسلام کا پیغام لے کر پہنچے۔ یہ دراصل آپ ﷺ کی اُس دعا کا اثر تھا جو آپ نے طائف کے میدان میں کی تھی۔ طائف کا محاصرہ کیا گیا لیکن فتح نہ ہو سکا، آپ واپس تشریف لے آئے۔ پھر اللہ پاک نے انہی لوگوں کو خود آپ کی خدمت میں ایمان لا کر بھیج دیا، یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ نبی اکرم ﷺ نے معافی اور درگزر کو اختیار فرمایا، یاد رکھیں! انبیاء کرام علیہم السلام کو سب سے زیادہ ستایا گیا۔ اللہ کے نبی کو پاگل کہا جاتا، لیکن آپ نے صبر سے جواب دیا۔ آج اگر ہمیں کوئی پاگل کہہ دے تو ہم آپے سے باہر ہو جائیں اور اپنے عمل سے اس الزام کو سچ ثابت کر دیں! اسی لیے ایک بزرگ نے فرمایا ہے: ''غصہ دراصل جنون اور پاگل پن کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔

غصے پر قابو؛ نبی ﷺ کی پسندیدہ صفت:

حدیثِ شریف میں بتایا گیا ہے کہ غصہ آ تو سکتا ہے، مگر اس کی مختلف صورتیں آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح فرمائی ہیں۔ سب سے پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ غصہ دیر سے آئے اور جلد ختم ہو جائے۔ (مسند احمد: رقم: ۱۱۵۸۷) یعنی کوئی کچھ بھی کہتا رہے، انسان فوراً غصہ نہ کرے، اور اگر غصہ آ جائے تو فوراً ٹھنڈا ہو جائے؛ البتہ ایسا شخص جو فوراً غصے میں آ جائے اور دیر تک اس پر قائم رہے، یہ طرزِ عمل آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں تھا۔ یہ تمام روایات اور قرآن کی آیات ہمیں زندگی میں چین، سکون، امن اور عافیت کی راہیں دکھاتی ہیں۔ اس کی عملی مثال حضرت ابو مسعود انصاریؓ کا واقعہ ہے۔ ایک مرتبہ وہ اپنے غلام کو کسی وجہ سے مار رہے تھے۔ پیچھے سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور صرف ایک جملہ ارشاد فرمایا، تین مرتبہ فرمایا: اے ابو مسعود، اے ابو مسعود، اے ابو مسعود! ''اللہ تعالیٰ تم پر اس سے زیادہ قدرت رکھتا ہے جتنی تم اس غلام پر رکھتے ہو۔'' یہ سن کر حضرت ابو مسعودؓ فوراً رک گئے اور فرمایا کہ اس دن کے بعد میں نے اپنی زندگی میں کبھی اپنے خادم یا نوکر پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ (مسلم: کتاب الایمان، باب صحبة المماليك و كفارة من لطم عبده)

تکبر کی جڑ کاٹ دو، دلوں میں سکون بو دو:

آج ہمارے گھروں میں، بھائی بہنوں کے درمیان، ماں باپ اور اولاد کے درمیان، عورتوں کے باہمی تعلقات میں، اور اسی طرح سماجی میدان میں، کاروباری دنیا اور ملازمت کے ماحول میں، حتیٰ کہ کھیت کھلیان اور کاشت کاری تک ہر جگہ جھگڑے، فتنے اور فساد نظر آتے ہیں۔ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ فرمایا کرتے تھے کہ ان تمام جھگڑوں کی سب سے بڑی جڑ دل کا تکبر ہے۔ جب انسان دوسروں کے ساتھ عاجزی اختیار کرتا ہے تو دلوں میں نرمی پیدا ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾'' (اسراء: ۳۷) یعنی اے انسان! تو اکڑ کر کیوں چلتا ہے؟ نہ تو زمین کو پھاڑ سکتا ہے۔ ''وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ﴿۳۷﴾'' اور نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتا ہے۔ انسان کو غصہ آتا ہے، مگر قرآن ایمان والوں کی اوصاف بیان کرتا ہے: ''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ'' جو غصہ پی جاتے

ہیں، ''وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ'' اور جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہی وہ اوصاف ہیں جو دلوں کو جوڑتے ہیں اور معاشرے کو سکون اور امن عطا کرتے ہیں۔

برداشت: انبیاء کا وصف، مومن کا زیور:

آپ ﷺ مالِ غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ ایک شخص نے، جو ایک عامی آدمی تھا، آپ سے کہا: ''اس تقسیم میں انصاف سے کام لیں!'' یہ الفاظ آپ ﷺ کے لیے تکلیف دہ تھے، مگر آپ نے کوئی سخت جواب نہ دیا، بس اتنا ارشاد فرمایا: اللہ پاک حضرت موسیٰؑ پر رحم فرمائے! اللہ پاک کی راہ میں انہیں بہت ستایا گیا، اور انہوں نے صبر سے کام لیا۔ (بخاری: کتاب الدعوات، باب قول اللہ تعالیٰ: وصل علیھم) قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَ لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اٰذَوْا مُوْسٰى'' (احزاب: ۶۹) یعنی ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے موسیٰؑ کو ایذا پہنچائی۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے اپنی زندگیوں کو ہمیشہ برداشت، صبر اور حُسنِ اخلاق سے مزین کیا۔ دوران نماز کعبہ کے صحن میں، ابوجہل کے اشارے پر، آپ ﷺ کی گردنِ مبارک پر اونٹ کی اوجھ ڈال دی گئی، لیکن آپ نے صبر اور برداشت سے کام لیا۔ پس زندگی میں برداشت پیدا کریں۔ جیسے والدین اپنی اولاد کے ساتھ کرتے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ اولاد کتنی ہی خطا کرے، مگر والدین محبت اور تحمل سے سنبھال لیتے ہیں۔ یہی برداشت انسان کے رشتوں اور زندگی کو خوش گوار بناتی ہے۔

تہمت کے زخم پر عفو کا مرہم:

دوستو اور بزرگو! انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اپنی امت کے ساتھ ہمیشہ عفو و درگزر کا برتاؤ فرمایا، اور یہی روش صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اپنائی۔ قرآن کریم میں ایک نہایت تفصیلی واقعہ ذکر ہوا، یہ واقعہ ہے سیدۃ النساء حضرت عائشہؓ پر تہمت کا، جو منافقین کی سازش تھی۔ یہ تہمت سید الانبیاء ﷺ کے گھرانے پر ایک شدید حملہ تھا۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ حضرت عائشہؓ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ اور سیدنا ابوبکر صدیقؓ کی صاحبزادی تھیں۔ وہی

ابو بکرؓ جن کی قرآن نے تعریف فرمائی: ’’ ثَانِیَ اثْنَیْنِ اِذْ ھُمَا فِی الْغَارِ ‘‘(توبہ:۴۰) یعنی ہجرت کی رات غارِ ثور میں نبی کریم ﷺ کے ہمراہ تھے۔ جب یہ تہمت پھیلائی گئی تو اس میں بعض نادان مسلمان بھی منافقین کے بہکاوے میں آ گئے۔ انہی میں سے ایک حضرت مسطحؓ بھی تھے، جو حضرت ابو بکرؓ کے قریبی رشتہ دار اور محتاج تھے، اور ابو بکرؓ ان پر باقاعدہ مالی احسان کیا کرتے تھے۔ جب صدیق اکبرؓ کو معلوم ہوا کہ مسطحؓ بھی اس تہمت میں شریک ہوئے ہیں تو آپ نے قسم کھالی کہ اب ان پر کچھ خرچ نہیں کریں گے۔ تب اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی: ’’ وَلَا یَاْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْکُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ یُّؤْتُوْٓا اُولِی الْقُرْبٰی وَالْمَسٰکِیْنَ وَالْمُھٰجِرِیْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۖ وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ؕ اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَکُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۲۲﴾ ‘‘(نور:۲۲) یعنی: تم میں جو فضیلت والے اور خوش حال ہیں وہ قسم نہ کھائیں کہ وہ اپنے رشتہ داروں، مسکینوں اور اللہ کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کی مدد نہیں کریں گے، بلکہ چاہیے کہ وہ معاف کر دیں اور درگزر سے کام لیں، کیا تم یہ پسند نہیں کرتے کہ اللہ تمہیں معاف فرما دے؟ حضرت ابو بکرؓ نے یہ آیت سنتے ہی فرمایا: اللہ کی قسم! میں ضرور مسطح پر اپنا خرچ جاری رکھوں گا، اور پھر کبھی اسے بند نہ کیا۔ (بخاري: كتاب الايمان والنذور، باب اليمين فيما لا يملك وفي المعصية وفي الغضب)

ایمان کی بنیاد پر خیر خواہی اور نفع بخشی کی تعلیم:

مسلمان کا مسلمان سے رشتہ ایمان کی بنیاد پر خیر خواہی اور تعاون کا رشتہ ہے۔ بخاری شریف میں ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے فرمایا: **المسلم اخو المسلم لا يظلمه ولا يسلمه ومن كان في حاجة اخيه كان الله في حاجته ومن فرج عن مسلم كربة فرج الله عنه كربة من كربات يوم القيامة ومن ستر مسلما ستره الله يوم القيامة.** (بخاری: كتاب المظالم، باب لا يظلم المسلم المسلم ولا يسلمه) مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، نہ اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اُسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ جو شخص اپنے بھائی کی ضرورت پوری کرنے

میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس کی ضرورتیں پوری فرماتا ہے اور جو کسی مسلمان کی ایک پریشانی دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی کئی پریشانیاں دور فرمادے گا اور جو کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اُس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ نے زمین پر مختلف مخلوقات پیدا فرمائیں۔ ان میں انسان کے ساتھ ساتھ بے شمار جانور بھی ہیں۔ لیکن ہر جانور کی ایک خاص حیثیت اور مقصد ہے؛ اگر ہم غور کریں تو جانوروں کو تین بڑی قسموں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلی قسم؛ تکلیف دہ جانور: یہ وہ جانور ہیں جو انسان کے لیے نقصان دہ اور ایذا دینے والے ہوتے ہیں۔ جیسے سانپ، بچھو، چوہا یا خونخوار درندے۔ شریعت نے ایسے جانوروں سے بچنے اور بعض اوقات انہیں مارنے کی اجازت دی ہے تاکہ انسان کی جان، مال اور امن محفوظ رہے۔ دوسری قسم؛ غیر موذی اور غیر نفع بخش جانور: یہ وہ مخلوقات ہیں جو نہ انسان کو فائدہ دیتی ہیں اور نہ کوئی خاص نقصان پہنچاتی ہیں۔ جیسے لومڑی، گیدڑ، چمگادڑ، یا کچھ جنگلی پرندے۔ تیسری قسم؛ نفع بخش جانور: یہ وہ جانور ہیں جن سے انسان کو طرح طرح کے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ جیسے گائے، بکری، اونٹ، گھوڑا، مرغی، مچھلی وغیرہ۔ زندگی کے سفر میں ہمیں سوچنا ہوگا کیا ہم موذی بن کر دوسروں کو تکلیف دیتے ہیں؟ کیا ہم بے مقصد بن کر بس وقت گزار رہے ہیں؟ یا ہم نفع بخش بن کر اللہ کی مخلوق کے کام آ رہے ہیں؟ کوشش کریں کہ اگر نفع نہیں پہنچا سکتے تو کم از کم کسی کو نقصان بھی نہ پہنچائیں اور اگر اللہ توفیق دے تو دوسروں کے لیے آسانی، محبت اور خیر کا سبب بنیں، یہی اصل انسانیت ہے، یہی ایمان کی روح ہے۔

کسی کے لیے آسانی بنو، اللہ تمہارے لیے آسانی بنائے گا:

دوستو اور بزرگو! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **من نفس عن مؤمن كربة من كرب الدنيا نفس الله عنه كربة من كرب يوم القيامة ومن يسر على معسر يسر الله عليه في الدنيا والآخرة.** (مسلم: كتاب الذكر والدعاء والتوبة والاستغفار، باب فضل الاجتماع على تلاوة القرآن....)

جو شخص کسی مومن کی دنیا کی پریشانی دور کرے، اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی پریشانیوں میں سے ایک بڑی پریشانی دور کر دے گا اور جو کسی تنگ دست کے لیے آسانی پیدا کرے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں آسانی پیدا کرے گا۔

دنیا میں ہر انسان کبھی نہ کبھی کسی دکھ، غم، یا پریشانی سے گزرتا ہے۔ کسی پر قرض کا بوجھ ہوتا ہے، کسی پر غم کا، کسی کے دل میں بے سکونی کا۔ اور یہی وقت ہوتا ہے جب کوئی دوسرا انسان اگر آگے بڑھ کر اس کی مدد کرے، چاہے ایک لفظ سے، ایک مشورے سے، یا ایک معمولی تعاون سے تو اللہ تعالیٰ اسے خالی نہیں جانے دیتا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: جس نے کسی کی دنیا کی پریشانی دور کی، میں قیامت کے دن اس کی پریشانی دور کروں گا۔ سوچو! وہ کیسا دن ہوگا جب سب گھبرائے ہوں گے، کوئی کسی کو نہ پہچان رہا ہوگا اور اسی دن اگر اللہ پاک فرمائے: یہ بندہ دنیا میں میرے کسی بندے کے کام آیا تھا، آج میں اس کے کام آتا ہوں تو اس سے بڑی کامیابی اور کیا ہو سکتی ہے؟ ہم اکثر سوچتے ہیں کہ نیکی کے لیے دولت چاہیے، وقت چاہیے، یا طاقت چاہیے۔ نہیں کبھی کبھی نیکی صرف ایک مسکراہٹ ہوتی ہے، کبھی دلجوئی کے دو بول، کبھی کسی کا بوجھ تھام لینا، کبھی کسی مقروض کو مہلت دینا، اور کبھی کسی غریب کو امید دینا، یہی وہ کام ہیں جن کے بدلے میں اللہ دنیا میں بھی آسانی دیتا ہے اور آخرت میں بھی، ہمیں یاد رکھنا چاہیے اگر ہم دوسروں کے لیے تکلیف کا سبب بنیں گے تو کل ہمیں بھی کوئی تکلیف دے گا اور اگر ہم دوسروں کے لیے آسانی بنیں گے تو ہمارا رب خود ہمارے لیے آسانیاں پیدا کرے گا، نرمی اللہ پاک کو بہت پسند ہے، اللہ کا نظام بڑا عدل والا ہے، جو تم کرو گے، وہی تمہارے پاس لوٹ کر آئے گا۔

پیاسے کتے کو پانی پلانے کے سبب مغفرت:

بخاری شریف میں حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ایک شخص راستے میں جا رہا تھا کہ اسے سخت پیاس محسوس ہوئی، وہ ایک کنویں میں اترا اور پانی پی کر باہر نکلا، جب وہ باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ ایک کتا ہانپ رہا ہے اور شدتِ پیاس سے کیچڑ

چاٹ رہا ہے، اس شخص نے دل میں کہا: اسے بھی وہی تکلیف پہنچی ہے جو مجھے پہنچی تھی؛ چنانچہ وہ دوبارہ کنویں میں اترا، اپنے موزے میں پانی بھرا، اسے اپنے منہ میں پکڑا اور اوپر چڑھ آیا۔ پھر اس نے کتے کو پانی پلایا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے اس عمل کو پسند فرمایا اور اس کو بخش دیا، صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کیا ہمیں جانوروں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے میں بھی اجر ملتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر تر جگر والی مخلوق کے ساتھ بھلائی کرنے میں اجر ہے۔ (بخاری: کتاب المساقاۃ، باب فضل سقی الماء)

اسی طرح ایک اور روایت بھی بخاری شریف میں ہے: حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: **غُفِرَ لِامْرَأَةٍ مُومِسَةٍ مَرَّتْ بِكَلْبٍ عَلَى رَأْسِ رَكِيٍ يَلْهَثُ كَادَ يَقْتُلُهُ الْعَطَشُ فَنَزَعَتْ خُفَّهَا فَأَوْثَقَتْهُ بِخِمَارِهَا فَنَزَعَتْ لَهُ مِنَ الْمَاءِ فَغُفِرَ لَهَا بذلك.** ایک بدکار عورت کی مغفرت کر دی گئی اس کا سبب یہ ہوا کہ وہ ایک کتے کے پاس سے گزری جو شدت پیاس کے سبب زبان نکالے کنوئیں کے کنارے پر کھڑا تھا، قریب تھا کہ اسے پیاس مار ڈالتی، اس عورت نے اپنا موزہ اتارا اور اسے دوپٹہ سے باندھ کر کنوئیں سے پانی نکالا اور کتے کو پلا دیا، بس اس عمل کی بدولت اس کی مغفرت ہوگئی۔ (بخاری: کتاب بدء الخلق، باب اذا وقع الذباب فی شراب احدکم فلیغمسہ)

خلاصہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک رحم کی کوئی حد نہیں، چاہے وہ انسان پر ہو، جانور پر ہو یا کسی پرندے پر، جو دل میں نرمی رکھتا ہے، اللہ تعالیٰ اُس پر رحم فرماتا ہے۔

رحمتِ الٰہی اور آسانی پیدا کرنے والے تاجر کا واقعہ:

احادیث میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک تاجر اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا، اس کے اعمال نامے میں نیکیاں بالکل نہیں ہوں گی، مگر اس کے پاس ایک خاص عمل ہوگا کہ وہ کاروبار میں دوسروں کے لیے آسانیاں فراہم کرتا رہا، دوسروں کو قرض دیتا رہا، پھر تنگ دستوں کا قرض معاف کرتا رہا اور خوش حال لوگوں کے لیے بھی نرمی کا معاملہ کرتا رہا، جب اللہ کے

سامنے اس کے اس عمل کا ذکر ہوگا تو اللہ کی رحمت جوش میں آئے گی اور اللہ اس کی مغفرت فرمادیں گے۔(بخاری: کتاب الاستقراض، باب حسن التقاضی: ۲۳۹۱)

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: رَحِمَ اللهُ رَجُلًا سَمْحًا إِذَا بَاعَ، وَإِذَا اشْتَرَى، وَإِذَا اقْتَضَى. اللہ رب العزت اُس شخص پر رحم فرمائے جو بیچے تو نرمی کرے، خریدے تو نرمی کرے اور جب اپنے حق کا تقاضا کرے تب بھی نرمی کرے۔(بخاری: کتاب البیوع، باب السھولۃ والسماحۃ فی الشراء والبیع)

ویسے تو اسلام نے زندگی کے ہر معاملے میں نرمی اور خوش اخلاقی اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے، مگر خاص طور پر خرید و فروخت اور قرض کے مطالبے جیسے معاملات میں انسان اکثر جلدی جذباتی ہوجاتا ہے اور تلخ کلامی پر اتر آتا ہے؛ اسی لیے اس حدیث میں انہی پہلوؤں کا خصوصی ذکر فرمایا گیا ہے۔

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ ایک آدمی کو اللہ تعالیٰ کے پاس لایا گیا، اللہ تعالیٰ نے پوچھا: دنیا میں تو نے کیا عمل کیا؟ اس آدمی نے کہا: میں نے ذرا برابر بھی کوئی خیر کا کام نہیں کیا، اس سے تین مرتبہ اللہ تعالیٰ نے پوچھا: تو اس نے تیسری مرتبہ میں فرمایا کہ تو نے مجھے دنیا میں وافر مقدار میں مال عطا کیا تھا، تو میں لوگوں سے لین دین کیا کرتا تھا، تو اس میں صاحب وسعت لوگوں پر آسانی کیا کرتا تھا اور تنگ دست کو مہلت دیا کرتا تھا۔(یہ سن کر) اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: أَنَا أَحَقُّ بِذَا مِنْكَ، تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِي. میں تجھ سے زیادہ لائق ہوں کہ اپنے بندوں سے درگزر کا معاملہ کروں، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی مغفرت فرمادی۔(مسلم: کتاب المساقاۃ، باب فضل انظار المعسر، رقم: ۱۵۶۰)

دوستو اور بزرگو! اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں نرمی، آسانی، اور دوسروں کے ساتھ رحم دلی کا برتاؤ صرف دنیاوی فائدہ نہیں دیتا بلکہ آخرت میں بخشش کا ذریعہ بن سکتا ہے، اگر ہم اپنے کاروبار، لین دین اور روزمرہ زندگی میں آسانی پیدا کریں، تو اللہ تعالیٰ بھی ہمارے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نرمی اور شفقت کا واقعہ:

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام، نبوت سے قبل، حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چرا رہے تھے، اچانک ایک بکری ریوڑ سے الگ ہو کر بھاگ نکلی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے پیچھے دوڑ پڑے تاکہ اسے واپس لے آئیں۔ بکری مسلسل بھاگتی رہی، حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاؤں میں دوڑنے کی وجہ سے چھالے پڑ گئے۔ آخر کار جب انہوں نے بکری کو پکڑ لیا تو مارنے کے بجائے ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ محبت و شفقت کے ساتھ فرمانے لگے: اگر تجھے مجھ پر رحم نہیں آیا تو کم از کم اپنے آپ پر ہی رحم کرتی، اگر میرے پاؤں کی تکلیف کا خیال نہ آیا تو اپنی تھکن ہی کا خیال کر لیتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: نبوت کے لیے موسیٰ ہی موزوں ہیں، کیونکہ جو دوسروں پر رحم کرتا ہے، وہی میری مخلوق کی قیادت اور ان کی تکالیف برداشت کرنے کے قابل ہے۔ (مرقاۃ المفاتیح، کتاب الاطعمۃ، ۷/۲۷۰۳)

حضرت جنید بغدادیؒ کی دریا کنارے دعا:

دوستو اور بزرگو! ایک روز حضرت جنید بغدادیؒ دریائے دجلہ کے کنارے چہل قدمی فرما رہے تھے، اسی دوران ایک کشتی قریب سے گزری، جس میں کچھ اوباش اور غافل نوجوان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گاتے بجاتے، ہنستے کھیلتے جا رہے تھے، اور ان کے چہروں پر دنیاوی مستی اور لہو و لعب کے آثار نمایاں تھے۔ جب ان نوجوانوں نے دیکھا کہ ایک بزرگ گزر رہے ہیں، تو مذاق اور تمسخر کے جذبے سے انہوں نے حضرت جنید بغدادیؒ پر جملے کسے اور ہنسی اڑائی۔ حضرت کے ساتھ ایک صاحب موجود تھے، وہ یہ گستاخی دیکھ کر بے چین ہو گئے اور عرض کیا: حضرت! یہ لوگ نہ صرف فسق و فجور میں مبتلا ہیں بلکہ اللہ کے نیک بندوں کا مذاق بھی اڑا رہے ہیں، آپ ان کے حق میں بددعا فرما دیں تاکہ اللہ ان سے انتقام لے۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے یہ سن کر نرمی اور رحمت سے سر جھکا دیا، ہاتھ دعا کے لیے اٹھائے اور فرمایا: اے اللہ! جیسے تو نے ان نوجوانوں کو آج دنیا میں خوشیاں عطا کی ہیں، اسی طرح ان کے اعمال کو ایسا بنا دے کہ قیامت کے دن بھی ان کو حقیقی خوشیاں نصیب

ہوں۔حضرت کے ہمراہ موجود شخص حیران رہ گیا، بددعا کے بجائے دعا! حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا: میں ان کی ذات سے نفرت نہیں کرتا، کیونکہ یہ سب اللہ پاک کی مخلوق ہیں۔ بندوں پر رحم کرنا اللہ کی صفت ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ میرے دل میں بھی اسی کی جھلک رہے۔

معاف کرو، بھول جاؤ، سکون پاؤ:

دوستو اور بزرگو! قرآن کریم میں ایک عجیب نکتہ بیان ہوا سب سے پہلے قریبی رشتہ دار کا ذکر، ہم سب کا تجربہ ہے کہ اگر آپ کسی اجنبی پر احسان کریں تو وہ شکریہ ادا کرتا ہے، احترام سے پیش آتا ہے؛ لیکن قریبی رشتہ دار پر حسن سلوک کریں تو اکثر یہ سوچ ہوتی ہے: بڑا بھائی ہے، رشتہ دار ہے، یہ نہ دیتا تو اور کون دیتا؟ اور ایسے جملے بار بار سننے کو ملتے ہیں، اسی لیے قرآن کریم نے فرمایا کہ سب سے زیادہ برداشت قریبی رشتہ داروں کے ساتھ کرنی ہوگی۔ ان کو دینے کے بعد بھول جاؤ، اگر ان کی طرف سے اذیت یا تکلیف پہنچے تو صبر کرو۔ اسی لیے سب سے پہلے فرمایا: ''اُولِی الْقُرْبٰی''، پھر فرمایا: ''وَالْمَسٰکِیْنَ'' یعنی مالی طور پر کمزور لوگ، اس کے بعد فرمایا: ''وَلْیَعْفُوْا وَلْیَصْفَحُوْا ط'' دو جملے، ایک معاف کرنا اور دوسرا صفح یہ ہے کہ قصور معاف کرنے کے بعد اس کا تذکرہ بھی نہ کیا جائے۔ بعض لوگ معاف تو کر دیتے ہیں مگر بعد میں موقع ملتے ہی یاد دلا دیتے ہیں، معلوم ہے! فلاں وقت تم نے یہ کیا تھا اور میں نے تمہیں معاف کر دیا تھا! قرآن کہتا ہے کہ یہ رویہ درست نہیں۔ پھر فرمایا: ''اَلَا تُحِبُّوْنَ اَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَکُمْ'' کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کر دے؟ اگر ہم بندوں کے قصور معاف کریں گے تو اللہ بھی ہمارے گناہ معاف فرمائے گا۔ اسی لیے فرمایا: ''وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ'' (آل عمران: ۱۳۳) اور اس کے بعد پھر معافی اور درگزر کا ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم سب کو کہی سنی باتوں پر اللہ پاک عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے،، معافی اور درگزر کو اپنی زندگی کا شعار بنائیں، اور اپنی زندگی چین، سکون، امن اور عافیت سے گزار سکیں۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۷)

صلہ رحمی کی اہمیت

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَالَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰہُ بِہٖٓ اَنْ یُّوْصَلَ وَیَخْشَوْنَ رَبَّھُمْ (رعد:۲۱)

وقال تعالیٰ:

فَھَلْ عَسَیْتُمْ اِنْ تَوَلَّیْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَکُمْ ﴿۲۲﴾ (محمد:۲۲)

وَقَالَ النَّبِيّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: صِلْ مَنْ قطَعَكَ، وأَعْطِ مَنْ حرَمَكَ، واعْفُ عمَّنْ ظلَمَكَ. (مسند احمد: رقم: ۱۷۴۵۲)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم ونحن علیٰ ذلک لمن الشاھدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین.

رشتوں کو جوڑو، دلوں کو جیتو:

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جو آیت میں نے تلاوت کی اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو مبارک روایت آپ کے سامنے پیش کی، ان میں ہمیں ایک نہایت اہم اور ضروری سماجی مسئلے کی طرف اللہ پاک کا حکم ملتا ہے اور وہ ہے صلہ

رحمی، یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صِلْ مَنْ قَطَعَكَ'' جو تم سے تعلق توڑ دے، تم اس سے تعلق جوڑو۔ ''وَأَعْطِ مَنْ حَرَمَكَ'' جو تم کو محروم رکھے تم اسے عطا کرو ''وَاعْفُ عَمَّنْ ظَلَمَكَ'' جو تم پر ظلم کرے، تم اسے معاف کرو۔ (مسند احمد: رقم: ۱۷۴۵۲) قرآنِ کریم میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی صفات بیان فرمائی ہیں۔ انہی میں ایک صفت یہ ہے: '' وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ '' (رعد: ۲۱) یعنی وہ لوگ جو ان رشتوں کو جوڑتے ہیں جنہیں جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور اپنے رب سے ڈرتے ہیں۔ پس، صلہ رحمی یہ ہے کہ قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے، ان کی زیادتی اور برے سلوک پر درگزر اور معافی کو اختیار کیا جائے۔ یہی وہ عمل ہے جو دلوں کو جوڑتا ہے اور معاشرے کو امن وسکون عطا کرتا ہے۔

رشتہ داری کا حق؛ قرآن کی نظر میں:

محترم حضرات! اسلام میں سب سے پہلے جو بنیادی عقائد ہیں، ان کے بعد اگر ہم معاشرتی زندگی کے مسائل کی طرف نظر ڈالیں تو سب سے اہم مسئلہ قریبی رشتہ داروں کے حقوق کا ہے۔ ان میں سب سے پہلا اور بلند درجہ ماں باپ کا ہے، پھر بیوی اور بچے، اس کے بعد بھائی بہن، پھر دیگر قریبی رشتہ دار۔ جوں جوں رشتہ دور ہوتا جائے گا، حقوق اور ذمہ داریاں بھی اسی حساب سے کم ہوتی جائیں گی، مگر جو رشتے قریب تر ہیں، خونی رشتوں سے جڑے ہیں، ان کا حق اور درجہ سب سے زیادہ ہے۔ یہ اہمیت ایسی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے نکاح والی آیت میں بھی فرمایا: ''الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ '' (نساء: ۱) یعنی تم آپس میں جس اللہ کا واسطہ دے کر ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہو، اور رشتہ داریوں کا حوالہ دے کر حق مانگتے ہو۔ یہ آیت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ رشتہ داروں کا حق دینا اور ان کے ساتھ بھلائی کرنا اللہ کا حکم ہے۔ اسی طرح ایک اور جگہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا گیا کہ مکہ کے مشرکین، جو آپ ہی کے قبیلہ قریش سے تھے، ان سے کہہ دیجئے: ''قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا '' میں تم سے کوئی

اجر نہیں مانگتا، اور ایک جگہ فرمایا: ''اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ''(شوریٰ: ۲۳) البتہ قریبی رشتہ داری میں جو مودت اور محبت ہوتی ہے اس کی بنیاد پر میں چاہتا ہوں کہ میں جو اللہ کا دین پہنچا رہا ہوں تم اس میں میرے لیے رکاوٹ نہ بنو۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ قریش کا قبیلہ بہت وسیع تھا، اور اس کی ہر شاخ میں رسول اللہ ﷺ کی رشتہ داریاں تھیں، کہیں پھوپھی، کہیں چچا، کہیں خالہ۔ اس لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کے دین کی دعوت میں تمہیں میری مدد کرنی چاہیے، اور اگر مدد نہیں کرتے تو کم از کم تکلیف بھی نہ دو، اور اس رشتہ داری کے حق کو ضرور پہچانو۔ ان آیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نہ صرف مسلمانوں بلکہ پوری انسانیت کو یہ اصول سکھا رہے ہیں کہ انسان چونکہ دوسروں کے ساتھ رہتا ہے، اور سب سے زیادہ واسطہ قریبی رشتہ داروں سے پڑتا ہے، اس لیے قرآن نے بار بار صلہ رحمی یعنی رشتے جوڑنے اور اچھا سلوک کرنے پر زور دیا ہے۔

رشتہ داری؛ اللہ پاک کی رحمت کا عکس:

محترم بھائیو اور بزرگو! اللہ پاک نے قرآن کریم میں منافقین کے بارے میں ایک نہایت سخت تنبیہ فرمائی: '' فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ ''(محمد: ۲۲) یعنی کیا تم سے یہ گمان کیا جا سکتا ہے کہ تم دین و شریعت پر قائم رہو گے اور قریبی رشتہ داروں سے اچھا سلوک کرو گے، جبکہ تم زمین میں فساد کرتے ہو اور رشتہ داریاں کاٹتے ہو؟ قرآن نے واضح کر دیا کہ قطع رحمی یعنی رشتہ داری توڑ دینا، اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت ناپسندیدہ عمل ہے، اور یہ منافقین کی علامتوں میں سے ہے۔ اس کے برعکس جب ایمان والوں کی صفات بیان کی گئیں تو فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ ''یعنی وہ بندے جو رشتہ داریوں کو جوڑتے ہیں۔ حدیثِ قدسی میں اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ''أنا اللہ، أنا الرحمن'' میں اللہ ہوں، میں رحمٰن ہوں۔ اور میری شانِ رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ میں نے اپنی رحمت کو تم سب کے لیے عام کر دیا ہے۔ پھر فرمایا: ''وشققت لها من اسمي'' میں نے رشتہ داری کو

اپنے ہی نام سے ماخوذ کیا ہے۔(ترمذی:ابواب البر والصلۃ،باب ماجاء فی قطیعۃ الرحم) یعنی جس لفظ سے رشتہ داری کو تعبیر کیا گیا ہے ''رحم''، وہ دراصل ''رحمت'' سے نکلا ہے۔ گویا رشتہ جوڑنا اللہ تعالیٰ کی صفتِ رحمت کا ایک عکس ہے، اور اس شانِ رحیمی کا ایک حصہ انسان کو عطا کیا گیا ہے تاکہ وہ بھی دوسروں پر رحم کرے اور رشتوں کو جوڑنے والا بنے۔ یہ بھی یاد رہے کہ صلہ رحمی سب سے پہلے خود انسان کے فائدے کے لیے ہے۔ جب تم دوسروں سے بھلائی کرو گے تو تمہارے اپنے دل کو سکون ملے گا، تمہاری زندگی میں امن و عافیت پیدا ہوگی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو یہ چاہے کہ اس کا رزق کشادہ ہو اور عمر دراز ہو، ''**فلیصل رحمه**'' (بخاری:کتاب الادب،باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم) تو وہ صلہ رحمی کرے اور ساتھ یہ بھی وضاحت فرمائی: ''**لیس الواصل بالمکافئ**'' (بخاری:کتاب الادب،باب لیس الواصل بالمکافئ) صلہ رحمی یہ نہیں کہ صرف اس سے تعلق رکھو جو تم سے رکھے، بلکہ یہ کہ جو تم سے کاٹے، تم پھر بھی اس سے جوڑو۔ اگرچہ قرآن نے اجازت دی ہے کہ: ''وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ ؕ'' (نحل:۱۲۶) یعنی اگر بدلہ لو تو اتنا ہی جتنا تمہیں تکلیف دی گئی، لیکن ساتھ یہ بھی فرمایا: ''وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝'' (شوریٰ:۴۳) جو صبر کرے اور معاف کر دے، یہ بڑے حوصلے اور بلند ہمت والوں کا کام ہے اور یہی انبیاء کا شیوہ ہے۔

دین کی دعوت اور رشتہ داری کی اہمیت:

نبی اکرم ﷺ نے جب اللہ کے دین کی دعوت دی، تو اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ دنیوی معاملات تو اچھے ہونے چاہئے، لیکن ساتھ ہی دینی اعتبار سے بھی آپ ﷺ ان کی رہنمائی فرمائیں، ان کے ساتھ حسن سلوک کریں اور دینی امور میں ان کی مدد کریں، اگر وہ کسی غلط کام میں مبتلا ہوں تو نرمی اور حکمت کے ساتھ انہیں روکیں۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو وحی میں فرمایا: ''وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ۝'' (شعراء:۲۱۴) یعنی اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کرو۔ اسی آیت کے نزول کے بعد، آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صفا پہاڑی پر چڑھ کر اپنے رشتہ داروں کو بلایا اور انہیں اللہ کے دین کی دعوت دی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قریبی رشتہ داروں کا دنیوی حق جتنا اہم ہے، اتنا ہی آخرت والا حق بھی ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کچھ گناہ ایسے ہیں جن کا بدلہ اللہ پاک دنیا میں ہی دے دیتے ہیں، چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، خاص طور پر برے اعمال میں شامل ہے رشتہ داروں سے تعلق توڑنا۔ جو شخص اپنے رشتہ داروں سے تعلق توڑتا ہے، اسے دنیا میں بھی اس کا بدلہ ملے گا، اور آخرت کا حساب تو الگ ہے۔ (ترمذی: ابواب صفة القيامة والرقائق والورع)

یہ بات بہت بڑی حقیقت ہے! اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''وأن ينسأله في اثرهِ'' یعنی وہ چاہتا ہے کہ اس کا نام روشن رہے۔ (بخاری: کتاب الادب، باب لیس الواصل بالمکافئ) لہٰذا لازم ہے کہ ہم اپنے قریبی رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کریں۔ کتنی شاندار روایت ہے کہ ''لیس الواصل بالمکافئ'' تم کسی کے ساتھ برابر سرابر معاملہ نہ کرو، کیونکہ معاملات صرف سماجی نہیں ہوتے بلکہ ان کے پیچھے رات دن کے تعلقات ہوتے ہیں۔ اگر وہ تمہارے ساتھ جیسے سلوک کرتا ہے، تم بھی ویسا ہی سلوک کرو، تو یہ رشتہ داری کا حق ادا کرنا نہیں بلکہ صرف مکافی یعنی برابر بدلہ دینا ہے۔ ''ولكن الواصِلُ الذي إذا قُطعتْ رحِمُه وَصَلَها'' (بخاری: کتاب الادب، باب من بسط له فی الرزق بصلة الرحم) اصل رشتہ دار وہ ہے جو جب رشتہ توڑ دیا جائے، اسے جوڑ دے، یہی صلہ رحمی کی اصل روح ہے۔

رشتہ داروں کی بدسلوکی اور اللہ کی حفاظت کا وعدہ:

ایک صحابیؓ رسول حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میرے قریبی رشتہ دار میرے ساتھ بدسلوکی کرتے ہیں، اچھا برتاؤ نہیں کرتے، میں ہر ممکن طریقے سے ان سے تعلق جوڑنے اور نیکی کا سلوک کرنے کی کوشش کرتا ہوں، لیکن وہ کسی نہ کسی صورت میں میرے ساتھ ناروا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا: اگر معاملہ بالکل ویسا ہی ہے جیسا تم بیان کر رہے ہو، تو یاد رکھو! اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک فرشتہ مسلسل تمہاری حفاظت اور

نگرانی پر مامور ہے، (مسلم: کتاب البر و الصلۃ، باب صلۃ الرحم و تحریم قطیعتھا) جو تمہیں برے اور غلط کاموں سے روکتا ہے۔ اور اس صبر و احسان کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے جنت میں تمہارے لیے ایک بلند مقام اور خاص جگہ تیار کر رکھی ہے۔

جوڑنے والا جنت کا حق دار، کاٹنے والا محروم:

دوستو اور بزرگو! قرآنِ کریم میں، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بے شمار احادیث میں، صلہ رحمی (رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک) کی بڑی ترغیب دی گئی ہے اور اسی کے ساتھ ساتھ، اگر کوئی رشتہ داری کو توڑ دے، بے رخی اور بدسلوکی کرے، تو اس پر سخت وعیدیں بھی بیان فرمائی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے منافقین کے بارے میں فرمایا: ''فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ'' کیا تم سے یہ امید ہے کہ اگر تمہیں کوئی ذمہ دار بنایا جائے تو تم اس ذمہ داری کو اچھی طرح نبھاؤ گے نہیں؛ بلکہ زمین میں فساد مچاؤ گے، قرآن کی یہ اور اس جیسی دیگر آیات، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کئی احادیث، ہمیں بتاتی ہیں کہ صلہ رحمی اللہ تعالیٰ کو کتنی محبوب ہے۔

ماں باپ کا حق: قرآن وسنت کی روشنی میں:

محترم بھائیو اور بزرگو! اسلام چاہتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آئے جس میں امن ہو، سکون ہو، چین و عافیت ہو اور یہ تب ہی ممکن ہے جب ہم ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں، ایک دوسرے کی ذمہ داریوں کو سمجھیں اور نبھائیں۔ یاد رکھیں! انسانی زندگی میں سکون اور راحت حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ صلہ رحمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بار بار اس کی تاکید فرمائی۔ حدیث شریف میں آتا ہے ''جاء رجل الی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فاستأذنہ فی الجھاد، فقال: أحی والداك؟ قال: نعم'' کہ ایک صحابی اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے اجازت لینے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: جی ہاں! تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

فرمایا: ''فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ'' اپنے ماں باپ کی خدمت کرو، اسی میں تمہارے لیے جہاد کا ثواب ہے۔ (بخاری: کتاب الجهاد والسير، باب الجهاد باذن الابوين) جہاد کی کئی قسمیں ہیں، اور ماں باپ کی خدمت بھی ان میں سے ایک عظیم جہاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں والدین کے حق میں بے شمار تاکیدات فرمائی ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''وَإِنْ جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَنْ تُشْرِكَ بِي مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۙ فَلَا تُطِعْهُمَا وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا ۖ'' (لقمان: ۱۵) اگر والدین تمہیں کفر وشرک کی طرف بلائیں تو ان کی بات نہ مانو کیونکہ ''**لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق**'' (شرح السنة: كتاب الامارة والقضاء، باب الطاعة في المعروف) اللہ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں۔ مگر فوراً ساتھ ہی فرمایا: ''وَصَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوفًا'' دنیا میں ان کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ رہو۔ ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا: ''فَلَا تَقُلْ لَّهُمَا أُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ۝'' (اسراء: ۲۳) والدین کے سامنے اف تک نہ کہو، اور نہ انہیں جھڑکو، بلکہ ان سے نرمی اور عزت کے ساتھ بات کرو۔ قرآن کریم کی یہ فصاحت وبلاغت ہمیں سکھاتی ہے کہ والدین کو ذرا سی بھی تکلیف دینا، خواہ وہ الفاظ کے ذریعے ہو یا عمل کے ذریعے، ممنوع اور گناہ ہے۔ بلکہ حکم یہ ہے کہ ان کے لیے اپنے پر بچھا دو، ان کی راحت کو اپنی راحت سمجھو، اور ان کی دعاؤں کو اپنی زندگی کا سرمایہ بناؤ۔

تو اور تیرا مال، سب والدین کے لیے:

محترم بھائیو اور بزرگو! ماں باپ کا مقام اور ان کے حقوق شریعت میں کس قدر بلند ہیں، اس کا اندازہ ایک واقعے سے لگائیں۔ ایک صحابی رسول ﷺ حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! میرا مال میرے والد کے پاس چلا گیا ہے۔ میں نے یہ مال کسی اور کو دیا تھا، مگر پہنچتے پہنچتے یہ والد کے پاس پہنچ گیا۔ اللہ کے نبی ﷺ نے یہ سن کر ارشاد فرمایا: ''أَنْتَ وَمَالُكَ لِأَبِيكَ'' (ابن ماجه: ابواب التجارة، باب الشركة والمضاربة) تو بھی اور تیرا مال بھی تیرے باپ کا ہے۔ گویا ماں باپ کا حق اتنا بڑا ہے کہ اگر وہ اولاد کے مال میں سے کچھ لے لیں

تب بھی ان پر اعتراض نہ کیا جائے، بلکہ ماں باپ ہونے کی بنیاد پر ان کے ساتھ حسنِ سلوک اور احترام کا معاملہ کیا جائے۔

والد کے دوست کا حق:

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی اور حضرت عمر فاروقؓ کے صاحبزادے تھے۔ایک دن حضرت عبداللہ بن عمرؓ مکہ کے راستے پر سفر کر رہے تھے، راستے میں ایک بدوی (دیہاتی) شخص ملا۔حضرت ابن عمرؓ نے اُسے سلام کیا، محبت سے اپنے گدھے پر سوار کیا اور پھر اپنا عمامہ بھی اُسے عطا کر دیا، ساتھیوں نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہو کر عرض کیا: اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے، یہ ایک عام دیہاتی آدمی ہے، ایسے لوگ تھوڑے سے احسان پر بھی خوش ہو جاتے ہیں، آپ نے تو اسے اپنی سواری اور عمامہ جیسی قیمتی چیز دے دی! حضرت عبداللہ بن عمرؓ مسکرائے اور فرمایا: یہ عام آدمی نہیں اس کے والد میرے والد، عمر بن خطابؓ کے دوست تھے۔اور میں نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے ''إِنَّ أَبَرَّ الْبِرِّ صِلَةُ الْوَلَدِ أَهْلَ وُدِّ أَبِيهِ'' سب سے بڑی نیکی یہ ہے کہ بیٹا اپنے باپ کے دوستوں سے بھی نیک سلوک کرے۔(مسلم: کتاب البر والصلۃ، باب صلۃ اصدقاء الاب والام ونحوھما) دوستو! کیا عظیم تعلیم ہے! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں صرف اپنے والدین کے ساتھ بھلائی کا حکم نہیں دیا، بلکہ فرمایا کہ جو لوگ تمہارے والدین کے دوست تھے، اُن سے محبت اور احترام قائم رکھنا بھی احسان کا اعلیٰ درجہ ہے۔

ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک اور اولاد میں عدل:

محترم بھائیو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے ساتھ حسنِ سلوک کا جو اعلیٰ طریقہ اور تقاضا بیان فرمایا ہے، اس میں سب سے پہلے یہ ارشاد ہے: ''فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ'' کہ والدین کے سامنے ''اُف'' تک نہ کہو۔اگر کبھی ان سے کوئی غلطی بھی ہو جائے جیسا کہ گھروں میں بسا اوقات ہو جاتا ہے کہ کسی ایک بیٹے یا بیٹی کے ساتھ سلوک دوسروں سے مختلف ہوا تو بھی

زبان سے کوئی سخت یا بے ادبی کا کلمہ نہ نکلے۔ ہمارا معاشرہ گواہ ہے کہ ایسے موقع پر بعض لوگ اپنے والدین کے بارے میں ناپسندیدہ جملے کہہ دیتے ہیں، حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں عدل وانصاف کا حکم فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت بشیر بن نعمان ؓ کا واقعہ ہے کہ ان کے والد نعمان ؓ نے اپنے ایک بیٹے کو دوسروں سے زیادہ عطا کیا، اور پھر اس پر گواہی کے لیے اپنی اہلیہ کے کہنے پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا: کیا تم نے اپنی تمام اولاد (بیٹی اور بیٹیوں) کو اس طرح دیا ہے؟ انہوں نے کہا: نہیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں ظلم پر گواہ نہیں بنتا۔ (بخاری: کتاب الشهادات، باب شهادة القاذف والسارق والزانی) اس لیے والدین کو بھی چاہیے کہ اپنی تمام اولاد کے ساتھ برابری اور انصاف کا معاملہ کریں، تاکہ گھروں میں محبت، امن اور سکون قائم رہے۔

والدین کی خدمت اور اسلام کا پیغام:

دوستو اور بزرگو! اولاد کو چاہیے کہ ہمیشہ ماں باپ کا احترام ملحوظ رکھے۔ یاد رکھو! یہ بہت بڑا مسئلہ ہے کہ بچپن میں ماں باپ نے تمہارے لیے کس قدر محنت کی، کہاں کہاں سے روزی روٹی کا انتظام کیا، کھانے پینے کا بندوبست کیا، اور تمہاری پرورش کی؛ لیکن افسوس! جب اولاد بڑی ہو جاتی ہے اور خود کمانے لگتی ہے تو اکثر ماں باپ کی ایک ایک بات پر گرفت کرنے لگتی ہے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اعتراض کرتی ہے۔ کتاب اللہ ہمیں تعلیم دیتی ہے: ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا ﴿٢٤﴾'' (اسراء: ۲۴) اے میرے رب! ان دونوں پر رحم فرما، جیسے انہوں نے بچپن میں میری تربیت کی۔ غور کرو! یہاں لفظ ''رب'' استعمال کیا گیا وہ ذات جو پرورش کرنے والی ہے۔ بیٹا اپنے والدین کے لیے دعا کرتا ہے ''رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا'' کہ مولیٰ کریم! آپ ان پر ویسا ہی رحم فرمائیں جیسا انہوں نے میری پرورش کے وقت کیا، جب میں بالکل کمزور اور عاجز تھا، والدین تمہاری خاطر دن رات جاگتے رہے، تمہیں کھلایا، پلایا، تمہاری راحت کے لیے محنت کی، تمہارے لیے دوسروں سے لڑائیاں کیں، حتیٰ کہ رشتہ داروں

سے تعلقات تک قربان کر دیے؛ لیکن افسوس! یہی چیزیں بعد میں سماج اور خاندان میں رنجشوں کا سبب بن جاتی ہیں، اور پھر یہ رنجشیں کورٹ، کچہری اور جھگڑوں تک جا پہنچتی ہیں۔ اسلام ہمیں یہ پیغام دیتا ہے کہ ہم اپنی زندگی کو چین، سکون، امن اور عافیت سے گزاریں، اور اس کی سب سے بڑی بنیاد ہے والدین کا احترام اور صلہ رحمی۔

حضرت خدیجہؓ کی زبان سے نبی ﷺ کے اخلاق کا اعتراف:

دوستو اور بزرگو! جب پہلی وحی نازل ہوئی، اور اللہ کے نبی ﷺ کا دل لرز رہا تھا، آپ فرما رہے تھے: ''زملونی زملونی'' مجھے اوڑھا دو، مجھے اوڑھا دو، آپ ﷺ گھر تشریف لائے تو اُمّ المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ نے آپ کو اپنے پُرمحبت دامنِ تسلی میں سمیٹ لیا، نبوت کا پہلا مرحلہ تھا، ابھی وحی کے سفر کی ابتدا ہی ہوئی تھی، اس وقت حضرت خدیجہؓ کے لبوں سے جو کلمات نکلے، وہ ہمیشہ کے لیے تاریخ میں ثبت ہو گئے۔ انہوں نے عرض کیا: اللہ کی قسم! اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں کرے گا۔ آپ تو صلہ رحمی کرنے والے ہیں، کمزوروں کا سہارا بننے والے ہیں، محتاجوں کی مدد کرنے والے ہیں، مہمانوں کی ضیافت کرنے والے ہیں، اور حق کے راستے میں آنے والی ہر مشکل میں صبر و ثابت قدمی دکھانے والے ہیں۔ (بخاری: باب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ ﷺ) دیکھئے! حضرت خدیجہؓ نے توحید و رسالت کی دعوت آنے سے پہلے ہی اخلاق و کردار کی بلندی کو آپ ﷺ کی سچائی کی دلیل بنایا، اور سب سے پہلے ذکر کیا، رشتہ داروں سے حسن سلوک، صلہ رحمی اور کمزوروں کی مدد۔

ماں سے حسنِ سلوک کا بے مثال نمونہ:

دوستو اور بزرگو! صلح حدیبیہ کے زمانے کا واقعہ ہے۔ حضرت اسماء بنت ابی بکرؓ کی والدہ مکہ سے مدینہ آئیں، اُس وقت وہ مسلمان نہیں تھیں، حضرت اسماءؓ کے دل میں سوال پیدا ہوا کہ کیا میں اپنی غیر مسلم ماں کو اپنے گھر بٹھا سکتی ہوں، اپنے بستر پر جگہ دے سکتی ہوں اور اس کے ساتھ حسنِ سلوک کر سکتی ہوں؟ انہوں نے بارگاہِ نبوی ﷺ میں عرض کیا۔ اللہ کے نبی

ﷺ نے ارشاد فرمایا: ضرور! اپنی ماں کے ساتھ حسنِ سلوک کرو۔ (بخاری: کتاب الجزیۃ، رقم: ۳۱۹۱) دیکھیے! یہ ہے اسلام کی وسعت، یہ ہے رحمۃ للعالمین ﷺ کا پیغام، کہ رشتہ داری کا حق مذہب کی بنیاد پر ختم نہیں کیا جاتا، بلکہ ہر حال میں صلہ رحمی کو قائم رکھا جاتا ہے۔

صلہ رحمی؛ آزاد کرنے سے بڑھ کر اجر کا عمل:

محترم دوستو! ام المؤمنین حضرت میمونہؓ کے پاس ایک باندی تھی۔ اُس دور میں باندیاں خریدی اور بیچی جاتی تھیں، جیسے آج ہم اشیاء خریدتے ہیں۔ ایک رات انہوں نے اللہ کی رضا کے لیے اپنی باندی کو آزاد کر دیا، صبح جب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا: یارسول اللہ! میں نے رات میں اپنی باندی کو آزاد کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا: یہ بہت اچھا اور نیک عمل ہے، اللہ آپ کو اس کا اجر دے، لیکن اگر تم یہ باندی اپنے کسی قریبی رشتہ دار کے حوالے کر دیتیں، تاکہ وہ اُن کے کام آتی، تو اس کا ثواب تمہیں اور بھی زیادہ ملتا۔ (بخاری: کتاب الھبۃ وفضلھا والتحریض علیھا، باب الھبۃ المرأۃ لغیر زوجھا) دوستو! یہ تعلیم ہے کہ نیکی کا دروازہ صرف عبادات یا آزاد کرنے تک محدود نہیں، بلکہ قریبی رشتہ داروں کی خدمت اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرنا اللہ کے نزدیک زیادہ افضل اور زیادہ اجر کا باعث ہے۔

رشتہ داروں پر خرچ؛ ایک عمل اور دو انعام:

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت زینبؓ کے پاس کچھ مال آیا۔ ان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ کیوں نہ یہ مال اپنی اولاد اور اپنے شوہر پر خرچ کروں، مگر ایک مومنہ کا دل ہمیشہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی رضا چاہتا ہے، اس لیے وہ براہِ راست جناب نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں تاکہ دریافت کریں کہ کیا اس عمل کا کوئی اجر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اگر تم اپنی اولاد اور اپنے شوہر پر خرچ کرو گی تو تمہیں دوہرا ثواب ملے گا؛ ایک صلہ رحمی کا ثواب، اور ایک اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ثواب۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ باب الزکاۃ علی الزوج والایتام فی الحجر)

رشتہ داری کی پہلی اینٹ؛ والدین کا احترام:

دوستو اور بزرگو! قرآنِ کریم نے ہمیں ایک مکمل نظامِ زندگی عطا فرمایا ہے؛ لیکن یاد رکھو! جب تک ہم اس نظام کی تمام کڑیوں کو جوڑ کر اپنی زندگی میں نافذ نہیں کریں گے، اُس وقت تک حقیقی سکون اور سماجی ہم آہنگی نصیب نہیں ہوسکتی۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪'' (بقرہ:۲۰۸) یعنی اے ایمان والو! پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ۔ ہمارے معاشرے میں جو تلخیاں اور کڑواہٹیں پیدا ہوتی ہیں، اُن میں سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ یہ اکثر انتہائی قریبی رشتہ داروں کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں باپ کے ساتھ، ماں کے ساتھ، بہن بھائیوں کے ساتھ۔ قرآنِ کریم نے حقوق کی ترتیب بتاتے ہوئے سب سے پہلا حق اللہ پاک کی عبادت کا بیان کیا، اور فوراً اس کے بعد رشتہ داری کے حقوق کی ترتیب میں سب سے پہلے ماں باپ کے حق کا ذکر فرمایا: ''وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ؕ'' (اسراء:۲۳) تمہارے رب نے فیصلہ فرمادیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو، یہ ہمارے ربِ مجازی ہیں، جنہوں نے ہماری تربیت کی، ہمیں پالا پوسا، اور اپنی زندگی کا سکون ہماری پرورش پر قربان کردیا۔

نبوی تعلیم اور خاندانی وفا کا تقاضا:

دوستو اور بزرگو! رشتہ داری کوئی معمولی چیز نہیں، یہ دینِ اسلام میں نہایت اہم اور ضروری فریضہ ہے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''صِلْ مَنْ قَطَعَكَ'' (مسند احمد:۱۶۲۰۷) جو تم سے تعلق توڑ دے، تم اس سے تعلق جوڑو۔ یہ جملہ کہنا میرے لیے بھی آسان ہے، سننا آپ کے لیے بھی آسان ہے، لیکن اصل امتحان اُس وقت آتا ہے جب عملی زندگی میں یہ مواقع پیش آتے ہیں، افسوس! ان حالات میں اکثر ماں باپ کا لحاظ نہیں کیا جاتا، بڑوں کی عزت اور خاندانی رشتہ داری کا پاس نہیں رکھا جاتا، یہ رشتہ داری اتنی بڑی حقیقت ہے کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی ؕ'' تم میرے خاندانی تعلق کی بنیاد پر کم از

کم اتنا تو کرو کہ میرے ساتھ بھلائی اور معاونت کا سلوک کرو۔ یاد رکھو! عرب کی جاہلیّت میں عصبیت کا یہ عالم تھا کہ خاندان والے حق پر ہوں یا باطل پر، لوگ اندھی حمایت میں ان کے ساتھ لڑتے تھے۔ نبیِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گویا اشارہ فرمایا کہ جاہلیّت میں تم اپنے خاندان کی خاطر کھڑے ہوتے تھے، اب جب میں تمہیں نیکی اور بھلائی کا حکم دے رہا ہوں تو تم میرے راستے میں رکاوٹ نہ بنو، بلکہ اس رشتہ داری کے حق کو پہچانو اور اس بنیاد پر میرے ساتھ خیر خواہی کرو۔

قرابت کا حق؛ باغِ بیرحاء سے فتح مکہ تک:

دوستو اور بزرگو! ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی صلہ رحمی اور رشتہ داری کے حسنِ سلوک سے بھری پڑی ہے۔ دیکھئے! حضرت ابوطلحہؓ کا واقعہ، جن کا ایک مشہور و معروف باغ ''بیرحاء'' تھا، وہی باغ جس کا کنواں تھا، آج بھی مسجدِ نبوی کے گیٹ نمبر ۲۵ ہے وہاں سے اوپر چڑھیں گے تو کونے پر ایک ڈھکن ہے اس پر لکھا ہوا ہے بیرحاء، حضرت ابوطلحہؓ نے جب اس کو اللہ کی راہ میں پیش کرنے کا عزم کیا، عرض کی: یا رسول اللہ! یہ باغ آپ جس کام میں چاہیں خرچ فرما دیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ابوطلحہ! میں نے تمہاری بات سن لی، لیکن سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں میں تقسیم کرو۔ حضرت انسؓ جو اس روایت کے راوی ہیں، فرماتے ہیں: یہ میرے سوتیلے والد تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق انہوں نے اپنے تمام رشتہ داروں میں بانٹ دیا، مگر میں چونکہ ان کے خاندان کا نہ تھا، اس لئے مجھے نہ دیا۔ (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون) یہ ہے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کہ خیرات بھی ہو تو پہلے اپنوں سے شروع ہو۔

پھر دیکھئے! فتحِ مکہ کا منظر بیس سال کی ایذائیں، ظلم و ستم، سازشیں، اور خون کے پیاسے دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑے ہیں، لیکن زبانِ نبوت سے اعلان ہوتا ہے: ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ ط'' (یوسف:۹۲) آج تم پر کوئی پکڑ نہیں، ''اَنْتُمُ الطُّلَقَاء'' (سنن کبری: کتاب السیر، باب فتح مکۃ) تم سب آزاد ہو۔ یہ قرابت اور رشتہ داری کا ایسا لحاظ ہے جو صرف نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل

میں ہوسکتا ہے۔اس کے برعکس، قرآن وحدیث میں رشتہ توڑنے، قطع رحمی کی سخت وعید آئی ہے؛ کیونکہ یہ شیطانی کام ہے، آسان ہے مگر خطرناک، اوراس کے اثرات نسلوں تک چلتے ہیں۔ہاروت وماروت کے قصے میں بھی بیان ہوا کہ شیطان کی سب سے بڑی کوشش میاں بیوی میں جھگڑا ڈالنا ہے، کیونکہ جب یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو گھر کا سکون برباد ہوتا ہے اور آنے والی نسلیں متاثر ہوتی ہیں۔

صلح حدیبیہ کے زمانے میں ابوسفیان- جو اس وقت مسلمان نہ تھے-تجارت کے لیے شام گئے، روم کے بادشاہ ہرقل کے ساتھ گفتگو ہوئی۔ ہرقل نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات کے بارے میں پوچھا تو ابوسفیان نے کہا: وہ رشتہ جوڑنے کا حکم دیتے ہیں اور رشتہ توڑنے سے منع فرماتے ہیں۔(بخاری:باب کیف بدء الوحی، رقم:۷) یہی بات حضرت جعفر طیارؓ نے نجاشی کے دربار میں بھی بیان کی۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کو خبر ملی کہ مکہ میں ایک نبی مبعوث ہوئے ہیں۔انہوں نے اپنے بھائی کو مکہ بھیجا کہ جا کر سنو، وہ کیا کہتے ہیں۔ بھائی واپس آ کر بولے: وہ بہت سی نیک باتوں کا حکم دیتے ہیں، اور خاص طور پر رشتہ جوڑنے کا حکم دیتے ہیں اور رشتہ توڑنے سے منع فرماتے ہیں۔

اس لیے دوستو اور بزرگو! یہ ہماری سماجی زندگی کی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہیں جن کی وجہ سے ہم کبیرہ گناہوں میں مبتلا ہوجاتے ہیں، رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات ٹوٹ جاتے ہیں، شادی کے مواقع پر بھی اور غم کے مواقع پر بھی ہم ایک دوسرے سے دوری اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ قرآنِ کریم کی آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ صلہ رحمی، یعنی رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک، اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی پسندیدہ عمل ہے۔اسی لیے نکاح کی آیت میں بھی اسے جوڑتے ہوئے فرمایا: ''الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط '' (نساء:۱)

رحم؛ عرشِ الٰہی کے سائے تلے:

دوستو اور بزرگو! حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''خلق الله الخلق، فلما فرغ منه قامت الرحم، فأخذت بحقوي الرحمان، فقال له:

مه؟ قالت: هذا مقام العائذ بك من القطيعة، قال: ألا ترضين أن أصل من وصلك، وأقطع من قطعك؟ قالت: بلىٰ يا رب! قال فذاك.'' (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب وتقطعوا ارحامکم)

جب اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا، یعنی ان کی تخلیق سے پہلے ہی اپنے علمِ ازلی میں ان کی صورتیں، شکلیں اور مقدرات طے فرما دیں، اور تخلیق کا مرحلہ مکمل ہوا، تو ''رَحِم'' (رشتہ ناتا اور قرابت) اللہ کے حضور کھڑا ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے رحم! بتا تو کیا چاہتا ہے؟ رحم نے عرض کیا: یارب! میں تیرے دربار میں کھڑا ہوں، تیرے عزت وجلال کے دامن کو پکڑے ہوئے ہوں، اس بات کی پناہ مانگتا ہوں کہ کوئی شخص مجھے کاٹ دے، رشتہ داری کو توڑ دے، میرے جوڑنے کے بجائے اسے پھاڑ دے اور ختم کر دے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تم اس بات پر راضی نہیں کہ جو شخص تجھے جوڑے، رشتہ داری کو قائم رکھے، میں بھی اس کے ساتھ اپنا تعلقِ فضل وکرم قائم رکھوں؟ اور جو تجھے کاٹے، رشتہ داری کو توڑے، میں بھی اس سے اپنا فضل وانعام کا تعلق توڑ دوں؟ رحم نے عرض کیا: پروردگار! میں راضی ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تو پھر یہ وعدہ تیرے لیے ہمیشہ کے لیے پکا اور قائم ہے۔

اس لیے، دوستو اور بزرگو! آؤ ہم سب عہد کریں کہ رشتہ داریوں کا لحاظ رکھیں، آپس میں چین، سکون، امن وعافیت کے ساتھ زندگی گزاریں، چھوٹی موٹی باتوں کو دل سے نکال دیں اور ایک دوسرے کو معاف کرتے رہیں۔

حقِ وراثت؛ صلہ رحمی کی اصل کسوٹی:

یقیناً ہمارے معاشرے کا ایک بڑا اور نازک مسئلہ وراثت کا ہے، اکثر رشتہ داروں میں جھگڑوں کی جڑ یہی ہے کہ کوئی کسی کا حق کھا جاتا ہے، یا کوئی حق دینا نہیں چاہتا۔ برسوں تک یہ زیادتیاں چلتی رہتی ہیں اور دلوں میں کدورتیں بھر جاتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس مسئلے کے متعلق بذات خود واضح احکام نازل فرمائے، تاکہ وراثت کا فیصلہ انسان اپنی مرضی سے نہ

کرے بلکہ رب کے حکم کے مطابق ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ ''(نساء:۱۱) تم نہیں جانتے کہ تمہارے باپ اور تمہارے بیٹوں میں سے کون تمہارے لیے زیادہ نفع مند ہے، اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جس بیٹے پر والدین نے سب سے زیادہ خرچ کیا، تعلیم دی، سہولتیں فراہم کیں، وہی بڑا ہو کر والدین سے منہ موڑ لیتا ہے، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس سے والدین نے کم توقع رکھی ہو وہ بڑھاپے کا سب سے بڑا سہارا بن جاتا ہے۔ پس، وراثت کا فیصلہ اپنے جذبات اور پسند ناپسند پر نہ چھوڑو، بلکہ اللہ کے حکم پر چلو، کیونکہ ''اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ '' کو صرف وہی جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں صلہ رحمی کی توفیق دے، قطع رحمی سے بچائے، اور ہمارے گھروں کو محبت و سکون کا گہوارہ بنائے۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۸)

پردہ اور حجاب کا ثبوت قرآن وحدیث اور سماجیات کی روشنی میں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۵۹ (احزاب:۵۹)

وقال تعالیٰ: وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْـَٔلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ؕ ذٰلِكُمْ اَطْھَرُ لِقُلُوْبِكُمْ وَقُلُوْبِھِنَّ ؕ (احزاب:۵۳)

وقال تعالیٰ: وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ وَیَحْفَظْنَ فُرُوْجَھُنَّ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ ۪ (نور:۳۱)

وقال النبی ﷺ: إنَّ النَّظرةُ سَھمٌ مِن سِھامِ إبلیسَ مَسمومٌ، مَن تَرَکَھا مَخافتي، أبدَلتُه إیمانًا یَجِدُ لہ حَلاوتَہ في قَلبِہ. (معجم کبیر:۱۲۷/۵)

محترم ومکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! میں نے ابھی آپ کے سامنے جو کلامِ

پاک کی آیات تلاوت کی ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسلامی سماج ومعاشرے اور سوسائٹی کے سب سے بڑے اور اہم عنصر؛ شرم وحیا، پاکدامنی، اور اپنے لباس کے ذریعے اپنے آپ کو ڈھانپنے کا ذکر فرمایا ہے۔

حجاب کے معاملے میں غلط فہمیاں اور گمراہ کن بیانیے:

ان آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہی امور کی طرف اشارہ فرمایا ہے، میں نے یہ آیت آپ حضرات کے سامنے اسی لیے تلاوت کی کہ اس وقت ہندوستان میں جو حالات ہیں، اس کے پس منظر میں پچھلے ہفتے دو بالکل متضاد واقعات پیش آئے۔ ایک طرف، حجاب کے مسئلہ پر کرناٹک کی ہائی کورٹ میں مقدمہ چل رہا ہے اور روزانہ سماعت ہورہی ہے۔ اسی بنیاد پر کچھ ایسے مسلمان، جنہیں بڑے ''اسکالر'' سمجھا جاتا ہے اور جن کے بارے میں ملک کا میڈیا یہ تاثر دیتا ہے کہ یہ اسلام کے معتبر نمائندے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کو کتاب وسنت کا بنیادی علم بھی حاصل نہیں۔ اس کے باوجود وہ میڈیا پر آکر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نعوذ باللہ قرآنِ کریم کی کسی آیت میں پردہ، حجاب یا خمار کا کوئی ذکر نہیں، اور اگر کہیں ذکر ہے تو وہ صرف اُس زمانے کے لیے تھا، آج کے دور کے لیے نہیں۔ یہ وہ پڑھا لکھا مسلمان طبقہ ہے جو اسلام کی غلط تصویر پیش کرتا ہے، اور عام لوگ سمجھتے ہیں کہ یہی اسلام کا اصل حکم اور یہی اس کی تعلیم ہے۔

عدمِ تحفظ اور بے پردگی:

دوسری چیز اسی ملک اور صوبے میں، دن دہاڑے ایک عورت کو قتل کر دیا جاتا ہے اور نہ کوئی دیکھنے والا ہوتا ہے، نہ ہی کوئی اس کی نگرانی اور حفاظت کرنے والا۔ یہ کوئی ایک واقعہ نہیں، بلکہ ملک کے بڑے بڑے شہروں میں ایسے واقعات روزانہ پیش آتے ہیں۔ کچھ خبروں میں آجاتے ہیں، اور کچھ کو دبا دیا جاتا ہے۔

یہ دو بالکل متضاد منظر ہیں، ایک طرف عورت کی بے پردگی اور فیشن پرستی، جو مردوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے گناہوں کا سبب بنتی ہے، اور دوسری طرف اسی عورت کی عزت، جان

اور وقار کی کوئی ضمانت نہیں۔

پاکیزہ سماج کا اسلامی تصور:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں فرمایا: ''حبائل الشیطان'' (الترغیب والترھیب: ۳، ۲۵۷، رقم: ۲) یہ شیطان کی رسیاں ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ ہر زمانے میں عورت کا غلط طریقے سے استعمال کیا گیا اور ذاتی مفادات کے لیے اس سے جو چاہا گیا، کیا گیا؛ لیکن قرآنِ کریم اور اسلام دنیا کو ایک پاکدامن اور صاف ستھرا معاشرہ دینا چاہتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد تو آپ بارہا سنتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین کو پاکدامنی اور شرم وحیا والا بنایا ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اپنے بدن کے دو حصوں کی حفاظت کرلے، میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں'' مَن يَضْمَن لي ما بيْنَ لَحْيَيْهِ وما بيْنَ رِجْلَيْهِ، أَضْمَنْ له الجَنَّة'' (بخاری: کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان) جو اپنی شرمگاہ اور اپنی زبان کی حفاظت کرے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسے جنت کی خوشخبری دیتے ہیں۔

احکامِ پردہ؛ وحی کی روشنی میں:

خیر! میں نے آپ کے سامنے کلامِ پاک کی جن آیات کی تلاوت کی، مجموعی طور پر قرآنِ کریم میں سات آیات ایسی ہیں جو براہِ راست پردے کے احکام سے متعلق ہیں۔ اس کے علاوہ کئی اور آیات، واقعات اور مضامین میں شرم وحیا، پاکدامنی، پردہ اور حجاب کا ذکر ملتا ہے۔ ان میں سورۂ احزاب کی چار آیات اور سورۂ نور کی تین آیات شامل ہیں۔ میں نے آپ کے سامنے سورۂ احزاب کی ایک آیت پیش کی، جہاں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خطاب فرماتے ہیں: ''يَآأَيُّهَا النَّبِيُّ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کیا اور پھر اس کے بعد حکم دیا ہے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ''قُلْ لِّأَزْوَاجِكَ'' اپنی عورتوں کو ''وَبَنٰتِكَ'' اپنی بیٹیوں کو ''وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' اور ایمان والی عورتوں کو حکم دے دیجئے، ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ'' مردوں کے لیے الگ حکم دیا گیا اور عورتوں کے لیے الگ۔ عورتوں کے سلسلے میں

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ '' (احزاب: ۳۳) اپنے گھروں میں ٹھہری رہو۔ اسی موضوع پر سورۂ احزاب کی ایک اور آیت میں فرمایا: ''وَاِذَا سَاَلْتُمُوْھُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْھُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ ط '' (احزاب: ۵۳) اور جب تم ان (ازواجِ مطہرات) سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگو۔ چاہے کوئی خرید و فروخت ہو یا لین دین کا معاملہ، سوال بھی پردے کے پیچھے سے ہی ہونا چاہیے۔ یہ قرآن کا واضح حکم ہے، جس میں عورت کی عزت، وقار اور معاشرتی تطہیر کا مکمل اہتمام کیا گیا ہے۔

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف فرما دیا ایمان والے مردوں کو، اور بالخصوص نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے قیامت تک کے انسانوں کو یہ حکم پہنچا دیا کہ آپ اپنی بیویوں، بیٹیوں اور بہنوں سے کہہ دیجیے: ''یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ '' وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ اسی آیت میں مزید فرمایا: ''یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ○ '' وہ اپنی چادروں کو اپنے اوپر ڈھانپ لیں۔ قرآنِ کریم نے ایک اور جگہ ''خُمُر '' کا لفظ استعمال کیا: وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِھِنَّ عَلٰی جُیُوْبِھِنَّ ص (نور: ۳۳) اپنی اوڑھنیوں کو گریبان پر ڈال لیں تاکہ سینہ کی حفاظت ہو اور جسم کے اعضاء نظر نہ آئیں۔ ''جلباب'' عربی میں چادر کو کہتے ہیں، اور ''جلابیب'' اس کی جمع ہے۔ پس حکم یہ ہے کہ اپنی چادروں کو اپنے اوپر اچھی طرح ڈال لیں۔ یہ وہ واضح اور صریح آیات ہیں جن میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے پردے کا حکم براہِ راست بیان فرمایا ہے، اور عام مومن عورتوں کو بھی یہی ہدایت دی کہ '' یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ○ ''۔

میڈیا کے شبہات اور قرآنی جواب:

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ یَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِھِنَّ '' ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔ پھر ارشاد ہے: '' اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا '' عام حالات میں مکمل پردہ ضروری ہے، البتہ بعض مواقع

پر، مجبوری یا ضرورت کے تحت، چہرہ یا ہاتھ کھولنے کی نوبت آسکتی ہے۔اس آیت کی تفسیر میں جلیل القدر ائمہ کا اختلاف پایا جاتا ہے: امام احمد، امام شافعی اور امام مالک رحمہم اللہ کی رائے ہے کہ کسی حال میں بھی چہرہ کھولنے کی اجازت نہیں؛ جبکہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ اس آیت کے الفاظ ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا '' سے استدلال کرتے ہوئے کچھ رخصت دیتے ہیں، میں یہ بات اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آج کل میڈیا پر کچھ لوگ یہ کہہ کر شبہ ڈالتے ہیں کہ پردہ تو مولویوں نے ایجاد کر دیا، قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر اور ثبوت نہیں؛ حالانکہ یہ سراسر جہالت ہے، قرآنِ کریم میں کم از کم سات آیات اور تقریباً ستر احادیث مبارکہ ایسی ہیں جن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پردے کے احکام واضح طور پر بیان فرمائے ہیں۔

دعویٰ حفاظت کا، مخالفت پردے کی:

دوسری بات! یہ تو کتاب وسنت کی تائید تھی، لیکن عمل کے اعتبار سے بھی ہم اور آپ دن رات بے پردگی کے نقصانات دیکھ اور سن رہے ہیں، ابھی حال ہی میں سورت کی ایک بچی کا اندوہناک واقعہ پیش آیا، تو آوازیں بلند ہوئیں کہ ایسے مجرموں کو زندہ جلا دیا جائے یا پھانسی دی جائے۔ یہ ایک طرف کا دعویٰ ہے، اور دوسری طرف اسی ملک میں جو عورتیں اپنی حفاظت کے لیے برقع پہننا چاہتی ہیں، ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کی جاتی ہیں، یہ کھلا تضاد ہے، ایک طرف آپ بچیوں کی حفاظت کی بات کرتے ہیں، اور دوسری طرف وہ لباس جو عورت کو عزت اور تحفظ دیتا ہے، اسے روکنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ حکم صرف قرآنِ کریم میں ہی نہیں، بلکہ آپ کی اپنی مذہبی کتابوں جیسے ''رُگ وید اور گیتا'' میں بھی عورت کے پردے اور حیا کے بارے میں واضح احکام موجود ہیں۔ یہی حال بائبل (تورات اور انجیل) میں تھا، البتہ بعد میں لوگوں نے انہیں بدل ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ ساری قوموں میں پردے کا تصور مسلم رہا ہے۔ ابھی چند دن پہلے ایک سروے میں بتایا گیا کہ راجستھان میں آج بھی ۹۳ فیصد عورتیں خود کو گھونگھٹ یا پردے میں رکھتی ہیں۔

شیطانی نظریات اور فطری انسانی اقدار:

ہم دیکھ رہے ہیں کہ ہمارے گھروں میں کام کے لیے یا مکانات کی تعمیر کے سلسلہ میں جو عورتیں آتی ہیں، وہ کتنے منظم اور باوقار طریقے سے رہتی ہیں، یہ عمل؛ وہ ایک مذہبی شعار یا سماجی رواج سمجھ کر کرتی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ان کے مذہب کی تعلیم کا حصہ ہے۔ یہ جو نظریہ پیش کیا جاتا ہے کہ انسان پہلے ننگا تھا اور پھر کپڑے پہننے لگا، یہ سب سائنس میں دکھائی جانے والی وہ باتیں ہیں جو ڈارون اور اس کے ہم خیال لوگوں کے نظریات ہیں، یا آئزک نیوٹن وغیرہ کے فلسفے ہیں؛ یہاں تک کہ ایک مستشرق نے انسانوں کو جانوروں سے تشبیہ دی اور کہا کہ شادی بیاہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ چند گمراہ لوگ تھے، اور ان کا یہ طرزِ فکر کسی مہذب قوم یا آسمانی دین کا کلچر نہیں، بلکہ شیطانی اور نفسانی خواہشات کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی کسی بھی قوم کے ہاں یہ فحاشی کا کلچر موجود نہیں رہا، بلکہ عیسائیوں میں بھی پاکدامنی، شرم و حیا اور عفت و عصمت کی تعلیمات بہت زیادہ پائی جاتی ہیں۔

قرآن کی روشنی میں حیا کی چمکتی مثالیں:

محترم دوستو اور بھائیو! کتاب اللہ نے حضرت مریمؑ کا ذکر بڑے عظیم انداز میں فرمایا اور ان کی پاکدامنی کو یوں بیان کیا: ''وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا'' (تحریم:۱۲) وہ مریمؑ، عمران کی بیٹی، جنہوں نے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی۔ اسی طرح قرآن مجید نے سیدنا موسیٰؑ کا ایک عظیم واقعہ بیان کیا۔ جب وہ مدین کے پانی کے گھاٹ پر پہنچے تو دیکھا: ''وَلَمَّا وَرَدَ مَآءَ مَدْيَنَ وَجَدَ عَلَيْهِ اُمَّةً مِّنَ النَّاسِ يَسْقُوْنَ ۡ'' (قصص:۲۳) ایک ہجوم پانی پلا رہا ہے، اور پیچھے دو عورتیں کھڑی ہیں، موسیٰؑ نے وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا: ہم مردوں کی باری ختم ہونے کے بعد پانی بھرتی ہیں، کیونکہ ہمارے گھر میں کوئی مرد نہیں، اور ہمارے والد بوڑھے ہیں، اس لیے ہم آتی ہیں۔ قرآن نے اس منظر کو قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا۔ موسیٰؑ نے ان کے لیے پانی کا انتظام کیا، بھاری پتھر ہٹایا اور انہیں پہلے پانی بھر دیا۔ اس دن وہ جلدی گھر لوٹیں، تو والد

نے پوچھا: آج اتنی جلدی کیوں؟ بیٹیوں نے بتایا کہ ایک نیک اور شریف شخص نے مدد کی۔ پھر قرآن فرماتا ہے: ''فَجَآءَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ ۫'' ان میں سے ایک بیٹی شرم وحیا کے ساتھ موسیٰؑ کے پاس آئی، انہیں بلانے کے لیے۔ حضرت موسیٰؑ نے بھی حیا کا مظاہرہ کیا، آگے چلتے اور پیچھے نہ دیکھتے۔ جب کوئی موڑ آتا تو بیٹی کنکری پھینک دیتی تاکہ راستہ بتا دے۔ دوستو اور بزرگو! قرآن نے ان عورتوں کی پاکدامنی، حیا، اور وقار کو ہمیشہ کے لیے مثال بنا دیا۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن پر معاشرہ امن وعزت سے قائم رہتا ہے۔

جنت سے زمین تک؛ لباس اور حیا کا پہلا سبق:

دوستو اور بزرگو! جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، بعض لوگ یہ غلط نظریہ پھیلاتے ہیں کہ انسان پہلے ننگا تھا اور بعد میں لباس آیا، یہ تصور سراسر قرآن کی روشنی میں باطل ہے۔ قرآن کریم ہمیں حقیقت بتاتا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ جنت میں تھے، جہاں ابھی احکامِ شریعت کے مکلف نہیں تھے، بلکہ محض انعام اور بدلے کا مقام تھا۔ شیطان نے دھوکے اور فریب کے ساتھ ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈالا کہ اگر اس ممنوع درخت سے کھالو گے تو ہمیشہ ہمیشہ جنت میں رہو گے اور کبھی باہر نہیں نکلو گے۔ حضرت حواؑ کو ورغلایا گیا، اور پھر دونوں نے اس درخت کا استعمال کرلیا، لیکن جیسے ہی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا یہ ظاہری پہلو سامنے آیا، فوراً جنتی لباس ان کے بدن سے اترنے لگا۔ قرآن کریم اس لمحے کو یوں بیان کرتا ہے: ''وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ'' (اعراف: ۲۲) وہ دونوں جلدی جلدی جنت کے پتے توڑ کر اپنے جسم کو ڈھانپنے لگے۔ یہاں ''وَطَفِقَا'' کا لفظ اس گھبراہٹ اور اہمیت کو ظاہر کرتا ہے کہ یہ عمل کس قدر فوری تھا۔ یہ واقعہ ہمیں بتاتا ہے کہ فطرتِ انسانی میں شرم وحیا اور پاک دامنی شروع سے موجود ہے۔ اسلام نے انہی واقعات کی روشنی میں عورت ومرد دونوں کے لیے ستر اور پردے کے احکام مقرر فرمائے، اسی لیے سورۂ نور میں فرمایا گیا: ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ'' کہ ایمان والی عورتیں اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اور ''وَلَا يُبْدِيْنَ

زِیْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا ''اپنی زینت ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے، اور ''وَلْیَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰی جُیُوْبِهِنَّ ''(نور:۳۱) اپنی اوڑھنیوں کو اپنے گریبانوں پر ڈال لیں۔قرآن نے محرم اور غیر محرم کے احکام بھی تفصیل سے بتا دیے، اور یہ تعلیم صرف اسلام ہی میں نہیں بلکہ تمام انبیاء کی شریعتوں میں موجود رہی ہے۔ ہمارے ملک کے ہندو بھائیوں کی مذہبی کتابوں رُگ وید، گیتا اور دیگر صحیفوں میں بھی پردے، عفت اور حیا کا بار بار ذکر ملتا ہے۔گویا شرم وحیا تمام آسمانی اور الہامی مذاہب کی مشترکہ تعلیم ہے۔

پردہ؛ دین کی چاروں بنیادوں سے ثابت شرعی حکم:

دوستو اور بزرگو! آج میں آپ کے سامنے ایک نہایت اہم نکتہ رکھنا چاہتا ہوں۔ یہ جو غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے کہ'' قرآن کریم میں پردے کا ذکر کہیں موجود نہیں'' یہ سراسر بے بنیاد بات ہے۔ یاد رکھیے! اسلام میں مسائل کے ثابت ہونے کے چار بنیادی اصول ہیں: سب سے پہلا اور سب سے بڑا ماخذ کتابُ اللہ ہے۔اگر کسی مسئلے کی وضاحت قرآن میں نہ ملے، تو دوسرا ماخذ احادیثِ مبارکہ ہیں۔ اگر احادیث میں بھی صراحت نہ ہو، تو پھر امت کے جید علماء جو قرآن وحدیث سے مسائل اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں وہ باہمی اتفاق سے کسی مسئلے پر فتویٰ دیتے ہیں، جسے اجماع کہا جاتا ہے، اور یہ اسلامی اصولِ شریعت میں ایک مضبوط بنیاد ہے۔اگر ان تینوں سے بھی کسی مسئلے کا حل نہ ملے، تو پھر چوتھا اصول آتا ہے جسے قیاس کہا جاتا ہے۔اس میں مفتی یا مجتہد قرآن وسنت میں غور وفکر کر کے، اسی سے ملتے جلتے مسائل پر قیاس کرتے ہوئے فتویٰ دیتا ہے۔ پردے کا حکم ان چاروں ماخذ سے بالکل واضح اور دوٹوک انداز میں ثابت ہے۔قرآن میں جگہ جگہ اس کا ذکر آیا ہے، احادیث میں بار بار پردے کی تاکید ملتی ہے، اجماعِ امت میں اس پر مکمل اتفاق ہے، اور قیاس سے بھی اس کے احکام پوری طرح ثابت ہیں۔ یہاں تک کہ ازواجِ مطہرات جو سب سے زیادہ نیک، پاکیزہ اور مقدس خواتین تھیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجۂ محترمہ ہونے کا شرف رکھتی تھیں ان کے بارے میں بھی

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِذَا سَاَلْتُمُوْهُنَّ مَتَاعًا فَسْئَلُوْهُنَّ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ'' اور جب تم ان سے کوئی چیز مانگو تو پردے کے پیچھے سے مانگا کرو۔ تو جب ازواجِ مطہراتؓ کے لیے یہ حکم ہے، تو باقی خواتین کے لیے اس کی اہمیت اور بھی زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔

جب ''حیا'' رخصت ہو جائے تو فتنہ عام ہو جاتا ہے:

دوستو اور بزرگو! آج ملک کے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ گناہوں کی کثرت بڑھتی جا رہی ہے۔ جرائم میں سب سے نمایاں اور تکلیف دہ پہلو عورتوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ، بے حرمتی اور ریپ کے واقعات ہیں، جو ہم روز سنتے اور پڑھتے ہیں۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ یہ بگاڑ کب پیدا ہوا، کہاں سے آیا اور کیسے پھیلا؟ شیطانی قوتوں نے اس فتنے کو پھیلانے کے لیے بڑی خطرناک تدبیر اختیار کی۔ سب سے پہلے یورپ سے یہ وبا اُٹھی۔ روم و ایران کی قدیم تہذیبوں میں، اسلام سے پہلے بھی ایسے گناہ شروع ہو چکے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ یہ فحاشی پوری دنیا میں سرایت کر گئی۔ پچھلے سات سو برس میں یورپ نے لبرلزم اور سیکولرزم کے نام پر مرد و زن کے آزادانہ میل جول کو عام کیا، اور اسی بنیاد پر ''جنسی تعلیم'' (Sex Education) کے نام سے بے حیائی کو فروغ دیا۔ میڈیا نے بھی نگاہوں کی حفاظت کے اس حکمِ الٰہی کو مٹانے میں کردار ادا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں کی سوچ اور فکر بدل گئی، حیاء ختم ہونے لگی، اور معاشرے میں گناہ عام ہو گئے۔ یاد رکھئے! ان برائیوں کے پھیلنے کا سب سے بڑا سبب بے پردگی اور حیا کے اس حکم کو چھوڑ دینا ہے۔

دوستو اور بزرگو! چند سال پہلے بمبئی میں ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا، ایک عورت کی عزت لوٹی گئی۔ اس موقع پر بمبئی کے کمشنر نے خود کہا کہ اگر لڑکیاں اپنا لباس درست کر لیں، تو ہمارے لیے جرائم کو روکنا آسان ہو جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان واقعات کے پیچھے بے پردگی کی لعنت کارفرما ہے۔ یہی بے پردگی ہے جس نے ہماری بچیوں کو اپنے ماں باپ سے دور کر دیا، اپنے بڑوں کی نصیحت سے بیگانہ کر دیا۔ آج نہ وہ سننے کو تیار ہیں، نہ کوئی سمجھانے کی ہمت رکھتا ہے۔ ہم ایک عجیب امت بن چکے ہیں! جن پر پردہ فرض ہے، ان کو روکا جا رہا ہے،

اور جن کو روکا نہیں جا رہا وہ پردہ کرنے کا نام نہیں لیتیں۔ شادی بیاہ کے مواقع پر تو ہم سب اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ سب کو خوش کرنے کی فکر ہے، مگر ایک اللہ کو خوش کرنے کی فکر نہیں! عورتیں تک یہ کہہ دیتی ہیں کہ آج کے دن ہمیں پردے کا نہ کہو، ہمیں روکو مت۔ گویا نعوذ باللہ آج کے دن شریعت اسلامیہ ہم پر منسوخ ہو چکی ہے!

ایک بار اکبر الہ آبادیؒ سے کسی نے بے پردہ عورتوں کے بارے میں پوچھا کہ ان کا پردہ کہاں ہے؟ تو اکبر الہ آبادیؒ نے بڑے معنی خیز انداز میں اشعار کہے:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیبیاں — اکبؔر زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو میں نے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا — کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کے پڑ گیا

پردے کی پامالی اور اجتماعی نقصان:

دوستو اور بزرگو! یہ جو زنا کاری اور نگاہ کی بے راہ روی ہے، یہ کسی ایک فرد کا ذاتی گناہ نہیں رہتا، بلکہ اس کی لپیٹ میں پورا معاشرہ آجاتا ہے۔ گھر کی ایک بچی کا معاملہ ہو جائے تو پورا خاندان پریشانی اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسلام نے ہمیں بچپن ہی سے حفاظت کے اصول سکھا دیے، بستروں کو الگ کرنا، شرم و حیاء کی تربیت دینا، اور دیگر بہت سی ہدایات جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بطور تاکیدی حکم امت کو عطا فرمائیں۔ مومنہ عورتوں کو واضح طور پر بتایا گیا کہ انہیں کیسے رہنا ہے، کس انداز سے اپنی عفت کی حفاظت کرنی ہے۔ مگر افسوس! جنہیں روکا جا رہا ہے وہ عمل کرنے پر تیار نہیں، اور ایک بڑا طبقہ بدستور بے پردگی کی زندگی گزار رہا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ جب ہم ایسے معاملات کو عدالتوں تک لے کر جاتے ہیں تو وہاں شریعت پر اعتراضات کیے جاتے ہیں اور دین کی پاکیزہ تعلیمات کو نشانہ بنایا جاتا ہے۔

حدودِ الٰہی سے انحراف، خسارے کا سودا:

دوستو اور بزرگو! داڑھی کا مسئلہ ہمارے سامنے کئی بار آیا۔ ہمارے کچھ نوجوان پولیس میں تھے، کچھ فوج میں، وہاں داڑھی رکھنے کے لیے باقاعدہ اجازت لینی پڑتی تھی۔ اس

اجازت کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، یہ وہی لوگ جانتے ہیں۔ ہمارے چند دوستوں نے داڑھی رکھنے کی اجازت مانگی، تو دو تین سال کی جدوجہد کے بعد کہیں جا کر اجازت ملی۔ اور ہم ہیں کہ یہاں کسی نے نہیں روکا، پھر بھی داڑھی نہیں رکھتے! حالانکہ یہ سنتِ مؤکدہ بلکہ واجب کے درجے کی سنت ہے۔ یہی حال پردے کے معاملے میں بھی ہوا؛ چونکہ ہماری عورتوں میں بے پردگی عام ہوگئی ہے، غیر مسلم یہ سوچنے لگے کہ اگر یہ اسلام میں ضروری ہوتا تو سب مسلمان عورتیں پردہ کرتیں۔ افسوس! آج جو عورتیں اسلام میں داخل ہو رہی ہیں، وہ کئی وجوہات بیان کرتی ہیں، مگر ان میں ایک بڑی وجہ پردہ ہے۔ جب وہ اسلام کے پاکدامنی، شرم و حیا اور عزت و احترام والے ماحول کو پڑھتی اور سنتی ہیں، تو ان کے دلوں میں اسلام کی عظمت بیٹھ جاتی ہے۔ وہ سمجھتی ہیں کہ اسلام نے عورت کو کتنا مقام دیا، اسے گھر کی معزز رانی بنایا۔ کتاب اللہ میں حکم آیا: ''وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى'' (احزاب: ۳۳) گھروں میں قرار سے رہو اور پہلی جاہلیت کی طرح زینت کا اظہار نہ کرو۔ مگر آج ہمارے معاشرے میں وہی جاہلیت کی رسمیں لوٹ آئی ہیں۔ لوگ سوچتے ہیں کہ سبھی نہیں کر رہے تو شاید یہ ضروری نہیں۔ یاد رکھو! کتاب اللہ کا حکم ہے، چاہے کوئی کرے یا نہ کرے، اللہ نے فرما دیا: ''تلک حدود اللہ'' یہ اللہ کی حد بندیاں ہیں، جو ان پر عمل کرے گا کامیاب ہوگا، اور جو انہیں توڑے گا، وہ دنیا میں بھی ناکام اور آخرت میں بھی ناکام ہوگا۔

جب یورپ نے پردے میں اسلام کی جھلک دیکھی:

دوستو اور بزرگو! یورپ نے سائنس، ٹیکنالوجی اور دنیا بھر کی راحت و آسائش کی چیزیں ہمیں دیں۔ یہ سب آسانی سے نہیں آیا، بلکہ انہوں نے اس کے لیے شب و روز محنت کی، ریسرچ کی، تجربے کیے، اور یوں جدید سائنس وجود میں آئی۔ لیکن جہاں وہ دنیاوی ترقی میں آگے بڑھے، وہیں سماجی زندگی میں بُری طرح ناکام ہو گئے۔ کسی ملک میں 70 فیصد طلاق کی شرح ہے، تو کسی میں 80 فیصد۔ مرد و عورت کا بے پردہ اختلاط، چند روزہ تعلقات، اور پھر وقتی ''کونٹریکٹ

نکاح'' ان کے معاشرے کی حقیقت بن گئے۔ جب یورپ کی عورتوں نے یہ بے حیائیاں اور خاندانی بکھراؤ دیکھا، اور پھر اللہ تعالیٰ نے وہاں مسلمانوں کو پہنچایا، تو ان عورتوں نے بسوں اور ٹرینوں میں مسلمان خواتین کو برقع وحجاب میں دیکھا۔ ان کی نظریں فوراً چرچ میں حضرت مریمؑ کی تصاویر اور مسلم عورتوں کے پردہ دار حلیے میں مماثلت تلاش کرنے لگیں۔ یہی مماثلت ان کے لیے اسلام کی طرف آنے کا ذریعہ بن گئی۔ یورپ میں جتنی عورتیں ایمان لائیں، ان میں بڑی تعداد صرف پردے کے سبب اسلام میں داخل ہوئی۔ انگلینڈ کی ایک صحافی [Journalist] خاتون افغانستان گئیں۔ وہاں کے لوگوں نے انہیں چھوڑ دیا، مگر یہ شرط رکھی کہ گھر جا کر قرآن کا مطالعہ کرنا۔ وہ وعدہ کر کے واپس گئیں اور وہ لوگ وعدہ نبھانے میں بہت اصول پسند ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن پڑھتے پڑھتے اسلام قبول کر لیا۔ ہمارا حال یہ ہے کہ ہم نے اپنے اعمال سے ایسا تاثر پیدا کیا ہے کہ بعض غیر مسلم سمجھتے ہیں وعدہ توڑنا، قرض لے کر ادا نہ کرنا مسلمانوں کا وصف ہے؛ حالانکہ اللہ پاک نے صاف حکم دیا ہے: ''وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ'' جو وعدہ کرو، اسے پورا کرو۔

غزوۂ بدر میں وفائے عہد کی روشن مثال:

بدر کے میدان میں مسلمانوں کی تعداد نہایت کم تھی، ایک ایک آدمی قیمتی اور ضرورت سے بڑھ کر اہم تھا۔ ایسے وقت میں ایک صحابیؓ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ راستے میں مشرکین نے مجھے پکڑ لیا تھا اور اس شرط پر چھوڑا کہ میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ہو کر ان کے خلاف جنگ میں شریک نہیں ہوں گا۔ جب یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے رکھی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں غزوۂ بدر میں شریک ہونے سے روک دیا اور فرمایا: تمہارا ان سے معاہدہ ہو چکا ہے، اس معاہدہ پر ہم ضرور عمل کریں گے۔ (مسلم: کتاب الجهاد و السیر، باب الوفاء بالعهد) یہ فیصلہ اس وقت کیا گیا جبکہ ایک ایک آدمی کی ضرورت تھی، لیکن وعدہ کی وفا ایمان کا تقاضا ہے۔

دوستو اور بزرگو! لوگ دین کو زیادہ تر مسلمانوں کے اعمال اور رویوں سے پہچانتے ہیں، کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، اسے پڑھنے کا موقع اور فرصت بہت کم لوگوں کو ملتی ہے؛ اس لیے

ہمارے سماجی معاملات، ہمارے اخلاق، اور ہماری روزمرہ زندگی کے مسائل کو دیکھ کر ہی غیر لوگ یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ مسلمان کون ہے اور اسلام کی اصل تعلیمات کیا ہیں۔

قرآنی پردہ؛ برکتوں کا سبب، فتنوں سے حفاظت:

دوستو اور بزرگو! ہمارے دلوں میں یہ اطمینان ہونا چاہیے کہ پردے کا حکم کتاب اللہ کی واضح آیات اور تقریباً ستر احادیثِ مبارکہ سے ثابت ہے۔ ان آیات کا جو پس منظر (Background) ذکر کیا جاتا ہے، یہ ضروری نہیں کہ صرف اسی واقعے سے اس کا تعلق ہو، آیات تو قیامت تک کے لیے نازل ہوئی ہیں۔ محمد عارف خان، جو کیرالہ کے گورنر ہیں اور تعلیم یافتہ بھی ہیں، انہوں نے کتاب اللہ کی آیات کی جو تشریح پیش کی، وہ درست تفسیر نہیں ہے۔ قرآنِ کریم کی صحیح تفسیر وہی ہے جو صحابۂ کرام، تابعین اور ائمۂ مجتہدین سے منقول ہو۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اپنے گھروں میں اپنی عورتوں کو اللہ کا حکم سمجھا کر، اور خود سمجھ کر اس پر عمل کروانے کی توفیق عطا فرمائے۔ اس میں برکتیں آتی ہیں اور بے پردگی کی وجہ سے آنے والی بے برکتیاں دور ہوجاتی ہیں، بے پردگی نے آج طلاق کی شرح میں بھی اضافہ کردیا ہے۔ یورپ میں کی جانے والی تحقیقات (Research) سے بھی یہی بات سامنے آئی ہے کہ بے پردگی ہی طلاق کے بڑھنے کا ایک بڑا سبب ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح جھگڑے بڑھ رہے ہیں۔ آج کل موبائل کا فتنہ بھی ہماری قوم کی بچیوں اور بچوں کے لیے بڑے مسائل پیدا کررہا ہے، لہٰذا ہمیں اپنے گھروں میں ان کی حفاظت کرنی ہے۔ جیسے حضرت شعیب علیہ السلام نے بیٹیوں سے جلدی آنے کی وجہ پوچھی تھی، ویسے ہی ہمیں بھی ہمت کرنی چاہیے کہ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں سے دیر سے گھر آنے بلکہ معمول سے جلدی آنے کی وجہ بھی دریافت کریں کہ کہاں گئے تھے اور کیا کررہے تھے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو کہی سنی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق دے، اور ہمارے ذریعے لوگوں تک قرآنِ کریم کی صحیح تعلیم پہنچانے کا انتظام فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۹)

مصائب وآلام میں رجوع الی اللہ تعالیٰ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝۲۲ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ط وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝۲۳ (حدید: ۲۲، ۲۳)

وقال تعالی: وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝۲۱ (حجر: ۲۱)

وقال تعالی: قَالَ لَا عَاصِمَ الْیَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ج وَحَالَ بَیْنَھُمَا الْمَوْجُ فَکَانَ مِنَ الْمُغْرَقِیْنَ ۝۴۳ (ہود: ۴۳)

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبي الکریم ونحن علی ذلك لمن الشاھدین والشاکرین والحمدللہ رب العالمین...

زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ایمان کا امتحان:

محترم ومکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی وہ آیات جو ابھی آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی گئی ہیں، ہمارے موجودہ حالات سے نہایت گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ آج ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ بارش کے مسلسل برسنے کی وجہ سے کتنے ہی مکانات منہدم ہو گئے، کتنے ہی انسان اور کتنا ہی سامان برباد ہو گیا۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ

حقیقت سمجھائی ہے کہ اس نظامِ کائنات میں ہمیں کس طرح اللہ کی مرضیات پر چلنا ہے۔ اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں ارشاد فرماتے ہیں: ’’ مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فِی الۡاَرۡضِ وَلَا فِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ‘‘ نہ کوئی مصیبت زمین میں آتی ہے اور نہ تمہاری جانوں میں، مگر یہ کہ سب کچھ ایک رجسٹر میں لکھا ہوا ہے، قبل اس کے کہ ہم ان کو پیدا کریں۔ ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’ وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ کَثِیۡرٍ ﴿۳۰﴾ ‘‘ (شوریٰ: ۳۰) جو مصیبت تم پر آتی ہے، وہ تمہارے اپنے ہاتھوں کے اعمال کا نتیجہ ہے، اور اللہ تعالیٰ بہت سے گناہوں کو معاف فرما دیتے ہیں۔ اسی طرح چودھویں پارے میں بھی ارشاد فرمایا کہ انسانوں پر آنے والی مصیبتیں ان ہی کے کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

محترم حضرات! میں نے جو آیت آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ تعالیٰ نے دو اہم پہلوؤں کو واضح فرمایا۔ پہلی بات یہ کہ: ’’ وَمَآ اَصَابَکُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَۃٍ فَبِمَا کَسَبَتۡ اَیۡدِیۡکُمۡ ‘‘ دوسری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: تمہارے ساتھ جو کچھ پیش آتا ہے، وہ سب پہلے سے لوحِ محفوظ میں لکھا جا چکا ہے، تمہاری پیدائش سے بھی پہلے۔ چاہے وہ خوشی کے لمحات ہوں یا آزمائش کے حالات، سب کچھ پہلے ہی سے طے ہے۔ ’’ اِلَّا فِیۡ کِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَہَا ؕ ‘‘ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے نصیحت فرمائی کہ اگر آسانی اور خوش حالی نصیب ہو تو شکر ادا کرو، اور اگر مشکلات و پریشانیاں آئیں تو صبر اختیار کرو۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: ’’ لِّکَیۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰی مَا فَاتَکُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَآ اٰتٰىکُمۡ ‘‘ جو چیز تم سے چھن جائے اس پر غم نہ کرو، اور جو نعمت مل جائے اس پر غرور اور فخر نہ کرو۔ آخر میں اللہ تعالیٰ نے اصول بیان کر دیا: ’ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ ﴿۲۳﴾ ‘‘ (حدید: ۲۳) اللہ تعالیٰ کسی تکبر کرنے والے اور شیخی بگھارنے والے کو پسند نہیں فرماتے۔

راحت اور آزمائش میں بندے کا رویہ:

دوستو اور بزرگو! ان آیات میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے اصول اور ضابطے بیان فرمائے ہیں کہ جب اللہ کی طرف سے انسان پر حالات آتے ہیں تو دو صورتوں میں انسان اکثر

اپنے رب کو بھول جاتا ہے، آخرت کی زندگی کو نظر انداز کر دیتا ہے، اور مرنے کے بعد کے حساب وکتاب کا خیال نہیں کرتا۔ پہلی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں اتنی کثرت اور بڑی مقدار میں عطا فرماتا ہے کہ بندہ ان نعمتوں پر شکر ادا کرنے کے بجائے یہ گمان کرنے لگتا ہے: ''اِنَّمَآ اُوْتِیْتُهٗ عَلٰی عِلْمٍ عِنْدِیْ ؕ'' (قصص:۷۸) یہ مال تو مجھے میری اپنی دانش مندی اور صلاحیت کی بنیاد پر ملا ہے۔ یہ سوچ اسے تکبر اور فخر میں مبتلا کر دیتی ہے، اور مال کی فراوانی کے نشے میں وہ اللہ کو بھول جاتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ پاک نے ذکر فرمایا کہ جب انسان پر کوئی مصیبت اور تکلیف آتی ہے تو اس موقع پر بھی وہ اللہ پاک کو بھول جاتا ہے؛ چنانچہ جب بہت زیادہ راحتیں اور نعمتیں ملتی ہیں، تو بجائے شکر گزاری کے ناشکری اور نافرمانی والے اعمال کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح جب اللہ پاک کی طرف سے آزمائش اور حالات آتے ہیں، تو بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے، غم اور تکلیف میں گھبرا کر ایسے جملے زبان سے نکالتا ہے جو اللہ کی ذات عالی کے مناسب نہیں ہوتے۔

آزمائش عارضی ہے، صبر پر دائمی اجر:

پورے صوبے میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان اور آس پاس کے ممالک میں بھی مسلسل بارشیں ہو رہی ہیں، لوگوں کی دکانیں، مکانات، کھیتیاں، باغات اور سامان تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں یہ پیغام دیا کہ آنے والی مصیبت کو یہ نہ سمجھو کہ یہ ہمیشہ رہنے والی ہے یا یہ کہ جو تکلیف آئی ہے، وہ آخرت میں بھی ساتھ رہے گی۔ نہیں! اس مصیبت کا تعلق صرف دنیاوی زندگی سے ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے آزمائشیں آتی رہتی ہیں، اور انہی آزمائشوں کے بارے میں فرمایا: ''لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ'' جو کچھ تمہیں نقصان پہنچا، اس پر حد سے زیادہ افسوس نہ کرو۔ غم ہونا فطری بات ہے، لیکن ایسے کلمات زبان سے نہ نکالو جو ناشکری یا اللہ کی ناراضگی کا سبب بنیں۔ ایمان اور یقین کی روشنی کو بجھانے والے جملے اور اللہ تعالیٰ کی شانِ اقدس کے خلاف بات کرنا مومن کے شایانِ

شان نہیں۔یہی سبق اس آیتِ مبارکہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔

ہر چیز کا خزانہ اللہ کے پاس ہے:

دوستو اور بزرگو! ایک اور آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫'' دنیا کی جتنی بھی چیزیں ہیں، ان سب کے خزانے ہمارے پاس ہیں۔''وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾'' (حجر:۲۱) اور ہم جو کچھ بھی نازل کرتے ہیں، وہ ایک مقررہ اندازے کے مطابق ہوتا ہے۔ چاہے راحت وآرام کے وسائل ہوں، بارش ہو یا قحط سالی، پانی کا کم یا زیادہ ہونا، رزق کی فراوانی ہو یا کمی، یہ سب اللہ کے حساب اور علم کے تحت ہے؛ اس لیے جب بارش یا کسی اور قدرتی سبب سے مکانوں اور دکانوں کا نقصان ہو، تو یہ نہ سمجھو نعوذ باللہ کہ بادل یا بارش اپنی ذات میں کوئی طاقت رکھتے ہیں۔نہیں! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ہر چیز کا ہمارے پاس اندازہ ہے۔جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا: ''وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا یَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِیْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِیْ كِتٰبٍ مُّبِیْنٍ ﴿۵۹﴾'' (انعام:۵۹) خشکی اور سمندر میں جو کچھ ہے، وہ سب جانتا ہے۔کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے، اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جو اس کے علم سے باہر ہو۔خشک ہو یا تر، ہر چیز ایک کھلی کتاب میں درج ہے۔یہ آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ ہر چیز کا اصل مالک اور خالق اللہ پاک ہے۔جو کچھ ہمیں ملا ہے، وہ اسی کے خزانے سے ملا ہے۔اصل بات یہ ہے کہ انسان اللہ پاک کی دی ہوئی چیزوں کو کس طریقے سے استعمال کرتا ہے، اور اللہ پاک کی دی ہوئی نعمتوں میں کس طرح اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گزارتا ہے۔

ساڑھے نوسو سال کی محنت اور قوم کا انکار:

ایک اور آیت میں نے آپ حضرات کے سامنے پڑھی جس میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ پیش کیا گیا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ نے انہیں اپنی طرف سے نبی بنا کر بھیجا، اور آپ نے ساڑھے نوسو سال تک اپنی قوم کو اللہ کے دین کی دعوت دی۔جیسا کہ قرآن میں ہے: ''وَلَقَدْ

اَرۡسَلۡنَا نُوۡحًا اِلٰی قَوۡمِہٖ فَلَبِثَ فِیۡہِمۡ اَلۡفَ سَنَۃٍ اِلَّا خَمۡسِیۡنَ عَامًا ؕ ''(عنکبوت:۱۴) آپ ایک نسل کے بعد دوسری نسل کو دعوت دیتے رہے، لیکن بعد والے لوگ ہدایت سے اور دور ہوتے گئے، جیسا کہ فرمایا: ''وَلَا یَزِیۡدُ الظّٰلِمِیۡنَ اِلَّا خَسَارًا ﴿۸۲﴾ ''(اسراء:۸۲) یہ ظالم ہلاکت اور خسارے ہی میں بڑھتے گئے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوا: ''لَنۡ یُّؤۡمِنَ مِنۡ قَوۡمِکَ ''(ھود:۳۶) اب آپ کی قوم میں سے کوئی ایمان نہیں لائے گا۔ چنانچہ اللہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا: ''وَاصۡنَعِ الۡفُلۡکَ بِاَعۡیُنِنَا وَوَحۡیِنَا ''(ھود:۳۷) ہماری نگرانی اور وحی کے مطابق کشتی بنائیے۔ جب آپ خشکی پر کشتی بنا رہے تھے، تو نافرمان لوگ آپ کا مذاق اڑاتے اور کہتے: خشکی میں کشتی کیسے چلے گی؟ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنۡ تَسۡخَرُوۡا مِنَّا فَاِنَّا نَسۡخَرُ مِنۡکُمۡ کَمَا تَسۡخَرُوۡنَ ﴿۳۸﴾ ''(ھود:۳۸) آج تم ہمارا مذاق اڑاتے ہو، لیکن کل جب اللہ کی طرف سے پانی کا عذاب آئے گا، اس وقت تمہارا حال کیا ہوگا؟

اختیار اللہ کا، انحصار بندے کا:

قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ نافرمان اور کافر سب جہنم میں جائیں گے، وہاں وہ جہنم کے داروغہ (دربان) سے کہیں گے: ہمارے لیے عذاب کو ذرا ہلکا کر دو۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ایک ہزار سال تک انہیں کوئی جواب نہیں ملے گا۔ جب وہ بار بار درخواست کریں گے تو فرشتہ پوچھے گا: ''اَوَلَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ ؕ ''کیا تمہارے پاس تمہارے ہی درمیان سے اللہ کے رسول نہیں آئے تھے؟ وہ کہیں گے: آئے تھے، لیکن ہم نے نہیں سنی۔ تب فرشتے کہیں گے: آج تم اسی حال میں رہو گے۔ (ترمذی: ابواب صفة جهنم عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی صفة طعام اهل النار) اللہ تعالیٰ نے جب حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی بنانے کا حکم دیا اور وہ مکمل ہوگئی، تو عذابِ الٰہی کے آنے کا وقت آ پہنچا۔ اللہ نے فرمایا: ''وَفَارَ التَّنُّوۡرُ ۙ ''(ھود:۴۰) جب وہ چولہا، جس میں آگ جلائی جاتی ہے اور کھانا پکایا جاتا ہے، اس میں سے پانی نکلنے لگے، تو یہ عذاب کے آنے کی نشانی ہے۔ جب یہ

نشانی ظاہر ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے فرمایا: ''وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۴۱﴾ '' (ھود:۴۱) اس کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ ہی کے نام سے اس کا چلنا ہے اور اسی کے نام سے اس کا ٹھہرنا ہے، بے شک میرا رب بڑا بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔ یہ آیت ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ جب بھی ہم اپنی کسی سواری پر سوار ہوں، چاہے وہ کشتی ہو، اسکوٹر، گاڑی، ٹرین یا ہوائی جہاز، ہمیں یہ دعا پڑھنی چاہیے: ''بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ '' یہ دعا ہمیں یاد دلاتی ہے کہ چلنا اور رکنا، بارش کا کم یا زیادہ ہونا، اور قدرت کے تمام فیصلے ہمارے اختیار میں نہیں، بلکہ صرف اور صرف اللہ کے حکم سے ہیں۔

زندگی میں بہت سے ایسے مواقع آتے ہیں جہاں سائنس کی ترقی اور جدید ٹیکنالوجی اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے بے بس ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر احمد آباد شہر، جسے ''اسمارٹ سٹی'' کہہ کر دنیا میں سراہا گیا، محض چند دن کی بارش میں اس کا سارا انظام درہم برہم ہو گیا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا '' جو کچھ بھی کائنات میں چل رہا ہے، وہ میری اور آپ کی طاقت سے نہیں چلتا اور جو چیز چل پڑتی ہے، اس کو قائم رکھنا بھی صرف اسی کی قدرت سے ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد نعوذ باللہ اسے یوں ہی چھوڑ نہیں دیا، جیسا کہ یہودیوں کا گمان ہے کہ اللہ نے ہفتے کے دن آرام کیا؛ بلکہ اللہ پاک نے خود فرمایا: ''لَا يَمَسُّنَا فِيْهَا نَصَبٌ وَّلَا يَمَسُّنَا فِيْهَا لُغُوْبٌ ﴿۳۵﴾ '' (زمر:۳۵) ہمیں نہ کبھی کوئی تھکن چھوتی ہے اور نہ کبھی کوئی کلفت ہم پر گزرتی ہے۔ یہ آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ کائنات کا ہر نظام، بارش سے لے کر زندگی کے ہر پہلو تک، اللہ کی قدرت سے چل رہا ہے، اور وہی ہمیشہ اس کو قائم رکھتا ہے۔

اللہ کا حکم آئے تو کوئی پناہ گاہ کام نہیں آتی:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآنِ مجید کے بارہویں پارے میں حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا اور کشتی میں سوار ہوتے وقت کی دعا بھی سکھائی، تاکہ یہ سبق ملے کہ سب کچھ صرف اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جب پانی کا طوفان قریب تھا، تو قرآن بیان کرتا ہے:

''وَنَادٰی نُوۡحُ ابۡنَهٗ وَكَانَ فِیۡ مَعۡزِلٍ یّٰبُنَیَّ ارۡكَبۡ مَّعَنَا '' حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے ایک بیٹے کو، جو ایمان نہیں لایا تھا، پکارا اور کہا: بیٹا! ایمان لے آ اور ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جا؛ لیکن اس نے جواب دیا: ''سَاٰوِیۡۤ اِلٰی جَبَلٍ یَّعۡصِمُنِیۡ مِنَ الۡمَآءِ ؕ '' (ھود:۴۳) میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا، وہ مجھے پانی سے بچالے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اسے حقیقت یاد دلائی: ''لَا عَاصِمَ الۡیَوۡمَ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنۡ رَّحِمَ ۚ '' آج کے دن اللہ کے حکم سے کوئی بھی بچانے والا نہیں، سوائے اس کے جس پر اللہ رحم کرے۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ اللہ کی پکڑ سے نہ کوئی طاقت، نہ پہاڑ، نہ ٹیکنالوجی اور نہ کوئی منصوبہ بچا سکتا ہے۔ نجات صرف ایمان اور اللہ کی رحمت میں ہے۔

مومن کی تکلیف؛ مغفرت کا ذریعہ:

دوستو اور بزرگو! یہ معاملہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں بھی پیش آیا، آج بھی ہو رہا ہے، اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔ یہ نظامِ خداوندی ہے، اللہ تعالیٰ کا قانون اور فیصلہ ہے کہ جب کسی چیز کا ارادہ فرماتا ہے، تو جیسا کہ قرآن میں ہے: ''اِنَّمَاۤ اَمۡرُهٗۤ اِذَاۤ اَرَادَ شَیۡـًٔا اَنۡ یَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَیَكُوۡنُ ﴿۸۲﴾ '' (یس:۸۲) بس وہ کہتا ہے ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتی ہے۔ دنیا میں اسباب محض ظاہری علامت ہیں، اصل اثر اللہ کے حکم میں ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں مومن کو یہ خوشخبری دی گئی: ''مَا یُصِیبُ الْمُسْلِمَ مِنْ نَصَبٍ وَلَا وَصَبٍ وَلَا هَمٍّ وَلَا حَزَنٍ وَلَا أَذًى وَلَا غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةُ یُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللهُ بِهَا مِنْ خَطَایَاه'' (بخاری: کتاب المرضی، باب ماجاء فی کفارۃ المرض) مومن کو جو بھی تکلیف، بیماری، غم یا پریشانی پہنچتی ہے، یہاں تک کہ اگر کانٹا بھی چبھ جائے، تو اللہ پاک اس کے ذریعے اس کے گناہ معاف فرما دیتا ہے، اسی لیے سمجھنا چاہیے کہ دنیا میں اللہ کی طرف سے آنے والے حالات چاہے وہ مالی نقصان ہو یا جانی، دراصل بندے کو جھنجھوڑنے اور اس کو اپنے رب کی طرف پلٹانے کا ذریعہ ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَاۤ اِلٰۤی اُمَمٍ مِّنۡ قَبۡلِكَ فَاَخَذۡنٰهُمۡ بِالۡبَاۡسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمۡ یَتَضَرَّعُوۡنَ ﴿۴۲﴾ '' (انعام:۴۲) ہم نے آپ سے پہلے کئی امتوں کی طرف نبی بھیجے، پھر ہم

نے ان کو سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا، تا کہ وہ عاجزی کے ساتھ ہماری طرف رجوع کریں۔ مگر جب اُن پر ہماری طرف سے عذاب آیا تو اُن کے دل نرم نہ ہوئے، نہ ہی وہ گریہ وزاری میں مشغول ہوئے، بلکہ اُن کے دل اور زیادہ سخت ہو گئے۔ پھر ہم نے انہیں اپنی نعمتوں سے آزمایا تا کہ وہ شکر گزار بنیں، مگر جب وہ غفلت میں ڈوبے رہے تو ہم نے اچانک اپنی پکڑ میں لے لیا۔ دوستو! جب آسمان سے رحمت کی بارش برستی ہے، زمین اپنی نعمتیں اُگلتی ہے، تو انسان کی آنکھوں کو بھی چاہئے کہ اللہ پاک کے خوف اور اس کی محبت میں برسیں، جب آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں تو دل نرم ہو جاتا ہے، اور جب دل نرم ہو جائے تو گناہوں کی معافی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

مصیبت کا حل؛ توبہ ورجوع الی اللہ:

دوستو اور بزرگو! اسپین کے ایک بادشاہ کے دور میں قحط سالی آ گئی، اس زمانے میں یہ خطہ مسلمانوں (بنواُمیہ) کے قبضے میں تھا، بارش نہ ہونے پر بادشاہ نے ایک بزرگ مجذوب کے پاس قاصد بھیجا کہ وہ دعا کریں تا کہ بارش ہو جائے۔ مجذوب نے قاصد سے پوچھا: بادشاہ نے تمہیں میرے پاس بھیجا؛ اس وقت بادشاہ کی کیفیت اور حالت کیا تھی؟ قاصد نے کہا: بادشاہ نے سادہ لباس پہن رکھا ہے اور اللہ کے حضور رو رہا ہے، یہ سن کر بزرگ نے کہا: بادشاہ کو جا کر بتا دو کہ جب زمین کا بادشاہ روتا ہے تو آسمان کا بادشاہ بارش نازل کرتا ہے۔ چنانچہ اللہ نے بارش بھیجی اور قحط ختم ہو گیا۔ یہ ہے اللہ پاک کی سنت وہ اپنے بندے کی ندامت، عاجزی اور گریہ وزاری کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو پیدا کیا اور پانی کو انسانیت کی زندگی کا دارو مدار بنایا: ''وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ ط '' (انبیاء:۳۰) سائنس دان تسلیم کرتے ہیں کہ زمین کے سوا کسی اور سیارے پر پانی نہیں ملا، اور پانی ہی زندگی کی بنیاد ہے۔ ایک مومن کے لیے تو یہ وضو، غسل اور عبادات کا ذریعہ بھی ہے، اسی لیے بڑے بڑے شہر ہمیشہ دریا اور ندیوں کے کنارے آباد ہوئے تا کہ پانی کی ضروریات پوری ہو سکیں۔

اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَتَرَى الْاَرْضَ هَامِدَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ

وَرَبَتْ وَاَنْۢبَتَتْ مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ ۝ ''(حج:۵) جب زمین خشک ہوتو ہم آسمان سے بارش برساتے ہیں اور وہ لہلہا اٹھتی ہے۔قرآن کی مکی سورتوں میں بارش کا ذکر بار بار آتا ہے اور فوراً آخرت کی زندگی کی مثال دی جاتی ہے کہ جیسے مردہ زمین بارش سے زندہ ہوتی ہے، ویسے ہی مردہ انسان قیامت کے دن زندہ ہوں گے۔

نیپال کے ایک مولانا سے میری اکثر بات چیت ہوتی رہتی ہے۔ایک دن میں نے پوچھا: آپ کے یہاں بارش کا کیا حال ہے؟ کہنے لگے: ہمارے ہاں بالکل بارش نہیں ہورہی، پہلے ہوچکی تھی، مگر اب زمین میں دراڑیں پڑ چکی ہیں، اور دھان کی کھیتی کے لیے بارش کی سخت ضرورت ہے۔ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان یاد آتا ہے: ''مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ''(شوریٰ:۲۸) یعنی جب بندے مایوس ہوجاتے ہیں، تو اللہ اپنی رحمت پھیلا دیتا ہے۔

حضرت عمرؓ کے دور میں بھی قحط سالی آئی۔لوگوں نے شکایت کی تو آپ نے فرمایا: اب بارش ضرور ہوگی، کیونکہ جب انسان دنیا کے سارے اسباب اور ٹیکنالوجی سے مایوس ہوجاتا ہے تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے: وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآىِٕمًا ''(یونس:۱۲)۔پانی کا نازل ہونا، اس کی مقدار اور وقت سب اللہ کے اختیار میں ہے: ''وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآىِٕنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ ''(حجر:۲۱) اس کے نظام میں کوئی کمی بیشی یا بدانتظامی نہیں۔

حضرت نوحؑ کے واقعے میں بھی یہی سبق ہے۔آپ نے اپنے بیٹے سے کہا: ''لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ ''(ھود:۴۳) آج اللہ کے حکم سے کوئی نہیں بچا سکتا، سوائے وہ جس پر اللہ رحم کرے۔'' اِلَّا مَنْ رَّحِمَ '' مگر بیٹے نے پہاڑ کا سہارا لیا اور غرق ہوگیا۔بڑے بڑے پہاڑ ڈوب گئے، مگر نوح علیہ السلام کی کشتی اللہ کے حکم سے پانی پر سکون سے تیرتی رہی۔ساڑھے نو سو سال کی دعوت کے بعد جب قوم نے ایمان قبول نہ کیا تو اللہ کا فیصلہ آ گیا: ''وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ''اے زمین! اپنا پانی نگل لے،

اور اے آسمان! رک جا۔ پانی اتر گیا،'' وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ﴿۴۴﴾ ''(ھود:۴۴) کشتی جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی اور اعلان ہوا: ہلاکت ہے ظالم قوم کے لیے۔

بہر حال، حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے بار بار یہی فرماتے رہے:'' فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا﴿۱۰﴾ (نوح:۱۰) اپنے رب سے استغفار کرو، بے شک وہ بڑا بخشنے والا ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ جب بارش نہ ہو اور قحط کی صورت پیدا ہو جائے، اس وقت بھی استغفار کرنا ہے اور جب بارش زیادہ ہو جائے اور نقصان کا اندیشہ پیدا ہو جائے، اس موقع پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف توبہ و استغفار کے ساتھ رجوع کرنا ہے۔ کیونکہ ہر حال میں، چاہے کمی ہو یا زیادتی، اصل سہارا اللہ ہی کا ہے۔

گناہ جہاں بھی ہوں، پکڑ یقینی ہے:

دوستو اور بزرگو! اللہ پاک نے آسمان سے مسلسل پانی برسایا، یہاں تک کہ جب اس کا فیصلہ ہوا تو زمین نے اپنا پانی نگل لیا اور آسمان سے بارش رک گئی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے جودی پہاڑ- جو آذربائیجان اور ترکی کے سرحدی علاقے میں ہے- پر کشتی کو ٹھہرا دیا۔ یہ کشتی پوری زمین کا چکر لگا چکی تھی، مگر اللہ کے حکم سے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا۔ اس کشتی میں اللہ پاک نے انسانوں اور جانوروں سمیت ہر ضروری مخلوق کو محفوظ رکھا۔ یہ واقعہ اللہ پاک نے قرآن کریم کی ایک سورت میں بیان کر کے نہ صرف مسلمانوں کو بلکہ پوری انسانیت کو یہ سبق دیا کہ جب اللہ پاک ناراض ہوتے ہیں تو حالات بدل جاتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں فرمایا:'' ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ ''(روم:۴۱) انسانوں کے گناہوں کے سبب سے خشکی اور سمندر میں فساد پھیل گیا۔ آج صورتِ حال یہ ہے کہ نہ صرف زمین بلکہ سمندروں میں بھی گناہ عام ہو گئے ہیں، اور حد تو یہ ہے کہ فضاؤں میں اُڑتے جہازوں میں بھی گناہ ہونے لگے ہیں۔ جب ایسی نافرمانیاں آسمان تک پہنچ جائیں تو اللہ کی طرف سے آزمائشیں اور عذاب کے حالات آتے ہیں۔

اللہ پاک نے دنیا کے نظام میں یہ اصول رکھا ہے کہ بعض چیزوں میں بظاہر فائدہ ہوتا

ہے اور بعض میں بظاہر نقصان نظر آتا ہے، لیکن حقیقت میں ان ہی نقصان دکھائی دینے والی چیزوں میں اللہ تعالیٰ نے خیر اور بھلائی چھپا رکھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''فَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّيَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ﴿۱۹﴾'' (نساء:۱۹) ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ اسی میں تمہارے لیے بہت بھلائی رکھ دے۔ بندۂ مومن کا کام یہ ہے کہ ہر حال میں اللہ کے فیصلے پر راضی رہے، کیونکہ ہمارے علم کی حد محدود ہے اور اللہ پاک کی حکمت لامحدود۔

عاجزی، معافی اور اللہ کی حفاظت:

دوستو اور بزرگو! جو کچھ بارش برس رہی ہے یا ملک میں جو حالات پیش آرہے ہیں، یہ سب اللہ پاک کی طرف سے ہمیں اپنی طرف متوجہ کرنے کا پیغام ہے۔ انسان جب سرکشی اور تکبر میں مبتلا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ'' (انعام:۴۲) تاکہ وہ عاجزی کریں اور اللہ کے حضور آہ وزاری کریں؛ لیکن اگر انسان گناہوں کی معافی کے لیے اللہ پاک کی طرف رجوع نہ کرے، تو پھر قرآن کہتا ہے: ''فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾'' (انعام:۴۵) ظلم کرنے والی قوم کی جڑ کاٹ دی گئی اور تمام تعریف اللہ رب العالمین کے لیے ہے۔ نوح علیہ السلام کی قوم کے ساتھ جو کچھ ہوا، قرآن ان واقعات کے ذریعے ہمیں عبرت اور نصیحت کی طرف بلاتا ہے۔ ہمیں اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے، اس لیے کہ ہم کمزور اور عاجز ہیں، اور ہماری ساری مشینری اور ظاہری اسباب، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ جب بندہ عاجزی کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے خیر و عافیت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کہی اور سنی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، بارش کو ہمارے لیے رحمت، امن اور عافیت کا ذریعہ بنائے، اور ہماری دکانوں، مکانوں اور بچوں کی حفاظت فرمائے۔ ''فَاللّٰهُ خَيْرٌ حَافِظًا'' بیشک اللہ ہی بہترین محافظ ہے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱۰)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان عظیم دین اور علم و عقل کا رشتہ

الحمد لله رب العالمين و الصلوة و السلام على رسوله الكريم و على آله و أصحابه أجمعين.

قالَ اللهُ تَبَارَكَ وتَعَالٰى فِي الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ و الْفُرْقَانِ الْحَمِيْدِ.

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝۱ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳ الَّذِيْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝۵ (علق:۱-۵)

وقال تعالى: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۝۴۸ (عنکبوت:۴۸)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين...

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! گزشتہ جمعہ کو ہم نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُن عظیم احسانات کا ذکر کیا تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوری دنیا کو عطا فرمائے، اور آپ کی وہ خصوصیات بیان کی تھیں جنہوں نے قیامت تک کی پوری انسانیت کی رہنمائی اور اصلاح میں عظیم کردار ادا کیا۔ ان ہی میں سے ایک اہم بات یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین اور دنیا کو آپس میں جوڑ دیا ایسا نہیں کہ دین دار شخص دنیا سے کنارہ کش ہو، یا دنیا کمانے والا دین سے غافل ہو؛ بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتا دیا کہ ایک شخص دین دار ہوتے ہوئے بھی دنیا کما سکتا

ہے، اور دنیا کمانے والا بھی دین دار رہ سکتا ہے۔

علم وفہم سے جڑا ہوا دین:

یہ تصور جب آپ ﷺ نے پیش فرمایا اور آج کی دنیا میں جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ہر زمانے میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کی اُس وقت بڑی اہمیت ہوتی ہے اور بعد کے ادوار میں ان کی جگہ دوسری چیزیں لے لیتی ہیں، لیکن جناب نبی اکرم ﷺ کو اللہ پاک نے جو نعمتیں عطا فرمائیں اور آپ ﷺ کے وسیلے سے دنیائے انسانیت پر اللہ کی رحمت کا جو ظہور ہوا، وہ ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔ انہی نعمتوں میں سے ایک کا ذکر میں نے آپ حضرات کے سامنے ان آیات میں کیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے بطورِ احسان بیان فرمایا۔ آپ ﷺ جو دین لے کر آئے، اس کا تعلق علم، دنیاوی وسائل، عقل وشعور، فہم و فراست اور حکمت و دانائی سے کس قدر ہے اس کو سمجھنے کے لیے ہم دیکھتے ہیں کہ آپ ﷺ پر سب سے پہلی وحی جو نازل ہوئی، وہ کلامِ پاک کی وہی آیات ہیں جن کی میں نے ابھی تلاوت کی، اور جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی پر پہلی بار اُتریں۔

انسانیت سے دوبارہ آسمانی ربط:

سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کو تقریباً ۵۷۰ سال گزر چکے تھے، اور اس کے بعد حضور اقدس ﷺ کی ولادت ہوئی، یعنی تقریباً ۶۰۰ سال بعد۔ گویا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد یہ پہلی وحی تھی جو براہِ راست انسانیت کے نام آئی۔ اس مدت میں کوئی اور رسول یا نبی دنیا میں مبعوث نہیں ہوا۔ پچھلی شریعتوں کے پیروکار یہود و نصاریٰ اپنی کتابوں کے تابع زندگی گزار رہے تھے۔ مگر جب جنابِ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے تو یہ طویل خلا پُر ہوا اور انسانیت کا تعلق دوبارہ ایک نبی کے واسطے سے اللہ تعالیٰ سے قائم ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کے بارے میں فرمایا: ''اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ '' (اعراف: ۱۵۷) وہ نبی جنہیں اللہ تعالیٰ نے امی بنایا، کسی انسان کا شاگرد

نہیں بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا: وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۴۸﴾ (عنکبوت:۴۸) (اے نبی ﷺ!) ہماری آپ پر وحی نازل کرنے سے پہلے نہ آپ کسی کتاب کی تلاوت کرتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے کچھ لکھتے تھے، ورنہ باطل پرست لوگ شک میں پڑ جاتے۔ مزید فرمایا: ''وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ؕ '' (یس:۶۹) ہم نے نبی کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی یہ ان کے شایانِ شان ہے۔

جاہل قوم میں علم کا آغاز:

اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو امی ہی رکھا، یعنی آپ کو اس وقت کی تعلیمی سرگرمیوں سے الگ رکھا، اُس زمانے کے یہود بھی جانتے تھے کہ عربوں کے ہاں تعلیم کا کوئی عام رواج نہیں، آپ ﷺ نے جب اعلانِ نبوت فرمایا تو قریش جیسے بڑے قبیلے میں صرف سترہ آدمی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ باقی پورا معاشرہ دین و دنیا، تعلیم، کتاب اور قلم سے دور تھا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا ؕ '' (شوریٰ:۵۲) آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے اور ایمان کیا ہے، لیکن ہم نے اسے ایک نور بنایا، جس کے ذریعے ہم اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں۔ انبیاء کا سب سے بڑا شرف یہ ہے کہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرتے ہیں، کسی انسان کے شاگرد بن کر نہیں۔ اسی لیے اس آیت میں بھی فرمایا: ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ '' آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہے، اور ایمان کی تفصیلات آپ کو معلوم نہ تھیں۔ پھر اس قرآن کو نور بنا کر نازل کیا گیا، جس میں ایمان، معرفتِ الٰہی، صفاتِ باری تعالیٰ اور شرک سے بچنے کا ذکر ہے۔ یہ وحی تقریباً چھ سو سال بعد نازل ہو رہی تھی، اور سب سے پہلا کلمہ جو حضرت جبرئیلؑ نے آپ سے کہلوایا وہ تھا: ''اقرأ'' پڑھیے! یہ کس سے کہا جا رہا تھا؟ اس سے جس کے بارے میں اللہ خود فرماتا ہے: ''مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ '' آپ ﷺ نے خود بھی فرمایا: ''نحنُ أُمَّةٌ أُمِّيُون لا نَحسُبُ ولا نكتُبُ، الشهرُ هكذا وهكذا وهكذا،

وقبض إبهامَه في الثالثة. ‘‘(مسند احمد: رقم: ۶۰۴۱) ہم امی قوم ہیں، نہ حساب جانتے ہیں نہ لکھنا۔ اسی لیے چاند کے حساب میں آپ نے فرمایا کہ مہینہ کبھی ۲۹ دن کا ہوگا اور کبھی ۳۰ دن کا، اور تین مرتبہ ہاتھ سے اشارہ فرما کر یہ بات سمجھائی۔ یہ سب اس بات کی گواہی ہے کہ اس وقت جزیرۃ العرب، خاص طور پر قریش میں لکھنے پڑھنے کا کوئی عام رواج نہ تھا۔ ایسی قوم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی ﷺ کو مبعوث فرمایا، اور آپ کا لقب بھی ’’امی‘‘ رکھا۔ یہودی اس پر فخر کرتے کہ وہ ’’اہلِ کتاب‘‘ ہیں اور عرب ’’امی‘‘ ہیں، اور اسی حقارت سے کہتے: ’’لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ ۚ ‘‘(آل عمران: ۷۵) ان امیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں ہماری کوئی پکڑ نہیں ہوگی؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اسی امی قوم میں وہ نبی بھیجا جو ساری انسانیت کے لیے آخری نبی بن کر آیا، اور جس کی زبان مبارک سے سب سے پہلا وحی کا جملہ نکلا: ’’اقرأ‘‘ پڑھیے! آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ما أنا بقارئ‘‘ میں پڑھنے والا نہیں، اور یہ مکالمہ تین بار ہوا، پھر آپ پر سب سے پہلی وحی نازل ہوئی: اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِيْ خَلَقَ ۝ پڑھیے! اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔

براہِ راست ربانی علم:

دوستو اور بزرگو! یہ حقیقت بتاتی ہے کہ امتِ محمدیہ ﷺ ہی کے واسطے سے ساری انسانیت تک اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچ رہا ہے، اس عظیم پیغام کی ابتدا خود اللہ پاک نے ’’اقرأ‘‘ کے جملے سے فرمائی، اسی لیے علماء کرام کہتے ہیں کہ پہلے اس لفظ ’’اقرأ‘‘ کو سمجھو اور محسوس کرو، اور غور کرو کہ جسے پڑھنے کا حکم دیا جا رہا ہے، وہ خود پڑھنے پر قادر نہیں، یہی تو انبیائے کرام کا معجزہ ہے کہ وہ عام انسانوں سے علم حاصل نہیں کرتے بلکہ سیدھا براہِ راست اللہ تعالیٰ کی ذاتِ عالی سے علم پاتے ہیں۔ یہ کوئی کسبی یا محنت سے حاصل ہونے والا علم نہیں بلکہ خالص وحی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ’’وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ ‘‘(شوریٰ: ۵۱) کسی بشر کی یہ وسعت نہیں کہ وہ اللہ سے براہِ راست گفتگو کرے؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب ﷺ پر ۲۳ سال تک

مسلسل وحی نازل فرمائی، وحیِ متلو اور وحیِ غیر متلو۔ وحیِ متلو یعنی قرآنِ کریم، جس کی نماز میں تلاوت کی جاتی ہے، اور وحیِ غیر متلو یعنی آپ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ جس کی نماز میں تلاوت نہیں ہوتی۔ یہ دونوں مجموعے آپ ﷺ پر نازل ہوئے اور ان سب کا آغاز اللہ تعالیٰ نے ''اقرأ'' کے عظیم پیغام سے کروایا۔

غارِ حرا سے اٹھنے والی روشنی:

خیر! آپ ﷺ نے دین اور علم کے درمیان ایک مقدس اور دائمی رشتہ قائم فرمایا، آپ ﷺ نے یہ بتا دیا کہ دین اور علم الگ الگ چیزیں نہیں، بلکہ دونوں ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ آپ ﷺ نے علم کو وہ مقام عطا فرمایا جس پر مزید اضافہ ممکن نہیں۔ آپ نے امت کے دلوں میں علم کا ایسا شوق اور احترام پیدا کیا کہ اسلامی تاریخ میں ایک عظیم علمی و فکری انقلاب برپا ہو گیا۔ اسی شوقِ علم کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے دنیا میں وہ تصنیفی اور تعلیمی تحریک پیدا کی جس کی مثال کسی اور تہذیب میں نہیں ملتی۔

یہ حقیقت کسی دلیل کی محتاج نہیں کہ نبیِ کریم ﷺ کی بعثت میں علم کی بنیاد رکھی گئی۔ اس کی سب سے بڑی اور واضح دلیل وہ پہلی وحی ہے جو محمد مصطفیٰ ﷺ پر نازل ہوئی۔ غور کیجیے! نبوت کی ابتدا پڑھنے کے حکم سے ہوئی، اور وحیِ اولیٰ میں قلم کو علم کا عظیم وسیلہ قرار دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنے بندوں کو علم عطا کرنے کے احسان کا ذکر فرمایا، اور بتایا کہ قلم وہ ذریعہ ہے جس سے علم کی روشنی پھیلتی ہے، اور انسان جہالت کے اندھیروں سے نکلتا ہے۔ یہی قلم ہے جس نے علم کے سفر کو جاری رکھا۔ اسی کے ذریعے علم ایک فرد سے دوسرے فرد تک، ایک قوم سے دوسری قوم تک، ایک زمانے سے دوسرے زمانے تک منتقل ہوتا رہا۔ اسلام نے علم کو صرف کتابوں تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اسے انسانی ترقی، تہذیب، اور عبادت کا ذریعہ بنا دیا۔ یہی علم وہ خزانہ ہے جس کی برکت سے دنیا میں مدارس، جامعات، علمی ادارے اور کتب خانے آباد ہوئے۔ اور یہی علم ہے جس نے امتِ مسلمہ کو دنیا کے ہر گوشے میں روشنی پھیلانے

والا بنایا۔ علم اسلام کی پہچان ہے، اور قلم اس کا علمبردار۔ یہ قلم ہی ہے جس سے وحی لکھی گئی، قلوب روشن ہوئے، اور انسانیت کو سوچنے، سمجھنے، اور پہچاننے کا شعور ملا۔

غارِ حرا کی وہ بابرکت گھڑیاں انسانیت کی تاریخ کا سب سے عظیم لمحہ تھیں۔ چھ سو سال کے طویل وقفے کے بعد جب وحی کا دروازہ دوبارہ کھلا، اور آسمان کا زمین سے، اور زمین کا آسمان سے دوبارہ تعلق قائم ہوا، تو اس پہلی وحی میں کوئی طویل عبادتی حکم نہیں دیا گیا، نہ بتوں کی نفی کا ذکر تھا، نہ جاہلیت کے رسم و رواج کی سختی سے نکیر کی گئی، اگرچہ یہ سب باتیں اپنے وقت پر ضروری تھیں، لیکن ابتدائے وحی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک نئے دروازے یعنی علم کی طرف متوجہ کیا۔ اللہ نے اپنے محبوب ﷺ سے فرمایا: ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۝۱'' آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے یعنی نبوت کا پہلا پیغام ''پڑھنے'' کا حکم تھا۔ ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝۲'' جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ ''اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۝۳'' آپ قرآن پڑھا کیجئے، اور آپ کا پروردگار بڑا کریم ہے۔ ''الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝۴'' جس نے کہ قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی۔ ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۝۵'' انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنھیں وہ نہیں جانتا تھا۔

دوستو اور بزرگو! یوں غارِ حرا میں نازل ہونے والی یہ پہلی وحی ایک ایسا تاریخی واقعہ بن گئی جس نے نہ صرف زمین و آسمان کا رشتہ جوڑا، بلکہ انسانی فکر اور تاریخ کا رخ بھی بدل دیا، یہ وہ لمحہ تھا جس نے مؤرخین، مفکرین اور دانشوروں کے لیے نئے اور وسیع آفاقِ فکر و تحقیق کھول دیے۔ دنیا نے دیکھا کہ نبیِ اُمی ﷺ کے ذریعے انسانیت کے سفر میں ایک نیا باب، ایک نیا دور شروع ہو رہا ہے، ایسا دور جو جہالت کے اندھیروں سے نکل کر علم، قلم اور روشنی کے عہد میں داخل ہو گیا۔ یہ وحی اس بات کا اعلان تھی کہ اب دنیا پر علم کی حکمرانی قائم ہوگی، اب انسان کو پڑھنے، سوچنے اور سمجھنے کی دعوت دی جائے گی۔ یہ محض ایک دینی انقلاب نہیں تھا، بلکہ فکر و علم کی عالمی تحریک کی ابتدا تھی۔ نبیِ کریم ﷺ کے ذریعہ وہ وقت آیا جب علم اور ایمان نے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال لیا، اور

دین وعلم نے مل کر نئی انسانیت کی بنیاد رکھی۔ یہ نیا دور وہ تھا جہاں پڑھنا عبادت بن گیا، قلم امانت بن گیا، اور علم انسانیت کی خدمت کا ذریعہ قرار پایا۔ یہ وہ زریں عہد تھا جس میں جہالت کے اندھیرے چھٹ گئے، اور علم، ایمان اور تحقیق کی روشنی نے دنیا کے افق کو جگمگا دیا۔

اسلام میں علم کا آغاز کسی دنیاوی مقصد یا ذاتی فائدے کے لیے نہیں ہوا، بلکہ اس کی ابتدا نبوت کی آغوش میں اور خالقِ کائنات کے نام سے ہوئی۔ یہ وہ عظیم اصول ہے جو اسلام کو باقی تمام نظاموں سے ممتاز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یہ سکھایا کہ علم صرف معلومات کا نام نہیں، بلکہ یہ یقین، معرفت، اور روحانیت کا سفر ہے۔ علم وہی بابرکت ہے جو اللہ کے نام سے شروع ہو، اور اسی کی رضا کے لیے حاصل کیا جائے۔ اسی لیے جب نبیِ اُمی ﷺ پر پہلی وحی نازل ہوئی، تو وحی کے پہلے ہی الفاظ میں یہ پیغام دیا گیا: ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ'' ''آپ پڑھئے اپنے پروردگار کے نام کے ساتھ جس نے (سب کو) پیدا کیا ہے یعنی علم کا دروازہ رب کے نام سے کھلتا ہے۔ یہ پیغام دراصل ایک اصول تھا کہ علم کی بنیاد خالق کی پہچان پر ہو، اور اس کا مقصود انسان کو رب سے جوڑنا ہو، نہ کہ اسے اپنے خالق سے غافل کر دینا۔

اللہ تعالیٰ نے جب اپنے نبیٔ کریم ﷺ پر پہلی وحی نازل فرمائی، تو ساتھ ہی انسان کو یہ بھی یاد دلایا کہ علم حاصل کرتے ہوئے اپنی حقیقت اور اپنی اصل کو کبھی نہ بھولنا؛ کیونکہ اگر انسان اپنی ہستی کو بھول جائے، تو وہ علم و عقل، صنعت و فن، اور دنیا کی فتوحات کے نشے میں اپنے خالق سے غافل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے ارشاد فرمایا گیا: ''خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ'' جس نے انسان کو خون کے لوتھڑے سے پیدا کیا۔ یعنی اے انسان! تُو جو آج زمین و آسمان کو مسخر کرنے کی بات کرتا ہے، اپنی ابتدا کو مت بھول تُو مٹی سے پیدا ہوا، ناپائیدار ہے، اور جو کچھ تیری طاقت ہے، وہ تیرے رب کی عطا ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے قلم کا ذکر کر کے اس کی عظمت اور برکت کو دنیا کے سامنے واضح فرمایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مکہ اور پورے عرب میں قلم و کتابت کا نام و نشان بہت کم تھا، اس وقت صرف

چند لوگ ہی لکھنا جانتے تھے، اور اُنہیں فخر سے ''الکاتب'' کہا جاتا تھا۔ ایسے ماحول میں قرآن نے فرمایا: ''الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۙ'' جس نے کہ قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی۔ کیا عظیم اعلان تھا یہ! اللہ نے قلم کو علم کا ذریعہ، اور علم کو انسانیت کی بقا کا وسیلہ بنا دیا۔

پھر ربّ کائنات نے انسان کی ایک اور صلاحیت بیان کی کہ وہ سیکھ سکتا ہے، سمجھ سکتا ہے، اور جان سکتا ہے۔ مگر ساتھ ہی یاد دلایا کہ یہ علم، یہ سمجھ، یہ عقل سب اللہ کی تعلیم ہے، انسان کا اپنا کمال نہیں۔ ارشاد ہوا: ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ؕ'' انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دے دی جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

دوستو! یہی وہ آیتیں ہیں جنہوں نے انسان کو بتایا کہ علم کا سرچشمہ آسمان سے اترتا ہے، وحی سے جڑتا ہے، اور رب کی معرفت میں پروان چڑھتا ہے۔ قلم کی سیاہی اور وحی کی روشنی نے مل کر انسانیت کے دلوں میں علم، ایمان اور تہذیب کا چراغ روشن کیا، یہی وہ لمحہ تھا جس نے دنیا کو بتایا کہ اسلام میں علم عبادت ہے، اور ہر سچی جستجو دراصل اللہ کی پہچان کا ایک ذریعہ ہے۔

یورپ کا ظلمت بھرا زمانہ؛ تحقیق کے بدلے سزا:

دوستو! یورپ کی تاریخ کا ایک باب ایسا بھی ہے جسے پڑھ کر آج بھی دل دہل جاتا ہے اور روح کانپ اُٹھتی ہے۔ وہ زمانہ جب مذہب اور علم کے درمیان ایک خوفناک جنگ چھیڑ دی گئی تھی۔ عیسائی دنیا میں کلیسا نے علم و تحقیق کو اپنا دشمن سمجھ لیا، اور جو شخص سچ کی تلاش کرتا، یا کائنات کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتا، اُسے کفر، بغاوت اور الحاد کا مجرم ٹھہرا دیا جاتا۔ امریکی مصنف ''ڈریپر'' (Mr. Draper) کی مشہور کتاب '' Conflict Between Religion and Science'' یورپ کے اس دردناک دور کی تاریخی دستاویزات پیش کرتی ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں کلیسا نے ''تفتیشی محکمے'' (Courts of Inquisition) قائم کیے ایسے ادارے جن کا کام صرف یہ تھا کہ جو شخص ان کے نظریات سے اختلاف کرے، یا نئی تحقیق کی بات کرے، اُسے اذیت، قید، یا آگ کے الاؤ میں جھونک دیا جائے۔

ان عدالتوں کی داستانیں دل دہلا دینے والی ہیں، اٹلی، اسپین، جرمنی، اور فرانس میں ہزاروں نہیں، بلکہ لاکھوں لوگ ان کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گئے۔ سچ بولنا جرم بن گیا، تحقیق کرنا گناہ قرار پایا، اور سوچنا بغاوت سمجھی جانے لگی۔ اسپین میں جب مسلمانوں کی حکومت ختم ہوئی، تو ۱۴۹۰ء میں ان عدالتوں کا نظام حکومت کے ہاتھ میں آ گیا۔ سترھویں صدی میں ان کی طاقت کم ہوئی، نپولین نے ۱۸۰۸ء میں انہیں مٹانے کی کوشش کی، مگر وہ پھر ۱۸۲۰ء میں دوبارہ قائم ہوگئیں اور ۱۸۳۵ء تک کسی نہ کسی صورت چلتی رہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ کتنے لوگ ان عدالتوں کے ظلم کا نشانہ بنے، مگر تاریخ گواہی دیتی ہے کہ ان کی تعداد لاکھوں میں تھی۔ دوستو! یہ وہ زمانہ تھا جب انسان کو سوچنے کی سزا دی جاتی تھی، اور علم کو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ وہ تاریک دور تھا جب مذہب اپنی اصل روح سے خالی ہو چکا تھا، اور انسانیت علم کی روشنی سے محروم کر دی گئی تھی۔

قرآن وحدیث کی نگاہ میں علم کا بلند مقام:

دوستو اور بزرگو! جب قرآنِ کریم نازل ہوا تو اس نے علم کو وہ عزت و وقار بخشا جو کسی پچھلی کتاب یا مذہب میں کبھی نہ دی گئی تھی۔ قرآن نے علم کو روشنی، ہدایت اور ایمان کی بنیاد قرار دیا، اور اہلِ علم کو وہ مقام عطا کیا جو تمام انسانوں میں بلند ترین ہے۔ قرآن نے اہلِ علم کی عزت کو اتنا بڑھایا کہ ان کا نام اللہ اور فرشتوں کے ساتھ ذکر فرمایا۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: ''شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾'' (آل عمران:۱۸) اللہ نے خود گواہی دی کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، اور فرشتوں نے اور اہلِ علم نے بھی عدل کے ساتھ گواہی دی۔

سوچو، کتنا بڑا مقام ہے اُن لوگوں کا جنہیں اللہ نے اپنی وحدانیت کی گواہی میں شامل فرما دیا۔ یہی علم کا وہ درجہ ہے جو بندے کو ایمان کے مقامِ یقین تک پہنچاتا ہے۔ پھر قرآن نے علم کو بڑھانے کی دعا خود نبیٔ کریم ﷺ کو سکھائی: ''وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ﴿۱۱۴﴾'' (طٰہٰ:۱۱۴) اے

میرے رب! میرے علم میں اضافہ فرما۔یعنی نبی ﷺ کو حکم ہوا کہ دعا میں علم کا اضافہ مانگیں،اس سے علم کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔قرآن مزید فرماتا ہے:''قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ط ''(زمر:۹) کیا علم والے اور بے علم برابر ہو سکتے ہیں؟اور ایک اور جگہ فرمایا:''وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ط ''(مجادلہ:۱۱)اللہ ایمان والوں اور علم پانے والوں کے درجے بلند کرے گا۔دوستو!اللہ تعالیٰ نے علم کو صرف فہم کا نام نہیں کہا، بلکہ فرمایا:''اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا ط ''(فاطر:۲۸)اللہ سے سچا خوف تو صرف علم رکھنے والے بندوں کو ہوتا ہے۔یعنی علم کا اصل اثر دل میں خشیتِ الٰہی پیدا کرنا ہے۔جو شخص جتنا زیادہ علم والا ہے،اتنا ہی زیادہ وہ اپنے رب کے سامنے جھکنے والا ہے۔

پھر نبیٔ اکرم ﷺ نے اہلِ علم کے مقام کو یوں بیان فرمایا:''**فضل العالم علی العابد کفضلی علی ادناکم**'' (ترمذی: ابواب العلم باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة)عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی میری فضیلت تم میں سے ادنیٰ ترین شخص پر ہے۔اور فرمایا:''**ان العلماء ورثة الانبیاء ،ان الانبیاء لم یورثوا دیناراً ولا درهماً، انما ورثوا العلم فمن اخذه اخذ بحظ وافر**''(ترمذی:ابواب العلم باب ماجاء فی فضل الفقه علی العبادة) دوستو!یہ کتنی عظیم بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے مال و دولت نہیں چھوڑی، بلکہ علم کو اپنی میراث بنایا۔جو شخص اس علم کو حاصل کرتا ہے، وہ گویا انبیاء کی وراثت پاتا ہے۔

جب دینِ اسلام نے علم کی ایسی قدر و منزلت بیان کی اور نبیٔ کریم ﷺ نے امت کو علم حاصل کرنے کی ایسی ترغیب دی،تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمانوں کے دلوں میں علم کے لیے ایک زبردست جوش،جذبہ اور قربانی کا ولولہ پیدا ہوا۔یہ وہ زمانہ تھا جب علم کے راستے میں سفر کرنا عبادت بن گیا،اور علم کے لیے قربان ہونا فخر کی بات سمجھی جاتی تھی۔مسلمانوں نے علم کے حصول کے لیے زمان و مکان کی سب سے بڑی مسافتیں طے کیں کوئی ریگستانوں سے گزرا، کوئی پہاڑوں کو پار کر گیا،کوئی سمندروں کو عبور کر گیا،مگر علم کی تلاش سے باز نہ آیا۔اور دوستو!

یاد رکھو، ان کی یہ محنت صرف ظاہری سفر تک محدود نہیں تھی، بلکہ ان کے علم کی معنوی بلندی تو زمین و آسمان کی وسعتوں سے بھی آگے بڑھ گئی۔ ان کے دلوں میں علم کی ایسی روشنی پیدا ہوئی جس نے صدیوں تک دنیا کو منور رکھا۔

اندلس کا کتب خانہ اور یورپ کی علمی پسماندگی:

جب اسلام نے علم کی قدر و منزلت کو عام کیا، تو دنیا کے گوشے گوشے میں علم و کتابت کی روشنی پھیل گئی۔ مسلمانوں نے جہاں کہیں حکومت قائم کی، وہاں سب سے پہلے مدارس، مکتب اور کتب خانے آباد کیے۔ تاریخ کے صفحات بتاتے ہیں کہ قرطبہ (اندلس) میں ایک ایسا سنہری زمانہ آیا جب وہاں کے حکمران الحاکم ثانی نے دنیا کے سب سے بڑے کتب خانوں میں سے ایک قائم کیا۔ مؤرخینِ عرب کے مطابق اس کتب خانے میں چھ لاکھ جلدوں پر مشتمل کتابیں موجود تھیں! دوستو! ذرا سوچیے، یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ اندھیروں میں ڈوبا ہوا تھا، اور مسلمانوں کے شہر علم و فنون کے مینار بنے ہوئے تھے؛ یہاں تک کہ صرف فہرستِ کتب ہی ۴۴ جلدوں پر مشتمل تھی یعنی صرف کتابوں کی فہرست ہی کئی الماریوں میں سماتی تھی! اور تاریخ نے ایک دلچسپ تقابل بھی محفوظ کیا ہے، چار سو برس بعد جب فرانس کے بادشاہ چارلس عاقل نے اپنے ملک میں شاہی کتب خانہ قائم کیا، تو وہ بمشکل نو سو کتابیں جمع کر سکا اور اُن میں ایک بھی الماری غیر مذہبی علوم کی کتابوں سے بھری نہ تھی۔ دوستو! یہی وہ فرق تھا جو اُس وقت کی اسلامی تہذیب اور مغربی دنیا میں نمایاں نظر آتا تھا۔ اسلامی دنیا میں علم کو عبادت سمجھا جاتا تھا، جبکہ باقی دنیا ابھی علم کی روشنی تلاش کر رہی تھی۔ یہ قرطبہ، بغداد، اور سمرقند کے وہ سنہری دن تھے جب مسلمانوں نے دنیا کو پڑھنا سکھایا، تحقیق کے دروازے کھولے، اور علم کے سمندروں کو وسعت دی۔

قرآن کریم کا تقاضا؛ سوچو، سمجھو اور بیدار ہو جاؤ:

دوستو اور بزرگو! قرآنِ کریم نے بارہا انسان کو عقل سے سوچنے، سمجھنے اور غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل و شعور کی دولت عطا فرمائی تاکہ وہ سچ اور جھوٹ، حق

اور باطل، اور روشنی اور اندھیرے میں تمیز کر سکے۔ قرآنِ مجید میں 'تَعْقِلُوْنَ'' کا لفظ بار بار استعمال ہوا ہے۔ ایسی آیات کی تعداد کم و بیش تئیس (۲۳) ہے جن میں مختلف انداز سے انسان کو جھنجھوڑا گیا ہے کہ اے انسان! تو کیوں نہیں سوچتا؟ کیوں نہیں سمجھتا؟ قرآن نے کبھی فرمایا: ''لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ'' کبھی کہا: ''أَفَلَا تَعْقِلُوْنَ'' اور کبھی فرمایا: إِن كُنتُمْ تَعْقِلُوْنَ'' اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر اپنی آیات اور احکام بیان کر کے انسان کو عقل سے سمجھنے کی دعوت دی۔ جیسے ارشاد فرمایا: ''كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴿۲۴۲﴾'' (بقرہ: ۲۴۲) اللہ اسی طرح تمہارے لیے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔ پھر فرمایا: ''قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ﴿۱۱۸﴾'' (آل عمران:۱۱۸) ہم نے تمہارے لیے نشانیاں واضح کر دی ہیں، اگر تم عقل سے کام لو۔ اور فرمایا: ''وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۱۶۹﴾'' (اعراف:۱۶۹) آخرت ہی کا گھر بہتر ہے اُن کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں، پھر کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے؟

قرآن نے انسان کو یاد دلایا کہ یہ دنیا فانی ہے، اور جو کچھ تم دیکھتے ہو، اس میں غور و فکر کرو، کیونکہ سوچنے والا دل اور سمجھنے والی عقل ایمان کی راہ دکھاتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ كِتٰبًا فِيْهِ ذِكْرُكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۱۰﴾'' (انبیاء:۱۰) ہم نے تمہاری طرف وہ کتاب اتاری جس میں تمہارے لیے نصیحت ہے، کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے؟ اور ایک مقام پر ارشاد ہوا: ''وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ﴿۱۳۷﴾ وَبِالَّيْلِ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ﴿۱۳۸﴾'' (صافات:۱۳۷، ۱۳۸) تم دن رات اُن بستیوں کے پاس سے گزرتے ہو جن پر عذاب آیا، پھر بھی عقل سے کام نہیں لیتے؟

قرآن واضح کرتا ہے کہ جن لوگوں نے عقل اور سماعت کو استعمال نہ کیا، وہ گمراہی میں پڑ گئے۔ اہلِ جہنم خود اعتراف کریں گے: ''وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ﴿۱۰﴾'' (ملک:۱۰) وہ کہیں گے، اگر ہم سنتے یا عقل سے کام لیتے، تو آج ہم جہنم والوں میں

شامل نہ ہوتے۔ دوستو! یہ آیت ایک خطرناک حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے کہ عقل اللہ کی نعمت ہے، مگر اگر انسان اس سے کام نہ لے، تو یہی عقل وبال بن جاتی ہے۔

علم کو عام کرنے والا پہلا نظام:

دوستو اور بزرگو! میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت علم اور معلومات چند افراد اور مخصوص خاندانوں تک محدود تھیں، مثال کے طور پر ہندوستان میں مذہبی کتاب پڑھنے اور پڑھانے کا اختیار صرف ایک خاص طبقے کے پاس تھا، باقی لوگ اس سے محروم تھے۔ انسائکلو پیڈیا آف بریٹانیکا میں ایک مقالہ History of education (تعلیم کی تاریخ) میں لکھا گیا ہے کہ دنیا میں بڑے بڑے محل تعمیر ہوئے، عظیم مندر بنے، شاندار مذہبی عمارتیں بنیں، لیکن اگر علم کی نسبت سے کوئی عمارت یا ادارہ قائم کرنے کا سوال آئے تو یہ شرف صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ انہوں نے ساری انسانیت کو یہ سبق دیا۔ اس مقالے کا مصنف ایک انگریز مستشرق (Orientalist) ہے، اس کے باوجود وہ تسلیم کرتا ہے کہ نبیٔ اکرم ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ آنے والی نسلیں پڑھنے لکھنے والی ہوں گی۔ قرآن کو صحیح طور پر وہی سمجھ سکے گا جس کا تعلق علم اور عقل دونوں سے ہو اور جب یہ آیات آپ ﷺ پر نازل ہو رہی تھیں، اس وقت دنیا کی تعلیم کا حال یہ تھا کہ انسائیکلو پیڈیا کے مطابق تعلیم کے عنوان سے کسی قسم کی مستقل عمارت یا مدرسہ موجود نہ تھا۔ سب سے پہلے تعلیم کے لیے باقاعدہ عمارت، یعنی مدرسہ، مسلمانوں نے بنایا۔ خلافتِ بنو اُمیہ اور خلافتِ بنو عباس کے دور میں شاندار مساجد اور عظیم مدارس قائم ہوئے، جن میں صرف دینی علوم ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم بھی پڑھائے جاتے تھے، وہ علوم جو انسانیت کی فلاح، روزی کمانے، اور زندگی کی ضروریات پوری کرنے کے لیے ضروری تھے۔ اس طرح علم کے دروازے ہر انسان کے لیے کھول دیے گئے، اور یہ کارنامہ صرف اسلام اور مسلمانوں کا ہے۔

اندلس سے یورپ تک؛ علم کی امانت اور اس کی خیانت:

آج دنیا میں سائنس اور ٹیکنالوجی نے ہمیں بے شمار فائدے پہنچائے ہیں، اور ہم دن رات ان سے فائدہ اٹھا رہے ہیں؛ لیکن جب انسان ان کامیابیوں کو اپنی ایجاد، اپنی عقل اور اپنی سمجھ داری کا نتیجہ سمجھ کر یہ گمان کر لے کہ اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں، تو یہی وہ نقطہ ہے جہاں سے گمراہی شروع ہوتی ہے۔ یہی حال عیسائی مذہب کے ماننے والوں کا ہوا۔ پوپ اور پادریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو بدل کر ایک یہودی، شاؤل (Shoal) کی تعلیم کو رواج دیا۔ اس بدلی ہوئی تعلیم کو عام کیا گیا اور جب یہ یورپ پہنچی، وہاں اسپین کے مسلمانوں سے انہوں نے علوم حاصل کیے، مگر اس کے مقابلے کے لیے چرچ اور پوپ نے ایک سخت مزاحمتی کمیٹی قائم کی۔ ۱۴۹۰ عیسوی سے ۱۸۳۵ عیسوی تک کمیشن اور تحقیقی عدالتیں چلتی رہیں، جو بھی سائنس دان کوئی ایسی بات کرتا جو چرچ کی تعلیمات کے خلاف ہوتی، اسے قتل کر دیا جاتا یا جلا دیا جاتا، یہ وہی یورپ ہے جو آج سائنس اور ٹیکنالوجی میں اپنے آپ کو سب سے بڑا سمجھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ مبارک کے بعد سے ایک طویل مدت گزرنے کے بعد، انہیں علم پہنچا اور وہ بھی اندلس و اسپین کے مسلمانوں کے واسطے سے۔ ''انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا'' میں صاف لکھا ہے کہ مسلمانوں نے علم کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھا بلکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق دنیا بھر میں پھیلایا، اور تعلیم سب کے لیے عام کی، اس سے پہلے انسانی تاریخ میں یہ تصور ہی موجود نہ تھا۔ یورپ میں بھی چند خاص لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے کا حق تھا، اور ہمارے اپنے ملک کا بھی یہی حال تھا، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے اور ایسا علم عطا فرمایا جو انسان کو اس کے رب سے جوڑ دے اور بندوں تک پہنچائے۔ وہ علم جس میں خدا کا واسطہ نہ ہو، انسانیت کے لیے ہلاکت اور بربادی کے سوا کچھ نہیں۔

خواص سے عوام تک، علم کی مساوی تقسیم:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ علم پہنچایا تو صحابہ کرامؓ اور تابعینؒ نے اسے دل سے قبول کیا اور

اس پر عمل کیا۔ پھر اس امت نے اتنا لکھا کہ کتابوں پر کتابیں تیار ہو گئیں۔ دنیا میں سب سے زیادہ لکھنے والی امت یہی بنی۔ مگر افسوس کہ جس زمانے میں میں یہ بات کر رہا ہوں، امت خوابِ غفلت میں ڈوب چکی ہے۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زوال سے بھی پہلے، علم اور تعلیم بلکہ دنیاوی علوم کا سلسلہ بھی ٹوٹ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب آج ہم ہزار (۱۰۰۰) سال پہلے کے علمی کارناموں کا ذکر کرتے ہیں تو بعض لوگوں کو یہ عجیب سا لگتا ہے۔

میں نے آپ سے عرض کیا تھا کہ آپ ﷺ جب تشریف لائے، اُس وقت قریش کا کیا حال تھا؟ اور اس وقت کی دنیا کس کیفیت میں تھی؟ انسائیکلوپیڈیا آف بریٹانیکا میں ایک مثال دی گئی ہے کہ دوسرے مذاہب میں مذہبی رسومات تو ادا کی جاتی تھیں، مگر پڑھنے، سیکھنے اور سکھانے کا حق صرف چند مخصوص لوگوں کو حاصل تھا، وہی مذہبی پیشوا مغفرت کے پروانے اور بخشش کے کاغذات پیسوں کے عوض فروخت کرتے تھے۔ یہ حال آج بھی دنیا کے کئی حصوں میں پایا جاتا ہے؛ لیکن جناب نبی اکرم ﷺ نے تشریف لا کر سب سے بڑا کارنامہ یہ انجام دیا اور اعلان کیا کہ یہ علم صرف خواص کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے۔ علم کو عوام تک پہنچانا اور ہر انسان کے لیے اس کے دروازے کھول دینا آپ ﷺ کی سب سے بڑی خدمتِ انسانیت ہے۔

آغازِ انسانیت سے علم کی تکمیل تک:

سب سے پہلے ہم سب کے والد حضرت آدمؑ ہیں، جن کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے: ''وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا'' (بقرہ:۳۱) اور اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیے۔ یہ صرف دینی علم نہیں تھا، بلکہ انسانی ضروریات کے لیے جتنی بھی صنعتی اور ٹکنیکی مہارتیں درکار تھیں، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کو وہ سب سکھا دیا۔ اسی لیے انبیائے کرامؑ کے بارے میں آتا ہے کہ فلاں نبی یہ کام کرتے تھے اور فلاں نبی وہ کام کرتے تھے۔ یہ سب اس بات کی گواہی ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ نے دین اور دنیا کو ساتھ جوڑا، اور دین کو علم کے ساتھ یکجا کر کے ایک کامل اور متوازن زندگی کا نظام دیا۔

چرچ کی علم دشمنی، تاریخ کا سیاہ باب:

آپ نے گیلیلیو (Galileo) کا نام سنا ہوگا، وہ ایک عظیم فلسفی اور زمین کی گردش کا نظریہ پیش کرنے والا سائنس دان تھا۔ اسے ستر (۷۰) سال کی عمر میں چرچ کے سامنے پیش ہو کر معافی مانگنی پڑی، وہ اپنے نظریے سے رجوع کرتا ہے، تب جا کر اسے معافی دی گئی، اسی طرح ایک اور عظیم سائنس دان برانڈو کو زندہ جلا دیا گیا۔ یہ وہ قومیں ہیں جنہیں علم سے اس قدر دشمنی تھی کہ انہوں نے کتب خانوں کے کتب خانے جلا دیے۔ پھر تاریخ کو مسخ کر کے یہ جھوٹا الزام سیدنا حضرت عمر بن خطابؓ پر لگا دیا کہ اسکندریہ کا کتب خانہ انہوں نے جلایا (نعوذ باللہ) گویا مسلمان جاہل تھے اور علم سے ان کا کوئی واسطہ نہ تھا، اس لیے دنیا کے کتب خانے انہوں نے تباہ کیے۔

''شیخ سعدیؒ'' فرماتے ہیں:

یتیمے کہ ناکردہ قرآں درست　　کتب خانۂ چند ملت بشست

نبی ﷺ علم و حکمت کا سرچشمہ:

ایک ایسا یتیم، جو پڑھنا لکھنا نہیں جانتا تھا، اس نے دنیا کی قوموں کے تمام کتب خانوں کو گویا دھو ڈالا۔ مطلب یہ کہ علم و حکمت کے ایسے نایاب موتی بکھیرے کہ تمام ملتوں کے بڑے بڑے کتب خانے ماند پڑ گئے، جیسے پانی سے دھو کر صاف کر دیے گئے ہوں۔ دنیا کے مختلف مذاہب کے بڑے بڑے علمی ذخائر کے مقابل آپ ﷺ نے وہ تعلیم دی جس نے یہ حقیقت واضح کر دی کہ جب تک انسانی علم اللہ تعالیٰ کی ذات سے جڑا نہ ہو، انسان ظالم اور جابر بن جاتا ہے۔ آج کی ٹیکنالوجی ہی کو دیکھ لیجیے، یہ جتنی سہولتیں دیتی ہے، اتنا ہی بڑا نقصان بھی پہنچا رہی ہے، کیونکہ اس کے پیچھے خدا سے کٹا ہوا ذہن کارفرما ہے۔ جناب نبی اکرم ﷺ نے علم کی ایسی فضیلت بیان فرمائی کہ خود قرآن کریم نے آپ کی شان میں فرمایا: ''اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ وَّدَاعِيًا اِلَى اللّٰهِ بِاِذْنِهٖ وَسِرَاجًا مُّنِيْرًا ۝'' (احزاب: ۴۵-۴۶) بیشک ہم نے آپ کو گواہ، خوشخبری دینے والا، ڈر سنانے والا، اور اللہ کے حکم سے اس کی

طرف بلانے والا اور روشن چراغ بنا کر بھیجا۔ قرآن کریم کی مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کی اس علمی صفت اور روشنی پھیلانے والے کردار کو بیان فرمایا۔

عبادت کا عموم، علم اور بندگی کی آزادی:

دنیا پر جناب نبی اکرم ﷺ کا ایک عظیم احسان ہے کہ آپ نے نماز کو دو حصوں میں رکھا، ایک وہ نماز جو تنہا پڑھی جاتی ہے، یعنی فرض سے پہلے اور بعد کی سنتیں، اور دوسری وہ جو جماعت کے ساتھ امام کے پیچھے پڑھی جاتی ہے۔ تنہا پڑھی جانے والی نماز میں ہر مسلمان خود اپنی ذمہ داری سے کھڑا ہوتا ہے، کسی امام کا محتاج نہیں رہتا۔ اس طرح ہر فرد کو اپنی نماز کے فرائض، واجبات، سنتیں، دعائیں اور تلاوت اچھی طرح جاننا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ علم، جو پہلے مخصوص طبقے تک محدود تھا، اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے عام فرما دیا۔ عبادتوں کو عام کرنے کا مقصد یہی تھا کہ ان کے ذریعے اللہ کا دین بندوں تک پہنچے اور کسی ایک طبقے کی اجارہ داری قائم نہ ہو۔ جو شریعت کے مسائل جانتا ہو اور شرعی آداب و طریقہ کے ساتھ نماز ادا کرتا ہو، وہ نماز کی امامت کر سکتا ہے، چاہے وہ کسی بھی پس منظر سے ہو۔ دنیا کے دیگر مذاہب میں ایسا نہیں ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وجعلت لي الأرض مسجداً و طهوراً'' (بخاری: کتاب الصلاۃ، باب قول النبی ﷺ: جعلت لی الارض مسجداً و طهوراً) میرے لیے ساری زمین کو سجدہ گاہ اور پاکیزگی کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز کے لیے مخصوص جگہ شرط نہیں، بلکہ جہاں وقت ہو جائے وہاں نماز ادا کی جا سکتی ہے۔ اگر وضو کے لیے پانی نہ ملے تو تیمم کر کے طہارت حاصل کی جا سکتی ہے۔ یہی وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے ذریعے انسانیت کو عطا کی۔ ''عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ'' اس نے انسان کو وہ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

توحید؛ سائنسی ترقی کی بنیاد:

دوستو اور بزرگو! ایک مستشرق لکھتا ہے کہ مسلمانوں کے قرآن میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے شمار باتوں کا ذکر ہے، مگر یہ دراصل محض سائنسی معلومات نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت

اور طاقت کی نشانیاں ہیں۔ اس نے مزید کہا کہ حضرت محمد ﷺ نے آ کر مختلف علوم اور فنون کو ایک Unity عطا کی اور وہ Unity تھی اللہ کی معرفت۔ جب ایک سائنس دان اللہ کی پہچان حاصل کرتا ہے اور جان لیتا ہے کہ یہ کائنات ایک منظم اور حکیم ذات نے بنائی ہے، تو پھر سائنس کی دنیا میں اسے شک وشبہات نہیں رہتے۔ قرآن کہتا ہے: ''اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ ﴿۱۴﴾'' کیا وہ جو پیدا کرنے والا ہے، نہیں جانتا؟ اور وہ تو باریک بین، ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ یہ وہ ذات ہے جو ''مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚ'' (ق:۱۶) انسان کے دل کے وسوسوں کو بھی جانتی ہے۔ جب سائنسی سوچ الحاد اور خدا کے انکار سے نکل کر ایک اللہ کی وحدانیت پر آتی ہے، تو ترقی کا دروازہ کھلتا ہے۔ ایک ہزار عیسوی سے لے کر سولہویں صدی تک کا دور مسلمانوں کا تھا، اور اسی دور میں سائنس وٹیکنالوجی نے عملی میدان میں قدم رکھا۔ اس سے پہلے یورپ میں سائنس (فلسفہ) زیادہ تر محض نظری گفتگو (Theoretical) تک محدود تھی۔

ایک محقق نے سوال اٹھایا: حضرت آدمؑ سے لے کر جناب نبی اکرم ﷺ کے زمانے تک یہ علوم اور ایجادات کیوں عام نہ ہوئیں؟ اور آپ ﷺ کے آنے کے بعد ہی یہ دنیا میں کیوں پھیل گئیں؟ پھر خود ہی اس نے جواب دیا کہ سب سے بڑی رکاوٹ شرک ہے۔ جب انسان اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرا کر انہیں خدائی کا درجہ دے دے، تو تحقیق اور ریسرچ رک جاتی ہے؛ کیونکہ ریسرچ غور وفکر کا نام ہے، اور جس کو معبود بنا لیا جائے، اس پر تحقیق نہیں کی جاتی۔ آپ ﷺ نے بتلایا کہ یہ ساری کائنات تمہاری منفعت کے لیے اللہ نے پیدا کی ہے، کسی اور کے لیے نہیں؛ لیکن جب علم کو اللہ سے کاٹ دیا گیا تو الحاد نے جنم لیا۔ آئزک نیوٹن، چارلس ڈارون اور ان جیسے لوگوں نے سائنس میں کچھ نظریات پیش کیے مگر توحید سے الگ کر کے، اور پھر خدا کے وجود سے انکار کر کے ایک ایسا تعلیمی ماحول بنایا جس میں اخلاقیات غائب ہو گئیں۔ آج دیکھ لیجیے، جتنا انسان زیادہ پڑھا لکھا، اتنا ہی زیادہ اس کا نقصان بھی بڑھ گیا۔ ایٹم بم کس نے بنایا؟ پہلی اور دوسری جنگ عظیم کس نے کروائی؟ اب تیسری کی

تیاری بھی وہی کر رہے ہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ علم ''بِاسْمِ رَبِّكَ'' سے نکل چکا ہے۔

جناب نبی اکرم ﷺ کی تعلیم آج بھی انسانیت کو یہ کہہ رہی ہے کہ حضور ﷺ نے جس طریقہ سے علم کو خدا کی ذات سے وابستہ کیا، ایک اور سائنٹسٹ (Scientist) کہہ رہا ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے دنیائے انسانیت کو وحدت عطا کی، اور وہ توحید کے واسطے سے کہ جب توحید میں آدمی لگ جائے گا تو بڑی سے بڑی سائنسی چیزوں میں آگے جائے گا؛ لیکن وہ اللہ کی قدرت اور طاقت کے مظاہر لوگوں کے سامنے بیان کرے گا، وہ یہ نہیں کہے گا کہ ہم نے یہ کیا، ہم نے وہ کیا، اس لئے کہ تجھے تو کچھ نہیں آتا تھا، تجھے تو ماں کے پیٹ سے تین تین اندھیریوں سے اللہ پاک نے نکالا۔

اللہ تعالیٰ نے پہلی وحی میں ہی فرمایا: ''اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۚ﴿۱﴾ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾'' پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا، جس نے انسان کو گوشت کے لوتھڑے سے بنایا، ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ''فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ۗ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ'' (مومنون: ۱۴) ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھایا اور فرمایا: ''فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ ﴿۱۴﴾'' (مومنون: ۱۴) بڑی برکت والا ہے اللہ، سب سے بہترین پیدا کرنے والا۔ یہ ہے وہ علم جو خالق سے جڑتا ہے، اور انسان کو ترقی کے ساتھ ساتھ عاجزی بھی سکھاتا ہے۔

دوستو اور بزرگو! ہمیں چاہیے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کریں تاکہ ایک مسلمان کو یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جن ہستی کو ہمارے لیے نبی آخر الزماں بنا کر بھیجا، انہوں نے انسانیت کے مسائل کو ۱۴۰۰ سال پہلے اس حکمت اور بصیرت سے حل کر کے بتا دیا کہ اگر تم اس راہ سے ہٹو گے تو پھر ایٹم بم جیسے ہلاکت خیز ہتھیار تمہاری پوری دنیا کو تباہ کر دیں گے۔ اللہ پاک کی ذاتِ عالی سے دعا ہے کہ ہمیں سیرت پڑھنے کی توفیق عطا فرمائے، علم میں ترقی کرنے کی توفیق دے، اور یہ ترقی اللہ کی ذات سے وابستگی کے ساتھ ہو۔ جتنا ہم اس وابستگی میں آگے بڑھیں گے، اللہ پاک ہمارے لیے کامیابی کے دروازے کھولتے جائیں

گے۔ ہمارے نوجوانوں سے گزارش ہے کہ موبائل اور دنیا بھر کی سوشل میڈیا سائٹس پر صرف لایعنی اور بے فائدہ چیزوں میں وقت ضائع نہ کریں، کیونکہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بہترین خوبیوں والا مسلمان وہ ہے جو لایعنی بات کو چھوڑ دے۔ آپ سائنس میں آگے بڑھیں، دین میں آگے بڑھیں، اور موبائل کو غلط کاموں کے بجائے اچھی اور مفید چیزوں کے لیے استعمال کریں۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ کہی سنی باتوں پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

(۱۱)

دُنیا کی حقیقت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نظر میں

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين.

قالَ اللهُ تَبَارَكَ وتَعَالٰى فِي الْقُرْآنِ الْمَجِيْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِيْدِ.

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ۝۴۵ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ۝۴۶ (کہف:۴۵)

وقال النبي ﷺ: إنَّ الدُّنيا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، وإنَّ اللهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيها، فَيَنْظُرُ كيفَ تَعْمَلُونَ. (مسلم: كتاب الرقاق، باب اكثر اهل الجنة الفقراء)

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم ونحن على ذلك لمن الشاهدين والشاكرين والحمد لله رب العالمين...

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام، اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جس آیتِ مبارکہ کی تلاوت کی، اس میں اللہ ربّ العزت نے ہمارے سامنے دنیا اور دنیا کی حقیقت کو نہایت واضح انداز میں بیان فرمایا، اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے انبیائے کرام علیہم الصّلوٰۃُ وَالسّلَام کا سلسلہ جاری فرمایا، اور پھر آخر میں جنابِ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرما کر

یہ اعلان فرمایا ''اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ '' (مائدہ:۳) آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا یعنی اب انبیائے کرام کا سلسلہ ختم کر دیا گیا، اور یہ دین اسلام، اللہ تعالیٰ کی طرف سے قیامت تک کے لیے باقی رہنے والا ہے، اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی ارشاد فرمایا: ''وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ط '' (مائدہ:۳) اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا۔ مطلب یہ کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس پر اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل ہوتی ہے، اور جو قیامت تک انسانیت کے لیے ہدایت کا واحد راستہ ہے۔

محفوظ پیغام، تا قیامت ہدایت:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک طرف جناب نبیٔ اکرم ﷺ کی تعلیمات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ فرما دیا، امّت کے پاس ایک ایسی کتاب موجود ہے: ''لَا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ط '' باطل نہ اس کے آگے سے آ سکتا ہے، نہ پیچھے سے، قرآنِ کریم کو باطل طاقتوں میں سے کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکا اور نہ پہنچا سکے گا، اسی طرح، آپ ﷺ کی احادیثِ مبارکہ کا بھی ایک عظیم الشان ذخیرہ اللہ تعالیٰ نے امت کے لیے محفوظ فرما دیا۔ اس خدمت میں محدثینِ کرام کی عظیم جماعتیں شامل ہوئیں، جنہوں نے احادیث کو ہر پہلو سے جانچ پرکھ کر، صحیح اور واضح روایتیں امت کے سامنے پیش کر دیں۔ یوں قرآن اور حدیث، دونوں اللہ پاک کی طرف سے ایک محفوظ امانت ہیں، جو قیامت تک کے لیے ہدایت کا چراغ رہیں گی۔

ہر دور میں اٹھنے والی حق کی جماعت:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے کتاب وسنت کو محفوظ فرمانے کے ساتھ ایک اور عظیم انتظام فرمایا، جب آپ ﷺ کی تعلیم مکمل ہوگئی، تو اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں ایسے نیک، صالح، اور کتاب وسنت کے ماہر علماء کرام پیدا فرمائے، جو امت کے حالات کے مطابق دین کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے رہے، چاہے حالات اندرونی ہوں یا بیرونی، امت کے اپنے مسائل ہوں یا باہر سے آنے والے فتنے، اللہ ربّ العزت نے ہمیشہ ایسی شخصیات کو منتخب

فرمایا، جنہوں نے اللہ کے دین کی حفاظت میں اپنی زندگیاں، اپنا علم اور اپنی صلاحیتیں لگا دیں۔ حدیث شریف میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ أُمَّتِي قَائِمَةً بِأَمْرِ اللهِ، لَا يَضُرُّهُمْ مَّنْ خَذَلَهُمْ أَوْ خَالَفَهُمْ'' (مسلم: کتاب الامارۃ، باب قولہ علیہ السلام! لا تزال طائفۃ من امتی...) ہمیشہ میری امت میں ایک جماعت حق پر قائم رہے گی، اُنہیں نہ مایوس کرنے والا نقصان پہنچا سکے گا، نہ مخالفت کرنے والا۔ ایک اور روایت میں فرمایا: ''إِنَّ اللهَ يبعثُ لهذه الأُمَّةِ على رأسِ كلِّ مائةِ سنةٍ من يُجدِّدُ لها دينَها'' (أبو داود: کتاب الملاحم، باب مایذکر فی قرن المأۃ) اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر سو سال کے آغاز میں ایسے شخص کو بھیجتے ہیں جو دین کی تجدید کرتا ہے۔ یعنی جب بھی باطل قوتیں، خواہ وہ سماجی رسم و رواج ہوں، ثقافت ہو، خواہشات ہوں یا فلسفیانہ گمراہیاں، دین میں بگاڑ پیدا کرنے کی کوشش کریں گی، اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے مجددین اور علماء کو کھڑا کریں گے۔ وہ دین میں شامل ہونے والی غلط چیزوں کو نکالیں گے اور سنت کو زندہ کریں گے۔

نام نہیں، سیرت اپنائیں:

آپ حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر دور میں اپنے دین کی حفاظت کے لیے ایسی عظیم شخصیات پیدا فرمائیں جنہوں نے اپنے علم، عمل اور تقویٰ سے امت کی رہنمائی کی۔ آج میں آپ کے سامنے جس ہستی کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں وہ پانچویں صدی ہجری کے ایک جلیل القدر مجدد ہیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے طویل عمر عطا فرمائی اور جن کا نام سنتے ہی احترام و عقیدت کے جذبات دل میں جاگ اٹھتے ہیں۔ میری مراد حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ سے ہے، جنہیں ''پیرانِ پیر'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج ان کی طرف وہ باتیں منسوب کی جاتی ہیں جن کے وہ خود قائل نہیں تھے۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو محض نام کی حد تک یاد رکھا ہے، لیکن ان کے حقیقی کارنامے اور ان کی تعلیمات سے ناواقف ہیں۔ حالانکہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے اپنی زندگی کے ۷۳ برس قرآن، حدیث، فقہ اور فتویٰ کی تعلیم و ترویج میں

گزارے۔ صبح سے اگلی صبح تک کا آپ کا معمول محدثین اور فقہاء نے تفصیل سے محفوظ کیا ہے۔ آپ حنبلی مسلک سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے تذکرۃ الحنابلہ، طبقات الشافعیہ اور دیگر معتبر کتب میں آپ کی سیرت کا نہایت اہتمام کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم ان کی زندگی سے یہ سیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندوں میں کون سی صفات پیدا فرمائی تھیں اور انہوں نے دین کی خدمت کس اخلاص سے کی۔ ان کی یاد محض کھانے پینے یا رسومات تک محدود کرنا ان کے حق میں بڑی کوتاہی ہے۔ ان کا اصل حق یہ ہے کہ ہم ان کی مستند سیرت کا مطالعہ کریں، محدثین وفقہاء کی بیان کردہ تعلیمات کو سمجھیں اور اپنی زندگی میں ان پر عمل کرنے کی کوشش کریں۔

پاکیزہ نسب اور حلال لقمے کا فیض:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کو ظاہری و باطنی علوم سے بھرپور نوازا، اس سے پہلے بھی میں آپ کے چند واقعات سنا چکا ہوں، جن میں آپ کے والد محترم اور نانا کے درمیان پیش آنے والا واقعہ بھی شامل ہے۔ آپ کے والد نے ہمیشہ اس بات کا خیال رکھا کہ آپ کے پیٹ میں حرام لقمہ نہ جائے۔ ایک مرتبہ انہوں نے نادانستہ ایک سیب کھا لیا، پھر فوراً باغ کے مالک کے پاس گئے، جو بعد میں آپ کے نانا بنے۔ وہاں جا کر معذرت کی اور اپنا معاملہ صاف کیا۔ یہاں تک کہ مالکِ باغ نے اپنی صاحبزادی کا نکاح آپ کے والد سے کر دیا، مگر پہلے صاف کہہ دیا کہ میری بیٹی اندھی، گونگی، لنگڑی اور بہری ہے، لیکن جب نکاح ہوا تو اللہ تعالیٰ نے ان سب عیوب سے پاک اور باکمال بیٹی عطا فرمائی، جو بعد میں آپ کی والدہ محترمہ بنیں۔ دوستو! اس واقعہ میں سب سے پہلا سبق ہمیں یہی ملتا ہے کہ حلال کمائی کی فضیلت کیا ہے۔ اگر کبھی زندگی میں کوئی حرام چیز آ جائے تو فوراً اس کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں توبہ کرنی چاہیے۔ اور اگر معاملہ حقوق العباد کا ہو تو بندے سے معافی مانگنی چاہیے اور اس کا حق ادا کرنا ضروری ہے۔ یہی پہلا سبق حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی ولادت سے پہلے ہمیں ملتا ہے کہ آپ کا نسب پاکیزہ، والد بزرگ، نانا بزرگ اور والدہ بھی بزرگ خاتون تھیں۔

بغداد کا سنہری دور اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی علمی سفر کی ابتدا:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کو ۴۷۰ ہجری میں پیدا فرمایا۔ ۱۸ سال کی عمر میں، ۴۸۸ ہجری میں، آپ بغداد علم حاصل کرنے کے لیے تشریف لے گئے۔ ذرا سوچیے! اُس وقت کا بغداد کیسا تھا؟ دنیا کے کسی بھی شہر کو آپ اُس کے مقابلے میں لا ہی نہیں سکتے۔ آج کے واشنگٹن، ٹوکیو یا لندن ہو، سب اُس وقت کے بغداد کے سامنے ماند پڑ جاتے تھے۔ اسلامی تاریخ کا سنہری دور بغداد میں عباسی خلفاء کے زیرِ سایہ قائم تھا، یہ شہر علم و عمل کا گہوارہ تھا، سیاسی اعتبار سے خلافت کا مرکز اور مادی اعتبار سے اُس وقت کی دنیا کا سب سے مالدار شہر، بنوعباسیہ کے دور میں دولت کی ایسی ریل پیل تھی کہ مشہور قصے الف لیلہ میں جو بغداد کی شان بیان کی گئی ہے، وہ اسی خوش حالی کی عکاسی کرتی ہے، البتہ لکھنے والوں نے بعض اوقات اس میں غلط رنگ بھی بھر دیا اور بادشاہوں کو عشقیہ قصوں کے ساتھ جوڑ کر اصل تصویر بگاڑ دی، اس خوش حالی کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ ہارون رشید اپنے محل کی چھت پر کھڑے ہو کر بادل کو مخاطب کر کے کہتے: ''أمطري حيث شئتِ، فسوف يأتيني خراجُك'' جہاں چاہے برس جا، تیرا ٹیکس میرے پاس ہی آئے گا، یعنی اتنی وسیع و عریض حکومت کہ مغرب میں مراکش سے لے کر مشرق میں چین تک، شمال میں ماوراء النہر، ازبکستان اور قزاقستان سے لے کر جنوب میں افریقہ تک، تینوں براعظموں کے ایک بڑے حصے پر بنوعباس کی حکمرانی قائم تھی۔

علم کی طلب سے بغداد کی مسندِ تدریس تک:

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ جب بغداد تشریف لائے، تو پھر اپنی زندگی کے ۷۳ سال میں سے تقریباً ساٹھ سال وہیں گزارے، اور ۹۰ سال کی عمر میں آپ کا انتقال ہوا۔ اتنی طویل عمر اللہ تعالیٰ نے عطا فرمائی کہ ابتدا کے ایام میں گیلان سے بغداد آ کر سب سے پہلے اپنے آپ کو علم حاصل کرنے میں لگایا، اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ جن بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنا ہے، وہ وہی ہیں جنہوں نے صحیح، ٹھوس اور کتاب وسنت کا گہرا علم حاصل کیا ہو۔ جاہل کبھی ولی

نہیں بن سکتا! جو حلال وحرام کو نہ پہچانتا ہو، وہ اللہ کے مقربین میں کیسے شامل ہوسکتا ہے؟ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے بغداد میں اس وقت کے بڑے بڑے مدارس اور جلیل القدر علماء سے عربی گرامر، کتاب وسنت اور دیگر علوم کی تعلیم حاصل کی۔ پھر اسی بغداد میں ساٹھ برس تک قرآن، حدیث اور تفسیر کی تدریس فرمائی، علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ علیہ، جو خود حنبلی تھے، بیان کرتے ہیں کہ آپ صبح کے وقت کتاب اللہ کا درس دیتے، تفسیر وحدیث کا بیان فرماتے، فقہ کا سبق پڑھاتے اور فتاویٰ لکھتے۔ ظہر کے بعد قراءت وتجوید کی تعلیم ہوتی، تاکہ قرآن کریم کو صحیح مخارج اور خوبصورت ادائیگی کے ساتھ پڑھا جائے۔ یہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے اپنی زندگی کے ابتدائی سال تعلیم حاصل کرنے میں اور باقی زندگی بغداد میں علمِ دین پھیلانے میں گزاری۔ آپ کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ کے پانچ خلفاء آئے اور گئے، آپ نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ کیسے بادشاہ بدلتے اور بعض اوقات ایک دوسرے کو معزول یا قتل کر دیتے۔ اس وقت کا ماحول یہ تھا کہ ایک طرف سلجوقی سلاطین تھے، دوسری طرف عباسی خلفاء، اور دونوں کے درمیان کشمکش اور تناؤ بھی رہتا تھا۔

مادیت کے طوفان میں روحانیت کا چراغ:

لیکن سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دنیا اور اس کی چیزوں کی محبت لوگوں کے دلوں میں اس قدر رچ بس گئی تھی کہ انہوں نے مادی زندگی کو ہی سب سے بڑا مقام سمجھ لیا تھا، اللہ پاک نے ایسے ہی ماحول میں آپ کو بغداد پہنچایا، وہ بغداد، جس کے بارے میں تاریخ میں مشہور ہے: ''**بغداد لیس منزل عباد**'' (معجم البلدان: ۱/۴۶۴) یعنی بغداد عابدوں اور زاہدوں کا شہر نہیں، بلکہ مالداروں، دنیا کمانے والوں اور اپنی آخرت کو بھول جانے والوں کا شہر ہے۔ جو وہاں جاتا، وہ اُسی کا ہو کر رہ جاتا۔ ایسے مادیت سے بھرے ماحول میں، جہاں دنیا کو سب کچھ سمجھ لیا گیا ہو اور مالداروں کو عزت جبکہ غریبوں کو نظر انداز کیا جاتا ہو، حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کو اللہ پاک نے اسی مادیت کو توڑنے اور دلوں کو آخرت کی طرف موڑنے کے لیے قبول فرمایا۔

مادیت سے معنویت تک:

دوستو اور بزرگو! دنیا اور اس کی حقیقت کیا ہے؟ اور یہ انسان کو کہاں لے جا رہی ہے؟ افسوس کہ آج کا انسان اندھا دھند اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے ملفوظات، الفیوض الربانی اور دیگر کتابیں ہمارے لیے ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ سوچیے، یہ بزرگوں کے سردار کس طرح اس مقام تک پہنچے کہ ایک صدی تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو امت کی رہنمائی اور رہبری کے لیے منتخب فرمایا۔ حافظ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ جو خود بھی حنبلی تھے، فرماتے ہیں: سب سے زیادہ کرامات کا ظہور حضرت عبدالقادر جیلانیؒ سے ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے دلوں کو آپ کی طرف مائل فرما دیا، آپ کے درس اور مجلس میں ہزاروں لوگ شریک ہوتے، توبہ و استغفار کرتے اور اپنی زندگی کی اصلاح کر کے واپس لوٹتے۔ آپ نے کتاب وسنت کا گہرا علم لوگوں تک پہنچایا، اور اس کے ساتھ اس وقت کے سب سے بڑا فتنہ یعنی مادیت کا مقابلہ کیا۔ یہ وہی فتنہ ہے جو آج ہمارے زمانے میں بھی پوری قوت سے موجود ہے۔ آج دیکھیے! سیاست میں بھی معاشیات کو معیار بنایا جاتا ہے، معاشرت میں بھی دولت اور غربت کو اصل سمجھا جاتا ہے، یہی کچھ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے زمانے میں بھی تھا، آپ نے اس کی اصلاح کے لیے سب سے پہلے کتاب وسنت کا علم حاصل کیا، پھر وقت کے شیخ ابوسعید مخرمی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعت کی، ان کی صحبت اختیار کی، اپنے نفس کی اصلاح اور دل کی پاکیزگی کی محنت کی، تب جا کر اللہ تعالیٰ نے آپ کو امت کی رہنمائی کے لیے چن لیا، اور تقریباً پون صدی یعنی ۷۳ سال تک بغداد میں رہ کر امت کی خدمت کا شرف عطا فرمایا۔

مردہ دلوں کی مسیحائی:

حضرت ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی سب سے بڑی کرامت یہی ہے کہ آپ نے مردہ دلوں کی مسیحائی کی، ایسے دل جو دنیا اور اس کی محبت میں، اور طرح طرح کی لذتوں اور خواہشات میں الجھ گئے تھے، انہیں آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا۔ آپ نے

انسانوں کو ان کے خالق و مالک سے قریب کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی لگا دی۔ جن لوگوں نے اپنے رب سے دوری اختیار کر لی تھی، آپ نے انہیں محبت و معرفت کے راستے پر واپس لانے کی محنت کی، دنیا اور دنیا کی محبت کی حقیقت کو آپ نے نہایت مؤثر انداز میں، مثالوں، کہاوتوں اور سبق آموز واقعات کے ذریعے بیان کیا۔ یہ قیمتی نصیحتیں اور ملفوظات آج بھی ہمارے پاس موجود ہیں، اور ہمیں بتاتے ہیں کہ اللہ کے اس ولی نے کس طرح اس فانی دنیا کی حقیقت کو واضح فرمایا۔

شیطان کا سب سے بڑا دھوکہ:

سب سے پہلے ضروری ہے کہ انسان کتاب وسنت اور حلال وحرام کا واضح علم رکھے، آپ یہ واقعہ سن چکے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ پر شیطان نے اوپر بادل کی طرف سے آواز دی: اے عبدالقادر! میں تمہارا رب ہوں، آج سے میں نے تمہارے لیے ہر حرام چیز کو حلال کر دیا ہے۔ آپ نے فوراً ''اعوذ باللہ'' پڑھا۔ اس پر وہ دھوئیں کی شکل اختیار کر کے غائب ہو گیا اور جاتے جاتے یہ کہہ گیا: عبدالقادر! تمہارے علم نے تمہیں بچا لیا، ورنہ تم جیسے ستر (۷۰) عابدوں کو میں گمراہ چکا ہوں اور ان سے حرام کام کروا چکا ہوں، شیطان، اللہ کی حرام کردہ چیز کو مختلف تاویلات، مثالوں اور گمراہ کن دلائل کے ذریعے حلال کروا دیتا ہے، جب وہ کسی کو گناہ میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس پر سزا آتی ہے تو خود کنارہ کش ہو جاتا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے غزوۂ بدر کا واقعہ بیان کیا کہ کس طرح شیطان، ابوجہل کے ساتھ ''شیخ نجدی'' کی شکل میں آیا، مگر جیسے ہی حضرت جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا تو فوراً بھاگ کھڑا ہوا، ابوجہل نے پوچھا: کہاں جا رہے ہو؟ اس نے کہا: ''اِنِّیۡۤ اَرٰی مَا لَا تَرَوۡنَ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ ؕ'' (انفال: ۴۸) میں وہ دیکھ رہا ہوں جو تم نہیں دیکھ رہے، اور مجھے اللہ سے ڈر لگ رہا ہے، یہ بتانے کا مقصد یہ ہے کہ شیطان نے ہمیشہ عبادت گزاروں کو حرام میں مبتلا کر کے ان کی عبادت میں خرابی پیدا کی ہے، حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے: اس نے جو یہ کہا کہ تمہارے علم نے تمہیں بچا لیا، یہ دراصل میرے علم پر میرا دھیان مرکوز کر کے مجھے اللہ تعالیٰ کی

ذات سے غافل کرنے کا ایک حربہ تھا۔

دل؛ محبتِ الٰہی کا مرکز اور آزمائش کا میدان:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمارے دلوں کو اپنی محبت کا مرکز بنایا ہے۔ قرآنِ کریم میں فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ''(بقرہ:۱۶۵) اور جو لوگ ایمان والے ہیں، وہ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت کرتے ہیں، ایمان والے اپنی جان، مال اور وقت سب کچھ اللہ کی رضا کے لیے قربان کر دیتے ہیں، یہ محبت محض زبان کا دعویٰ نہیں، بلکہ عمل اور قربانی سے ثابت ہوتی ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک یہ نظام جاری رکھا ہے کہ اپنے نیک اور صالح بندوں کو آزمائش میں ڈالتا ہے۔ یہ مشکلات اور حالات کسی سزا کے طور پر نہیں، بلکہ پرکھنے اور سنوارنے کے لیے آتے ہیں، تاکہ بندہ اپنی محبت اور وفاداری کو عملی طور پر ثابت کرے۔

محبتِ الٰہی بمقابلہ محبتِ دنیا:

دوستو اور بزرگو! حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک بڑا سبق آموز ملفوظ ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بندے کو کوئی مشکل یا پریشانی پیش آتی ہے، سب سے پہلے وہ انسانوں کے پاس جاتا ہے، اپنی ضرورت ان سے پوری کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شریعت نے اسے منع نہیں کیا، لیکن جب وہاں سے بات نہیں بنتی، تب وہ بے بس ہو کر روتا ہے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرتا ہے۔ قرآنِ کریم میں بھی یہی ذکر ہے: ''وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا اِلَيْهِ ''(زمر:۸) جب انسان پر تکلیف آتی ہے تو وہ اپنے رب کو پکارتا ہے اور اس کی طرف جھک جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ نافرمان بندہ، جو عام حالات میں اللہ کا انکار کرتا ہے، مصیبت سے خود کو بچانے کے لیے کہنے لگتا ہے: ''میں تیرا ہی بندہ ہوں!'' یہی لمحہ دراصل اللہ تعالیٰ کی طرف سے امتحان ہوتا ہے۔ یہ محبت کی دنیا ہے، جہاں دن رات عاشق اور معشوق کے قصے سننے کو ملتے ہیں، کوئی کسی کے لیے جان دے رہا ہے، لیکن

حقیقت میں وہ اپنی ذات یا خواہش کی محبت ہوتی ہے۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''عشقِ مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود'' یعنی اگر ہم دنیا کی لیلیٰ کی خاطر اللہ کو ناراض کرتے ہیں، چاہے وہ کسی عورت کی صورت میں ہو یا حرام مال کی شکل میں، تو یہ اصل میں ''عشقِ لیلیٰ'' ہے۔ مولانا رومؒ آگے فرماتے ہیں: ''گوئے گشتن بہر او اولیٰ بود'' یعنی جب اللہ ہی لیلیٰ کا خالق ہے، تو کیا اللہ کی محبت لیلیٰ کی محبت سے کم ہوسکتی ہے؟ پس اصل کمال یہ ہے کہ بندہ مولا کی محبت میں خود کو قربان کرے، اپنی جان اور خواہشات سب کچھ اس کی رضا کے لیے لگا دے۔

ظاہری حسن کی حقیقت اور اصل کامیابی:

دوستو اور بزرگو! ایک نہایت سبق آموز واقعہ ہے: ایک شیخ تھے، ان کا ایک مرید خانقاہ کی ایک خادمہ پر فریفتہ ہوگیا، وہ اس کے پیچھے پیچھے گھومنے لگا، شیخ کو جب یہ کیفیت محسوس ہوئی تو انہوں نے حکمتِ عملی سے اس مرید کی اصلاح کا پلان بنایا، خادمہ کو کچھ دوائیاں دیں جس سے اسے اسہال (دست) لگ گئے، اور وہ کمزور ہوکر چہرے کی رونق کھو بیٹھی، کچھ دنوں بعد شیخ نے دیکھا کہ اب وہ نوجوان اس عورت کے قریب نہیں جاتا، شیخ نے مرید کو بلایا اور پوچھا: بیٹے! پہلے تو تم اس کے پیچھے پیچھے رہتے تھے، اب کیا ہوا؟ مرید نے کہا: حضرت! اب اس میں وہ کشش باقی نہیں رہی، شیخ نے فرمایا: دیکھو! اس کی ذات تو وہی ہے، جسم بھی وہی ہے، کچھ کم نہیں ہوا، بس جو چیز اس کے اندر سے نکلی ہے وہ یہ ہے اور اس وقت انہوں نے ایک برتن کی طرف اشارہ کیا جس میں بدبودار مواد جمع تھا۔ شیخ نے کہا: یہی حقیقت ہے انسان کی! تم جس حسن پر فریفتہ ہو رہے تھے، وہ صرف اوپر کی چمڑی کا غلاف ہے، جب وہ کھلتا ہے تو انسان دوسرے انسان سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اللہ پاک نے بھی یہی حقیقت بیان فرمائی ہے: ''اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ'' (کہف:۴۶) یعنی مال و اولاد دنیا کی رونق ہیں، مگر باقی رہنے والے اعمالِ صالحہ ہی اصل سرمایۂ حیات ہیں، جو انسان کو آخرت میں نفع پہنچاتے ہیں۔

مایوسی کے بعد رحمتِ الٰہی:

دوستو اور بزرگو! حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے ہمیں یہ سبق دیا کہ جب دل میں اللہ پاک کی محبت پیدا ہو جائے تو دنیا کی محبت ضرور کم ہونی چاہیے، اگر نماز کے وقت نیند یا دنیاوی مشغولیات ہمیں روک رہی ہوں، اور ہم ان رکاوٹوں کو چھوڑ کر اللہ کے حضور کھڑے ہو جائیں، تو یہی سب سے بڑا کمال ہے، یہی اللہ کی طرف حقیقی رجوع ہے، اور پھر ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے بندے کی تکالیف دور فرما دیتا ہے۔

اسی طرح ایک اور ملفوظ میں آپ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کبھی انسان محنت کرتا ہے لیکن مطلوبہ نتیجہ حاصل نہیں ہوتا، وہ مایوس اور ناراض ہو جاتا ہے، حالانکہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتے ہیں: ''مِنۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ '' (شوریٰ:۲۸) جب لوگ مایوس ہو جاتے ہیں تو اللہ اپنی رحمت کو پھیلا دیتا ہے۔ حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اسی حقیقت کو اپنے اشعار میں یوں بیان فرمایا ہے:

بازآ بازآ ہرآنچہ ہستی بازآ گرکافر و گبر و بت پرستی بازآ
این درگہ ما درگہ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی بازآ

یعنی اللہ کی بارگاہ میں مایوسی کی کوئی جگہ نہیں، اگر سینکڑوں بار بھی توبہ توڑی ہو، تب بھی درِ خدا کھلا ہے، بندے کو پلٹ آنے کی دعوت ہے۔

دوستو اور بزرگو! ناامیدی کے اندھیروں میں اللہ پاک خود اپنی رحمت کی خوشخبری سناتا ہے: ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ؕ '' (زمر:۵۳) فرما دیجئے: اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اللہ کی رحمت سے ناامید مت ہو اور ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ''وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَيَّ ۚ '' (لقمان:۱۵) ان لوگوں کے راستے پر چلو جنہوں نے دل سے میری طرف رجوع کیا۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ اسی حقیقت کو اپنے مواعظ میں واضح فرماتے تھے کہ سب سے بڑا فتنہ یہ ہے کہ دنیا کی

محبت دلوں میں رچ بس جائے۔ آپؒ کی خانقاہ کا سب سے بڑا مشن یہی تھا کہ لوگوں کے دلوں سے دنیا کی محبت نکال کر اللہ کی محبت کو بٹھا دیا جائے۔

دنیا کی زندگی ایک عارضی سایہ:

دوستو اور بزرگو! یہ حقیقت ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے دنیا کی حقیقت کو مختلف مثالوں سے لوگوں کے سامنے واضح فرمایا، ایک ملفوظ میں آپ نے فرمایا کہ انسان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو دریا کے بیچ یا کنویں میں لٹکا دیا جائے اور اس کی رسی ایک بڑے طاقتور بادشاہ کے ہاتھ میں ہو، وہ چاہے تو اسے اوپر کھینچ لے اور چاہے تو نیچے گرا دے۔ اب سوچئے! اس وقت وہ بے بس انسان کسے پکارے گا؟ اسی بادشاہ کو، جس کے ہاتھ میں اس کی جان کی ڈور ہے۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس مثال کے ذریعے سمجھایا کہ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے؛ ہم ہر لمحہ اللہ کے محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دنیا کی مثال یوں بیان فرمائی: ''اِنَّمَا مَثَلُ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا کَمَآءٍ اَنْزَلْنٰہُ مِنَ السَّمَآءِ '' (یونس:۲۴) دنیا کی زندگی بارش کی طرح ہے، جو برستی ہے تو خشک زمین لہلہانے لگتی ہے، کھیتیاں سبز ہو جاتی ہیں، پھل اور پھول نکل آتے ہیں۔ کسان خوش ہوتا ہے اپنی کھیتی کو دیکھ کر؛ لیکن اللہ پاک فرماتے ہیں: ''اَتٰىهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ ط '' (یونس:۲۴) یعنی رات یا دن کے کسی وقت اللہ کا حکم آتا ہے اور وہ کھیتیاں کٹی ہوئی زمین کی طرح ہو جاتی ہیں، گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ یہ ہے دنیا کی حقیقت؛ آج سبزہ و بہار ہے، لیکن کل فنا اور بربادی ہے۔

دنیا کی مثال کھیتی کی مانند:

دوستو اور بزرگو! چوتھے پارے میں بھی اللہ پاک نے ایک نہایت بلیغ مثال ذکر فرمائی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایک بوڑھا آدمی ہے جس کی چھوٹی چھوٹی اولاد ہے، اب وہ پریشان رہتا ہے کہ میری اولاد ابھی کمزور ہے، نہ وہ مال و دولت کی حفاظت کر سکتی ہے، نہ اپنی جان کی حفاظت۔ اسی دوران اچانک ہوائیں چلتی ہیں اور اس کے باغ و باغیچے کو جلا کر یا اجاڑ کر ختم کر

دیتی ہیں۔ یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ '' (یونس:۲۴) انسان یہ سمجھتا ہے کہ میرا بیٹا جوان ہوگیا، میری فیکٹریاں چلنے لگیں، میری دکانیں مکمل ہوگئیں، اب دنیا کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤں گا؛ لیکن اللہ تعالیٰ بتلاتے ہیں کہ جیسے ایک ہری بھری کھیتی لمحوں میں برباد ہوجاتی ہے، ویسے ہی انسان کی دنیاوی کامیابیاں بھی لمحہ بھر میں ختم ہوسکتی ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى '' (اعراف:۵۷) اسی طرح ہم مردوں کو دوبارہ زندہ کریں گے۔ گویا دنیا کی یہ زندگی، اس کی رونقیں اور کامیابیاں ایک کھیتی کی طرح ہیں، جو کبھی لہلہا رہی ہوتی ہیں اور کبھی اچانک اجڑ جاتی ہیں۔

یاد رکھو! خاص طور پر اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندوں کا امتحان اسی طرح لیتے ہیں کہ ان کے دلوں میں سے دنیا کی محبت کو ختم کریں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں حضرت اسماعیلؑ کی محبت آئی، مگر اللہ کی شان یہ ہے کہ اس کے عشق میں کسی اور کی شرکت برداشت نہیں، اسی لیے اپنے محبوب خلیل سے وہ امتحان لیا کہ بیٹے کو اللہ کے راستے میں قربان کرنے کا حکم دے دیا۔ یہی حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مقرب بندوں کو دنیا کی محبت سے کاٹ کر اپنی ذات کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔

شاہ عبدالقادرؒ کی امانت داری اور ڈاکوؤں کی توبہ:

دوستو اور بزرگو! شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کا بچپن کا ایک واقعہ کتابوں میں ملتا ہے، آپ طالب علم تھے، کم عمر بچے تھے، والدہ ماجدہ نے سفر کے وقت آپ کو ایک گدڑی دی اور اس میں کچھ سونے کی اشرفیاں ڈال دیں، راستے میں ڈاکو آگئے اور سب لوگوں کا مال لوٹنے لگے، ہر شخص اپنی چیزیں چھپاتا تھا، لیکن حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کی نوبت آئی تو ڈاکوؤں نے پوچھا: تمہارے پاس کیا ہے؟ آپ نے سادگی سے فرمایا: میری ماں نے مجھے سونا دیا ہے، جو میرے بغل کے نیچے ایک تھیلی میں رکھا ہوا ہے، ڈاکو حیران رہ گئے کہ یہ بچہ جس سے ہم نے کچھ پوچھا بھی نہیں، خود اپنا راز کھول رہا ہے، حالانکہ ہر انسان اپنی چیز چھپاتا ہے۔ آپ نے وہ تھیلی ان کے حوالے کردی، یہ سچائی اور صداقت ڈاکوؤں کے دل پر بجلی بن کر گری۔ وہ سوچنے لگے کہ ایک بچہ اپنی

ماں کے کہے ہوئے وعدے کو نبھانے کے لیے اپنی جان اور مال کی پرواہ نہیں کرتا، اور ہم کون سی زندگی گزار رہے ہیں؟ ہم جھوٹ اور بددیانتی میں ڈوبے ہوئے ہیں! اسی لمحے اللہ پاک نے ان کے دلوں کو جھنجھوڑ دیا، اور وہ توبہ کر کے آپ کے ہاتھ پر اصلاح کے راستے پر چل پڑے۔ اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ''اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ'' (حدید:۱۶) کیا ایمان والوں کے لیے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے آگے پسیج جائیں؟ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ دنیا کی چیزوں میں امتحان آتے ہیں، لیکن سچائی، ایمان اور ماں کی نصیحت پر عمل انسان کو وہ مرتبہ عطا کر دیتا ہے جو دلوں کی زندگی بدل دیتا ہے۔

خاص بندوں کے خاص امتحانات:

دوستو اور بزرگو! یاد رکھو، اللہ کے خاص بندوں پر امتحانات بھی خاص آتے ہیں، ذرا حضرت اسماعیلؑ کو دیکھئے، باپ کی نگاہِ محبت پڑی تو فوراً منیٰ کے میدان میں ذبح کرنے کا حکم آ گیا، یہی امتحانِ عشق ہے کہ اللہ کی محبت کے مقابلے میں کسی اور کی محبت باقی نہ رہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کی زبان سے ایک مرتبہ نکل گیا: ''أنا أعلم الناس'' میں سب سے زیادہ جاننے والا ہوں۔ بات اپنی جگہ درست تھی مگر اللہ پاک کو اپنے محبوب نبی سے یہ دعویٰ پسند نہ آیا؛ چنانچہ اللہ پاک نے اپنے ایک خاص بندے، حضرت خضرؑ کے پاس بھیجا اور فرمایا: ''وَعَلَّمۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ﴿۶۵﴾'' (کہف:۶۵) ہم نے اُسے اپنے پاس سے خاص علم عطا فرمایا۔ یہ اللہ پاک کے علم کی وسعت اور امتحان کی شان ہے کہ حضرت موسیٰؑ جیسے جلیل القدر نبی بھی علم کی طلب میں سفر پر روانہ ہوئے اور یہی حقیقت حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے بیان فرمائی کہ اصل کامیابی حالات سے نہیں، بلکہ سچائی اور اللہ پاک کی طرف سے آنے والی نصرت سے ہوتی ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کی دعوت اور آج کا سبق:

دوستو اور بزرگو! ہمارے اسلاف نے جو دین کی خدمت کی، وہ کسی داستان سے کم نہیں، حضرت عبدالغنیؒ جو حنبلی مسلک کے بزرگ ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے

ہاتھ پر پانچ ہزار غیر مسلم ایمان لائے، اور ایک لاکھ مسلمان اپنے گناہوں سے توبہ کر کے سچے دین کی راہ پر آ گئے۔ یہ ہے آپؒ کی دعوت کی برکت اور اللہ کا وہ علم وفیض جو آپ کو عطا کیا گیا۔ آپؒ نے نہ صرف علم دیا بلکہ دنیا کی حقیقت بھی سمجھائی۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن میں فرمایا: '' زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ '' (آل عمران: ۱۴) یعنی لوگوں کے دلوں میں عورتوں کی محبت، اولاد کی چاہت، سونے چاندی کے ڈھیر، گھوڑے اور سواریوں کی رغبت ڈالی گئی ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ یہ محبتیں بُری نہیں، مگر شرط یہ ہے کہ ان کو جائز اور شریعت کے دائرے میں استعمال کیا جائے، یہی انسان کی کامیابی ہے۔ آج بھی جب مادیت کا طوفان اُسی طرح لوٹ آیا ہے جیسا کہ ایک ہزار سال پہلے تھا، تو ہمارے لیے سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ کے ملفوظات، آپ کی عملی زندگی اور آپ کی تعلیمات کو سمجھیں اور اپنی دنیا و آخرت کو سنواریں۔

فتنوں کے دور میں اولیاء کرام کی خدمات:

دوستو اور بزرگو! اولیاء کرام کو اللہ تعالیٰ نے دین کی حفاظت کے لیے دنیا میں بھیجا۔ انہوں نے ہر دور میں آنے والے فتنوں کا مقابلہ کیا۔ آپ دیکھئے! امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ آئے تو منطق اور باطل فرقوں کا رد فرمایا اور جب وہ بغداد چھوڑ گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اسی شہر میں ایک اور مردِ کامل کو کھڑا فرمایا، اور وہ تھے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، جو ۴۸۸ ہجری میں بغداد تشریف لائے۔ ان بزرگوں نے اپنے وقت کی سب سے بڑی بیماری مادیت کو مغلوب کیا اور دلوں کو اللہ کی محبت سے سرشار کیا۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد اور مشن تھا۔ اللہ پاک ہم سب کو ان اولیاء کرام کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ان کی صحیح تعلیمات کو اپنی زندگی میں اختیار کرنے کی سعادت نصیب فرمائے۔ آمین۔۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱۲)

محرم الحرام اور عظمت صحابہؓ

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين، و على آله و اصحبه أجمعين.

قال الله تبارک و تعالىٰ في الكلام المجيد و الفرقان الحميد.

اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ (بقرہ: ۱۵۴)

و قال النبی ﷺ: ليسَ مِنَّا مَن ضَرَبَ الخُدُودَ، أَوْ شَقَّ الجُيُوبَ، أَوْ دَعا بدَعْوَى الجاهِلِيَّةِ. (مسلم: كتاب الايمان، باب: تحريم ضرب الخدود و شق الجيوب و الدعاء بدعوى الجاهلية)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم، و نحن على ذالک لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين

محترم ومکرم حضرات علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج میں نے جو آیاتِ مبارکہ تلاوت کی ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عظیم فضیلت کا ذکر فرمایا ہے، جناب نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں رہ کر اللہ کے دین کے لئے صحابہ کرام نے جو قربانیاں پیش کیں، قرآن کریم کی متعدد آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے انہیں بیان فرمایا، انہی میں سے ایک آیت ہے: ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ'' جو لوگ اللہ کی راہ میں شہید کردیے جائیں، تم انہیں مردہ مت کہو، بلکہ اللہ فرماتے ہیں: ''بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾''

وہ زندہ ہیں، مگر تم اس کا شعور نہیں رکھتے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا: ''بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾'' (آل عمران:۱۶۹) وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں اور انہیں رزق دیا جارہا ہے۔

محرم کی برکتیں اور روزۂ عاشورہ:

یہ آیات ہمیں یاد دلاتی ہیں کہ اللہ کے راستے میں جان دینے والوں کی قربانی رائیگاں نہیں جاتی۔ میرے بھائیو! محرم کا مہینہ شروع ہو چکا ہے اور کل دس محرم ہے۔ اس دن کی فضیلت احادیث میں کثرت سے آئی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: رمضان کے بعد سب سے افضل روزہ عاشورہ کا ہے۔ (مسلم: کتاب الصیام، باب فضل صوم المحرم) حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ جب تک رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے، اُس وقت عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ (بخاری: کتاب الصوم، باب صیام یوم عاشوراء) پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو دیکھا کہ یہودی دس محرم کا روزہ رکھتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا: تم اس دن کا روزہ کیوں رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا: اس دن اللہ تعالیٰ نے موسیٰ ؑ اور ان کے ماننے والوں کو فرعون سے نجات عطا فرمائی اور فرعون کو غرق کیا۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: **"نحن أَوْلی بموسی منکم"** (بخاری: کتاب المناقب، باب اتیان الیهود النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین قدم المدینة) یعنی ہم موسیٰ علیہ السلام سے تم سے زیادہ قریب ہیں، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت کو حکم دیا: **"صوموا یوم عاشوراء"** عاشورہ کا روزہ رکھو۔ اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: **"خالِفوا الیهود، صوموا قبلَهُ یومًا أو بعده یومًا"** (مسند احمد: رقم:۲۱۸۸) یعنی یہودیوں کی مخالفت کرو، ایک دن پہلے یا ایک دن بعد کو بھی شامل کرو تاکہ امت کا اپنا تشخص باقی رہے، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عاشورہ کے روزے کو سنت قرار دیا اور امت کے لئے فضیلت اور اجر کا ذریعہ بنا دیا۔

ماضی کا محاسبہ، مستقبل کی تیاری:

دوستو اور بزرگو! محرم کی پہلی تاریخ سے ہماری اسلامی تاریخ کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ دن ہمارے لئے نئے سال کی ابتدا ہے۔ گزشتہ ہفتے ایک سال مکمل ہوا اور اب نیا سال شروع ہوا

ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ ''یقیناً اللہ کے ہاں مہینوں کی گنتی بارہ ہے،'' مِنْهَآ اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ط '' (توبہ:۳۶) ان میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں، انہی مہینوں میں محرم بھی ہے جسے اللہ پاک نے خاص عظمت اور حرمت والا بنایا، یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ہی ''محرم الحرام'' رکھا گیا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی ان مہینوں کا احترام کیا جاتا تھا اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے خطبات میں ان مہینوں کی حرمت وفضیلت کو خاص طور پر بیان فرمایا؛ لہٰذا محرم نہ صرف نئے سال کی ابتدا ہے بلکہ یہ ہمیں متوجہ کرتا ہے کہ ہم پچھلے سال پر نظر ڈالیں، ہم نے جو اعمال کیے اچھے یا برے ان کا محاسبہ کریں، بالکل ایسے ہی جیسے تاجر سال کے اختتام پر اپنے نفع ونقصان کا حساب کرتے ہیں؛ جہاں نفع بڑھا ہو وہاں مزید ترقی کی کوشش کرتے ہیں اور جہاں نقصان ہو وہاں اس کو پورا کرنے کی تدبیر کرتے ہیں، اسی طرح ایک مسلمان کو بھی چاہیے کہ وہ اپنے گزرے سال پر غور کرے اور نئے سال کو زیادہ نیک اعمال اور بہتر زندگی کے ساتھ شروع کرے۔

وقت کی قدر اور نجات کی چار بنیادیں:

دوستو اور بزرگو! زندگی کے یہ دن اور لمحے گزرتے چلے جارہے ہیں، اللہ تعالیٰ نے سورۂ عصر میں زمانے کی قسم کھا کر اعلان فرمایا: ''وَالْعَصْرِ ۝۱ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ ۝۲'' (عصر:۱-۲) یقیناً انسان خسارے میں ہے؛ لیکن اس نقصان سے بچنے کا راستہ بھی اللہ تعالیٰ نے واضح فرما دیا ہے، چار اعمال ہیں جن پر عمل کرنے والے ہی کامیاب قرار پاتے ہیں: ایمان لانا، نیک اعمال کرنا، ایک دوسرے کو حق بات کی نصیحت کرنا، اور مصیبت وآزمائش پر صبر کرنا، یہی چار بنیادیں ہیں جو دنیا وآخرت میں کامیابی کی ضمانت دیتی ہیں۔

صحابہ کرامؓ پر اللہ کی رضا اور ایمان کی محبت:

دوستو اور بزرگو! آگے جو آیت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی، وہ دراصل صحابہ کرام کی عظمت اور فضیلت کو ظاہر کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ

الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا﴿۱۸﴾'' (فتح:۱۸) یعنی اللہ پاک اس وقت ایمان والوں سے راضی ہو گئے جب وہ درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے۔ اللہ نے ان کے دلوں کا حال جانا، ان پر سکون نازل فرمایا اور انہیں قریب کی فتح کی خوشخبری دی۔ ایک اور مقام پر فرمایا: '' وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ۝'' (حجرات:۷) اللہ پاک نے ایمان کو ان کے دلوں میں محبوب بنا دیا، اسے آراستہ کر دیا، اور کفر و گناہ سے ان کے دلوں کو متنفر کر دیا۔

یہی وجہ ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب صحابہ کرامؓ کو اپنے دل کے خلاف دب کر مشکل شرطیں قبول کرنا پڑیں، وہ اندر سے راضی نہ تھے لیکن دین کے لیے غیرت اور حمیت کا تقاضا ہونے کے باوجود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر سر جھکا دیا، یہی اطاعت اور یہی وفاداری تھی جس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ'' اور پھر اعلان کیا: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ'' (فتح:۲۹) صحابہ کرامؓ اللہ کی رضا کے مقام پر فائز ہوئے اور اللہ نے ان کی اطاعت و قربانی کو ہمیشہ کے لیے قرآن میں محفوظ فرما دیا۔

صلح حدیبیہ؛ نام و نسبت کی قربانی اور اللہ کی طرف سے اعزاز:

ہوا یوں کہ جب یہ صلح نامہ لکھا جا رہا تھا تو مشرکینِ مکہ کی طرف سے سہیل بن عمرو آئے۔ بعد میں اللہ تعالیٰ نے ان کو ایمان کی توفیق عطا فرمائی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لکھوایا: بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، مگر عربِ جاہلیت اس کلمے سے ناواقف تھے، وہ صرف کہتے تھے باسمک اللھم سہیل نے فوراً اعتراض کیا کہ ہم تو صرف ''اللہ'' کا لفظ جانتے ہیں؛ حالانکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ۚ'' (اسراء:۱۱۰) چاہے اللہ کے نام سے پکارو یا رحمٰن کے نام سے، سب اللہ کے ہی خوبصورت نام ہیں۔ پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح نامے میں لکھوایا: محمد رسول اللہ، سہیل نے دوسرا اعتراض کیا کہ اگر ہم آپ کو

رسول مانتے تو آپ سے لڑائی ہی کیوں کرتے؟ اس لیے آپ صرف محمد بن عبداللہ لکھوائیں، حضرت علیؓ لکھ رہے تھے، انہوں نے انکار کیا اور عرض کیا: میں تو محمد رسول اللہ ہی لکھوں گا، اس پر آپ ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے وہ لفظ مٹا دیا اور لکھوایا: محمد بن عبداللہ اور ساتھ یہ جملہ بھی فرما دیا: میں اللہ کا رسول ہوں، چاہے تم انکار کرو، یہ قربانی اس قدر عظیم تھی کہ آپ ﷺ اپنے سب سے بڑے منصب یعنی رسالت کے ذکر پر بھی وقتی طور پر صبر کر گئے، لیکن اللہ تعالیٰ نے جواب دیا: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط'' (فتح:۲۹) محمد اللہ کے رسول ہیں، قرآن میں جہاں بھی نبی کریم ﷺ کا نام آیا وہاں صرف ''محمد'' ذکر ہوا، لیکن یہاں مشرکین کے انکار کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے خود اعلان فرمایا: ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط'' اور ساتھ ہی صحابہ کرامؓ کی شان بھی ذکر کی: ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ'' (فتح:۲۹) جو آپ ﷺ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں نہایت رحم دل ہیں۔

صحابہ کرامؓ؛ دن کے مجاہد، رات کے عابد:

رومی جب شکست کھا رہے تھے تو ہرقل نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ جا کر تحقیق کرو، آخر یہ اسلام دن بدن اتنی تیزی سے کیسے پھیل رہا ہے؟ وہ جاسوس اسلامی لشکر میں آئے اور دن کے وقت دیکھا کہ ''بالنهار فرسان'' یہ گھوڑوں پر سوار بہادر سپاہی ہیں، اور جب رات کو دیکھا تو ''بالليل رهبان'' ایسے اللہ کی عبادت میں مشغول کہ گویا ان کی زندگی کا مقصد ہی صرف عبادت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن میں بھی ان کی اسی شان کو ذکر فرمایا: رکوع اور سجدے میں ڈوبے ہوئے بندے۔ پھر تورات اور انجیل میں ان کی تعریف کو بیان فرمایا مگر سب سے بڑی فضیلت یہ عطا کی کہ فرمایا: ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط'' (توبہ:۷۲) اللہ کی رضا جنت سے بھی بڑی نعمت ہے۔ جنت اس وقت مزید حسین لگے گی جب بندہ جان لے گا کہ اللہ اس سے راضی ہے، اور جہنم سے دوری کا اصل سکون تب ہوگا جب اللہ اپنی رضا عطا فرمائے گا،

یہی وہ مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعے صحابہ کرام کو بخشا۔ صلحِ حدیبیہ کے موقع پر بھی اللہ نے بشارت دی: ''لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ ۙ ''(فتح:۲۷) اللہ نے سچ فرمایا کہ تم ان شاء اللہ ضرور امن وامان کے ساتھ مسجد حرام میں داخل ہوگے۔

اللہ کے برگزیدہ اور دین کے حاملین:

دوستو اور بزرگو! دس محرم کے دن حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ خاص طور پر ذکر کیا جاتا ہے، اس موقع پر حضرت حسن، حضرت علی رضی اللہ عنہما اور کچھ دوسرے صحابہ کرام کا بھی تذکرہ ہوتا ہے، ہم اہلِ سنت والجماعت ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کے تمام صحابہ کرام کے بارے میں ''**الصحابة كلهم عدول**'' ہے، سب کے سب عادل ہیں، نیک ہیں اور گواہی دینے کے لائق ہیں، ان کی گواہی سے بڑھ کر کسی کی گواہی معتبر نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عظمت اور فضیلت کے بلند ترین مقام پر فائز فرمایا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ خود صحابی رسول ہیں، وہ صحابہ کرام کی تعریف میں فرماتے ہیں: ''**اولئك أصحاب محمد ﷺ، اختارهم الله لصحبة نبيه و لاقامة دينه**'' (مشکاۃ المصابیح: باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ) یہ حضرات محمد ﷺ کے صحابہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت کے لیے چنا اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے منتخب فرمایا۔

نبی آخر الزماں ﷺ کی فریاد اور صحابہؓ کی عظمت:

غزوۂ بدر کے موقع پر دشمن ایک ہزار کی تعداد میں تھا اور اللہ کے نبی ﷺ صرف تین سو تیرہ صحابہ کو لے کر میدان میں پہنچے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چوتھے اور نویں پارے میں بدر کے واقعے کو بڑی تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا ہے، جہاں جناب نبی اکرم ﷺ کا خیمہ نصب کیا گیا تھا، وہاں آپ ﷺ رات بھر عبادت میں مشغول رہے اور زار وقطار اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرتے رہے۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کو تسلی دے رہے

تھے۔آپ ﷺ دعا میں عرض کر رہے تھے: یا اللہ! یہ تین سو تیرہ کی جماعت ہے، اگر آج یہ سب کے سب ختم ہو گئے تو روئے زمین پر کبھی بھی تیری عبادت نہ کی جائے گی۔آپ ﷺ خاتم النبیین ہیں، آپ کے بعد کوئی اور نبی آنے والا نہیں، لہٰذا یہ مٹھی بھر جماعت ہی وہ آخری سہارا ہے جس کے ذریعے آپ کے دین کی بقا ممکن ہے، اگر یہ باقی رہے تو اسلام دنیا میں قائم رہے گا، اور اگر یہ مٹ گئے تو پھر زمین پر کبھی بھی تیری عبادت نہ ہوگی۔(مسلم: کتاب الجهاد والسير، باب الامداد بالملائكة في غزوة بدر) یہ الفاظ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے شرف اور عظمت کو ظاہر کرتے ہیں کہ نبی آخر الزماں ﷺ نے اپنی دعا میں ان کے وجود کو دین کے بقا اور امت کی کامیابی کی ضمانت قرار دیا۔

صحابہ کرامؓ کی عظمت اور قرآنی سند:

دوستو اور بزرگو! انسان اپنے بیٹے پر خوش ہوتا ہے، جب وہ ڈاکٹر بنتا ہے یا انجینئر بنتا ہے تو باپ فخر کے ساتھ لوگوں کے سامنے ذکر کرتا ہے اور اگر کوئی غلط بات سامنے آجائے تو والد شرمندہ ہوتا ہے۔یہی مثال سمجھ لیجیے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کی صحبت میں جو حضرات رہے، ان کی صحبت کے سچے ہونے کی گواہی خود قرآن کریم دے رہا ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ''، وہ اللہ سے راضی اور اللہ ان سے راضی۔یہ کتنی بڑی سند ہے! پھر آگے فرمایا: ''اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۲۲﴾'' (مجادلہ:۲۲) کامیابی اگر چاہتے ہو تو انہی کے طریقے پر چلو؛ کیونکہ یہ وہ جماعت ہے جس کو اللہ نے کامیاب قرار دیا ہے۔اللہ پاک نے دین کی کامیابی کی ضمانت انہی کے راستے پر رکھی ہے، اسی لیے جب ہم محرم کے مہینے میں صحابہ کرامؓ کے تذکرے کرتے ہیں تو یاد رکھیں کہ اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ تمام صحابہ کرامؓ عادل ہیں، ان پر طعن و تشنیع جائز نہیں۔جہاں کہیں صحابہ کرامؓ سے کوئی ادنیٰ سی غلطی بھی سرزد ہوئی، قرآن کریم میں اس کا ذکر ضرور آیا، لیکن ساتھ ہی فوراً اللہ پاک نے ان کی مغفرت اور معافی کا اعلان فرمایا کہ اللہ غفور و رحیم ہے، یہ کتنی بڑی

فضیلت ہے! غزوۂ اُحد کا موقع لے لیجیے، وقتی شکست ہوئی اور اس پر کئی آیات نازل ہوئیں؛ لیکن ان تمام آیات میں بھی اللہ نے صحابہ کرامؓ کی عظمت کو باقی رکھا۔ فرمایا: ''اِنْ تَكُوْنُوْا تَاْلَمُوْنَ فَاِنَّهُمْ يَاْلَمُوْنَ كَمَا تَاْلَمُوْنَ ۚ وَتَرْجُوْنَ مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُوْنَ ؕ '' (نساء:۱۰۴) اگر تمہیں تکلیف پہنچی ہے تو انہیں بھی پہنچی ہے جیسی تمہیں پہنچی ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ تم اللہ سے اس خیر کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں۔

صحابہ کرامؓ کی فضیلت؛ ایمان کا حصہ:

دوستو اور بزرگو! حضراتِ صحابہ کرامؓ کی فضیلت ہمارے ایمان کا بنیادی جزو ہے، اسی بنیاد پر بڑے بڑے محدثین نے ان کے تذکرے کے لیے مستقل کتابیں تصنیف فرمائیں۔ حضرت حافظ ابن حجر عسقلانیؒ جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں، انہوں نے ''**الاصابہ فی تمییز الصحابہ**'' کے نام سے ایک عظیم کتاب لکھی، جس میں اُن تمام حضرات کے نام اور حالات جمع کیے جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی اور آپ کی مجلس میں بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا، یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ قرآن کریم نے جس عظمت اور تعریف کے ساتھ صحابہ کرامؓ کو یاد فرمایا، ویسی فضیلت کسی اور کو نہیں دی گئی، مختلف آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان کے امتحان کا ذکر کیا اور پھر ان کی کامیابی کو بیان فرمایا، اسی لیے ہمارے لیے ضروری ہے کہ ان دنوں میں صحابہ کرامؓ کا تذکرہ کرتے ہوئے ان کی بے ادبی یا بے عزتی کی کوئی بات زبان پر نہ لائیں۔ اللہ پاک نے خود قرآن کریم میں فرمایا: ''تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ '' (بقرہ:۱۳۴) یہ ایک ایسی امت ہے جو گزر چکی، ان کا مقام و مرتبہ اللہ کے نزدیک طے ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت پر اعتراض؛ ایک خطرناک رویہ:

ایک بزرگ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت معاویہؓ کا تقابل کرتے ہوئے کسی نے پوچھا کہ ان دونوں میں افضل کون ہے؟ تو انہوں نے عجیب جملہ فرمایا: حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شریک ہوئے،

ان کے گھوڑے کے نتھنے سے لگا ہوا گبار بھی حضرت عمر بن عبدالعزیز سے بڑھ کر ہے، کیونکہ اس نے رسول اللہ ﷺ کی رفاقت پائی ہے، یہ ہے وہ اندازِ فکر جو تابعین اور تبع تابعین کا تھا، کہ اپنے اساتذہ، یعنی صحابہ کرامؓ کا اکرام واحترام کرتے تھے۔ علامہ شعبی رحمۃ اللہ علیہ، جو بڑے محدث گزرے ہیں، وہ فرماتے ہیں: یہودیوں سے پوچھا گیا: تمہارے نزدیک سب سے افضل کون ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے متبعین، جوان کے پہلے درجے کے ساتھی تھے، وہ ہمارے نزدیک سب سے افضل ہیں۔ پھر عیسائیوں سے پوچھا گیا: تمہارے نزدیک سب سے افضل کون ہے؟ انہوں نے کہا: حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریین، جن کا ذکر قرآن نے بھی کیا ہے، وہ سب سے افضل ہیں۔ امام شعبی رحمۃ اللہ علیہ آگے فرماتے ہیں: لیکن افسوس! مسلمانوں کی ایک جماعت سے جب پوچھا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے افضل کون ہے؟ تو انہوں نے افضل نہیں کہا بلکہ بغض کا اظہار کیا، نفرت کا ذکر کیا، اور صحابہ کرامؓ کے نام لئے! کیا عجب بات ہے! یہود اپنے نبی کے متبعین کو افضل مانتے ہیں، نصاریٰ اپنے نبی کے حواریوں کو افضل مانتے ہیں، مگر مسلمانوں میں بعض ایسے لوگ پیدا ہو گئے جو خود نبی اکرم ﷺ کی صحبت پر اعتراض کرتے ہیں۔

اللہ کا منتخب کردہ گروہ؛ صحابہ کرامؓ:

محترم دوستو اور بزرگو! دیکھئے! دنیا میں اگر کسی کا بیٹا ڈاکٹر یا انجینئر بن جائے تو باپ کو کتنا فخر ہوتا ہے، وہ خوشی سے کہتا ہے: میرا بیٹا ڈاکٹر ہے، میرا بیٹا انجینئر ہے، یہ سب میری تربیت اور صحبت کا نتیجہ ہے؛ کیونکہ شاگرد کی کامیابی اصل میں استاد کی کامیابی ہوتی ہے۔ اب سوچئے! جناب نبی اکرم ﷺ کی صحبت سے بڑھ کر دنیا میں اور کس کی صحبت ہو سکتی ہے؟ اگر کوئی اُن خوش نصیبوں کے بارے میں زبان درازی کرے جنہوں نے براہِ راست اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت پائی، تو درحقیقت یہ الزام صرف شاگردوں پر نہیں بلکہ استاد کی ذات پر بھی ہے۔ محرم کے مہینے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ واٹس ایپ اور سوشل

میڈیا پر صحابہ کرام کے بارے میں غلط اور بے بنیاد باتیں پھیلاتے ہیں، حالانکہ صحابہ وہ مقدس ہستیاں ہیں جنہیں خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت کے لیے منتخب فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ؛ جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، ارشاد فرماتے ہیں: ''اختارهم الله لصحبة نبيه'' اللہ تعالیٰ نے ان ہستیوں کو اپنے نبی کی صحبت کے لیے خاص طور پر چُن لیا۔ یہ کسی انسان کے منتخب کیے ہوئے نہیں تھے، بلکہ براہِ راست اللہ کے پسندیدہ اور منتخب بندے تھے۔ پھر انسان اگر کچھ کہے بھی تو اس کا کوئی وزن نہیں، کیونکہ یہ انتخاب خود ربّ کریم کا ہے۔

عداوت نہیں، محبت کرو:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کے دلوں پر نظر ڈالی، تو سب سے پاکیزہ، سب سے متقی اور سب سے پرہیزگار دل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نکلا؛ لیکن اسی روایت میں یہ بھی فرمایا گیا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے افضل جماعت میرے صحابہ ہیں، اللہ تعالیٰ نے خود اپنے خاص فضل سے ان کو میرے ساتھ رہنے کے لیے منتخب فرمایا۔ (مسند احمد: رقم: ۳۴۶۸) یہ کسی انسان کا انتخاب نہیں تھا بلکہ یہ اللہ کا انتخاب تھا؛ اسی لیے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید کے ساتھ فرمایا کہ میرے صحابہ کا خیال رکھا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک اور موقع پر فرمایا: ''خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم'' (بخاری: كتاب الشهادات، باب لا يشهد على شهادة جور اذا أشهد) سب سے بہتر زمانہ میرا زمانہ ہے، پھر ان کے بعد والا زمانہ، پھر اس کے بعد والا زمانہ۔ اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح کر دیا کہ میرے صحابہ کرام سب سے بہتر لوگ ہیں، صحابہ کے بارے میں اللہ پاک سے ڈرو، لہٰذا ان سے عداوت نہ رکھو اور ان کے خلاف دلوں میں بغض نہ رکھو، جس نے ان سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی، جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ پاک سے محبت کی۔ (ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب فيمن سب اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

محبتِ حسینؓ ایمان کا حصہ، بدظنی ایمان کا زیاں:

حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی صحابیٔ رسول ہیں اور حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی صحابیٔ رسول ہیں۔ ایک کی عمر چار سال سے زیادہ تھی اور دوسرے کی پانچ سال سے زیادہ، اسی لیے صحابہ کرام کی فہرست میں یہ دونوں عظیم ہستیاں شامل ہیں۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو ''سَیِّدا شَبابِ اَھلِ الجنة'' جنت کے نوجوانوں کے سردار قرار دیا۔ (ترمذی: ابواب الدعوات، باب مناقب ابی محمد الحسن بن علی بن ابی طالب) انہوں نے دین کی خاطر قربانی دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایت میں صاف الفاظ ہیں: ''لَیسَ مِنَّا مَن ضَرَبَ الخُدُودَ، وَشَقَّ الجُیُوبَ، وَدَعَابِدَعوَی الجَاھِلِیَّة'' وہ ہم میں سے نہیں جو رخسار پیٹے، گریبان پھاڑے یا جاہلیت کے رسم ورواج اختیار کرے۔ (بخاری: کتاب الجنائز، باب لیس منا من ضرب الخدود)

حضرت مولانا عبد الماجد دریابادی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ شخصیت کے مالک تھے۔ سرکاری سطح پر بھی نہایت بلند عہدوں پر فائز رہے، مگر بعد کی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو دین کی طرف کھینچ لیا، آپ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیرِ ماجدی بھی تصنیف کی، جو آج تک اہلِ علم کے لیے سرمایہ ہے۔ مولانا ایک جگہ نہایت اہم بات لکھتے ہیں کہ: ماتم تو اس کا کیا جاتا ہے جو دنیا سے رخصت ہو گیا ہو، زندوں کا ماتم نہیں ہوتا اور ہمارے حسینؓ زندہ ہیں۔ یہ جملہ کتنا بامعنی ہے! کیونکہ حضرت حسینؓ ان خوش نصیبوں میں سے ہیں جن کے بارے میں قرآن نے صاف اعلان فرمایا: ''وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾'' (بقرہ: ۱۵۴) جو اللہ کی راہ میں شہید ہو، اُسے مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تم شعور نہیں رکھتے۔ حضرت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت دراصل یہ اعلان ہے کہ جب باطل کے سامنے میدان خالی ہو جائے اور کوئی آواز بلند کرنے والا نہ ہو، تو ایک سچا مومن اپنی جان دے کر حق کو زندہ رکھتا ہے، وہ بھی صحابی ہیں، جنت کے نوجوانوں کے سردار ہیں، وہی حسین ہیں جنہیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی گود میں اٹھاتے، خطبہ کے دوران منبر سے نیچے

اتر کر ان کو تھام لیتے، اور پھر یہ بھی فرماتے کہ اولاد انسان کے لئے آزمائش کا ذریعہ ہے۔ (ترمذی: ابواب المناقب عن رسول اللہ ﷺ) یہ سب واقعات ہمیں یہ سبق دیتے ہیں کہ ان سے محبت اور عقیدت ایمان کا حصہ ہے، لیکن اس کی بنیاد پر کسی دوسرے صحابی کے متعلق بدظنی یا بدگمانی کرنا ایمان کے لیے خطرہ ہے، بلکہ ایمان کو کھینچ کر لے جانے والی چیز ہے۔

ایمان کی کھیتی کے خوشبودار پودے:

جو آیت میں نے آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی، اللہ پاک خود فرماتے ہیں: ''رُحَمَآءُ بَیۡنَہُمۡ'' اور آگے صحابہ کرام کی مثال تورات اور انجیل میں بھی ذکر فرمائی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کَزَرۡعٍ اَخۡرَجَ شَطۡـَٔہٗ فَاٰزَرَہٗ'' (فتح:۲۹) کھیت کی مثال دی، بارش کے دنوں میں کسان بیج ڈالتا ہے، وہ بیج زمین کی تہوں میں چھپ جاتا ہے، پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے اسے چیر کر اوپر نکالتا ہے، پودا بڑھتا ہے، تنا مضبوط ہوتا ہے، اور آخر کار لہلہاتا کھیت کسان کو خوشی دیتا ہے۔

یہی مثال اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی دی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غارِ حرا سے دعوت کا آغاز تن تنہا کیا، پھر حضرت ابوبکرؓ آئے، حضرت خدیجہؓ آئیں، حضرت علیؓ آئے، پھر حضرت عمرؓ اور دیگر صحابہ آتے گئے۔ اللہ کے نبی کی یہ کھیتی دن بدن بڑھتی گئی، اور دین کے سرسبز کھیت تیار ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ'' کاشتکار خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے صحابہ کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

اور پھر فرمایا: ''لِیَغِیۡظَ بِہِمُ الۡکُفَّارَ'' تاکہ کافروں کے دل جلیں۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ، جو مدینہ منورہ کے بڑے امام اور امام دار الہجرۃ ہیں، انہوں نے برسوں مسجد نبوی میں حدیث شریف کا درس دیا۔ آپ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ پاک نے صحابہ کرام کے بڑھنے اور دین کے لئے قربانی دینے کی مثال کھیتی کے بیج سے دی ہے۔ فرمایا: ''یُعۡجِبُ الزُّرَّاعَ'' کھیتی کرنے والا ان سے خوش ہو رہا ہے، یہی کیفیت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بھی نظر آئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال سے پہلے، اتوار کی فجر میں نماز کے لئے تو نہ آ سکے، لیکن حجرے سے باہر سر

مبارک نکالا، صحابہ کرام کو نماز کے لئے کھڑا دیکھا، اور خوش ہوکر واپس حجرے میں تشریف لے گئے۔ (بخاری: کتاب الاذان، باب اھل العلم و الفضل احق بالامامۃ) یہ منظر اسی آیت کی تفسیر ہے۔ گویا کاشتکار اپنی کھیتی کو لہلہاتے دیکھ کر خوش ہورہا ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تنہا مکہ کے بازاروں میں اللہ کا دین پکارا، اور آج مدینہ کی مسجد میں ایک عظیم جماعت تیار کھڑی تھی۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: یہی ہے ''لِيَغِيظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ط'' نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کو دیکھ کر خوش ہورہے ہیں، اور کافران کی بڑھتی ہوئی شان اور کامیابی دیکھ کر جل رہے ہیں۔ پھر امام مالک نے تنبیہ کی کہ جس کے دل میں بھی صحابہ کرام کے خلاف بغض ہوگا، وہ اس آیت کا مصداق ہے اور ایمان والوں میں شامل نہیں۔ یاد رکھیں! صحابی وہ ہے جس نے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں ایمان کے ساتھ وقت گزارا، چاہے تھوڑا ہو یا زیادہ، اور پھر ایمان پر ہی دنیا سے رخصت ہوا۔ اسی نسبت کی وجہ سے انہیں ''صحابی'' کہا جاتا ہے۔ عام دوستوں کو ''اصحاب'' کہا جاسکتا ہے، مگر نبی کے ساتھیوں کے لئے ''صحابی'' کا لفظ ایک خاص شرف اور عظمت رکھتا ہے۔

دوستو اور بزرگو! یہ ایام بڑے قیمتی اور اہم ہیں، ان میں ہمیں چاہیے کہ ہم صحابۂ کرام کی قربانیوں کو یاد کریں اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اپنے صحابہ کے بارے میں فرمائے گئے جملوں کو دل میں تازہ کریں، افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ آج کل (Whatsapp) اور دیگر ذرائع ابلاغ پر بعض لوگ صحابہ کرام کے خلاف غلط باتیں پھیلاتے ہیں، ہمارا نوجوان چونکہ اسلامی عقیدہ اچھی طرح نہیں جانتا، اس لئے کبھی ان باتوں میں بہہ جاتا ہے، یہ بڑی خطرناک چیز ہے۔ لہٰذا ہمیں لازم ہے کہ ہم اپنے دلوں میں صحابۂ کرام کی محبت اور عظمت کو بٹھائیں، کیونکہ یہی محبت دراصل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ صحابۂ کرام کی عظمت ہمارے دلوں میں پیدا فرمائے، ہمارے ایمان کو محفوظ رکھے، اور جو نیا سال شروع ہوا ہے اسے خیر، عافیت، ایمان اور اعمال صالحہ کے ساتھ مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱۳)

سورۂ نور کی روشنی میں سماجی زندگی کے اُصول

(مجلس نکاح)

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰت و السلام علی سید المرسلین و علی آله و اصحابه اجمعین.

قال الله تبارک و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم.

سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا وَفَرَضْنٰهَا وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ① (نور:۱)

وقال تعالیٰ:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ ③۰ (نور:۳۰)

وقال النبی ﷺ: يَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ، مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمُ الْبَاءَةَ فَلْيَتَزَوَّجْ، فَإِنَّهُ أَغَضُّ لِلْبَصَرِ، وَأَحْصَنُ لِلْفَرْجِ، وَمَنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَعَلَيْهِ بِالصَّوْمِ، فَإِنَّهُ لَهُ وِجَاءٌ. (مسلم: کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیك)

صدق الله العظیم و صدق رسوله النبی کریم و نحن علی ذلک لمن الشاهدین و الشاکرین و الحمدلله رب العالمین.

گھر سے سماج تک؛ قرآن کی رہنمائی:

محترم ومکرم حضرات علمائے کرام، عزیز طلبہ اور ایمان والے بھائیو! گزشتہ جمعہ کو بھی نکاح کی مجلس میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی اور اس جمعہ کو بھی نکاح کے سلسلے میں حاضری ہوئی ہے۔ آپ حضرات کے سامنے میں نے سورۂ نور کی دو آیتوں کی تلاوت کی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ

نے سورۂ نور کا آغاز اس اعلان کے ساتھ فرمایا: ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا'' یہ ایک ایسی سورت ہے جس کے الفاظ ہم نے نازل فرمائے۔ پھر فرمایا: ''وَفَرَضْنٰهَا'' اس کے احکام اور معانی کو ہم نے مقرر کیا، اور فرمایا: ''وَاَنْزَلْنَا فِيْهَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ'' ہم نے اس سورت میں واضح اور کھلی آیات نازل فرمائیں تاکہ کسی کو شبہ باقی نہ رہے۔ اور پھر مقصد بھی ذکر فرمایا: ''لَّعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ'' تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورۂ نور ایک خاص مقصد کے لیے نازل ہوئی ہے۔

اس میں بتایا گیا کہ انسان اپنی سماجی زندگی (Social life) کس طرح گزارے، کن چیزوں سے بچے، اور کون سی خرابیاں ہیں جو گھر کے ماحول سے لے کر پوری سوسائٹی تک فساد اور کرواہٹ پیدا کر دیتی ہیں۔ قرآن کریم نے ان تمام رکاوٹوں اور مسائل کا علاج بیان کیا ہے، چاہے وہ ایک گھر کے چھوٹے چھوٹے اختلافات ہوں یا پوری امت مسلمہ کی معاشرتی کمزوریاں۔

اسلامی معاشرے کی بنیاد اور منافقین کی سازش:

اس سورۃ کا بنیادی موضوع حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر لگائی گئی تہمت کا رد ہے، یہ ایک بہت بڑا منصوبہ تھا جو مشرکین و یہود کی سازش اور مدینہ کے منافقین کی چال تھی، اسلام ہجرت کے بعد مدینہ منورہ پہنچ چکا تھا اور وہاں ایک اسلامی ریاست اور اسلامی حکومت قائم ہو چکی تھی، اب اس نو قائم شدہ سماج اور سوسائٹی کو وہ تمام چیزیں اپنانی تھیں جو ایک بہتر اور صالح معاشرے کی پہچان ہوتی ہیں، اسی پس منظر میں اللہ پاک نے یہ احکام نازل فرمائے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تہمت لگانے کا واقعہ پیش آیا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ کا آغاز ہی اس واقعے کے ضمن میں بڑی شدت اور تاکید کے ساتھ فرمایا: ''سُوْرَةٌ اَنْزَلْنٰهَا'' اور پھر واضح اور کھلی نشانیوں کے ذریعے ہماری سماجی زندگی کے مسائل اور ان کا حل بیان فرمایا۔

مرد و عورت کے لیے الگ الگ قرآنی ہدایات:

دوستو اور بزرگو! قرآنِ کریم نے سورۂ نور میں سات بڑے آداب ذکر فرمائے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا ادب استئذان ہے، یعنی اگر کسی کے گھر جانا ہو تو اجازت لے کر جاؤ، اور

اجازت سلام کے ساتھ مانگو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاِنْ قِيْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْ ۭ '' (نور:۲۸) اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جاؤ، یہی تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے، اگر گھر والے کسی مجبوری یا کسی پریشانی کی وجہ سے اس وقت بات نہ کرسکیں اور کہہ دیں کہ بعد میں آنا، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ واپس لوٹ جاؤ۔

نگاہوں کی حفاظت اور استئذان کی حکمت:

حدیث شریف میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**النظرة سهم من سهام إبليس**'' (مستدرک للحاکم: کتاب الرقاق، رقم: ۸۰۷۳) نظر شیطان کے تیروں میں سے ایک تیر ہے، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں نگاہیں نیچی رکھنے کا حکم فرمایا۔

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**إنما جعل الاستئذان من أجل البصر**'' (بخاری: کتاب الاستئذان، باب الاستئذان من اجل البصر) استئذان اس لیے رکھا گیا ہے تاکہ نگاہ بے موقع نہ پڑے، اگر نگاہ بے موقع پڑ جائے تو پھر فتنوں اور مسائل کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے سب سے پہلی احتیاط یہی ہے کہ اجازت لے کر گھر میں داخل ہوا جائے، اسی طرح قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والے مردوں کو خطاب کر کے فرمایا: ''قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ '' اے نبی! ایمان والے مردوں سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔ یہاں عورتوں کو شامل کرنے کے لیے یہی کافی تھا؛ لیکن قرآن کریم نے مزید تاکید کے ساتھ فرمایا: ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ '' (نور:۳۱) اور ایمان والی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

گھروں میں داخلے کے قرآنی آداب:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات میں سب سے پہلے ہمیں اجازت لینے کا حکم دیا ہے اور اگر واپس جانے کا کہا جائے تو چلے جائیں، اور پھر اس کے بعد فرمایا کہ ایسے مکانات جس میں کوئی نہیں رہتا ہے، جیسے ریلوے اسٹیشن یا اس قسم کی عام جگہیں ہیں، تو وہاں کے آداب اور

اصول کے مطابق اجازت لی جائے، پلیٹ فارم کا ٹکٹ لیا جائے، ہسپتال میں Card لے جا کر جایا جائے، یہ ساری چیزیں آیت کے ذریعے اللہ تبارک وتعالی نے ذکر فرمائی؛ کسی کے گھر ایسے ہی بغیر بتائے اور بغیر سلام کے داخل ہونے سے کتاب اللہ میں منع فرمایا، حتی کہ وہ چھوٹے بچے جو ابھی شرعی طور پر مکلف نہیں ہے، ''وَاِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنْكُمُ الْحُلُمَ فَلْيَسْتَاْذِنُوْا كَمَا اسْتَاْذَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ '' (نور:۵۹) اللہ پاک نے ان بچوں کے سلسلے میں والیوں کو فرمایا کہ ان بچوں کے لیے بھی کسی کے گھر میں داخل ہونے کے آداب و اصول ہیں، جس طرح تمہیں یہ بتلایا گیا؛ اپنے بچوں کو بھی یہ آداب سکھائیں، اسی طرح گھر کے نوکر چاکر اور غلام وغیرہ جو بار بار آتے جاتے رہتے ہیں؛ ان کے لیے بھی تین اوقات ایسے بتلائے کہ جن کے اندر ان کو اجازت لیے بغیر داخل نہیں ہونا ہے، یعنی تین اوقات میں داخل ہی نہ ہوا جائے کہ اجازت لینے کی ضرورت پڑے، اس لیے کتاب اللہ نے اجازت کے مسائل کو اتنی تفصیل سے ذکر فرمایا ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِيَسْتَاْذِنْكُمُ الَّذِيْنَ مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ وَالَّذِيْنَ لَمْ يَبْلُغُوا الْحُلُمَ مِنْكُمْ ثَلٰثَ مَرّٰتٍ ؕ '' (نور:۵۸) یہ تین اوقات قرآن نے ذکر فرمائے، اس میں کسی کے گھر میں جانا نہی ہے، بچوں کو بھی ان تین اوقات میں روکنا ہے، یہ قرآن کریم نے سب سے بنیادی طور پر سب سے پہلے بریک لگائی اجازت لینے کی۔

سماجی برائیوں سے اجتناب:

اسی طرح قرآن کریم نے ایک اور بڑی برائی سے روکا، جو ہمارے معاشرے میں عام پائی جاتی ہے، اور وہ ہے ایک دوسرے کا مذاق اڑانا، دوسروں کو حقیر سمجھنا اور ٹھٹھا کرنا۔ اس بارے میں ارشاد ہے ''يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰۤى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ '' (حجرات:۱۱) اے ایمان والو! نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق بنایا جارہا ہے وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔

یہ بھی سماجی زندگی کا ایک بہت اہم مسئلہ ہے: ایک دوسرے پر لعن طعن کرنا، غیبت کرنا اور تہمت لگانا؛ چونکہ عورتیں اس میں زیادہ مبتلا ہوتی ہیں اس لیے قرآن نے مردوں کو بھی حکم فرمایا اور عورتوں کو بھی، سب کو ساتھ ساتھ نصیحت کی گئی کہ ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائیں، اور کسی کو حقیر نہ سمجھیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ رویہ دراصل تکبر کی نشانی ہے۔ آدمی اپنے آپ کو بڑا سمجھ کر دوسرے کو کم تر جانتا ہے، اسی لیے کتاب اللہ نے صاف الفاظ میں اس سے بھی منع فرمادیا۔

عورتوں کے لیے قرآنی ہدایات؛ نگاہ، عصمت اور پردہ:

دوسرا ادب جو ایمان والوں کے لیے بیان فرمایا وہ ہے نگاہوں کو نیچی رکھنا۔ اسی کے ساتھ اللہ تبارک و تعالیٰ نے عورتوں کو بھی حکم فرمایا: ''وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ '' (نور:۳۱) اور مؤمن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں، اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت کو اجنبی مردوں کے سامنے ظاہر نہ کریں، ''اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۪ '' جو زینت خود بخود ظاہر ہو جائے، اس کے سوا اور اپنی اوڑھنیوں کو اپنے گریبانوں پر ڈال لیا کریں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کو پردے کا اور اوڑھنی کا حکم دیا، البتہ یہ پابندی محرم رشتوں کے علاوہ ہے، قرآن کریم نے بارہ محرم رشتہ داروں کا ذکر فرمایا ہے، جن کے ساتھ عورت کا میل جول، بات چیت کرنا، سلام وکلام کرنا اور حتیٰ کہ کھانے پینے میں شریک ہونا بھی جائز ہے، یہ نہیں کہا گیا کہ عورت اپنے قریبی محرم رشتہ داروں سے بات نہ کرے یا ان کی خیر خیریت نہ پوچھے؛ لیکن غیر محرم اور اجنبی مردوں کے ساتھ میل جول اور آزادانہ بات چیت سے کتاب اللہ نے منع فرمایا اور یوں عورت کے لیے تین بنیادی ہدایات دی گئیں: نگاہ نیچی رکھنا، اپنی عصمت وعفت کی حفاظت کرنا، اور پردے کا اہتمام کرنا۔

زمانۂ جاہلیت کی رسم اور اسلام کی روشن تعلیم:

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آخری آیت کریمہ میں ایک اہم مسئلہ کا ذکر فرمایا۔ اُس زمانے میں یہ رواج تھا کہ مالدار لوگ اپنی باندیوں کو زنا کے لئے دوسروں کے پاس بھیجتے اور اس کے

بدلے پیسے کماتے۔ حدیث شریف میں اس عمل کو ’’مھر البغی‘‘ کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ (بخاری: کتاب الاجارۃ، باب کسب البغی والاماء) اسی طریقے سے طوائف خانے قائم تھے اور لوگ اس کی طرف رغبت رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس قبیح عمل سے روکتے ہوئے فرمایا: ’’وَلَا تُكْرِهُوْا فَتَيٰتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ ‘‘ (نور: ۳۳) اپنی عورتوں (باندیوں) کو، جو پاک دامن رہنا چاہتی ہیں، محض دنیاوی فائدے کے لئے زبردستی بدکاری پر مجبور مت کرو۔ یہ جاہلیت کا رواج تھا، لیکن اسلام نے آکر اس پر روک لگا دی، اس سے ہمیں سبق ملا کہ اپنی لڑکیوں کی حفاظت کریں، ان کی نگرانی کریں اور مسلم معاشرے میں بیٹیوں اور بہنوں کی بھی دیکھ بھال کریں، ہمیں چاہیے کہ اُنہیں اس گناہ سے ڈرائیں اور بچائیں، اگر ہم نے لاپرواہی کی تو یہ گناہ ہمارے اپنے گھروں تک پہنچ سکتا ہے، اسی لئے اللہ کی کتاب ہمیں حکم دیتی ہے کہ اس قسم کی برائیوں کو اپنے معاشرے اور سوسائٹی سے بالکل ختم کریں۔

فحاشی کی ترویج پر قرآنی تنبیہ:

اللہ تعالیٰ نے اس کے ساتھ ایک اور حکم فرمایا جو اسی سے جڑا ہوا ہے: ’’اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِيْعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۙ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ ‘‘ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ مسلم سماج پاکیزہ، باحیا اور شرم وعفت والا ہونا چاہیے، ایسے سماج میں جہاں برائی داخل ہونے کا خطرہ ہو، وہاں اللہ تعالیٰ نے روک لگا دی ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ برائی، بے حیائی اور منکرات مؤمنوں کے درمیان عام ہوں، اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اعلان فرمایا کہ ان کے لیے دنیا میں بھی دردناک عذاب ہے اور آخرت میں بھی۔

ذرا غور کیجیے! قرآن نے فرمایا: ’’اِنَّ الَّذِيْنَ يُحِبُّوْنَ ‘‘ یعنی صرف وہ لوگ نہیں جو برا کام کریں بلکہ وہ بھی سخت گنہگار ہیں جو یہ پسند کرتے ہیں کہ معاشرے میں بے حیائی پھیلے۔ آج ہمارے دور میں یہ برائیاں مختلف ذرائع سے آرہی ہیں: موبائل فون کے غلط استعمال

سے، ٹی وی اور ڈراموں سے، فحش لٹریچر اور بے مقصد اخبارات سے۔ چودہ سو سال پہلے قرآن نے خبر دے دی تھی کہ جو لوگ ایسی برائیوں کو معاشرے میں عام کریں گے، وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ اللہ تعالیٰ کے سخت عذاب کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ '' (لقمان:٦) کچھ لوگ ایسے ہیں جو کھیل تماشے اور لغو باتوں کو خریدتے ہیں، یعنی گانے بجانے اور فضول مشاغل کے ذریعے لوگوں کو بہکاتے ہیں، لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے معاشرے کو ان تمام برائیوں سے محفوظ رکھیں، ان پر بریک لگائیں اور انہیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کریں تاکہ یہ بیماریاں اور وبائیں ہمارے سماج میں داخل نہ ہوں۔

غیر اسلامی رسومات اور نکاح کی مشکلات:

ایک طرف اللہ تعالیٰ نے اسی سورۃ میں زنا کی سزا بیان فرمائی اور نہایت سخت سزا مقرر کی، لیکن ساتھ ہی اس کے ثبوت کے لیے گواہی کی کڑی اور سخت شرطیں بھی رکھیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں کسی پر تہمت لگانا یا بے بنیاد الزام تراشنا بھی کتنا بڑا جرم ہے۔ زنا کا گناہ اور نظر بد کا مرض ایسا متعدی روگ ہے جو ایک جگہ رُکنے والا نہیں، بلکہ آہستہ آہستہ پھیل کر پورے سماج اور سوسائٹی کو بگاڑ دیتا ہے۔ یہی وہ گناہ ہے جس کی بنیاد پر کئی اور گناہ جنم لیتے ہیں، حتیٰ کہ اسے ''اُمّ الامراض'' کہا جاسکتا ہے، یعنی بیماریوں کی ماں۔ آج کے معاشرے پر نظر ڈالیں، تو اخبارات کی سرخیاں اور روزمرہ کے واقعات اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ سماجی جھگڑوں، قتل و غارت گری اور دشمنیوں کی ایک بڑی وجہ یہی زنا کاری اور عورتوں کے ساتھ تعلقات کے ناجائز مسائل ہیں۔ یہ سب اس بگاڑ کے اثرات ہیں جس نے خاندان اور حسب ونسب کے نظام کو کھوکھلا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور انسان اور جانور کے درمیان فرق یہی رکھا کہ انسان کو نکاح کے مقدس رشتہ میں باندھا، جبکہ جانوروں میں اس طرح کا کوئی نظام نہیں، نکاح کو اسلام نے سادہ اور آسان رکھا تاکہ ہر شخص اس سے فائدہ اٹھا سکے اور یہ سماج

پر بوجھ نہ بنے؛ لیکن جہاں نکاح کو جہیز، بھاری لین دین یا معاشرتی دباؤ کا ذریعہ بنا دیا گیا ہے، وہاں ان غیر اسلامی رسومات نے نکاح کو مشکل بنا دیا، اسلام ان کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ ہاں، اگر آپس کی خوشی اور رضامندی سے کوئی چیز دی جائے تو جائز ہے، لیکن جب نکاح کے موقع پر لازم قرار دے کر لڑکوں یا لڑکیوں پر بوجھ ڈالا جائے تو یہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ پس ان آیات کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ہمیں زنا سے بچنے، نگاہوں کو قابو میں رکھنے، اور نکاح کو آسان و پاکیزہ رکھنے کی تعلیم دی ہے تاکہ معاشرہ اور سوسائٹی محفوظ رہے۔

دل کا نور کہاں سے آتا ہے؟

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ نور میں ان تمام آداب اور احکام کو بیان فرمایا ہے تاکہ ہمارا سماج اور سوسائٹی پاکیزہ اور باعفت رہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ''وَتُوْبُوْٓا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝۳۱'' (نور:۳۱) اگر کسی مرد یا عورت سے کوئی لغزش ہو جائے، کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اللہ کی بارگاہ میں توبہ واستغفار کریں۔ سورۃ کا نام اللہ تعالیٰ نے ''سورۂ نور'' رکھا اور فرمایا: ''اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ'' (نور:۳۵) خیر! ایک مؤمن کے دل میں ایمان کا نور کیسے آتا ہے؟ قرآن کہتا ہے: ''اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰي نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ'' (زمر:۲۲) جس بندے کا سینہ اللہ ایمان کے لئے کھول دیتا ہے، اللہ پاک اس کو اپنے نور سے نواز دیتا ہے۔ اسی لئے سورۂ نور میں بتایا گیا کہ اگر تمہیں اپنی زندگی میں نور چاہیے تو عبادتوں کے ذریعے، اعمال صالحہ کے ذریعے، اپنی نگاہوں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کے ذریعے نور حاصل ہوگا؛ چنانچہ فرمایا: ''فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ'' (نور:۳۶) یہ نور ان گھروں میں نازل ہوتا ہے جہاں اللہ کا ذکر ہوتا ہے، یعنی مسجدوں میں، اور ان لوگوں پر جو نماز قائم کرتے ہیں اور گناہوں سے بچتے ہیں۔ سورۂ مؤمنون میں بھی یہی کامیابی ذکر کی گئی: ''وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝۵'' (مومنون:۵) ایمان والے کامیاب ہوئے، جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ پس سورۂ نور اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ

اگر سماج کو نورانی اور پرامن بنانا ہے، خیر وعافیت والا بنانا ہے، تو کتاب اللہ کے ان اصولوں اور آداب کو سماجی زندگی میں اپنانا ہوگا۔ یہی راستہ ہے نورانی زندگی کا۔

اس لیے بزرگوں نے فرمایا ہے کہ بہت سی عبادتوں میں سب سے بڑی رکاوٹ بدنظری بنتی ہے، جب انسان اجنبی عورت کی طرف غلط نظر ڈالتا ہے تو اس کی بنیاد پر عبادتوں کی لذت ختم ہوجاتی ہے اور دل سے نور جاتا رہتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سماجی زندگی بے نور ہوجاتی ہے، آپس میں لڑائی جھگڑے، فتنے اور فساد جنم لیتے ہیں، اسی لیے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان آیات کے ذریعے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ ہم اپنی سوسائٹی اور سماج کی اصلاح کریں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ جو باتیں کہی اور سنی گئیں ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہونے والے نکاح کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے، اور دونوں خاندانوں کے درمیان محبت ومودت کا ذریعہ بنائے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا أَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ

(۱۴)

مسلمانوں کی کثرت آبادی کا پروپیگنڈہ اور قرآنی احکام

الحمدللہ رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین.

قال اللہ تبارک و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۶۰﴾ (عنکبوت:۶۰)

وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۭ كُلٌّ فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶﴾ (ھود:۶)

وقال تعالیٰ:

قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًۢا بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَاۗءً عَلَى اللّٰهِ ۭ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۴۰﴾ (انعام:۱۴۰)

انسان اور اس کی اولاد؛ رزق کے امتحان میں:

محترم و مکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جن آیات کی تلاوت آپ کے سامنے کی گئی ہے، ان میں اللہ تعالیٰ نے انسانی زندگی کے ایک نہایت بڑے مسئلے کو ذکر فرمایا ہے، انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش انسان خود اور اس کی اولاد ہے،

دنیا کے لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ روزی روزگار اور اس کے اسباب ہم خود اختیار کرتے ہیں، اسی لیے ہم ہی دوسروں کو روزی اور رزق فراہم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں حقیقت واضح فرمائی: ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۖ'' (عنکبوت:۶۰) بہت سی مخلوق ایسی ہے جو اپنی روزی خود نہیں اٹھا سکتی، نہ کما سکتی ہے؛ لیکن اللہ تعالیٰ ہی ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی رزق عطا کرتے ہیں۔

رزق کا انتظام؛ مستقر اور مستودع اللہ کے علم میں:

دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے ایک باطل نظریے کو ذکر فرمایا: ''قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ'' بے شک وہ لوگ خسارے میں پڑے جنہوں نے اپنی اولاد کو قتل کیا۔ مکہ کے مشرکین اور آج بھی بعض اقوام میں یہ رواج پایا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو بتوں کے نام پر قربان (بھینٹ چڑھاتے) کر دیتے ہیں، جاہلیت میں یہ رسم عام تھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ'' انہوں نے یہ سب محض جہالت اور بے وقوفی کی بنیاد پر کیا۔ ایک اور جگہ ارشاد فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ'' (انعام: ۱۳۷) بہت سے مشرکین کے لئے ان کے معبودوں نے اپنی اولاد کو قربان کرنا خوشنما بنا دیا۔ اللہ تعالیٰ ان آیات میں واضح فرماتے ہیں کہ رزق کا مالک نہ انسان ہے، نہ کوئی اور طاقت؛ بلکہ پوری کائنات کی ہر زندہ مخلوق کا رازق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ارشاد ہے: ''وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا'' زمین میں چلنے، رینگنے والی ہر مخلوق کا رزق اللہ تعالیٰ کے ذمے ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی وہ ذات ہے جو ماں کے پیٹ میں بھی روزی دیتا ہے، نو مہینے تک بچے کا مستقر ماں کا رحم ہے اور وہاں بھی اللہ تعالیٰ ہی اس تک رزق پہنچاتے ہیں۔ پھر جب بچہ دنیا میں آتا ہے تو اللہ پاک اپنی رحمت سے ماں کے سینے میں دودھ کے دو چشمے جاری فرما دیتے ہیں تاکہ وہ آسانی کے ساتھ پرورش پائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا'' انسان جہاں کہیں بھی ٹھہرے یا سفر

کرے، مستقل قیام ہو یا عارضی ٹھکانہ، اللہ تعالیٰ خوب جانتے ہیں کہ اسے کہاں اور کس وقت رزق دینا ہے۔ کبھی مختصر قیام کے لیے اور کبھی طویل مدت کے لیے رزق کا انتظام فرماتے ہیں۔ یہ سب اللہ ہی کے علم اور قدرت کے تحت ہے۔

آبادی کا پروپیگنڈہ اور حقیقت:

دوستو اور بزرگو! میں نے یہ مضمون آپ حضرات کے سامنے اس لیے رکھا ہے کہ گذشتہ ایک سال سے وقتاً فوقتاً ہندوستان کی آبادی کے بارے میں مختلف باتیں کی جارہی ہیں، ابھی چند دن پہلے ہی ایک نئی رپورٹ سامنے آئی کہ ہندوستان کی آبادی چین سے بھی آگے نکل گئی ہے، اس کے ساتھ ساتھ کچھ اور باتیں بھی ذکر کی گئیں، جن میں یہ الزام بھی شامل ہے کہ مسلمانوں میں زیادہ اولاد پیدا کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے، یہ الزام بعض سیاسی لوگوں کی طرف سے لگایا گیا، لیکن ان کے مقابلے میں ہندوستان کے وہ ماہرین جو آبادی کے مسائل، صحت اور نسل کی افزائش پر تحقیق کرتے ہیں، انہوں نے حال ہی میں ایک تحقیقی مضمون شائع کیا، اس میں صاف طور پر لکھا کہ جہاں مسلمانوں کی آبادی ۲۰ فیصد یا اس سے زیادہ ہے، جیسے جموں وکشمیر، بنگال، کیرالہ اور ایک جزیرہ لکشدیپ (جہاں ۹۶ فیصد مسلمان ہیں)، ان علاقوں کا سروے کیا گیا، اس سروے میں یہ بات سامنے آئی کہ ہندوستان میں بچوں کی پیدائش کا اوسط معیار (Fertility Rate) اس وقت دو اور ایک پوئنٹ (2.1) ہے، جبکہ انہی صوبوں میں مسلمانوں کا تناسب اس سے بھی کم یعنی (1.8) ہے۔ یہ اعداد وشمار وہ ماہرین پیش کررہے ہیں جنہوں نے سائنسی بنیادوں پر ہندوستان کی آبادی کا تجزیہ کیا ہے۔ اس لیے جو پروپیگنڈہ مسلمانوں کے خلاف کیا جاتا ہے، اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے، آواز لگانے والے اپنی باتیں کہتے رہیں؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان صرف کھانے پینے کے لیے پیدا نہیں ہوا، بلکہ اس کے اور بھی مقاصد ہیں، مگر افسوس کہ اس معاملے کو بھی سیاسی ارادوں اور مخصوص مقاصد کے تحت استعمال کیا جارہا ہے۔

ضبطِ ولادت اور قرآن مجید کا نقطۂ نظر:

خیر! بتانا یہ مقصود ہے کہ ایک مومن اور مسلمان کو ان اعتراضات کے جوابات بھی معلوم ہونے چاہئیں اور ساتھ ہی یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ضبطِ ولادت (Family Planning) کے بارے میں قرآن کریم نے کیا اصول بیان فرمائے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف آیات میں واضح طور پر ذکر فرمایا ہے، جیسا کہ ایک آیت میں فرمایا: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ '' تم اپنی اولاد کو ناداری، فقیری اور محتاجی کے ڈر سے قتل مت کرو۔ آگے فرمایا: ''نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ؕ '' (اسراء:۳۱) ہم ان کو بھی روزی دیتے ہیں اور تمہیں بھی روزی دیتے ہیں۔ یہ جاہلیت کا دستور تھا کہ لوگ اپنی اولاد کو بُتوں کے نام پر قربان کرتے یا بھوک و افلاس کے خوف سے قتل کر دیتے۔ اس پر قرآن نے اعلان کیا: ''قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ '' یقیناً وہ لوگ خسارے میں پڑے جنہوں نے اپنی اولاد کو بے عقلی اور ناسمجھی کی بنیاد پر قتل کیا۔

کائنات کی مخلوقات اور رزق کی تقسیم:

اللہ تعالیٰ ایک اور آیت میں فرماتے ہیں: ''وَكَاَيِّنْ مِّنْ دَآبَّةٍ لَّا تَحْمِلُ رِزْقَهَا ۖ اَللّٰهُ يَرْزُقُهَا وَاِيَّاكُمْ ۚ '' (عنکبوت:۶۰) زمین و آسمان میں کتنی ہی مخلوقات ہیں جو اپنی روزی اٹھا کر نہیں پھرتیں، اللہ ہی انہیں بھی رزق دیتا ہے اور تمہیں بھی رزق دیتا ہے۔ ذرا غور کیجیے! سمندر میں کروڑوں قسم کی مخلوقات آباد ہیں، جنگلات میں بے شمار جانور بستے ہیں، نہ ان کے ہاں Family Planning ہے، نہ اوسط معیار Fertility Rate پر کوئی کنٹرول۔ ان کی آبادی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے؛ لیکن کبھی کسی جانور نے یہ فریاد نہیں کی کہ ہمیں کھانا نہیں مل رہا، ماہرین کے مطابق ''شارک مچھلی'' ایک وقت میں تقریباً دس کروڑ انڈے دیتی ہے، اگر اس کی ساری اولاد زندہ رہتی تو آج سارے سمندر صرف انہی مچھلیوں سے بھر جاتے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ کائنات کی ہر مخلوق کو اللہ پاک ہی رزق پہنچاتے ہیں، کسی کو بھوکا نہیں چھوڑتے۔

سائنسی ترقی اور مالتھس کی پیش گوئی کا رد:

اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُهٗ ۫ وَمَا نُنَزِّلُهٗۤ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۲۱﴾'' (حجر:۲۱) اور کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں، مگر ہم اسے ایک مقررہ مقدار کے ساتھ ہی نازل کرتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا: ''ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۹۶﴾'' (انعام:۹۶) کائنات کا پورا نظام، روزی روزگار اور آبادی کے اعتبار سے، اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حساب اور اندازے کے ساتھ چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہر چیز کے ہمارے پاس خزانے ہیں اور ہم انہیں معلوم مقدار کے ساتھ تقسیم کرتے ہیں۔ انسان کی آبادی کو اس زمین پر دس ہزار سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا ہے، لیکن پچھلے صرف تین سو سال سے اس مسئلے کو اٹھایا جا رہا ہے، اس سے پہلے کبھی یہ اعتراض نہیں کیا گیا، یہ نظریہ سب سے پہلے ایک ماہرِ معیشت تھامس رابرٹ مالتھس (Thomas Robert Malthus) نے پیش کیا، اس نے کہا کہ انسانی آبادی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، یعنی ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲ کے حساب سے بڑھتی ہے، جبکہ وسائل اور زمین کی پیداوار صرف ۱، ۲، ۳، ۴ کے حساب سے آگے بڑھتی ہے، اس کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا کہ زمین پر اتنے لوگ ہو جائیں گے کہ کھانے پینے کی چیزیں سب کے لیے کافی نہیں ہوں گی اور بھوک کی وجہ سے انسان مرنے لگیں گے، اس وجہ سے اس نے آبادی پر کنٹرول کی بات کی، یہ نظریہ اس نے آج سے تقریباً ۲۰۰ سال پہلے پیش کیا، جب سائنس اور ٹیکنالوجی میں اتنی ترقی نہیں ہوئی تھی، بعد میں دوسرے سائنسدان آئے اور انہوں نے کہا کہ مالتھس (پیدائش:۱۷۹۸) کی پیش گوئی غلط ہے۔ یورپ میں ایک کتاب بھی لکھی گئی جس میں اسے ''مالتھس جھوٹا پیغمبر'' کہا گیا، Mr.Giannas نے لکھا کہ مالتھس ایسے زمانے میں تھا جب ٹیکنالوجی اور پیداوار کے ذرائع محدود تھے، آج دنیا کے پاس جدید ٹیکنالوجی اور سائنسی ترقی کی بدولت اتنے وسائل ہیں کہ آبادی کو سنبھالا جا سکتا ہے۔

چین کی ایک بچہ پالیسی اور اس کے نتائج:

دوستو! اس نظریے کے اثرات پھر بھی دنیا پر پڑے، بڑے ملکوں نے اس کے تحت پالیسیاں بنائیں، سب سے بڑی مثال چین کی ہے، جہاں ۱۹۷۸-۱۹۷۹ میں ''ایک بچہ پالیسی'' نافذ کی گئی، کہ کسی خاندان میں ایک سے زیادہ بچہ پیدا نہ ہو، لیکن اس پالیسی کا نقصان یہ ہوا کہ لوگ بیٹیوں کو پیدا ہی نہیں ہونے دیتے تھے اور صرف بیٹے کو پیدا کرتے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں لڑکیوں کی کمی ہوگئی اور آبادی میں توازن بگڑ گیا۔ ۲۰۰۸ کے زلزلے کے بعد تو حالات اور سنگین ہو گئے، ہزاروں بچے مر گئے اور چونکہ ہر خاندان میں صرف ایک ہی بچہ تھا، جب وہ بچہ چلا گیا تو والدین کے پاس کوئی سہارا باقی نہ رہا، اس کے بعد چینی حکومت کو اپنی پالیسی بدلنی پڑی اور اعلان کیا کہ جو دو بچے پیدا کرے گا، اسے انعام اور سہولت دی جائے گی، گزشتہ چھ مہینوں میں چین کی جانب سے اعلان کیا گیا کہ جو خاندان تین بچے پیدا کرے گا، اسے حکومت کی طرف سے انعام دیا جائے گا؛ لیکن وہ لوگ، جو اللہ تعالیٰ کو ہی رزق کا حقیقی مالک نہیں مانتے اور اپنی زندگی کو صرف دائمی آرام و آسائش کے منصوبوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، انہوں نے اس فیصلے کو قبول نہیں کیا۔

آبادی کا خوف یا وسائل کی غلط تقسیم؟:

اس لیے کہا جا رہا ہے کہ سن ۲۰۵۰ میں ہندوستان دنیا کا سب سے زیادہ آبادی والا ملک ہوگا، لیکن اسی کے ساتھ یہ پیش گوئی بھی کی جا رہی ہے کہ ۲۰۵۰ میں معیشت کے لحاظ سے ہندوستان دنیا کی تیسری بڑی معیشت بن جائے گا، اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ نوجوانوں کا ایک بڑا طبقہ، جو ۱۷، ۱۸ سال سے لے کر ۴۰ سال تک کی عمر کا ہوگا، وہ ہندوستان میں بڑی تعداد میں موجود ہوگا، یہ وہ طبقہ ہے جو روزگار کمانے اور اپنی ذہنی و دماغی صلاحیتوں کی بنیاد پر دنیا میں ترقی حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، ماہرین کے مطابق دنیا کا سب سے بڑا افرادی ذخیرہ (Human Capital) اگر کسی ملک کے پاس ہوگا تو وہ ہندوستان ہوگا، اس

پیمانے پر کوئی اور ملک ہندوستان کا مقابلہ نہیں کر سکے گا، یہ تجزیہ وہ حضرات پیش کر رہے ہیں جو نہ علماء ہیں اور نہ ہی اسلامی تصورِ معیشت کو جانتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر امرت سینھ نے صاف طور پر لکھا ہے کہ آبادی کے لحاظ سے اناج اور غلے میں کوئی کمی نہیں ہے، اصل مسئلہ اس کی صحیح تقسیم اور ذخیرہ اندوزی ہے۔ گوداموں (Godown) میں غلے کو محفوظ رکھنے کے صحیح انتظامات نہیں کیے جا رہے اور اس کے نتیجے میں رشوت اور بدعنوانی کی وجہ سے اناج ضرورت مندوں تک نہیں پہنچ پاتا۔

دجالی قوتوں کا عالمی معاشی جال:

یہی وہ مصنوعی (Artificial) حالات ہیں جو دنیا میں جان بوجھ کر پیدا کیے جا رہے ہیں، دجال کے آنے سے پہلے دجالی قوتیں اپنا کام کر رہی ہیں، جسے میں اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، دنیا کے سب سے بڑے سرمایہ دار اور مائیکروسافٹ کے بانی مسٹر بل گیٹس، جو پہلے کمپیوٹر اور ٹیکنالوجی کی دنیا میں معروف تھے، اب زمینوں کی خریداری کر رہے ہیں، وہ بڑے بڑے زرعی رقبوں کے مالک بن چکے ہیں اور اس کے نتیجے میں ایسے ظاہری اسباب پیدا کیے جا رہے ہیں کہ مصنوعی طور پر قحط سالی کا ماحول قائم ہو۔

مصنوعی قحط اور حقیقت کا آئینہ:

ہمارے یہاں جو کاشت کاروں کا آندولن ہوا، اس کے پیچھے اصل وجہ یہ تھی کہ اندیشہ ظاہر کیا جا رہا تھا کہ مہنگائی بڑھے گی، زمین کی کاشت کا ایک بڑا حصہ سرمایہ دار طبقہ اپنے گوداموں (Godowns) میں جمع کر لے گا، اور یوں مصنوعی قحط سالی اور بناوٹی مہنگائی پیدا کی جائے گی۔ اس طرح اناج کی قلت کا ماحول پیش کیا جائے گا، حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسان! تجھے اپنی روزی کی فکر ہے، لیکن ذرا دیکھ تو سہی، پوری کائنات کی مخلوقات میں کبھی کسی زمانے میں اناج اور غلے کی حقیقی کمی واقع نہیں ہوئی۔

مالتھس نے جو پیشن گوئی کی تھی کہ آبادی کے بڑھنے سے اناج ختم ہو جائے گا، وہ ایک

جھوٹی پیشین گوئی ثابت ہوئی، مغربی ماہرین نے بھی اسے ''جھوٹا پیغمبر'' کہا، کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی پیشین گوئی وحیِ الٰہی سے درست ثابت ہوتی ہے، لیکن مالتھس کی بات محض وہم نکلی۔

آج بھی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں اناج اور غلہ وافر مقدار میں موجود ہے، گودام بھرے پڑے ہیں، بازار اور مارکیٹیں اشیائے خوردونوش سے بھری ہوئی ہیں، اگر واقعی آبادی کی کثرت کے سبب کمی آنی تھی تو اب تک آجاتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ڈاکٹر امرت سینھ کا کہنا ہے کہ دنیا اور خصوصاً ہندوستان میں جو کھیتی باڑی ہو رہی ہے وہ کل زمین کے صرف ۲۰ فیصد حصے پر ہے، جب کہ ۸۰ فیصد زمین ابھی بیکار پڑی ہے، اگر اس کو بھی زراعت کے لئے استعمال کیا جائے تو اناج اور غلے میں کسی قسم کی کمی کا تصور ہی نہیں رہ سکتا۔ یہ وہ اسبابی باتیں ہیں جنہیں دنیا کے ماہرین تسلیم کرتے ہیں، لیکن قرآن کریم کی روشنی میں اصل حقیقت یہ ہے کہ روزی کا ضامن صرف اللہ تعالیٰ ہے، اور وہی انسان سمیت کائنات کی ہر مخلوق کی کفالت فرماتے ہیں۔

قرآن کریم کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ حقیقت بیان فرمائی ہے کہ زمین پر بسنے والے تمام جانداروں کی روزی کی ذمہ داری خود اللہ نے لی ہے، اس نے غیب کے خزانے سے ایک ایسا کامل نظام بنایا ہے جس میں انسانی آبادی کتنی ہوگی اور اس کے مطابق اناج اور رزق کس طرح تقسیم ہوگا، سب پہلے سے مقرر ہے، یہ پورا نظام اللہ تعالیٰ کے اختیار اور کنٹرول میں ہے، البتہ انسان جب اپنے مفاد کے لیے فساد مچاتا ہے تو اس کے نتیجے میں مصنوعی رکاوٹیں کھڑی ہوتی ہیں، اور یوں رزق کی تقسیم میں بناوٹی قلت پیدا کر دی جاتی ہے۔

ماں کے پیٹ سے دنیا تک؛ روزی کا الٰہی نظام:

قرآن کریم ان تمام آیات میں انسان کو یہ حقیقت سمجھاتا ہے کہ اے انسان! کیا تم تھے جو نو مہینے ماں کے پیٹ میں روزی فراہم کر رہے تھے؟ خود ماں کو بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کے بطن میں موجود بچہ کہاں سے کھا رہا ہے، کہاں سے پی رہا ہے اور کس طرح پرورش پا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ''يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ

ثَلٰثٍ ط ‘‘ (زمر:۶) وہ تمہیں ماؤں کے پیٹ میں تین اندھیروں کے اندر ایک حالت کے بعد دوسری حالت میں پیدا کرتا ہے، نو مہینے کے اس مرحلے میں مسلسل نشوونما ہوتی ہے، چار ماہ کے بعد اس کے اندر روح پھونکی جاتی ہے اور وہ ایک زندہ مخلوق بن جاتا ہے۔

اس سے پہلے کے مراحل قرآن کریم نے یوں بیان فرمائے: ’’مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ ‘‘ (حج:۵) پہلے نطفہ، پھر علقہ اور پھر مضغہ کی شکل میں۔ یہ سب مرحلے اللہ کے حکم سے طے ہوتے ہیں، انسان کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔ پھر اللہ پاک ہی ماں کے پیٹ میں اس بچے کو ایک بوند سے مکمل مشینری والا وجود بناتا ہے؛ آنکھ، کان، ناک، دماغ اور باقی اعضاء کے ساتھ۔ اور کمال یہ کہ جب وہ دنیا میں آنے کے قریب ہوتا ہے تو اس سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ ماں کی چھاتیوں سے دودھ جاری فرما دیتے ہیں تاکہ اس کی روزی کا انتظام ہو جائے۔

تقویٰ اور نماز؛ برکت رزق کے اسباب:

خداوند قدوس اعلان فرماتا ہے کہ روزی اور روزگار کا مسئلہ انسان کے اختیار سے وابستہ نہیں ہے، جس ذات کے ذمے روزی دینی ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے ’’وَمَامِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ‘‘ (ھود:۶) زمین پر چلنے والی ہر مخلوق کی روزی اللہ کے ذمہ ہے۔ اسی طرح نماز کے بارے میں فرمایا ’’لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ط نَحْنُ نَرْزُقُكَ ط ‘‘ ہم تم سے روزی نہیں مانگتے، بلکہ ہم ہی تمہیں روزی دیتے ہیں۔ مزید ارشاد فرمایا ’’وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ط لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا ط ‘‘ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دو اور اس پر ثابت قدم رہو۔ ایک اور جگہ وعدہ فرمایا: ’’وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ط ‘‘ (طلاق:۲، ۳) جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اور تقویٰ کی زندگی اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لیے نکلنے کا راستہ بنا دیتا ہے اور اس کو وہاں سے روزی دیتا ہے جہاں سے اسے گمان بھی نہیں ہوتا۔ الغرض، قرآن پاک نے رزق کو عبادت اور عقیدہ کے ساتھ جوڑا ہے، تاکہ بندہ جان لے کہ روزی کے دروازے تقویٰ، نماز اور یقینِ کامل سے کھلتے ہیں۔

قتل اولاد کی حرمت؛ قدیم جاہلیت سے جدید سائنس تک:

مکہ کے مشرکین یہ سوچتے تھے کہ کس کو داماد بنایا جائے اور کس کو نہیں، اسی سوچ کے تحت وہ اپنی بیٹیوں کو پیدا ہوتے ہی زندہ درگور کر دیتے تھے۔ قرآن پاک نے اس ظلم کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُىِٕلَتْۢ ۝ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝'' (تکویر:۸،۹) جب وہ زندہ دفن کی گئی بچی قیامت کے دن اٹھائی جائے گی تو اس سے پوچھا جائے گا کہ کس جرم کی پاداش میں تجھے قتل کیا گیا؟ یہ جاہلیت کی رسم تھی کہ بچیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا، آج کی نام نہاد ماڈرن دنیا میں بھی یہ ظلم مختلف شکل میں جاری ہے، میڈیکل کی ترقی نے اس عمل کو ''سائنس'' کا لبادہ پہنا دیا ہے، اب پیدا ہونے سے پہلے ہی اولاد کو قتل کر دیا جاتا ہے، وجہ اُس وقت بھی یہی تھی اور آج بھی یہی ہے، چودہ سو سال پہلے انسان سوچتا تھا کہ ان بچوں کو ہم کھلائیں گے کہاں سے؟ اور آج بھی یہی کہا جاتا ہے کہ معاشی بوجھ بڑھ جائے گا۔ قرآن پاک نے اس کا واضح جواب دیا: ''وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ'' (انعام:۱۵۱) بھوک، افلاس اور تنگدستی کے خوف سے اپنی اولاد کو قتل مت کرو۔ ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔ یعنی انسان کے ذہن میں یہ خیال نہیں رہنا چاہیے کہ میں اپنی اولاد کو پالتا ہوں، اصل رازق اللہ ہے۔ ہاں! محنت کرنا اور اسباب اختیار کرنا ضروری ہے۔ ان کی صحت، تعلیم اور ضروریات پوری کرنے کی جدوجہد تمہارے ذمہ ہے، لیکن روزی دینا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے۔ جیسا کہ حدیث پاک میں ہے: ''طلَبُ الحلالِ فَریضةٌ بعدَ الفَریضةِ'' (معجم کبیر: ۱۰/۷۴، رقم:۹۹۹۳) حلال روزی کی تلاش، فرض عبادات کے بعد ایک اور فرض ہے۔

روزی کے اسباب اور کمزوروں کی برکت:

روزی اور نفقہ کی ذمہ داری کتاب وسنت کے مطابق انسان پر ڈالی گئی ہے، باپ پر اولاد کا خرچ، شوہر پر بیوی کا خرچ، اور اولاد پر ماں باپ کا خرچ لازم ہے؛ لیکن انسان کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ میں ہی سب کچھ کر رہا ہوں اور میری ہی وجہ سے سب کو روزی مل رہی ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: تمہیں رزق دیا جاتا ہے تمہارے کمزوروں کی وجہ سے۔(بخاری: کتاب الجهاد والسير، باب من استعان بالضعفاء والصالحين) گھر میں اگر کوئی اپاہج ہو، طلاق شدہ بیٹی ہو، یا ایسا فرد ہو جو روزی نہیں کما سکتا، تو ان کے سبب اور ان کی برکت سے اللہ تعالیٰ روزی عطا فرماتے ہیں۔ انسان کا یہ گمان کہ ''میں ہی اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو روزی دیتا ہوں'' درست نہیں ہے۔ یہ صرف اسباب کے درجے میں ہے، حقیقت میں روزی دینے والا اللہ تعالیٰ ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: ''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝'' (بقرہ:۳) جو کچھ ہم نے انہیں رزق دیا، وہ اس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرتے ہیں، لہٰذا دیا اللہ پاک کی طرف سے جاتا ہے، اور اس میں سے تھوڑا خرچ کرنے کا حکم ہے اپنے گھر کے کمزوروں پر بھی اور سماج و معاشرے کے محتاج اور نادار لوگوں پر بھی۔

روزی کی فکر؛ ایمان اور بے ایمانی کا فرق:

مکہ کے مشرکین کا یہی تصور تھا کہ اولاد کو کون کھلائے گا، اسی بنیاد پر وہ بچیوں کو زندہ درگور کر دیتے یا اولاد کو قتل کر ڈالتے۔ آج کا مہذب اور ترقی یافتہ انسان، جو سائنس اور میڈیکل کے میدان میں ٹیکنالوجی کی بلندیوں کو چھو رہا ہے، افسوس کہ اسی جاہلانہ روش کو نئے انداز میں اپنائے ہوئے ہے۔ اولاد کو کیوں قتل کرتا ہے؟ وجہ وہی پرانی ہے یعنی یہ خیال کہ اگر آبادی زیادہ ہوگئی تو سب کو تعلیم نہیں مل سکے گی، سب کو روزگار نہیں ملے گا، سب کے لیے کھانے پینے کی چیزیں کم پڑ جائیں گی، یہ دراصل انسانی سوچ کا دھوکہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایک مؤمن کو قرآن کی آیات کے ذریعے یہ حقیقت سمجھا دی ہے کہ ایسا نہیں ہے! اصل سمجھ یہ ہے کہ وہ خداوندِ قدوس، جو جنگلوں، پہاڑوں اور سمندروں کی گہرائیوں میں موجود بے شمار مخلوقات کو رزق دے رہا ہے، وہی انسان کو بھی رزق دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تاکید کے ساتھ فرمایا: ''اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا'' تمام مخلوقات کی روزی ہمارے ذمے ہے۔ پھر انسان کیوں اپنی فکر میں غلط اندیشی کا شکار ہو کر یہ وہم پالے؟

مسلم سماج میں داخل ہوتا باطل نظریہ:

یہ سب کچھ خود بناوٹی طور پر آئندہ سالوں میں اور زیادہ ہوگا، اناج اور غلے کی مصنوعی قلت پیدا کر دی جائے گی تا کہ انسانوں کو پریشان کیا جا سکے، دوسری طرف دنیا کو مختلف طبقات میں تقسیم کیا گیا ہے: ترقی پذیر، ترقی یافتہ اور پسماندہ، یہ سب دراصل یہودیوں اور دنیا کی سپر پاور طاقتوں کی بنائی ہوئی تقسیم ہے؛ حالانکہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم سب کو روزی دیتے ہیں، اس لیے ایک مؤمن اور مسلمان کو یہ سمجھنا چاہیے، اور ہمارے غیر مسلم بھائیوں کے دلوں میں جو مسلمانوں کی آبادی کے بڑھنے کے حوالے سے وسوسے اور خوف ڈالے جا رہے ہیں کہ ۲۰۵۰ تک مسلمان اتنی بڑی آبادی بن جائیں گے، یہ حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں خدا کو نہ ماننے والوں کے جو تصورات ہیں، وہی خیالات اب ہماری امت مسلمہ میں بھی داخل ہونے لگے ہیں۔ عملی طور پر بھی یہ صورتحال سامنے ہے کہ اب وہ اولاد نہیں پیدا کی جاتی جس کو ایک عورت اپنی صحت اور تندرستی کے مطابق پیدا کر سکتی ہے، سب سے پہلے یورپ نے عورت کو کمانے کے بہانے گھر سے باہر نکالا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ شعبہ جو عورت کے ذمے تھا؛ بچوں کی تعلیم وتربیت، اخلاقیات کی حفاظت، اور گھر وسماج کو سنبھالنے کا فریضہ وہ سب نظر انداز ہو گیا۔ اسی وجہ سے گھروں کے اندرونی مسائل نے جنم لیا اور خاندانی زندگی کا سکون برباد ہو گیا۔

اسلامی تصورِ معیشت میں عورت کا مقام:

پہلے زمانے میں ایک ہی آدمی گھر کی کفالت کرتا تھا اور عورتوں کو کمانے کی ضرورت پیش نہیں آتی تھی، لیکن پہلی اور دوسری جنگِ عظیم کے نتیجے میں انسانیت کو ناہمواری اور عدم توازن کا سامنا کرنا پڑا، ان جنگوں میں مردوں کی ایک بڑی تعداد ختم ہو گئی، جس کی وجہ سے روزی روزگار کا مسئلہ پیدا ہوا، یورپ میں عورتوں کو ملازمتوں پر لگایا جانے لگا، حالانکہ اسلامی تصور یہ ہے کہ عورت بہت سی چیزوں کی مالک ہو سکتی ہے، لیکن روزی کمانا اس کے ذمہ نہیں ہے۔

قرآن نے صاف ارشاد فرمایا: ''وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط '' (نساء:۳۴) اللہ نے جو روزی تمہیں دی ہے، اس میں سے خرچ کرو، اسی کی وجہ سے مرد کو قوّام (نگران) کہا گیا۔

اولاد کی روزی اور ایمان کا عقیدہ:

دوستو اور بزرگو! یہ دراصل ایمان کا مسئلہ ہے کہ انسان اپنی اولاد کی روزی روزگار کا عقیدہ کس طرح بناتا ہے۔ قرآن نے مشرکین کے بارے میں فرمایا: ''وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ط '' (انعام:۱۳۷) آج بھی لوگوں کو مختلف باتوں کے ذریعے ڈرایا جارہا ہے، دنیا کے مادیت پرست انسانوں کا نظریہ مادیت پر ہی قائم ہے؛ مگر ہم مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ روزی نماز سے وابستہ ہے، تقویٰ سے وابستہ ہے، اور کمزوروں وغریبوں کی دعاؤں سے وابستہ ہے۔ قرآن نے فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝'' (معارج:۲۴) تمہارے مال میں غریبوں اور محتاجوں کا ایک مقرر حق ہے۔ فرض زکوٰۃ تو ہے ہی، لیکن اس کے علاوہ بھی ان کی مدد اور معاونت کرنے کا قرآن وحدیث میں بار بار ذکر ہوا ہے۔

لہٰذا نتیجہ یہ ہے کہ روزی کے مالک اللہ ہی ہیں، وہی مسبب الاسباب ہیں، ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں میں جو یہ غلط تصور ڈالا جارہا ہے کہ اولاد کم کریں تو روزی بہتر ملے گی، یہ وہی سوچ ہے جو پہلے مکہ کے مشرکین کی تھی اور آج کے ماڈرن سائنسدانوں کی ہے۔ درحقیقت یہ انسانی سوچ ہے، مگر ایمانی تصور یہ ہے کہ روزی کا مالک صرف اللہ ہے۔

Demand and Supply کا اصل نظام اللہ کے ہاتھ میں:

جب انسانی دنیا کے کاروبار میں طلب اور رسد (Demand and Supply) کا پورا نظام مانا جاتا ہے، تو اللہ پاک کے نظام میں بھی یہی حقیقت کارفرما ہے، اللہ پاک ہی طے فرماتے ہیں کہ کس کو کتنی اولاد دینی ہے، کب دینی ہے اور کس طریقہ سے دینی ہے، وہی احکم الحاکمین ہے، اپنے بندوں کو سب سے بہتر جاننے والا ہے۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: ''اَلَا

يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۴﴾'' (ملک:۱۴) کیا وہی (اللہ) نہ جانے گا جس نے پیدا فرمایا؟ وہی باریک بین اور ہر چیز سے باخبر ہے۔لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ رزق رسانی اور آبادی کا نظام کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں، بلکہ خالق کائنات کے دست قدرت میں ہے،اس لیے یہ پروپیگنڈہ کہ ۲۰۵۰ تک مسلمانوں کی آبادی حد سے زیادہ بڑھ جائے گی محض ایک غلط فہمی ہے، اعداد وشمار خود اس کی تردید کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا پیدائشی شرح (Fertility Rate) دوسرے طبقات سے زیادہ نہیں بلکہ کئی صوبوں میں اس سے بھی کم ہے۔

دوستو اور بزرگو! اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی روزی روزگار کا مالک ہے، اسی کو مسبب الاسباب سمجھنا سب سے بڑا عقیدہ ہے۔اسی پر ایمان اور یقین ایک مومن کی زندگی کو مضبوط بناتا ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے ایمان کو مضبوط فرمائے، ہمیں غلط پروپیگنڈے اور باطل نظریات سے محفوظ رکھے، اور کہی سنی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۱۵)

آپسی سرگوشی کے اصول وآداب

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آله و اصحابه اجمعین. قال الله تبارک و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍۢ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ (نساء:۱۱۴)

وقال تعالیٰ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿۹﴾ اِنَّمَا النَّجْوٰى مِنَ الشَّيْطٰنِ لِيَحْزُنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَيْسَ بِضَآرِّهِمْ شَيْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰﴾ (مجادلہ:۹،۱۰)

وقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: لا یحلُّ لرجلٍ أن یُفرِّقَ بین اثنَینِ إلا بإذنِهما. (ابو داود: کتاب الادب، باب فی الرجل یجلس بین الرجلین بغیر اذنهما)

وقال النبی صلی اللہ علیه وسلم: إنَّ اللهَ لاَ یَنْظُرُ إلَی صُوَرِکُمْ وَ أَمْوَالِکُمْ وَلٰکِنْ یَنْظُرُ إلَی قُلُوبِکُمْ وَأَعْمَالِکُمْ . (مسلم: کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم وخذله واحتقاره)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی کریم و نحن علی ذلك لمن الشاهدین و الشاکرین و الحمدللہ رب العالمین.

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ محض چند عقائد اور چند عبادتوں کا مجموعہ نہیں ہے، بلکہ یہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ دین انسان کی پیدائش سے لے کر موت تک کی انفرادی زندگی کے تمام پہلوؤں کو بھی محیط ہے اور ساتھ ہی پورے سماج، سوسائٹی اور پوری انسانی دنیا کے مسائل کو بھی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جو مسائل پیش آتے ہیں یا آئندہ آسکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سب کا ذکر اپنے پاک کلام میں فرمادیا ہے۔

انس ومحبت کا فطری جذبہ اور اس کی حدود:

انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے سماجی مخلوق ہے، وہ اکیلا رہ کر زندگی نہیں گزار سکتا، اسی لیے عربی کہاوت ہے: ''سُمِّی الإنسان إنساناً لأنه یأنس بغیرہ و غیرہ یأنس به'' انسان کو انسان اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ دوسروں سے انس رکھتا ہے اور دوسرے اس سے انس رکھتے ہیں۔ انسان اپنی طبیعت کی تسکین اور اپنے دکھ درد کے اظہار کے لیے دوسروں کی مجلس میں بیٹھتا ہے، بات چیت کرتا ہے اور تعلقات قائم کرتا ہے، یہی انس ومحبت انسان کی عملی اور سماجی زندگی کی بنیاد ہے؛ لیکن اس سماجی زندگی میں بعض اوقات رنجشیں، اختلافات اور جھگڑے بھی پیدا ہو جاتے ہیں، چاہے وہ خاندان میں ہوں، کسی ادارے یا کارخانے میں ہوں، یا پرائیویٹ سیکٹر کی ملازمت کے ماحول میں۔ ان ہی حالات کی اصلاح کے لیے قرآنِ کریم نے ہمیں اصول وضوابط سکھائے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَیْتُمْ'' اے ایمان والو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو، اللہ تعالیٰ نے اجازت دی کہ ضرورت کے وقت پرائیویٹ طور پر بات چیت کی جاسکتی ہے، لیکن اس کے آداب بھی سکھائے۔ فرمایا: ''فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ

وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ ''سرگوشی میں گناہ، دشمنی یا رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کی باتیں مت کرو۔ اکثر سرگوشیاں فتنہ وفساد، کسی کو تکلیف دینے، یا دوسروں کے خلاف سازش کرنے کی نیت سے کی جاتی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسی ہر بات سے منع فرمایا، کیونکہ یہ وہ چیز ہے جس میں ہم میں سے اکثر لوگ کبھی نہ کبھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

مدینہ منورہ میں سرگوشیوں کی حقیقت:

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو وہاں دو قومیں آباد تھیں، ایک طرف مشرکین کی قوم اوس وخزرج تھی، جنہیں اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے نوازا، اور دوسری طرف یہود تھے جو پہلے سے وہاں رہتے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے نتیجے میں جب لوگوں کے مفادات اور سرداری کو خطرہ محسوس ہوا تو انہوں نے آپ ﷺ کے خلاف ایک محاذ کھڑا کیا، یہی وہ لوگ تھے جنہیں منافقین کہا گیا۔ عبداللہ بن اُبی اور اس کے ساتھیوں نے مل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ کے خلاف خفیہ سرگوشیاں کیں، یہود نے بھی بارہا سازشی گفتگو کی تاکہ مسلمانوں کو ستایا اور کمزور کیا جا سکے۔ ایسے حالات میں اللہ تعالیٰ نے سورۂ مجادلہ میں واضح فرمایا: ''مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ'' (مجادلہ:۷) جب تم میں سے تین آدمی سرگوشی کرتے ہیں تو وہ دراصل چار ہوتے ہیں، کیونکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اگر پانچ ہوتے ہیں تو چھٹا اللہ ہوتا ہے۔ خواہ کم ہوں یا زیادہ، جہاں کہیں بھی ہوں، اللہ تعالیٰ ان کی سرگوشیوں سے پوری طرح باخبر ہے۔

سرگوشی بھی اللہ سے پوشیدہ نہیں:

اسی سورۂ مجادلہ کی پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ يَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌۢ بَصِيْرٌ ①'' (مجادلہ:۱) یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ایک شخص نے اپنی بیوی سے جاہلیت کے زمانے کا

ایک جملہ کہا: ''انتِ علیّ کظھر اُمّی'' تو میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے۔ جاہلیت میں یہ جملہ طلاق کے حکم میں سمجھا جاتا تھا، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ ماں ہمیشہ کے لیے حرام ہے: ''حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اُمَّهٰتُكُمْ'' (نساء: ۲۳) اسی طرح اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ'' (نساء: ۲۲) سوتیلی ماں سے نکاح بھی ممنوع ہے۔ جب اس شخص نے اپنی بیوی سے یہ جملہ کہا تو وہ عورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور شکایت پیش کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے انتظار میں خاموشی اختیار فرمائی، اسی دوران حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بھی حجرے میں موجود تھیں۔ وہ فرماتی ہیں: وہ عورت آ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کان میں آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہی تھی۔ مجھے صرف اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ گفتگو ہو رہی ہے، لیکن میں اس کی بات نہ سن سکی۔ اسی وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما دی: ''قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِيْ تُجَادِلُكَ فِيْ زَوْجِهَا'' اللہ نے اس عورت کی بات سن لی جو اپنے شوہر کے بارے میں آپ سے بحث کر رہی تھی اور اللہ سے فریاد کر رہی تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: جب یہ آیت نازل ہوئی تو میں بے ساختہ پکار اُٹھی: سبحان اللہ! اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے، اس کا علم کتنا وسیع ہے! زمین پر ایک عورت چپکے چپکے اللہ کے رسول ﷺ سے بات کر رہی تھی، میں پاس بیٹھی سن نہ سکی، مگر اللہ رب العزت نے سن لیا۔

مرنے کے بعد حساب:

دوستو اور بزرگو! یہی وہ تصور ہے جسے قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے، یعنی مرنے کے بعد کی زندگی کا یقین۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ۚ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ'' (مجادلہ: ۷) تم دنیا میں جہاں کہیں بھی ہو، اللہ تعالیٰ اپنی صفتِ علم اور صفتِ قدرت سے تمہارے ساتھ ہے، اور قیامت کے دن تمہارے تمام اعمال کو سامنے لائے گا۔ اسی حقیقت کو سورۂ کہف میں مزید واضح کیا گیا: ''مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ'' (کہف: ۴۹) قیامت کے دن جب

اعمال نامے کھولے جائیں گے تو مجرمین چیخ اٹھیں گے: ''یٰوَیْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ'' یہ کیسا اعمال نامہ ہے کہ ہماری کوئی چھوٹی بڑی بات بھی چھوڑ نہیں دی گئی! دنیا میں ہم جو کچھ بول کر بھول جاتے ہیں یا کر کے فراموش کر دیتے ہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ سب کو محفوظ رکھتا ہے اور قیامت میں اس کا حساب لینا ہوگا۔ اسی پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ'' (نساء:۱۱۴) تمہاری اکثر سرگوشیوں میں کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ عام طور پر سرگوشیاں غیبت، چغلی، دوسروں کو ستانے یا نقصان پہنچانے کے منصوبوں پر مشتمل ہوتی ہیں۔ البتہ، اسلام نے اعتدال کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، اس لیے سرگوشی کو کلی طور پر ممنوع قرار نہیں دیا گیا، بلکہ صرف اس وقت کی اجازت دی گئی ہے جب یہ کسی ضرورت یا خیر کے مقصد سے ہو۔

جائز سرگوشی کی تین صورتیں:

اب سوال یہ ہے کہ کون سی سرگوشی جائز ہے؟ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اس کا جواب دیا: ''اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ'' وہ سرگوشی جس میں نیکی، بھلائی یا اصلاح مقصود ہو۔ صدقہ اور خیرات کی سرگوشی مثلاً آپ کسی مالدار صاحب حیثیت سے کان کے قریب جا کر آہستہ سے کہیں: یہ شخص غریب ہے، محتاج ہے، کسی مشکل میں ہے، آپ خفیہ طور پر اس کی مدد کر دیں، یہ اس لیے کہ غریب کو شرمندگی نہ ہو اور اس کی عزت نفس محفوظ رہے، معروف (بھلائی) کی سرگوشی، کتاب اللہ نے ''معروف'' کا لفظ استعمال فرمایا، جو ہر اچھی اور نیک بات کو شامل ہے۔ مثال کے طور پر: کسی کو گناہ میں دیکھ کر سب کے سامنے رسوا کرنے کے بجائے تنہائی میں سرگوشی کے انداز میں سمجھایا جائے۔ یہ نصیحت ہے، فضیحت (رسوائی) نہیں، اصلاح بین الناس کی سرگوشی اگر دو افراد یا دو گروہ میں جھگڑا ہو، تو آپ چپکے سے کسی ایک کے پاس جا کر ایسی بات کر دیں کہ دل نرم ہو جائے اور تنازع ختم ہو جائے؛ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ لوگوں کے درمیان صلح کے لیے جھوٹ بولنا بھی جائز ہے۔ (ترمذی: ابواب البر والصلة عن رسول اللہ ﷺ، باب ماجاء فی اصلاح ذات البین) الغرض! سرگوشی صرف ان تین

نیکیوں کے لیے ہے: صدقہ وخیرات، بھلائی اور نیکی، لوگوں میں صلح کرانا۔ اس کے سوا اگر سرگوشی کا مقصد دوسروں کو ستانا، بُری سازش کرنا یا دل آزاری ہو تو یہ عمل مومن کی شان نہیں، بلکہ یہ منافقین اور یہود کا طریقہ ہے۔

میثاقِ مدینہ اور یہود کی سازشیں:

جب صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اور جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ منورہ تشریف لائے تو وہاں موجود یہودی قبائل کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک باقاعدہ معاہدہ فرمایا، جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے، یہ معاہدہ ایک مکمل دستاویز تھا جس میں یہ طے کیا گیا کہ مسلمان اور یہود آپس میں پرامن طور پر رہیں گے، ایک دوسرے کے حقوق کا لحاظ رکھیں گے، نیکی کے ہر کام میں تعاون کریں گے اور برائی سے اجتناب کریں گے؛ لیکن یہودی اپنی فطری عداوت اور سازشی ذہنیت کے سبب بارہا اس معاہدے کی خلاف ورزی کرتے رہے، وہ اکثر اس طرح کی حرکتیں کرتے کہ اگر کسی مسلمان کا گزر ان کے علاقے سے ہوتا تو وہ سرگوشیوں اور اشاروں کنایوں کے ذریعے اسے یہ احساس دلاتے کہ گویا وہ اس پر حملہ کرنے والے ہیں یا اسے نقصان پہنچائیں گے، اس خوف کی وجہ سے بعض صحابہ راستہ بدل دیتے تھے۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا: ''اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ '' (مجادلہ:۸) کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی سے روکا گیا تھا، پھر بھی وہ اسی حرکت کو دہراتے ہیں؟ اللہ تعالیٰ نے آگے ان کے لیے سخت وعید سنائی کہ یہ سرگوشیاں اور سازشیں دراصل منافقین اور یہود کی خصلت ہے، اور ایسے لوگوں کے لیے جہنم کا عذاب تیار ہے۔

آج کے دور کی معصیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا ہے؟

اللہ تعالیٰ اس آیت میں فرماتے ہیں: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ '' اے ایمان والو! جب تم آپس میں سرگوشی کرو تو ایسی سرگوشی نہ ہو جس میں گناہ کا پہلو ہو، کسی پر ظلم وزیادتی کی بات ہو، یا معصیتِ

رسول ﷺ شامل ہو۔رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں منافقین اور یہود اکثر ایسی سرگوشیاں کرتے تھے جن کے ذریعے آپ ﷺ اور صحابہ کرام کو اذیت پہنچتی تھی۔اس دور میں ''معصیتِ رسول'' کا مطلب یہی تھا کہ آپ ﷺ کی مخالفت اور آپ کو ستانے کے منصوبے سرگوشیوں میں طے کیے جاتے تھے۔مفسرین فرماتے ہیں کہ آج کے زمانے میں ''معصیتِ رسول'' کا مطلب یہ ہے کہ جب ہمیں اللہ کے رسول ﷺ نے سرگوشیوں سے منع فرمایا، پھر بھی ہم آپس میں چپکے چپکے ایسی باتیں کریں جن میں دوسروں کو تکلیف پہنچانے کا ارادہ ہو،تو یہ دراصل رسول ﷺ کی نافرمانی ہے۔

موت: ایک اٹل حقیقت:

دوستو اور بزرگو! انسانی زندگی کی ایک طبعی عمر ہے،عموماً ۶۰ سے ۷۰ سال تک؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے جوانی میں اٹھالے، جسے چاہے بڑھاپے میں بلالے،اور کسی کو اخیر عمر تک مہلت دے دے۔موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس میں کسی کو اختلاف کی گنجائش نہیں۔دنیا کے بڑے بڑے فلسفی، خدا کے منکر کمیونسٹ اور دہریے، یہاں تک کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے منکر بھی ملے،لیکن کبھی موت کا انکار نہ کرسکے۔کیوں؟ اس لیے کہ موت ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے کا مشاہدہ ہے۔اللہ تبارک وتعالیٰ قرآن میں اعلان فرماتے ہیں: ''اَیْنَ مَا تَکُوْنُوْا یُدْرِکْکُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ کُنْتُمْ فِیْ بُرُوْجٍ مُّشَیَّدَۃٍ ط '' (نساء:۷۸) تم جہاں کہیں بھی ہو،موت تمہیں پالے گی،خواہ مضبوط قلعوں ہی میں کیوں نہ چھپے بیٹھے ہو۔تاریخ شاہد ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ،سلطنتوں کے مالک،تخت وتاج کے وارث موت کی آغوش میں جاچکے ہیں۔یہ حقیقت کسی پر چھپی ہوئی نہیں۔

عبادتیں بمقابلہ حقوق العباد:

خیر! محترم حضرات! میں آپ کے سامنے ایک نہایت اہم حقیقت ذکر کرنا چاہتا ہوں، کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان نماز پڑھتا ہے،روزہ رکھتا ہے،زکوٰۃ دیتا ہے،بظاہر سارے فرائض

ادا کرتا ہے؛ لیکن بندوں کے حقوق میں کوتاہی کرتا ہے۔ایک مرتبہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے پوچھا: کیا تم جانتے ہو کہ میری امت کا مفلس کون ہے؟ صحابہ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! جس کے پاس مال و دولت نہ ہو، وہی مفلس ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن نماز، روزہ، زکوٰۃ اور بہت سی عبادتیں لے کر آئے گا؛ لیکن ساتھ ہی اس نے کسی کو ستایا ہوگا، کسی پر ظلم کیا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کی غیبت کی ہوگی، کسی کو پریشان کیا ہوگا، ایسا شخص اپنی عبادتوں کا ڈھیر تو لے کر آئے گا؛ لیکن قیامت کے دن یہ سب نیکیاں ان مظلوموں کو دے دی جائیں گی جن کے حقوق اس نے دنیا میں مارے تھے، اگر نیکیاں ختم ہوگئیں اور حقوق باقی رہے تو ان مظلوموں کے گناہ اس پر لاد دیے جائیں گے اور اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔(مسلم: کتاب البر و الصلۃ، باب تحریم الظلم) یہی حقیقی مفلس ہے۔اللہ تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں: ''مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ'' (بقرہ:۲۵۴) اس دن کے آنے سے پہلے پہلے اپنے حساب کو پورا کرلو، کیونکہ جب موت آجائے گی تو نہ کوئی خرید وفروخت چلے گی، نہ کوئی دوست کسی کے کام آئے گا۔قرآن کریم جگہ جگہ جہنم کا ذکر کرتا ہے، اور وہاں نافرمان انسان یہ حسرت کرے گا: ''يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا'' (نبا:۴۰) کاش! میں مٹی ہوتا اور حساب کتاب سے بچ جاتا۔

میرے عزیزو! یہ سب بندوں کے حقوق کی کوتاہیوں سے جنم لیتا ہے، اسی لیے سورۂ حجرات میں اللہ تعالیٰ نے بڑی تفصیل کے ساتھ ان باتوں سے روکا ہے جو جھگڑے اور نفرت کو بڑھاتے ہیں، کسی کا مذاق نہ اڑاؤ، نہ مرد مرد کا، نہ عورت عورت کا، نہ عورت مرد کا اور نہ مرد عورت کا۔مذاق دراصل اس سوچ کا نام ہے کہ دوسروں کو اپنے سے کمتر سمجھا جائے، یہی تکبر ہے، اور تکبر ہی وہ بیماری ہے جس پر حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے کتابیں لکھیں اور حضرت شیخ زکریاؒ کے افادات بھی ''اُمُّ الامراض'' کے نام سے چھپے ہیں۔یہ چھپی ہوئی بیماریاں ہیں، انسان کو خود بھی اکثر پتہ نہیں چلتا کہ میرے اندر تکبر ہے، میرے دل میں حسد اور بغض ہے۔

بھائیو اور دوستو! یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بندوں کے حقوق کو اتنی اہمیت دی، میراث کی تقسیم ہو یا رشتہ داروں کا حق؛ اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے: ''اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ لَا تَدْرُوْنَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ لَكُمْ نَفْعًا ؕ'' (نساء:۱۱) تمہیں نہیں معلوم کہ تمہارے والدین اور اولاد میں سے کون تمہارے لئے زیادہ نفع بخش ہے۔ اس لئے یہ تمہاری رائے پر نہیں بلکہ اللہ کے حکم پر ہے کہ میراث تقسیم ہوگی۔ اگر کسی نے بہنوں، پھوپھیوں، یا بیٹیوں کا حق دبایا تو وہ اللہ کے سامنے سخت جواب دہ ہوگا۔ ورنہ قیامت کے دن یہی ہوگا کہ ساری نیکیاں چھن جائیں گی اور مظلوموں کے کھاتے میں ڈال دی جائیں گی، اور پھر گناہ کا بوجھ ظالم پر منتقل کیا جائے گا۔ یہی تعلیمات ہمیں معاملات کی درستگی اور حقوق العباد کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرتی ہیں۔

تکبر کی حقیقت اور نفس کی اصلاح:

میں نے آپ کے سامنے ایک روایت پڑھی ہے جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''إنَّ اللہ لا ینظر إلی صورکم و أموالکم'' اللہ تعالیٰ تمہاری شکل وصورت کو نہیں دیکھتے اور نہ ہی تمہارے مال ودولت کو دیکھتے ہیں، حالانکہ انہی نے تمہیں پیدا فرمایا ہے: ''يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ'' (آل عمران:۶) یہ اللہ کی عجیب قدرت ہے کہ ایک حقیر اور ناپاک قطرے سے جس کا جسم کو چھو جانا غسل کو واجب کر دیتا ہے اور جو کپڑوں پر لگ جائے تو دھونا ضروری ہوتا ہے، اسی سے حضرتِ انسان کو اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا۔ اب ذرا سوچو! انسان کس بات پر تکبر اور بڑائی کرتا ہے؟ کس چیز پر فخر جتاتا ہے؟ اسی لیے قرآن بار بار متوجہ کرتا ہے: ''مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۝'' (انفطار:۶) تجھے کس چیز نے تیرے رب کریم سے دھوکے میں ڈال دیا؟ وہ رب جس نے تجھے پیدا کیا اور درست شکل عطا فرمائی: ''الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰىكَ'' (انفطار:۷) غرض یہ کہ انسان کے دل میں کسی نہ کسی موقع پر کبر اور غرور آجاتا ہے۔ اسی لیے بزرگوں کی مجلس میں بیٹھنا چاہیے اور قرآن وحدیث کی نصیحتیں سننی چاہئے تاکہ ہمارے نفس کی اصلاح ہو

سکے اور تکبر کی بیماری دور ہو جائے۔

آگ اور مٹی؛ برتری کا جھوٹا معیار:

شیطان کو کس نے گمراہ کیا؟ اس کے اپنے نفس ہی نے اسے گمراہ کیا۔ قرآن میں اس کا قول مذکور ہے: ''خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾'' (اعراف:۱۲) اے پروردگار! تُو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے پیدا کیا۔ شیطان نے آگ کو اعلیٰ اور مٹی کو کمتر سمجھا، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آگ ہمیشہ اوپر کو لپکتی ہے، لیکن آخر کار بجھ کر فنا ہو جاتی ہے، جبکہ مٹی میں وہ سکون، ثبات اور برکت ہے کہ اسی سے کھیتیاں اگتی ہیں اور زندگیاں پروان چڑھتی ہیں۔ شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں: زخاک آفریدت خداوند پاک، تجھے مٹی سے ہی خداوندِ قدوس نے پیدا کیا ہے، لہٰذا تجھے چاہیے کہ مٹی ہی کی طرح عاجزی اور انکساری اختیار کرے۔ اسی طرح سعدیؒ نے ایک اور مثال دی: جس درخت پر زیادہ پھل لگتے ہیں، وہ زمین کی طرف جھک جاتا ہے۔ یعنی جس انسان کے اندر علم زیادہ ہو، اس کے اندر حلم، بردباری اور برداشت بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ یہی مومن کی شان ہے کہ علم کے ساتھ ساتھ حلم اور انکساری بھی ہو۔

اپنی اصلاح کرو، دوسروں کے عیب نہ ٹٹولو:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک صاحب آئے اور عرض کیا کہ مالِ غنیمت میں سے میرا حصہ مجھے دیجئے، اور وہ مال جو اللہ نے آپ کو عطا فرمایا ہے، اس میں سے میرا حق دیجئے۔ اسی طرح ایک اور دیہاتی آیا، اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گلے میں چادر ڈال کر کھینچا، یہاں تک کہ آپ کے مبارک جسم پر نشان پڑ گئے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکراتے ہوئے اسے بھی عطا فرمایا۔ (بخاری: کتاب فرض الخمس، باب ما کان النبی یعطی المؤلفة قلوبهم وغیرهم) یہی وہ طرزِ عمل ہے جسے ہم اپنی زندگی میں اپنائیں تو معاشرتی کڑواہٹیں کم ہوں، بزرگانِ دین فرماتے ہیں کہ حسد کرنے والا پوری رات بے چینی میں کروٹیں بدلتا رہتا ہے، جبکہ جس سے حسد کیا جاتا ہے وہ سکون واطمینان سے سوتا ہے۔ کتاب اللہ نے ہمیں ایسے

آدابِ زندگی سکھائے ہیں جو کڑواہٹوں کو دور کرتے ہیں، اس نے مذاق اُڑانے سے منع فرمایا، غیبت سے روکا، چغلی سے بچنے کا حکم دیا، اور فرمایا: ''وَلَا تَجَسَّسُوا'' کسی کی جاسوسی نہ کرو۔ تم کون ہوتے ہو دوسروں کے عیب ٹٹولنے والے؟ اپنی ہی ذات کا محاسبہ کرو! صبح سے شام تک اپنے اعمال کا ریکارڈ تیار کرو کہ کتنے گناہ کیے اور کتنی نیکیاں انجام دیں، اور اپنے نفس کو ملامت کرو۔ یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے تم پر فرشتے مقرر کر دیے ہیں: ''كِرَامًا كَاتِبِينَ ﴿١١﴾ يَعْلَمُونَ مَا تَفْعَلُونَ ﴿١٢﴾'' (انفطار:۱۱) وہ ہر عمل کو لکھ رہے ہیں۔ اس لیے دوسروں کے پیچھے پڑنے کے بجائے اپنی ذمہ داریوں کی فکر کرو، ورنہ فرشتے تمہاری اس کوتاہی کو بھی محفوظ کر لیں گے۔

چھوٹی باتیں، بڑے جھگڑے:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیات انسانیت کی ہدایت کے لئے نازل ہوئیں، شیطان انسان کو گمراہ کرنے کے لئے کئی چور دروازے تلاش کرتا ہے، کبھی عبادات میں، کبھی معاملات میں، کبھی معاشرت اور سماجیات میں، اور کبھی معیشت اور کاروبار میں۔ انہی سب پہلوؤں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں واضح رہنمائی عطا فرمائی، انہی میں سے ایک مسئلہ سرگوشی اور چپکے چپکے بات کرنے کا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: کسی آدمی کے لئے حلال نہیں کہ دو آدمی بیٹھے ہوئے ہوں اور کوئی تیسرا ان کے درمیان بے اجازت شریک ہو جائے، ''إِلَّا بِإِذْنِهِمَا'' (ابو داود: کتاب الادب، باب فی الرجل یجلس بین الرجلین بغیر اذنهما) اگر دو افراد تنہائی میں کسی بات پر گفتگو کر رہے ہوں تو کوئی تیسرا شخص آ کر ان کی باتوں میں شریک نہ ہو، ان کی باتیں انہیں کرنے دو۔ ایک اور روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دو ساتھی بیٹھے ہوں اور تیسرا آ جائے تو ان میں سے کوئی ایک بھی اپنے ساتھی کو چھوڑ کر نئے آنے والے کے ساتھ مشغول نہ ہو۔ (ابو داود: کتاب الادب، باب فی الرجل یجلس بین الرجلین بغیر اذنهما) البتہ اگر ضرورت ہو اور اپنے ساتھی کو پہلے بتا دے کہ مجھے فلاں سے بات کرنی ہے، تو یہ درست ہے، لیکن جان بوجھ کر پہلے سے بیٹھے ہوئے ساتھی کو چھوڑ دینا اور نئے آنے والے

کے ساتھ لگ جانا دل آزاری ہے، اور یہی چیز رنجشوں کو جنم دیتی ہے، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے چھوٹی چھوٹی اور باریک باتوں کو بھی ہمیں سمجھایا تاکہ سکون اور امن والی زندگی گزار سکیں۔ اگر ان اصولوں پر عمل نہ کیا جائے تو یہی باتیں آگے چل کر غیبت، چغلی، حسد، بغض اور بدظنی کا سبب بنتی ہیں، اسی لئے فرمایا: ''ایاکم والظن'' (بخاری: کتاب النکاح، باب لا یخطب علی خطبة اخیه حتی ینکح او یدع) بدگمانی سے بچو۔ اور قرآن میں ارشاد ہے: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ'' (حجرات: ۱۲) اے ایمان والو! بکثرت بدگمانی سے بچو۔ نیکی کی باتیں کرو کتاب اللہ نے یہ بھی فرمایا کہ سماجی زندگی کی بنیاد تین چیزوں پر ہے: ''اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ'' یعنی اگر سرگوشی کرنی ہی ہے تو کسی مالدار کو چپکے سے یہ کہو کہ غریب اور محتاج کا خیال رکھے۔ یہی نیک سرگوشی ہے، جو معاشرے کو سکون اور خیر کی طرف لے جاتی ہے۔

صدقہ کے وسیع معنی اور نیت کی اہمیت:

اسی طرح ''اَوْ مَعْرُوْفٍ'' ہے۔ بھلائی کے جتنے بھی کام ہیں وہ سب اس میں داخل ہیں۔ لفظ ''معروف'' کا ذکر آیا تو کوئی ایک بھلائی بھی اس کے دائرے میں سے نکلتی نہیں ہے، صدقہ کے لفظ کا جب ذکر فرمایا گیا تو حدیث شریف میں یہ بھی فرمایا کہ راستے سے کانٹا اٹھانا صدقہ ہے۔ (مسلم: کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف) اپنے مومن بھائی سے خوش چہرے کے ساتھ ملنا یہ بھی صدقہ ہے۔ (ترمذی: ابواب البر والصلة، باب ماجاء فی صنائع المعروف) قرآن نے جس کا ذکر کیا: ''عَبُوْسًا قَمْطَرِیْرًا ۝۱۰'' (انسان: ۱۰) کہ تیور چڑھانے والے چہرے نہ بناؤ، بلکہ خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آؤ۔ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک آدمی نے آنے کی اجازت چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: ''بِئْسَ أَخُ العَشِیرَةِ'' یہ اپنے قبیلے کا بہت برا شخص ہے؛ لیکن جب وہ اندر آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا احترام کیا، اکرام کیا، کھانے پینے اور مہمان نوازی کا پورا حق ادا فرمایا۔ جب وہ شخص چلا گیا تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے

عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے تو آنے سے پہلے مجھے بتایا تھا کہ یہ شخص بہت برا ہے، لیکن جب آیا تو آپ نے عزت دی اور اکرام کیا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے عائشہ! اس کی برائی اس کے ساتھ ہے، لیکن کیا تم نے مجھے کبھی بدزبان پایا؟ (بخاری: کتاب الادب، باب لم یکن النبی ﷺ فاحشا ولا متفحشا) میں نے اس کی بری صفت متنبہ کرنے کے لئے ذکر کیا تاکہ کوئی اس کے ساتھ کاروبار کرے یا کوئی معاملہ کرے تو نقصان نہ اٹھائے۔'' یعنی برائی کی نشاندہی الگ چیز ہے، لیکن اخلاق اور رویہ الگ چیز ہے۔ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسنِ اخلاق اور اچھے برتاؤ کا مظاہرہ فرمایا۔ اسی لئے فرمایا کہ ہنستے چہرے سے کسی سے ملنا بھی صدقہ ہے۔ صدقہ صرف مال خرچ کرنے کا نام نہیں ہے، بلکہ ہزاروں قسم کے صدقے ہیں، چھوٹے بھی اور بڑے بھی، جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس دین کو بہت آسان بنایا ہے۔ (بخاری: کتاب الایمان، باب الدین یسر) ہر کام میں ثواب رکھا ہے۔ روایتوں میں یہاں تک آتا ہے کہ ایک آدمی بڑا مالدار تھا اور وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتا تھا، دوسرا آدمی غریب تھا، اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ لیکن وہ دل میں یہ نیت رکھتا تھا کہ اگر اللہ مجھے بھی مال عطا کرے تو میں بھی اسی طرح خرچ کروں گا۔ تو حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ اس نیت پر بھی اسے ثواب ملے گا۔ اسی طرح اس کا الٹا بھی ہے: ایک آدمی مالدار ہے اور گناہوں پر خرچ کرتا ہے، اور دوسرا غریب سوچتا ہے کہ اگر میرے پاس بھی مال ہوتا تو میں بھی ایسے ہی گناہ کرتا، تو یہ دل کی تمنا اور اندر کی نیت، اس پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوگی۔ (ترمذی ابواب الزھد عن رسول اللہ ﷺ، باب ما جاء مثل الدنیا مثل اربعۃ نفر)

سماجی رنجشوں کا اصل مرض: تکبر:

یہ سماجی زندگی کے جو ہمارے مسائل ہیں، ان میں ہم اور آپ سب مبتلا ہیں۔ ہم سب سماج میں رہتے ہیں، چھوٹی بڑی باتوں پر ایک دوسرے سے رنجشیں ہوجاتی ہیں؛ لیکن نبی ﷺ کی زبانی ان سب کا علاج بتادیا ہے۔ قرآن میں فرمایا: ''اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ'' (مجادلہ:۱۰)

یہ جو چپکے چپکے سرگوشیاں ہیں، یہ شیطان کی طرف سے ہیں۔کوئی آپ کے خلاف باتیں کرے، سرگوشیاں کرے، چغلی کرے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سرگوشیاں تمہیں نقصان نہیں پہنچاسکتیں، ''اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط '' جب تک اللہ نہ چاہے،اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے، چغلی کرنا، کانا پھونسی کرنا، سرگوشی کے ذریعے دوسروں کے درمیان فتنہ ڈالنا، یہ سب کام مومن کے نہیں ہیں۔قرآن میں فرمایا کہ یہ منافقین اور یہود کی عادت ہے، مؤمن ان راستوں پر نہیں چلتے،اسی لئے ہمیں دعا کرنی چاہئے کہ اللہ تعالیٰ ہماری پرائیویٹ زندگیوں میں،اور ہماری سماجی زندگیوں میں، جو کڑواہٹیں آجاتی ہیں، ان کے ظاہری اسباب سے ہماری حفاظت فرمائے۔حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اصل جڑ تکبر ہے۔یہ بہت باریک گناہ ہے،اور اکثر انسان کو پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کے اندر تکبر بیٹھا ہوا ہے، یہ کب نکلتا ہے؟ جب اللہ والوں کی صحبت نصیب ہو، جب مسلسل ان کی خدمت میں رہیں،اور وہ اللہ والے انسان کے نفس کو توڑنے والی باتیں سنائیں اور اس کی اصلاح کریں، جب تک اپنے نفس کو توڑنے کی مشق نہیں ہوگی، تکبر کا زہر اندر ہی اندر پھیلتا رہے گا۔

تکبر سے نجات کا راستہ:

دوستو اور بزرگو! اسی لئے حاجی امداد اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ سارا بگاڑ، یہ سارا ستیاناس، دراصل تکبر کی وجہ سے ہے، جب آپ کی کسی سے لڑائی ہوجائے اور آپ کہو کہ میں تو لڑنا ہی نہیں چاہتا، تم کچھ بھی کہتے رہو، میں جواب نہیں دوں گا، ہر مرتبہ وہ تکرار کرے لیکن آپ خندہ پیشانی کے ساتھ پیش آئیں، تبھی حقیقتاً دلوں میں نرمی پیدا ہوگی۔اللہ پاک نے قرآن کریم میں فرمایا: ''فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَكَ وَبَیْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ۝۳۴'' (فصلت:۳۴) جس سے تمہاری دشمنی ہے، جب تم بھلائی اور نیکی کے ساتھ پیش آؤ گے تو وہی دشمن تمہارا جگری دوست بن جائے گا، کیونکہ پھر وہ جان لے گا کہ یہ شخص اخلاص والا ہے،اس میں تکبر اور بڑائی نہیں ہے، جو کچھ کہتا ہے اخلاص اور سچائی سے کہتا ہے۔اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان

تعلیمات کے بعد یہ فرمایا: ''اصلاحُ بَینِ النّاس'' لوگوں کے درمیان صلح کرانا اور اخیر میں یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اللہ کی رضا کے لئے صدقہ کرے گا، بھلائی کی کوئی بات کرے گا یا لوگوں میں صلح کروائے گا، اللہ تعالیٰ اس کو بہترین اجر عطا فرمائے گا۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تبارک و تعالیٰ میری اور آپ سب کی، ہر قسم کی غلطیوں کو معاف فرمائے اور ہمیں اصلاح کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخرُ دعوانا انِ الحمدُ للہِ ربِّ العالمین

(۱۶)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا واقعہ اور کرسمس کی تاریخ

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين.

قال الله تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد.

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿۱۶﴾ (مریم:۱۶)

و قال الله تعالى:

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَ كُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾ (مریم:۲۳)

و قال الله تعالى:

وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ (مائدہ:۸۳)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

محترم ومکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج میں نے آپ حضرات کے سامنے کلامِ پاک کی جن آیات کی تلاوت کی ہے، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور اس وقت حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے حالات کا ذکر فرمایا ہے، سورۂ مریم کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بڑی وضاحت کے ساتھ حضرت مریم اور حضرت

عیسیٰ علیہا السلام کا تذکرہ کیا ہے۔ دو دن بعد ہمارے عیسائی بھائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن منائیں گے، قرآنِ کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جس قدر وضاحت فرمائی ہے، اتنی تفصیل کسی اور نبی کے بارے میں نہیں کی گئی، البتہ عیسائی حضرات کے ہاں تاریخ کے اعتبار سے اختلاف ہے، کچھ حضرات ۲۵ دسمبر کو مانتے ہیں، کچھ ۶ جنوری، کچھ ۷ جنوری، اور بعض ۱۹ جنوری کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن سمجھتے ہیں، ان کی مذہبی کتابوں اور تاریخوں میں بھی یہ اختلاف مذکور ہے، اس لیے ان کے یہاں ابتدائی طور پر یہ دن کسی ایک تاریخ پر متعین نہیں رہا۔

قسطنطین اور کرسمس کا آغاز:

محترم بھائیو اور بزرگو! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے تقریباً ڈھائی سو تین سو سال پہلے، تیسری صدی عیسوی میں رومن امپائر کے اندر ایک بادشاہ پیدا ہوا، جس کا نام قسطنطین تھا۔ انگلش میں اسے Constantine کہا جاتا ہے، اسی کی نسبت سے ترکی کا مشہور شہر قسطنطنیہ کہلایا، جسے آج ہم استنبول کے نام سے جانتے ہیں۔ یہ قسطنطین عیسائی مذہب قبول کرنے والا پہلا رومن بادشاہ تھا، اور اس کی والدہ کا نام بھی اتفاق سے مریم تھا، اس نے یورپ میں عیسائی مذہب کو پھیلایا؛ لیکن افسوس! پھیلانے کے ساتھ ساتھ کچھ ایسی چیزیں بھی اس میں شامل کر دیں جن کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات سے نہیں تھا، تمام انبیاء علیہم السلام توحید کی دعوت لے کر آئے تھے، سب نے اپنے آپ کو اللہ کا بندہ اور رسول قرار دیا، مگر عیسائیوں میں کچھ لوگوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلط عقائد اختیار کر لیے، کسی نے کہا کہ وہ ''تین میں کے تیسرے'' ہیں، یعنی تین خداؤں میں سے ایک۔ کسی نے کہا: ''حضرت عیسیٰ اللہ کے بیٹے ہیں''۔ (نعوذ باللہ) یہ سب باتیں ان کے دین میں داخل ہو گئیں۔ قسطنطین نے جب عیسائیت کو یورپ میں پھیلایا تو وہاں کے رومن لوگ پہلے ہی بت پرست تھے، ان میں اپولو (Apollo) نام کے ایک معبود کی پرستش عام تھی۔ قسطنطین نے اسی

ماحول کو دیکھ کر یہ فیصلہ کیا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کا دن ۲۵ دسمبر منایا جائے، اس نے شاہی اعلان کر کے اس دن کو مقرر کر دیا، شروع میں یہ دن سادگی سے منایا جاتا تھا، چرچ میں عبادت کے لیے لوگوں کو بلایا جاتا، لیکن کم لوگ آتے۔ پھر انہوں نے کہا کہ کچھ ایسی چیزیں شامل کی جائیں جن سے عوام زیادہ دلچسپی لیں، اس مقصد سے چرچ میں شمع جلانے اور میوزک شامل کیا گیا، رفتہ رفتہ اس میں اور اضافہ ہوا، مردوں کے ناچ گانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ پھر وقت کے ساتھ یہ بدعت اس حد تک پہنچی کہ ۲۵ دسمبر کو مرد اور عورتیں اجتماعی طور پر ناچنے کودنے لگے۔

شیطان کی تدبیریں اور دین کی تحریف:

دوستو اور بزرگو! یہ شیطان کی پرانی چال ہے، وہ کسی کو سیدھے کفر اور شرک میں نہیں ڈالتا بلکہ آہستہ آہستہ راستہ بدلتا ہے، آج بھی ہمارے بہت سے احباب یہی کہتے ہیں: ''مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ط '' (زمر:۳) ہم ان کی عبادت نہیں کرتے بلکہ انہیں اللہ پاک کے قریب لے جانے کا وسیلہ بناتے ہیں۔ یہی طریقہ عیسائی مذہب میں بھی شروع میں آیا، شیطان نے دھیرے دھیرے ان کے دین میں وہ چیزیں داخل کیں جو اصل میں اس دین کی نہیں تھیں۔

ایسا ہی حضرت آدمؑ اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد بھی ہوا، جب نیک لوگ وفات پا گئے تو شیطان نے ان کے ماننے والوں سے کہا کہ ان کی یاد کے لیے مجسمے بناؤ، تصویریں رکھو تاکہ عبادت میں دل لگے، پھر وقت گزرتا گیا، یہاں تک کہ حضرت نوحؑ کے زمانے تک لوگ انہی مجسموں کے سامنے جھکنے لگے اور شرک عام ہو گیا، اسی لئے حضرت نوحؑ نے سب سے پہلے اسی شرک کے خلاف آواز بلند کی، یہی بات سمجھنے کی ہے کہ دین میں جب کوئی نئی چیز ''مذہب کے نام پر'' داخل ہوتی ہے تو پہلے پہل وہ بے ضرر نظر آتی ہے، مگر وقت کے ساتھ وہ اپنی اصل شکل کھو دیتی ہے اور شیطانی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ ۲۵ دسمبر کی تاریخ کو لیجیے، تین سو سال تک عیسائیوں کے یہاں یہ دن منایا ہی نہیں گیا، مگر جب قسطنطین آیا تو اس نے اسے عبادت کے طور پر منانا شروع کیا، پھر وقت گزرتا گیا اور اس میں نئی نئی چیزیں شامل ہوتی گئیں،

آج صورت یہ ہے کہ اسی دن دنیا میں سب سے زیادہ شراب پی جاتی ہے، رقص وسرور ہوتے ہیں، اور ایسے اعمال کیے جاتے ہیں جن کا حضرت عیسیٰؑ کے دین سے کوئی تعلق نہیں۔

قرآن کی روشنی میں حضرت مریمؑ وحضرت عیسیٰ علیہ السلام:

محترم ومکرم حضرات! مجھے آپ حضرات کے سامنے یہ عرض کرنا ہے کہ قرآنِ کریم نے اگر کسی کا سب سے زیادہ تذکرہ فرمایا ہے، تو وہ ہے حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا قصہ؛ البتہ عمومی طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سب سے زیادہ ذکر میں آتا ہے، مگر کسی نبی کی پیدائش اور پیدائش سے پہلے کے حالات کا اتنا مفصل ذکر قرآن میں نہیں آیا، قرآن میں بیان ہوا کہ حضرت مریم علیہا السلام کی والدہ کی زندگی کیسی تھی، کس طرح کی تربیت ملی، اور حضرت زکریا علیہ السلام کے ذریعے ان کی پرورش کیسے ہوئی، اللہ تعالیٰ ایک آیت میں فرماتے ہیں: ''ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ۝'' (مریم: ۳۴) یہ جو قصہ ہم آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں، وہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سچا قصہ ہے، اس کے باوجود عیسائی اور یہودی اس قصے میں شک میں مبتلا ہیں، قرآنِ کریم نے حضرت مریم رضی اللہ عنہا کی پیدائش، ان کی والدہ کی دعاؤں اور ان کی پرورش کا ذکر بڑے احترام کے ساتھ کیا۔ سورۂ مریم کا نام ہی حضرت مریم کے نام پر ہے اور قرآن میں ۳۰ مرتبہ حضرت مریمؑ کا نام لے کر ذکر کیا گیا، جبکہ کسی اور عورت کا نام قرآن میں نہیں آیا، اس پورے قصے میں بنی اسرائیل کو وہ تمام حقائق بتائے گئے جو وہ نہیں جانتے تھے۔ بعد میں جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم قبول کرنے والے ہوئے، وہ عیسائی کہلائے، جبکہ اصل میں یہ دونوں گروہ یہود ہی تھے۔ وقت کے ساتھ یہودی اور عیسائی دو الگ ناموں میں تقسیم ہو گئے۔

ماں کی گود سے پہلی صدا: اِنِّی عَبْدُ اللّٰہ:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ تفصیل سے ذکر فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ''وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ'' اے نبی!

اس کتاب میں حضرت مریمؑ کا قصہ بیان کیجیے۔اللہ کی طرف سے حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت مریم کے پاس آئے اور خوشخبری دی کہ اللہ آپ کو اولاد عطا فرمائیں گے، حضرت مریم نے تعجب سے کہا: بھلا بغیر شوہر کے یہ کیسے ممکن ہے؟ جواب دیا گیا: ''قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ '' (مریم:۹) یہ تمہارا مسئلہ نہیں، یہ تو اللہ کی قدرت ہے، اور اللہ کے لیے یہ بالکل آسان ہے، پس، حکمِ الٰہی سے حضرت مریمؑ اپنی قوم سے الگ ہوگئیں، جیسا کہ فرمایا گیا: ''فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ '' (مریم:۱۷) جب ولادت کا وقت قریب آیا تو وہ کھجور کے تنے کے پاس جا پہنچیں: ''فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ '' اسی لمحے اللہ تعالیٰ نے ان کی ڈھارس بندھائی، اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ۝۲۴'' (مریم:۲۴) اللہ پاک نے حضرت مریمؑ کے لئے سب سے پہلا انتظام ایک چشمۂ آب جاری کر کے کیا جب لوگوں نے حضرت مریم پر اعتراض کیا کہ یہ بچہ کہاں سے آیا؟ تو اللہ نے حکم دیا کہ آپ بات نہ کریں بلکہ اشارہ کر دیں، چنانچہ حضرت مریمؑ نے اشارہ کیا: ''فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ۭ '' (مریم:۲۹) لوگوں نے تعجب سے کہا: ''كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ۝۲۹'' بھلا ہم گود کے بچے سے کیسے بات کریں؟ لیکن اللہ نے اپنی قدرت کا جلوہ دکھایا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام ماں کی گود میں ہی بول اٹھے: ''قَالَ اِنِّىْ عَبْدُ اللّٰهِ ۙ ''میں اللہ کا بندہ ہوں۔ یہ اعلان دراصل پوری انسانیت کے لیے پیغام ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔جس رب نے بغیر باپ کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا فرمایا، وہی رب العالمین آج بھی ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

قتل وصلیب کا دعویٰ اور قرآن کی تردید:

کتاب اللہ میں چھٹے پارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ '' (نساء:۱۵۶) انہوں نے کفر کیا اور حضرت مریمؑ پر جھوٹی تہمت لگائی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ تہمت سراسر باطل ہے، کیونکہ ''وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرٰنَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا '' (تحریم:۱۲) مریم بنتِ عمران ایسی پاک دامن خاتون ہیں جنہوں نے اپنی عصمت کی حفاظت کی اور پھر انہی

کے بطن سے اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت فرمائی، ہمارے عیسائی بھائی نہیں جانتے کہ ''کرسمس'' کی ابتدا کہاں سے ہوئی اور کس طرح رواج پائی۔ قرآن کریم نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کو نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، اس لیے ہر مسلمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ پاک کے برگزیدہ نبی اور رسول ہیں، وہ حیات ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے انہیں آسمان پر اٹھا لیا، اسی پارے میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر تہمت لگائی اور پھر جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبوت عطا کی گئی تو انہوں نے رومی بادشاہ کو ورغلا کر آپ کے مکان کو گھیر لیا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ نافذ فرمایا: ''وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ '' (نساء:۱۵۷) نہ وہ حضرت عیسیٰ کو قتل کر سکے اور نہ سولی پر چڑھا سکے، بلکہ انہیں شبہ میں ڈال دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ''بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝'' اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنی جانب اٹھا لیا، اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ پس ایک مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بھی دیگر انبیاء کرام کی طرح اللہ کے بندے اور رسول ہیں۔ جب عیسائیوں نے اعتراض کیا کہ بغیر باپ کے کیسے پیدا ہوئے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ '' (آل عمران:۵۹) عیسیٰ علیہ السلام کی مثال آدم علیہ السلام کی طرح ہے؛ اللہ نے انہیں مٹی سے پیدا فرمایا۔ یوں اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سلسلے میں آنے والے ہر اعتراض اور ہر شبہے کو دور کر دیا۔ بلکہ قرآن کریم میں ان کے خاندان، حضرت مریمؑ کی طہارت، اور ان کے تقویٰ و بزرگی کا ذکر فرمایا تاکہ ہمیشہ کے لیے یہ حقیقت واضح رہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت اللہ کی قدرت کی نشانی ہے۔

ہجرتِ حبشہ اور نجاشی کے دربار میں حق کی گواہی:

کیسی بزرگی کی بات ہے! میں نے آپ حضرات کے سامنے ایک اور آیت کی تلاوت کی تھی: ''وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ

الْحَقِّ ۚ ‘‘ (مائدہ:۸۳) ان آیات کے شانِ نزول میں ایک نہایت ایمان افروز واقعہ ملتا ہے، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ پر مکہ مکرمہ میں رہنا دشوار ہو گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں حبشہ (جسے آج ایتھوپیا [Ethiopia] کہا جاتا ہے) کی طرف ہجرت کا حکم دیا، آپ کو معلوم تھا کہ وہاں کا بادشاہ عیسائی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والا ہے، اس لیے وہاں مسلمانوں کو پناہ ملے گی۔ مکہ کے سرداروں کے مختلف ملکوں کے بادشاہوں سے تجارتی تعلقات تھے، اسی وجہ سے ان کا رابطہ حبشہ کے نیک دل بادشاہ نجاشی سے بھی تھا، جب صحابہؓ وہاں پہنچ گئے تو قریش کی طرف سے ایک وفد بھیجا گیا جس میں حضرت عمرو بن عاصؓ اور ربیعہ شامل تھے، انہوں نے وہاں کے پادریوں سے کہا کہ ہمارے کچھ نوجوان تمہارے ملک میں آئے ہیں، یہ نہ تو ہمارے دین پر ہیں اور نہ ہی تمہارے دین پر، بلکہ یہ ایک نیا دین لے کر آئے ہیں، اس لئے انہیں واپس مکہ بھیج دیا جائے؛ لیکن نجاشی ایک عادل اور نیک فطرت بادشاہ تھا، اس نے کہا: ’’یہ میرے مہمان ہیں، میں خود ان سے تحقیق کروں گا کہ یہ کون ہیں اور کیوں آئے ہیں۔‘‘ اس وقت صحابہؓ میں مشورہ ہوا اور حضرت جعفر بن ابی طالبؓ نے فرمایا: ’’آج میں تمہارا نمائندہ ہوں گا اور جواب دوں گا۔‘‘ بادشاہ سے کہا: ’’ہم ایک نبی کے پیروکار ہیں، اس سے پہلے ہم طرح طرح کی برائیوں میں مبتلا تھے؛ سماجی برائیاں بھی تھیں اور مذہبی گمراہیاں بھی، ہمارے نبیؐ نے ہمیں ان سب سے نکالا اور توحید و پاکیزگی کی دعوت دی۔‘‘ نجاشی نے ان کی باتیں سنیں، دل مطمئن ہوا اور فرمایا: ’’اب تم لوگ میرے مہمان ہو۔‘‘

عمرو بن عاصؓ جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے، انہوں نے اپنے ساتھی سے کہا: ’’ہمارا مسئلہ حل نہیں ہوا، کل میں ایک ایسی ترکیب کروں گا کہ بادشاہ ان مسلمانوں کو واپس بھیجنے پر مجبور ہو جائے گا۔‘‘ دوسرے دن وہ بادشاہ کے دربار میں گئے اور کہا: ’’حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں ان کا عقیدہ آپ کے عقیدے سے مختلف ہے، آپ ان سے دریافت کریں۔‘‘ چنانچہ حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے سامنے سورۂ مریم کی وہی آیات تلاوت کیں جن

میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت مریمؑ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں حقیقت بیان فرمائی ہے، کس طرح حضرت مریمؑ مشرقی حصے میں گئیں، اللہ کے حکم سے فرشتے نے ان میں روح پھونکی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ یہ آیات سن کر نجاشی اور اس کے پادریوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیونکہ وہ حق کو پہچان گئے۔ جب یہ کلام سنایا گیا تو نجاشی اور اس کے پادری بے اختیار رو پڑے۔ قرآن نے اس کیفیت کو یوں بیان کیا: ''وَاِذَا سَمِعُوْا مَا اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ'' (مائدہ:۸۳) وہ کیوں روئے؟ اس لئے کہ قرآن نے حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں وہی سچی حقیقت بیان کی جسے بعد میں رومی حکمران قسطنطین نے بدل ڈالا تھا، مگر وحی الٰہی نے اصل حق کو دوبارہ آشکار کر دیا۔

پھر رسول اکرم ﷺ نے احادیث میں اس حقیقت کو مزید واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام قیامت سے پہلے دوبارہ زمین پر اتریں گے۔ قرآن میں ارشاد ہے: ''وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ؕ'' حضرت عیسیٰؑ قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں، اس میں شک نہ کرو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب وہ اتریں گے تو عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کریں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، اور اس وقت کے تمام عیسائی ان پر ایمان لا کر درحقیقت نبی اکرم ﷺ کی نبوت کو مان لیں گے، خنزیر کو قتل کریں گے، جزیہ نافذ کریں گے، مال کی کثرت ہوگی؛ لیکن اس کی طرف توجہ نہ دیں گے۔ (صحیح مسلم: کتاب الایمان، باب نزول عیسیٰ ابن مریم ما کما بشریعة نبینا محمد ﷺ، بخاری: کتاب احادیث الانبیاء، باب نزول عیسیٰ ابن مریم) اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ''وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ'' (نساء:۱۵۹) اہل کتاب میں سے ہر ایک موت سے پہلے حضرت عیسیٰؑ کی حقیقت کو ضرور مان لے گا۔ یوں نجاشی اور اس کے پادریوں نے حق کو پہچان لیا، جیسے کہ قرآن نے فرمایا: ''يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ'' (بقرہ:۱۴۶) وہ نبی اکرم ﷺ کو ایسے پہچانتے تھے

جیسے اپنی اولاد کو پہچانتے ہیں۔

بدعات کا فتنہ اور سنت کا اٹھ جانا:

دوستو اور بزرگو! مجھے آپ حضرات کے سامنے دو باتیں عرض کرنی ہیں: پہلی بات یہ ہے کہ جو قومیں کسی ایک دن کو مناتی ہیں، یعنی جشن منانا اور نبی کی تعلیمات کے خلاف چلنا، دراصل یہ شیطانی چال ہے، اصل میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حقیقی تعلیم سے ان لوگوں کو ہٹا دیا گیا اور اس میں دوسری چیزیں شامل کر دی گئیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس علاقے سے سنت ختم ہو جائے گی اور جہاں بدعات رواج پائیں گی، اللہ تعالیٰ وہاں سے سنت کو اٹھا لیں گے۔ (مسند احمد: رقم: ۱۶۹۷۰) دوسری بات یہ ہے کہ یہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طریقہ ہے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبرِ مبارک کے پاس ایک جگہ ابھی محفوظ رکھی گئی ہے، قیامت سے پہلے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائیں گے اور آپ کی تدفین وہیں ہوگی، جہاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آرام فرما ہیں یعنی حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حجرے میں۔

تین میں ایک اور ایک میں تین کی حقیقت:

دوستو اور بزرگو! قرآن مجید نے بڑی تفصیل سے اصل عقیدہ بیان فرمایا ہے۔ حضرت عیسیٰؑ نے جب پیدا ہوئے تو سب سے پہلا جملہ کہا وہ یہی تھا: ''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ'' میں اللہ کا بندہ ہوں۔ یہ اعلان دراصل اس باطل عقیدے کی تردید تھی جو بعد میں گھڑا گیا کہ ''ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ'' یعنی تین میں ایک اور ایک میں تین۔ قرآن نے صاف فرمایا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اس تعلیم کے ساتھ نہیں آئے تھے، اسی لیے سورۂ مریم کے آخر میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: ''وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۘ'' لوگوں نے اللہ کے لیے بیٹا قرار دیا۔ یہود نے کہا: ''عُزَيْرُ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ ؕ'' (توبہ: ۳۰) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: یہ دونوں غلط کہتے ہیں، ''سبحانہ'' وہ ان تمام عیوب سے پاک ہے، یہ کہنا کہ اللہ کے لیے اولاد ہے، بہت بڑی جسارت ہے۔ قرآن مزید وضاحت کرتا ہے: ''لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ۙ۝۸۹'' (مریم: ۸۹) تم نے

نہایت بھاری بات کہی۔ ''تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝'' آسمان پھٹ جائیں، زمین شق ہوجائے اور پہاڑ لرز کر گر پڑیں، جب کوئی کہتا ہے کہ اللہ کی اولاد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ اخلاص میں بالکل صاف فرما دیا: ''اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وہ صمد ہے، یعنی سب اس کے محتاج ہیں اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے اور نہ وہ کسی سے پیدا ہوا ہے۔ دوستو! یہی اصل تعلیم تھی جو حضرت عیسیٰؑ لے کر آئے تھے، لیکن جب لوگوں نے اس پر اعتماد نہ کیا، اسے محفوظ نہ رکھا اور اپنی طرف سے عقیدے گھڑ لیے، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے گناہوں میں مبتلا کر دیا۔

سنت کی پیروی اور حفاظت:

''وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ'' (بقرہ:۱۰۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہود کو ہم نے تورات جیسی مقدس کتاب عطا کی: ''اِنَّآ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِيْهَا هُدًى وَّنُوْرٌ ۚ'' (مائدہ:۴۴) ہم نے انہیں ہدایت اور نور والی کتاب دی، مگر انہوں نے اس کی قدر نہ کی اور اسے نہ مانا، اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انہیں حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کے زمانے میں جادو اور جنات کے دھوکے میں ڈال دیا، یہ واقعہ قرآن میں بیان ہوا تاکہ ہمیں سبق ملے کہ جب ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں پر عمل کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ہمیں ہر قسم کے فتنوں اور نقصان سے محفوظ رکھیں گے۔

قرآن کی روشنی میں عقیدہ اور عمل:

اس لیے کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں، کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہیں۔ جب نجاشی کے سامنے حضرت جعفرؓ نے یہ بیان کیا تو انہوں نے نیچے سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا: اتنا بھی فرق میرے اور تمہارے عقیدے کے درمیان نہیں ہے۔ حضرت جعفرؓ نے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق قرآن کی آیات اور اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول بیان کیے، وہ بالکل اسی طرح ہمارے مذہب میں بھی موجود ہیں۔ اس کے

بعد نجاشی نے صحابہؓ کو عزت دی اور کچھ عرصہ انہیں وہاں ٹھہرنے دیا، پھر وہ مدینہ ہجرت کر گئے۔ یہ واقعہ قرآن میں ذکر کیا گیا ہے تا کہ ہمیں سبق ملے کہ ہمیں قرآن کی تعلیمات اخذ کرنی چاہئے، قرآن پڑھنا چاہیے اور اس کی تفسیر سننی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق جو شاندار کلام فرمایا، وہ ہمیں سمجھنے کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن میں چھوٹی چھوٹی باتیں بھی ان کے متعلق بیان کی گئی ہیں تا کہ ہم اپنے عیسائی بھائیوں کو بھی حقائق سمجھا سکیں۔ خاص طور پر سورۂ آلِ عمران میں یہ عقائد بار بار بیان ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں رسم و رواج یا غیر ضروری جشن و تقریبات میں گرفتار نہ کرے، بلکہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے والا بنائے، اور ہمیں ہر قسم کے خرافات سے محفوظ رکھے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے ایمان اور ہماری اولاد کے ایمان کی بھی حفاظت فرمائے، آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۱۷)

پڑوسیوں کے حقوق وآداب

الحمدلله رب العالمين و الصلوٰة و السلام على سيد المرسلين و على آله و اصحابه اجمعين. اما بعد! قال الله تبارک و تعالىٰ فى الكلام المجيد و الفرقان الحميد.

اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم بسم الله الرحمٰن الرحيم

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرَا ۙ﴿۳۶﴾ (نساء:۳۶)

وقال النبى صلى الله عليه وسلم: وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ، قِيلَ: وَمَنْ يَا رَسُولَ اللهِ؟ قَالَ: الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ. (بخارى: كتاب الادب، باب اثم من لا يأمن جاره بوائقه)

وقال النبى صلى الله عليه وسلم ما زال جبريلُ يوصيني بالجارِ حتّى ظننتُ أنه سيورِّثُه. (بخارى: كتاب الادب، باب الوصاة بالجار)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبى الكريم و نحن على ذلک لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمدلله رب العالمين

محترم ومکرم حضرات علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جس آیت کی آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اور اپنے بندوں کے حقوق

کو واضح طور پر بیان فرمایا، انسان ایک سماجی زندگی گزارنے والی ہستی ہے اور اسے مختلف لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے پڑتے ہیں، جن میں سب سے زیادہ وقت پڑوسیوں کے ساتھ گزرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں پڑوسیوں سمیت تمام سماجی تعلقات کے حقوق کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔

آپ کے سامنے پڑھی گئی آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاعْبُدُوا اللهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا'' سب سے پہلے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ صرف اسی کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہراؤ۔ اس کے بعد والدین کے حقوق کا ذکر فرمایا گیا، یعنی ماں اور باپ کے حقوق۔ مزید آیات میں بچوں، بیٹوں اور بیٹیوں کے حقوق بھی بیان ہوئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے سماج کے کمزور طبقوں، مساکین، اور ابن السبیل یعنی مسافروں کے حقوق کی تفصیل بیان کی۔ پوری آیت میں تین الگ الگ الفاظ استعمال کر کے پڑوسیوں اور دیگر افراد کے حقوق کی بڑی باریکی سے وضاحت کی گئی ہے، یہ سب ہمیں اس بات کی یاددہانی کرواتا ہے کہ ہمیں نہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت پر توجہ دینی چاہیے بلکہ اپنے اردگرد کے افراد کے حقوق کی بھی حفاظت کرنی چاہیے۔

سلوکِ حسنہ اور ایمان:

سب سے پہلے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ'' آپ کے قریب کے رشتہ دار یا قریب کے پڑوسی، اور ساتھ ہی آپ کے پہلو کے ساتھی۔ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف قریب کے پڑوسی کا ذکر فرمایا اور ساتھ ہی دور کے پڑوسی کا بھی، اور تیسرے نمبر پر اس شخص کا ذکر کیا جو تھوڑی دیر کے لیے آپ کے ساتھ بیٹھے، جیسے ٹرین یا بس میں، یا کسی مجلس میں۔

قرآن کریم نے انسانی حقوق کا یہاں تک اہتمام فرمایا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''وَاللهِ لَا يُؤْمِنُ'' اللہ کی قسم، وہ شخص کامل مؤمن نہیں ہے۔ صحابہ کرام نے تعجب کیا اور پوچھا: یہ کون شخص ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''الَّذِي لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ'' (بخاری: کتاب الادب، باب اثم من لا یأمن جارہ بوائقہ) وہ شخص جس کا پڑوسی اس کی تکلیف سے مطمئن نہ ہو، یا جس

سے پڑوسی کو نقصان پہنچے،اسی طرح آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهُ'' (بخاری: کتاب الادب،باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ)اور ایک اور روایت میں فرمایا: ''فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ'' (بخاری: کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ) جو شخص اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لاتا ہے، وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہیں دیتا بلکہ اسے عزت اور اکرام دیتا ہے اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص اللہ کی رحمت سے دور ہوگا جس کا پڑوسی اس کی تکلیف سے مطمئن نہ ہو، یہ تمام تعلیمات ہمیں یہ سبق دیتی ہیں کہ پڑوسیوں کے حقوق کی حفاظت ایمان کا حصہ ہے اور اللہ کی رضا کا ذریعہ ہے۔

پڑوسی کے تین درجے اور ان کے حقوق:

آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْبِ'' یہ تین کلمات پڑوسیوں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہیں۔قریب کا پڑوسی: اس سے مراد وہ شخص ہے جس کا مکان آپ کے مکان کے قریب ہو۔بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس سے مراد قریبی رشتہ دار بھی ہے۔دور کا پڑوسی: وہ جو آپ کے پاس رہتا ہے مگر رشتہ دار نہیں ہے۔ساتھ بیٹھنے یا ساتھ چلنے والا: جیسے سفر میں ٹرین یا بس کا ساتھی، یا مجلس میں پاس بیٹھنے والا۔اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ بعض پڑوسی ایسے ہوتے ہیں جو مسلمان بھی ہیں، رشتہ دار بھی ہیں اور پڑوسی بھی۔ایسے شخص کے تین حق ہیں: پڑوسی ہونے کا، رشتہ داری کا اور مسلمان ہونے کا۔اسی طرح کوئی پڑوسی ایسا ہوسکتا ہے جو مسلمان تو ہے مگر رشتہ دار نہیں؛ اس کے دو حق ہیں۔اور اگر پڑوسی غیر مسلم ہے تو اس کا بھی حق ہے۔(شعب الایمان،باب اکرام الجار، رقم: ۹۵۶۰) کیونکہ قرآن وحدیث نے پڑوسی کے حقوق کو عام رکھا ہے۔حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا، آپؓ اس کے ہاں کھانے پینے کی چیزیں بھیجتے رہتے تھے، جب کسی نے تعجب سے پوچھا تو آپؓ نے فرمایا: میں نے آپ ﷺ کو فرماتے ہوئے سنا ہے ''مازال جبرئیل یوصینی بالجار، حتی ظننت انه سیورثه'' (ترمذی: ابواب البر والصلة،باب ماجاء فی حق الجور) حدیث

شریف میں پڑوسی کے حقوق کا ذکر ہے، مسلمان یا غیر مسلم کی قید نہیں لگائی گئی، اس لیے میں اپنے پڑوسی کا حق ادا کرتا ہوں۔ یوں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑوسیوں کے حقوق پر بہت زور دیا اور مختلف احادیث میں ان کی اہمیت واضح فرمائی۔

روزمرہ جھگڑوں کی اصل بنیاد:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''بُعِثْتُ لِأُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْأَخْلَاقِ'' (سنن الکبریٰ: ۱۰، ۳۲۳، رقم: ۲۰۷۸۲) مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اخلاق کو کامل درجے تک پہنچاؤں۔ قرآنِ کریم میں جو آیت نازل ہوئی اور جس میں پڑوسیوں کے تین اقسام ذکر ہوئے اور ان کے حقوق بیان کیے گئے، یہ اس بات کی گواہی ہے کہ انسان کا سب سے زیادہ واسطہ اپنے پڑوسیوں سے پڑتا ہے، انہی کے ساتھ روزمرہ کے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً: پڑوسی کا بچہ اگر آپ کے گھر میں آکر کوئی چیز توڑ دے یا پڑوسی کا جانور نقصان پہنچادے۔ دیہاتوں میں اکثر جھگڑے انہی باتوں پر ہوا کرتے تھے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''فَلَا يُؤْذِ جَارَهُ'' (بخاری: کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ) اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دو۔ ایک طرف ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ اپنے پڑوسی کی عزت وتکریم کرو، اور دوسری طرف پڑوسی کو ہدایت دی گئی کہ وہ کسی کو تکلیف نہ دے۔ یہ تکلیف کبھی ظاہری ہوتی ہے اور کبھی نفسیاتی (سائیکولوجیکل)۔ کسی نہ کسی انداز میں پڑوسی کو ستانا بھی ایذا رسانی ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''إِنَّ اللهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا'' اللہ تعالیٰ اس شخص کو پسند نہیں کرتا جو متکبر اور گھمنڈی ہو اور پڑوسی کو کمتر سمجھنا اور اس کے حقوق کو نظر انداز کرنا دراصل تکبر کی ایک علامت ہے۔

جبرئیلؑ کی مسلسل تاکید:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: حضرت جبرئیل علیہ الصلاۃ والسلام مجھے مسلسل پڑوسی کے بارے میں وصیت کرتے رہے، یہاں تک کہ میں نے گمان کیا کہ شاید اللہ تعالیٰ پڑوسی کو بھی وراثت میں شریک کردیں گے۔ ''حتیٰ ظننتُ أنه سيورِّثه'' (ترمذی: ابواب البر والصلۃ، باب

ماجاء فی حق الجور) یعنی اتنی مرتبہ حضرت جبرئیلؑ نے پڑوسی کے حق اور اس کی اہمیت بیان کی کہ نبی کریم ﷺ نے اپنا یہ اندیشہ ظاہر فرمایا کہ شاید پڑوسی کو بھی والدین، بھائی، بہن اور دیگر ورثاء کی طرح وراثت میں شامل کر دیا جائے، یہ دراصل پڑوسی کے مقام اور اس کے حقوق کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔

صرف ہمسائیگی نہیں بلکہ امتحان:

دوستو اور بزرگو! ہم سب اپنے پڑوسیوں کے ساتھ رہتے ہیں، اور زندگی کے اکثر مسائل اور پریشانیاں جب بھی آتی ہیں تو سب سے پہلے ہمارا سہارا بھی پڑوسی ہی بنتا ہے، یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ سب سے قریب انسان کا پڑوسی ہوتا ہے، اسی لیے ایک صحابیؓ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا: یا رسول اللہ! مجھے کیسے پتہ چلے کہ میں اچھا ہوں یا نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: جب تمہارے پڑوسی تمہیں اچھا کہیں تو سمجھ لو کہ تم واقعی اچھے ہو اور وہ برا کہے تو تم برے ہو۔ (ابن ماجۃ: کتاب الزھد، باب الثناء الحسن) کیونکہ اخلاق کا اصل پیمانہ برتاؤ ہے۔ اپنے قریبی رشتہ دار کے ساتھ تو ہر کوئی اچھا سلوک کرتا ہے، لیکن پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک اس بات کا امتحان ہے کہ انسان کا اخلاق کیسا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ صرف ہمسائیگی کا تعلق ہوتا ہے، کوئی اور رشتہ داری نہیں، اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کو بار بار پڑوسی کے حقوق کی یاددہانی کروائی۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت علیؓ کو آپ ﷺ نے مسجد کے دروازے پر کھڑا کیا اور فرمایا: لوگوں کو اعلان کر دو کہ اپنے پڑوسیوں کے حقوق ادا کرو، تمہاری وجہ سے پڑوسی کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنی چاہیے۔ (المعجم الکبیر للطبرانی)

حقِ شفعہ؛ مکان بیچنے کا اسلامی اصول:

یہاں تک کہ فقہ کی کتابوں میں اور خود نبی کریم ﷺ کے ارشادات میں بھی پڑوسی کے حق کو نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ ایک مسئلہ حقِ شفعہ کا ہے، اگر کوئی شخص اپنا مکان بیچنا چاہے تو

سب سے پہلے پڑوسی سے بات کی جائے، اگر وہ اسی قیمت پر خریدنا چاہے جو آپ طلب کر رہے ہیں یا کوئی اور دے رہا ہے، تو سب سے پہلا حق پڑوسی کا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پڑوسی کو حقِ شفعہ حاصل ہے۔ (ترمذی: کتاب الاحکام، باب ماجاء فی الشفعة) اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نے بغیر پوچھے کسی اور کو مکان بیچ دیا تو خریدار پر لازم ہے کہ وہ یہ تحقیق کرے کہ بیچنے والے کا پڑوسی اس کو خریدنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر پڑوسی خریدنا چاہے تو اسے ترجیح دی جائے؛ یہاں تک کہ اگر کسی نے خرید لیا اور پڑوسی کو نظر انداز کر دیا تو وہ پڑوسی اسلامی قاضی کے پاس جا کر اپنا حق جتا سکتا ہے، یہ سب اس لیے ہے تاکہ خریدار اور بیچنے والا دونوں جان لیں کہ اسلام نے پڑوسی کے حقوق کو کس قدر اہمیت دی ہے، اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اتنی تاکید کیوں فرمائی؟ اس لیے کہ پڑوسی کے ساتھ سکونت اور ہمسائیگی کا تعلق باقی سب رشتوں سے زیادہ عملی اور روزمرہ زندگی کا حصہ ہوتا ہے، اسی لیے اسلام نے اسے غیر معمولی درجہ دیا۔

ایذاء سے عفو تک؛ ایک صحابیؓ کا ایمان افروز واقعہ:

ایک صحابیٔ رسول رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے پڑوسی سے اذیت پہنچتی تھی، وہ بار بار صبر کرتے رہے مگر جب تکلیف حد سے بڑھ گئی تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں فرمایا: اپنا سامان گھر سے باہر نکال دو؛ چنانچہ انہوں نے اپنا ساز وسامان باہر رکھ دیا، اب جو بھی گزرنے والا دیکھتا، پوچھتا کہ یہ سامان باہر کیوں رکھا ہے؟ صحابی جواب دیتے: ''میرے پڑوسی کی ایذا رسانی کی وجہ سے'' یہ خبر پورے محلے اور معاشرے میں پھیل گئی، چونکہ وہ خیر القرون کا زمانہ تھا، اس کا فوری اثر ہوا۔ جس پڑوسی نے تکلیف دی تھی، اسے ندامت ہوئی اور وہ دوڑ کر آیا، معافی مانگی اور منت سماجت کرنے لگا کہ بھائی! مجھے معاف کر دیجیے، اب آپ کو میری طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ (ابوداود: کتاب الادب، باب فی حق الجوار) یوں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عملی سبق دیا کہ پڑوسی کا حق ادا کرنا اور اس کا لحاظ رکھنا کتنا ضروری ہے۔

چھوٹے تحفے، بڑے رشتے:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لا تحقرن جارة لجارتها'' کوئی عورت اپنی پڑوسن کو کوئی چھوٹی سی چیز بھی ہدیہ میں دے تو اسے حقیر نہ سمجھے اور آگے حدیث میں فرمایا: ''ولو فرسن شاة'' (بخاری: کتاب الهبة وفضلها التعريض عليها ،رقم: ۲۵۶۶) اگرچہ وہ بکری کا کُھر ہی کیوں نہ ہو۔ عربوں کے یہاں بکری کا کھر نہایت معمولی چیز سمجھا جاتا تھا، کوئی بڑی قیمت یا وقعت نہیں رکھتا تھا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال سے دونوں پہلو واضح فرمادیے: دینے والے کو تعلیم دی کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز دینا بھی معمولی مت سمجھو، یہ بھی باعثِ اجر و محبت ہے اور لینے والے کو ہدایت دی کہ اگر کوئی پڑوسی یا پڑوسن تمہیں ہدیہ میں کوئی معمولی چیز بھی دے تو اسے حقیر نہ سمجھو، بلکہ اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی عملی تعلیم ہے کہ پڑوسیوں کے ساتھ تعلقات محبت، ایثار اور احترام پر قائم ہونے چاہئے۔

قرآنی دعا اور نبوی تربیت کی روشنی میں اجتماعی زندگی:

قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کا ذکر فرمایا جو فرعون کی بیوی تھیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی: ''رَبِّ ابْنِ لِيْ عِنْدَكَ بَيْتًا'' اے میرے رب! اپنے قرب میں میرے لئے جنت میں ایک گھر بنادیجئے۔ غور کیجئے! کیسا عظیم جملہ ہے جسے قرآن نے ان کی فضیلت کے موقع پر نقل فرمایا، اس دعا میں انہوں نے اللہ تعالیٰ سے محبت اور تعلق کی بنیاد پر اللہ کے قرب و پڑوس کا سوال کیا، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت آسیہ رضی اللہ عنہا کے نزدیک پڑوس کی کتنی اہمیت تھی، یہاں تک کہ انہوں نے جنت میں بھی اللہ کے پڑوس کو مانگا۔

دوستو اور بزرگو! بات کڑوی ضرور ہے لیکن حقیقت ہے کہ ہماری زندگی کا حال یہ ہے کہ ہم خود بھی بے چین ہیں اور ہمارے پڑوسی بھی سکون میں نہیں؛ حالانکہ ہم سب ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں اور ہر ایک پر لازم ہے کہ اپنے پڑوسی کے حقوق ادا کرے، بسا اوقات ایک شخص اچھے اخلاق اور حسنِ سلوک سے پڑوسی کے ساتھ رہتا ہے لیکن بدلے میں اسے وہی رویہ

نہیں ملتا، بلکہ شک وشبہات اور بدگمانیاں پیدا کردی جاتی ہیں، اگر کوئی احسان کرے تو یہ گمان کرلیا جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی مجبوری یا سیاست ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سوچ کو ختم کرنے کے لئے فرمایا: ''تَهَادُوْا تَحَابُّوْا'' (موطا مالك: كتاب الجامع، باب ماجاء فی المصافحة) آپس میں ایک دوسرے کو تحفے دیتے رہو، اس سے محبتیں بڑھتی ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک فرمایا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی اس سنت کو زندہ رکھا۔ یقیناً مسائل اور چھوٹی موٹی رنجشیں تو آتی ہیں، گھروں میں بچے ہیں، عورتیں ہیں، تعلقات میں اتار چڑھاؤ بھی ہوتا ہے، کبھی مہمان آتے ہیں اور گھر بند ہو تو سب سے پہلے پڑوسی سے پوچھا جاتا ہے، شادی بیاہ کے مشورے بھی پڑوسی سے لئے جاتے ہیں؛ لیکن کبھی دشمنی کی بنیاد پر پڑوسی صحیح مشورہ نہیں دیتا اور دل کی بھڑاس نکالتا ہے، اسی لئے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں تعلیم دی کہ اگر پڑوسی کی طرف سے کوئی تکلیف یا بدگمانی ہو تو صبر کرو، برداشت کرو اور خود تکلیف نہ دو؛ بلکہ اگر کوئی غلط فہمی ہو تو خود آگے بڑھ کر وضاحت کردو تاکہ دل صاف ہوجائے، یہی اسلامی شریعت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت للعالمین بن کر تشریف لائے، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلقات کو خوشگوار بنانے کے لئے ہر پہلو کی وضاحت فرمائی، اسی بنیاد پر پڑوسیوں کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سخت تاکید فرمائی کہ پڑوسی کے حقوق کا خیال رکھو، یہ یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ ہوتا ہے، اسی لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دونوں کو خطاب کرکے فرمایا کہ ایک دوسرے کا حق ادا کرو۔

حقوق کا نظام؛ اللہ پاک سے بندے تک:

الغرض! جس آیتِ مبارکہ کی تلاوت آپ حضرات کے سامنے کی گئی، اس میں اللہ تعالیٰ نے حقوق کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ ذکر فرمایا، سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کا حق بیان فرمایا: ''وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا'' اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہراؤ؛ نہ اس کی ذات میں، نہ اس کی صفات میں، نہ اس کے علم، قدرت اور کنٹرول میں، وہ

ہر پہلو سے یکتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا: ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ'' اس کے اسماء الحسنیٰ اور صفاتِ کاملہ کا تقاضا یہی ہے کہ عبادت صرف اسی کے لئے ہے، کسی اور کے لئے نہیں۔ فوراً بعد اللہ تعالیٰ نے والدین کا ذکر فرمایا: '' وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا'' دوسری آیات میں بھی یہی ترتیب رکھی گئی، جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا: ''وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا'' یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ ہی ربِ حقیقی ہے، وہی خالق اور رازق ہے، لیکن والدین کو ذریعہ بنایا کہ وہ انسان کی پرورش کریں، اس لئے انہیں ربِ مجازی کہا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے دعا سکھائی گئی: ''رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴿۲۴﴾'' اے میرے رب! میرے والدین پر رحم فرما، جیسا کہ انہوں نے بچپن میں مجھ پر رحم کیا۔ یوں اللہ کے حق کے فوراً بعد والدین کے حقوق کا نمبر آتا ہے، اور یہی ترتیب قرآن وحدیث میں بار بار دہرائی گئی ہے۔

اس کے بعد قرآنِ کریم نے قریبی رشتہ داروں کا ذکر فرمایا: '' الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ط '' صلہ رحمی کرو، رشتہ داری جوڑو، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات کو پیدا فرمایا تو صلہ رحمی کو ایک وجود دیا، اس نے عرض کیا: ''**هٰذا مَقامُ العائِذِ بِك من القطيعة**'' یہ موقع ہے کہ میں آپ سے شکایت کروں ان لوگوں کی جو رشتہ داری توڑیں گے اور قریبیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کریں گے۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا: ''**اما ترضين ان اصل من وصلك، و اقطع من قطعك؟**'' (بخاری: کتاب الادب، باب من وصل وصلہ اللہ) جو تجھ سے رشتہ جوڑے گا میں اس سے اپنا تعلق جوڑوں گا، اور جو تجھ کو توڑے گا میں اس سے اپنا تعلق کاٹ دوں گا۔ یوں دوسرے درجے پر والدین کے بعد قریبی اور دور کے رشتہ داروں کا ذکر فرمایا۔ پھر اس کے بعد مسکین کا ذکر کیا، یعنی سماج کے کمزور اور ضرورت مند طبقے کا اور اس کے بعد تین جملوں میں پڑوسیوں کے حقوق کی تفصیل بیان فرمائی: ''وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ '' آپ کے قریبی پڑوسی، غیر قریبی پڑوسی اور وہ ساتھی جو آپ کے پہلو میں ہو، چاہے وہ بس میں بیٹھا ہو، ٹرین میں ہو، ہوائی جہاز میں ہو یا کسی مجلس میں،

یہاں تک کہ کچھ دیر کا ہم نشین بھی قرآن کی نظر میں حقوق رکھتا ہے اور غور کیجئے! جس نبی ﷺ پر یہ قرآن نازل ہوا، ان کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اتنی بار پڑوسی کے حقوق کی تاکید کی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو گمان ہو گیا کہ شاید پڑوسی کو وارث بھی بنا دیا جائے۔

تکبر اور اَنا؛ تعلقات کی سب سے بڑی رکاوٹ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں یہ زندگی اور اس میں پیش آنے والے مواقع عطا فرمائے ہیں، سماجی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، کبھی ہلکی پھلکی رنجش بھی ہو جاتی ہے، یہ سب انسانی فطرت میں شامل ہے، جسے اللہ پاک نے رکھا ہے، اس لیے مسائل کا ہونا لازمی ہے، مگر اصل کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہم ان مسائل کو کم کریں اور ان کا بہتر حل تلاش کریں، پڑوسیوں کے مسائل بھی ہمیشہ سے انسانی سماج کا حصہ رہے ہیں، نبی کریم ﷺ کے زمانے میں بھی اس طرح کے مسائل پیش آئے اور حضور ﷺ نے ان کا بہترین حل بتایا؛ کیونکہ انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ اکیلا نہیں رہ سکتا۔ شاعر کہتا ہے: ''سُمِّيَ الإنسانُ إنسانًا لِأُنسِهِ'' انسان کی طبیعت میں اللہ نے انس، محبت اور مانوسیت رکھی ہے۔ انسان دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارتا ہے اور زیادہ تر سب سے پہلے جس کے ساتھ یہ مانوسیت قائم ہوتی ہے، وہ اس کا پڑوسی ہوتا ہے، اسی لیے اللہ پاک کے نبی ﷺ نے پڑوسی کے حقوق پر بہت تاکید فرمائی ہے، اگر ہر پڑوسی دوسرے کے ساتھ اچھے سلوک کا برتاؤ کرے، تو ناچاقیاں، نفرتیں اور دشمنی پھیلانے والے کبھی کامیاب نہ ہوں۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ'' برائی کو اچھائی سے ٹالو۔ اگر آپ کا پڑوسی آپ سے برا سلوک کرے، تب بھی آپ اس کے ساتھ بھلائی کریں؛ کیونکہ مقصد تو اپنے رب کو راضی کرنا ہے، جب اللہ راضی ہوں گے تو وہی بندوں کے دلوں میں بھی محبت ڈال دیں گے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے سے محبت کرتے ہیں تو حضرت جبرئیلؑ کو حکم دیتے ہیں کہ میں فلاں بندے سے محبت کرتا ہوں، تم بھی اس سے محبت کرو۔ پھر جبرائیلؑ آسمانوں پر اعلان کرتے ہیں، اور

تمام فرشتے بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔اس کے بعد اللہ تعالیٰ اس بندے کی محبت اپنے نیک بندوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ (بخاری: کتاب بدء الخلق، باب ذکر الملائکۃ) یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات ہم کسی کو دیکھے بغیر صرف نام سن کر ہی دل میں اس کی عظمت اور محبت محسوس کرتے ہیں، لہٰذا اصل عزت اور ذلت اللہ کی طرف سے ہے؛ لیکن سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ انسان تکبر یا ضد کی وجہ سے پہل نہیں کرتا۔قرآن میں فرمایا گیا: ''اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا'' بعض لوگ سوچتے ہیں کہ فلاں نے شادی یا کسی موقع پر ہمیں نظر انداز کیا، اس لیے ہم بھی اسے نظر انداز کریں گے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ'' برائی کو اچھائی سے دفع کرو، پھر دیکھو کہ جو شخص تمہارا دشمن تھا وہ تمہارا قریبی دوست بن جائے گا۔اسی لیے، دوستو! ہمیں اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہے، اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف اور اس کی راحت کو اپنی راحت سمجھنا ہے، یہی قرآن وحدیث کی تعلیم ہے اور یہی کامیاب زندگی کا راستہ ہے۔

اچھے اخلاق سے دل جیتنے کا راستہ:

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں زندگی گزارنے کے آداب، اصول اور سلیقے سکھائے ہیں، آج ہم انہی چیزوں کی کمی کی وجہ سے پریشانیوں میں مبتلا ہیں، دنیا کے سامنے اسلام کو سب سے بہتر انداز میں پیش کرنے کا ذریعہ یہی ہے کہ ہم ایک اچھے پڑوسی بن کر رہیں، پڑوسی کے ساتھ حسنِ سلوک کے ذریعے ہم بتا سکتے ہیں کہ اسلام کیا ہے، اخلاق کیا ہے اور ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اور صفات کیا تھیں؟ اخلاق دعوت دین کا بہت بڑا ذریعہ ہے، ہزاروں کتابیں لکھنے یا بے شمار تقاریر کرنے کے باوجود لوگ متأثر نہیں ہوتے، لیکن اچھے اخلاق کا ایک عملی نمونہ دیکھ کر ضرور متأثر ہوتے ہیں۔حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ فرماتے ہیں: ''میرے دیکھے ہوئے ہیں مشرق ومغرب کے مے خانے'' میں مشرق ومغرب میں گیا ہوں، لوگ علم یا ڈگری سے زیادہ متأثر نہیں ہوتے، بلکہ سب سے زیادہ اثر اخلاق ہی ڈالتے ہیں، انبیاء علیہم السلام نے ہمیشہ

اخلاق کو اہمیت دی اور چونکہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رحمت للعالمین بن کر آئے، اس لئے آپ کی تعلیمات میں سب سے زیادہ زور اخلاقی رویوں پر دیا گیا، اس سے سب سے پہلے فائدہ خود کرنے والے کو پہنچتا ہے اگر پڑوسی نے برا بھلا کہا یا گالی دی اور آپ نے صبر کرلیا، تو یہ قرآن کے مطابق بڑے عزم وحوصلے کا کام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۴۳﴾'' (شوریٰ: ۴۳) صبر اور معاف کرنا بڑے حوصلے والوں کا کام ہے۔ دوستو! پڑوسی ہی سب سے پہلے آپ کے دکھ درد میں ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ اس لئے حدیث شریف میں آیا: ''فَلَا يُؤْذِ جَارَهٗ'' (بخاری: کتاب الادب، باب من کان یؤمن باللہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ) اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ قریب کے ہوں یا دور کے، مؤمن ہوں یا غیر مؤمن، سب پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے، یہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل بھی تھا اور یہی تعلیم صحابہ کرام کو دی۔

اخلاق وایثار سے سجا ہوا محلہ:

ایک بہت بڑے بزرگ کا واقعہ ہے کہ ان کے پڑوس میں ایک شخص رہتا تھا جو بار بار انہیں تکلیف پہنچاتا اور ستاتا تھا، یہاں تک کہ وہ بزرگ اس ستانے سے تنگ آکر اپنا مکان بیچ کر دوسری جگہ جانے کا ارادہ کرنے لگے، جب یہ بات محلے کے دوسرے لوگوں کو معلوم ہوئی تو سب اکٹھے ہوگئے اور عرض کیا: آپ نہیں جاسکتے، آپ ہی تو وہ شخصیت ہیں جو ہم سب کا خیال رکھتے ہیں، اگر آپ یہاں سے چلے گئے تو محلہ اپنے سب سے بڑے سہارے سے محروم ہوجائے گا، یوں سب کی محبت اور اصرار نے ان کو روک لیا، اسی طرح ایک اور بڑے بزرگ حضرت مولانا سید اصغر حسینؒ کا قصہ بھی کتب میں ملتا ہے کہ انہوں نے ساری زندگی اپنا مکان اونچا نہ بنایا، محلے کے سارے لوگ غریب تھے، اگرچہ شرعاً مکان اونچا بنانا منع نہیں، بلکہ جسے اللہ نے دیا ہے وہ بنا سکتا ہے، لیکن حضرت نے یہ سوچا کہ اگر میں بڑا مکان بناؤں گا تو میرے ہمسائے بھی لالچ میں آکر کوشش کریں گے کہ وہ بھی ایسا ہی مکان بنائیں، اس کوشش میں شاید وہ حلال وحرام کی پرواہ نہ

کریں اور گناہ میں مبتلا ہو جائیں، اس اندیشے سے انہوں نے اپنی پوری زندگی سادہ مکان ہی میں گزاری تا کہ دوسروں کو کسی آزمائش میں نہ ڈالیں۔

دوستو اور بزرگو! یہ واقعات ہمیں یاد دلاتے ہیں کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث اور قرآن کی آیات نے پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک پر بہت زور دیا ہے، ہمارے اکابرین نے انہی تعلیمات کو اپنی عملی زندگی میں نافذ کیا اور ہمیں یہ سبق دیا کہ اخلاق اور ہمسایوں کے حقوق کی ادائیگی ہی اصل دین داری ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں بھی یہ توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے پڑوسیوں کے حقوق ادا کر سکیں، ان کے دکھ درد میں شریک ہوں اور ایک دوسرے کے لئے آسانی پیدا کریں، اور ہمیں ایسا معاشرہ بنانے کی توفیق دے جہاں سب ایک دوسرے کے خیر خواہ ہوں۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْن

(۱۸)

غیبت اور چغل خوری کے نقصانات

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين. قال الله تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝ (حجرات:۶)

وقال تعالیٰ:

وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ ۝ هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۝ (قلم:۱۰،۱۱)

وقَالَ رَسُولُ اللهِ ﷺ: لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّاتٌ. (بخاری: کتاب الادب، باب مایکرہ من النمیمة)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

امن وسکون کا ضامن دین:

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے محبوب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے جو دین حق ہمیں عطا فرمایا، اس میں انسانیت کے لئے سکون، چین، امن اور عافیت رکھی گئی ہے۔ یہ دین ہمیں باہمی لڑائی جھگڑوں سے بچاتا ہے، ایک دوسرے کی برائی کرنے، غیبت اور چغلی جیسے گناہوں سے روکتا ہے؛ کیونکہ یہ

چیزیں سماج کو زہر آلود کر دیتی ہیں اور سوسائٹی کی بنیادیں کمزور کر دیتی ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا ہے کہ دنیا کی زندگی بھی ہم چین، سکون اور محبت کے ساتھ گزاریں۔ اسی مقصد کے لئے قرآنِ کریم میں بالخصوص سورۂ حجرات میں بہت سے احکام نازل فرمائے گئے، جو ہماری اجتماعی اور سماجی زندگی کو پاکیزہ اور پرامن بنانے کے لئے رہنمائی فراہم کرتے ہیں۔

جلد بازی نہیں، تحقیق ہی نجات کا راستہ:

دوستو اور بزرگو! ابھی جو آیتِ مبارکہ میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ۝۶'' (حجرات:۶) اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو فوراً اس پر یقین نہ کرلو، بلکہ اس کی تحقیق کر لو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم جہالت میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور بعد میں اپنے کیے پر پچھتاؤ۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ بغیر تحقیق کے کسی کی بات مان لینا اور آگے بڑھا دینا ایک بڑی غلطی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کوئی خبر یا بات ہمیں سنائی جاتی ہے اور ہم تحقیق کے بغیر اس پر عمل کر بیٹھتے ہیں۔ کبھی زبان سے سختی کر دیتے ہیں، کبھی ہاتھ اٹھا لیتے ہیں، اور بعد میں معلوم ہوتا ہے کہ اصل بات ویسی تھی ہی نہیں، بلکہ درمیان میں آنے والے نے بات کو بدل دیا تھا یا غلط سمجھا تھا، اسی لئے قرآنِ کریم ہمیں یہ سکھا رہا ہے کہ صرف دینی معاملات ہی نہیں بلکہ دنیاوی اور سماجی معاملات میں بھی ضروری ہے کہ جب کوئی خبر ملے تو اس کی اچھی طرح تحقیق کی جائے؛ تاکہ نہ کسی پر ظلم ہو اور نہ ہمیں بعد میں شرمندگی اور ندامت اٹھانی پڑے۔

چغلی اور عیب جوئی؛ معاشرتی زہر:

ایک اور آیت آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی، اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِیْنٍۙ۝۱۰'' (قلم:۱۰) ''اے نبی! آپ ہر قسم کھانے والے ذلیل آدمی کی بات نہ مانیں۔ پھر ارشاد فرمایا: ''هَمَّازٍ مَّشَّآءٍۭ بِنَمِیْمٍۙ۝۱۱'' عیب جوئی کرنے والے اور چغل

خور کی پیروی نہ کریں۔ دوستو! غور کیجئے کہ قرآنِ کریم نے صرف یہ نہیں فرمایا کہ وہ چغلی کرتا ہے بلکہ یہ لفظ استعمال فرمایا: ''مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ'' وہ چغلی کے پیچھے چلنے پھرنے والا ہے، جس نے اپنی زندگی کا کام ہی یہ بنالیا کہ دو آدمیوں کے درمیان، میاں بیوی کے درمیان، جماعتوں یا رشتہ داروں کے بیچ جھگڑا ڈالے، یہ وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے انتہائی سخت الفاظ میں یاد فرمایا۔ حدیث شریف میں بھی یہی مضمون آیا ہے کہ ''أَنْ يُحَدِّثَ بِكُلِّ ما سَمِعَ'' (مقدمة مسلم: باب النهي عن الحديث بكل ما سمع) کسی آدمی کے جھوٹا ہونے کے لئے یہی کافی ہے کہ وہ جو بات سنے اُسے بلاتحقیق آگے بیان کردے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ قَتَّات'' (بخاری: کتاب الادب، باب مایکرہ من النمیمة) چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا، اور ایک دوسری حدیث میں فرمایا: دورُخا آدمی بدترین انسان ہے، ''يأتي هؤلاء الناس بوجه'' (بخاری: کتاب الادب، باب ما قیل فی ذی الوجهین) جو ایک کے پاس ایک چہرہ لے کر جاتا ہے اور دوسرے کے پاس دوسرا چہرہ لے کر جاتا ہے، ہم اپنی سماجی زندگی میں دیکھتے ہیں کہ یہی چغلی اور بدگمانی جھگڑوں کی جڑ بنتی ہے۔ کبھی بیوی شوہر کے سامنے اپنی ماں یا بہنوں کی شکایت کرتی ہے، کبھی ماں اور بہن بیوی کی شکایت کرتی ہیں۔ یوں چھوٹی چھوٹی باتوں پر رنجشیں پیدا ہوتی ہیں، تعلقات ٹوٹتے ہیں اور بعض اوقات عرصہ دراز تک بول چال بند رہتی ہے، اسی لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والوں کو حکم دیا: اے ایمان والو! جب کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو اس کی تحقیق کرلیا کرو۔

دورُخے پن کی قرآنی وعید اور نبوی تنبیہ:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ لہب میں فرمایا: ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝'' (لہب: ۴) مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہ آیت ابولہب کی بیوی کے بارے میں نازل ہوئی، اور اس کو لکڑیاں چننے والی، اٹھانے والی کہا گیا۔ مگر اہلِ تفسیر فرماتے ہیں کہ ''حَمَّالَةَ الْحَطَبِ'' عربی زبان میں چغلی کرنے والے کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جو ادھر ادھر سے باتیں جمع

کرتا ہے، پھر انہیں لے جا کر آگ لگاتا ہے، دلوں کو جلاتا ہے اور نقصان پہنچاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے بارے میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ دورُخے ہوتے ہیں۔ ایک جگہ جاتے ہیں تو الگ بات کرتے ہیں اور دوسری جگہ جا کر کچھ اور کہتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو ''ذو الوجھین'' فرمایا۔ (بخاری: کتاب الادب، باب ما یکرہ من النمیمة) اور حدیث شریف میں اس کی سخت سزا بھی بیان فرمائی گئی کہ چغل خور جنت میں داخل نہ ہوگا۔

چھوٹی سمجھی جانے والی بڑی غلطیاں:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک دن دو قبروں کے پاس سے گزرے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ احساس ہوا کہ ان دونوں قبر والوں کو عذاب دیا جا رہا ہے، آپ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا: ''لَیُعَذَّبَانِ'' ان دونوں کو سزا دی جا رہی ہے، اور وہ بھی ایسی چیز پر جو لوگوں کی نظر میں بڑی بات نہ تھی، لیکن اللہ کے نزدیک نہایت سنگین تھی۔ ایک تو وہ شخص تھا جو پیشاب کے چھینٹوں سے نہ بچتا، پاکیزگی کا اہتمام نہیں کرتا تھا۔ دوسرا وہ تھا جو چغلی کرتا۔ (بخاری: کتاب الجنائز، باب عذاب القبر من الغیبة والبول. بخاری: کتاب الوضوء، رقم: ۲۱۸) یعنی ادھر کی بات ادھر پہنچا کر لوگوں کے درمیان فساد ڈالتا۔

عبادات کے ساتھ اخلاقی گناہوں سے اجتناب کی ضرورت:

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَیۡلٌ لِّکُلِّ ہُمَزَۃٍ لُّمَزَۃٍ ۙ'' ہلاکت ہے ہر اُس شخص کے لیے جو لوگوں کے عیب بیان کرتا ہے۔ عیب زنی کبھی زبان سے کی جاتی ہے، کبھی اشاروں سے، کبھی ہاتھ پاؤں کی حرکتوں سے، اور کبھی کنکھیوں اور آنکھوں کے اشاروں سے۔ یہ سب طریقے دوسروں کو ذلیل کرنے اور حقیر دکھانے کے لیے ہوتے ہیں۔ امام غزالیؒ نے اس کو جھوٹ کی قسموں میں شمار کیا ہے۔ قرآن کریم کی مختلف آیات اور حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹ سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے۔ (بخاری: کتاب الجنائز، باب ما یکرہ من النیاحة علی المیت، بخاری: کتاب العلم، باب اثم من کذب علی النبی) لیکن یہ شخص صرف جھوٹ ہی نہیں بولتا، بلکہ

دوسروں کی چغلی بھی کرتا ہے اور لوگوں کے درمیان فساد اور جھگڑا کرواتا ہے؛ لہٰذا ہمیں اپنے سماج اور اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہیے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ فرائض ہیں؛ لیکن ان کے ساتھ ساتھ وہ چیزیں بھی اہم ہیں جن سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں منع فرمایا ہے، ہمیں ان باتوں کو بھی غور سے دیکھنا اور ان سے بچنا چاہیے۔

نیکیاں دوسروں کے نام اور گناہ اپنے دامن میں:

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اس طرح کی برائیاں کرتا ہے، جیسے غیبت، چغلی اور دوسروں کے ساتھ ظلم، تو قیامت کے دن دوسروں کے گناہ اس پر لاد دیے جائیں گے۔ (بخاری: کتاب المظالم، باب من کانت له مظلمة عند الرجل....) ایک اور مشہور روایت ہے جسے آپ نے یقیناً سنا ہوگا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابۂ کرامؓ سے پوچھا: میری امت کا مفلس کون ہے؟ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں مفلس وہ ہے جس کے پاس مال و دولت نہ ہو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: نہیں! میری امت کا مفلس وہ ہے جو قیامت کے دن بہت ساری نیکیاں لے کر آئے گا؛ لیکن دنیا میں لوگوں پر ظلم کیا ہوگا، کسی کو گالی دی ہوگی، کسی کا حق مارا ہوگا، کسی کے ساتھ زیادتی کی ہوگی۔ پھر قیامت کے دن یہ سب لوگ اپنے اپنے حق کے لیے کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا: اس کی نیکیاں فلاں کو دے دو، فلاں کو دے دو؛ یہاں تک کہ اس کی ساری نیکیاں ختم ہوجائیں گی، اور پھر بھی لوگوں کا حق باقی ہوگا۔ تب ان لوگوں کے گناہ اس پر ڈال دیے جائیں گے۔ (مسلم: کتاب البر و الصلة، باب تحریم الظلم) یوں وہ شخص باوجود نیکیاں لانے کے مفلس ہوجائے گا۔

زبان کی آفت اور حقوق العباد کی سنگینی:

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو غیبت اور چغلی سے ڈرانے کے لیے مختلف مثالیں بیان فرمائیں۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ زنا کرنا بڑا گناہ ہے، لیکن اس سے بھی بڑا گناہ غیبت ہے، اب ہم حیران ہوتے ہیں کہ آخر غیبت اور چغلی زنا سے بڑا گناہ کیوں؟ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ زنا کرنے والا اگر توبہ کرلے تو وہ معاملہ بندے اور اللہ کے درمیان ہے، اور اللہ

تعالیٰ چاہیں تو معاف فرما دیتے ہیں، یہ حقوق اللہ ہیں؛ لیکن غیبت اور چغلی حقوق العباد ہیں، جب تک وہ شخص جس کی غیبت کی گئی ہے معاف نہ کرے، اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں فرمائیں گے۔ (شعب الایمان: تحریم اعراض الناس و ما یلزم من ترک الوقوع فیھا فصل فیما ورد من الاخبار فی التشدید علی من افترض من عرض اخیہ المسلم شیئا بسبب او غیرہ، ۵/ ۳۰۹) اسی حقیقت کو ہم حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسفؑ کے واقعے سے بھی سمجھ سکتے ہیں، جب یوسف ؑ کے بھائیوں نے اپنی خطاؤں کا اعتراف کیا تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے فوراً معاف نہ کیا؛ کیونکہ زیادتی براہِ راست حضرت یوسف ؑ کے ساتھ ہوئی تھی۔ جب یہ ثابت ہوا کہ حضرت یوسفؑ نے خود معاف کر دیا ہے، تب حضرت یعقوبؑ نے بھی ان کے لیے دعا فرمائی، یہ ہے حقوق العباد کی نزاکت۔ آج بھی ہم دیکھتے ہیں کہ سماج کی تلخیوں اور جھگڑوں میں سب سے بڑا کردار چغلی اور غیبت کا ہوتا ہے، اکثر گھروں میں بیٹھے مرد یا عورتیں باتیں ادھر سے ادھر پہنچا کر فتنہ برپا کر دیتے ہیں، یہ برائیاں نیکیوں کو کھا جاتی ہیں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جھوٹ کو سب سے برا عمل کہا ہے؛ لیکن وہ جھوٹ جس سے میاں بیوی میں صلح ہو جائے یا سماج میں اصلاح ہو جائے، اس کی اجازت دی ہے۔ (ترمذی: ابو اب البر و الصلۃ، باب ماجاء فی اصلاح ذات البین) کیونکہ اگر میاں بیوی کے درمیان اختلاف پیدا ہو جائے تو پورا خاندان اور پورا معاشرہ برباد ہو جاتا ہے، اس لیے ہمیں زبان کی حفاظت کرنی ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک انسان اپنی زبان سے بھلائی کا ایک کلمہ بول دیتا ہے، اسے معمولی سمجھتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اسی کی برکت سے اس کے لیے بڑے بڑے درجات لکھ دیتے ہیں اور دوسری طرف، کوئی انسان اپنی زبان سے برا کلمہ بول دیتا ہے اور اس کو پرواہ نہیں ہوتی، لیکن وہی کلمہ اس کو جہنم میں گرا دیتا ہے۔ (بخاری: کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان)

نامۂ اعمال کا محفوظ ریکارڈ:

ایک مرتبہ ایک عورت نے دوسری عورت کا مذاق اڑاتے ہوئے اس کی عیب جوئی کی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا: فلاں عورت ایسی ہے اور ہاتھ کے اشارے سے

بتایا کہ وہ پست قد (ٹھنگنی) ہے، اس پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم نے ایک ایسا کلمہ کہا ہے کہ اگر اسے سمندر میں ڈال دیا جائے تو سمندر بھی کڑوا ہو جائے، (ابو داود: کتاب الادب، باب فی الغیبة) یعنی کسی کے عیب پر زبان کھولنا اتنی بڑی برائی ہے کہ اس کا اثر پوری کائنات پر پڑنے والا ہے۔ اسی لیے حدیث شریف میں ارشاد فرمایا گیا: ''مَن ستر مسلمًا ستره الله'' جو کسی مسلمان کے عیب کو چھپائے گا۔ (بخاری: کتاب المظالم، باب لا یظلم المسلم المسلم ولا یسلمه) اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کے عیبوں کو چھپائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کی صفت ہی ''ستّار'' ہے، یعنی گناہوں کو چھپانے والے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ میدانِ محشر میں ایک گنہگار کو پیش کیا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کے سامنے اس کے گناہوں کا ذکر کریں گے، اور وہ خود ان کا اعتراف کرے گا۔ (ترمذی: ابواب الایمان، باب ماجاء فیمن یموت وھو یشھد ان لا الہ الا اللہ) دوستو! آج ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی موبائل میں بھی کتنی بڑی اسٹوریج ہوتی ہے، کہاں کہاں ہماری باتیں اور اعمال محفوظ ہوتے ہیں تو سوچو اللہ کے ہاں کس قدر عظیم ریکارڈ محفوظ ہوگا! اللہ پاک قرآن میں فرماتے ہیں: ''مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ ﴿۱۸﴾'' (ق:۱۸) تم اپنی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکالتے مگر تم پر مقرر فرشتے اسے لکھ لیتے ہیں۔ مزید فرمایا: ''اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ ﴿۱۷﴾'' دائیں اور بائیں دونوں طرف فرشتے بیٹھے ہیں جو ہمارے ہر عمل کو قلمبند کرتے ہیں۔ یہ فرشتے وہ ہیں جن کے بارے میں ارشاد ہے: ''لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ﴿۶﴾'' (تحریم:۶) وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم دیا جائے وہی کرتے ہیں۔ اور قرآن میں اللہ نے یہ اصول بھی بیان فرمایا: ''وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾'' (کہف:۴۹) تمہارا رب کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یعنی جتنا گناہ کیا ہوگا، اتنا ہی لکھا جائے گا، کسی دوسرے کا بوجھ کسی پر نہیں ڈالا جائے گا۔ ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى'' (انعام:۱۶۴) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی اور کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور فرمایا: ''وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾'' (نجم:۳۹) انسان کو صرف وہی ملے گا جو اس نے خود

کمایا، لہٰذا، انسان اور اس کے اعمال ہی اس کی کامیابی یا بربادی کا فیصلہ کرتے ہیں۔ اور یاد رکھو! جو لوگ دوسروں کے عیب بیان کرتے ہیں، لوگوں میں فتنہ اور فساد پھیلاتے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو نہایت سختی سے منع فرمایا ہے اور اسے انتہائی برا عمل قرار دیا ہے۔

زبان کی لغزش اور اس کے بھیانک نتائج:

اللہ تبارک و تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ''وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ط'' (حجرات: ۱۲) تم میں سے کوئی ایک دوسرے کی غیبت نہ کرے۔ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ ﷺ! غیبت کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اپنے بھائی کا عیب اس کی غیر موجودگی میں بیان کرنا غیبت ہے، صحابہ نے عرض کیا: اگر وہ عیب واقعی اس میں موجود ہو تو؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تب ہی تو وہ غیبت ہے! اور اگر وہ عیب اس میں نہیں ہے تو پھر یہ بہتان اور تہمت ہے۔ (مسلم: کتاب البر و الصلة، باب تحریم الغیبة)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے پاس ایک شخص آیا اور کسی کی غیبت و چغلی کرنے لگا، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا: تمہاری یہ بات دو حال سے خالی نہیں یا تو تم جھوٹ بول رہے ہو اور یہ بہتان ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ'' اگر کوئی فاسق خبر لائے تو تحقیق کرو، کہیں ایسا نہ ہو کہ جہالت میں کسی قوم کو نقصان پہنچا دو اور اگر تمہاری بات سچ بھی ہے تو پھر یہ غیبت ہے اور ساتھ میں چغلی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''مَّشَّآءٍۭ بِنَمِيْمٍ ۙ'' (قلم: ۱۱) لوگوں میں چغلیاں پھیلانے والا۔

مردہ بھائی کا گوشت کھانے جیسا گھناؤنا عمل:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے محبوب نبی اکرم ﷺ کے ذریعے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، اس میں ہی زندگی کا سکون ہے۔ قرآن کریم میں اللہ نے فرمایا: ''مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ'' (نحل: ۹۷) جو شخص ایمان کے ساتھ نیک عمل کرے، خواہ مرد ہو یا عورت، ہم اسے پاکیزہ اور پرسکون زندگی عطا

کریں گے۔یہی حیاتِ طیبہ ہے، ایک پاکیزہ زندگی، چین وسکون اور امن و عافیت والی زندگی؛ لیکن افسوس! آج ہمارے گھروں میں، ہمارے معاشرے میں، حتیٰ کہ جہاں ہم ملازمت کرتے ہیں، وہاں بھی یہ سکون غیبت اور چغلی کی وجہ سے برباد ہورہا ہے، لوگ ایک کی بات دوسرے تک اور دوسرے کی بات تیسرے تک پہنچا دیتے ہیں۔نتیجہ یہ ہے کہ فتنے، نفرتیں اور جھگڑے جنم لیتے ہیں۔کتاب اللہ نے غیبت کی منظر کشی کتنی ہولناک انداز میں فرمائی ہے: ''اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا '' (حجرات:۱۲) کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ غیبت کی حقیقت یہی ہے، یہ مردار بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے۔اور سوچو! کوئی انسان کتنا گھٹیا اور مکروہ عمل کر رہا ہوگا جو قرآن اسے اس مثال سے بیان کر رہا ہے۔

حاجی امداد اللہؒ کے پاس ایک شخص آئے اور کسی کی غیبت چغلی کرنے لگے، کہ آپ کے متعلق فلاں یہ کہہ رہا ہے، حضرت نے فرمایا کہ اس نے تو مجھے غائبانہ تکلیف دی؛ مجھے معلوم نہیں تھا، تم نے آکر وہ بات مجھے کہہ کر اس وقت مجھے غمگین کر دیا، اس کا غم تو ادھار تھا؛ لیکن تم نے مجھے غم دے دیا، اس لیے کتاب اللہ نے فرمایا کہ اگر اس طریقے سے آپ کے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو نہ مانو۔

صحابہ کا تبصرہ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم:

آپ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام ایک جگہ سے گزر رہے تھے کہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ پیش آیا، انہوں نے زنا کا ارتکاب کیا تھا اور خود اپنے گناہ کا اقرار کیا، ان پر شرعی سزا بھی نافذ ہوئی۔سزا کے بعد وہاں موجود کچھ لوگ کہنے لگے: یہ کیسا شخص تھا! کسی کو اس کے گناہ کا علم نہ تھا، لیکن اس نے خود اقرار کیا اور اس طرح ذلیل ہوکر موت پائی، جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوئی تو آپ آگے بڑھے اور راستے میں ایک مرا ہوا بکری کا بچہ دیکھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ان دونوں کو بلاؤ اور ان سے کہو کہ اسے کھائیں، وہ

عرض کرنے لگے: یارسول اللہ! یہ تو مردار ہے، بدبودار ہے، ہم اسے کیسے کھا سکتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی تم نے اپنے بھائی کے بارے میں جو کلمات کہے ہیں، وہ اس مردار کو کھانے سے بھی زیادہ خطرناک ہیں۔ وہ شخص تو جنت کی نہروں میں غوطہ لگا رہا ہے اور تم اس کے پیچھے اس طرح کی باتیں کر رہے ہو! (ابو داود: کتاب الحدود، باب رجم ماعز بن مالك) اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآنِ مجید میں ارشاد فرمایا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُوْنُوْا خَیْرًا مِّنْهُمْ'' (حجرات: ۱۱) اے ایمان والو! کسی قوم کو دوسری قوم کا مذاق نہ اڑانا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو، اسی طرح عورتوں کے بارے میں بھی فرمایا: ''وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ'' عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے غیبت اور چغل خوری کے گناہوں پر بڑی تفصیل سے گفتگو فرمائی ہے، یہی وجہ ہے کہ صوفیائے کرام کی مجالس میں زیادہ تر اصلاحِ نفس کی باتیں کی جاتی ہیں، تاکہ انسان اپنے آپ کو ان ہلاکت خیز بیماریوں سے بچا سکے، آج بھی جب لوگوں کے دلوں میں طرح طرح کے دکھ اور بیماریاں موجود ہیں، ایسے میں کسی کو مزید تکلیف اور ٹینشن میں ڈالنا کتنا بڑا ظلم ہے!

نیکیوں کا سب سے بڑا ضیاع:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبان کی حفاظت کے بارے میں بار بار تاکید فرمائی۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کچھ سوالات کیے، آپ نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور بھلائی کے دیگر اعمال کا ذکر فرمایا، پھر آپ نے فرمایا: کیا میں تمہیں ان سب کا خلاصہ اور سب سے اونچی نیکی نہ بتاؤں؟ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: جی ہاں ضرور! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا: ''**كف عليك هذا**'' (ترمذی: ابواب الایمان، باب ما جاء فی حرمة الصلاة) اپنی زبان پر قابو رکھو۔ ایک اور روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''**أَمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ، وَلْيَسَعْكَ بَيْتُكَ**'' اپنی زبان پر قابو رکھو اور تمہارا گھر تمہارے لیے کافی ہو۔ باہر نکلنے سے فتنہ وفساد میں پڑنے کا اندیشہ رہتا

ہے، ہاں، ضرورت کے کام کے لیے باہر جانا جائز ہے، لیکن لغویات اور بیکار مجلسوں کے لیے نکلنا نقصان دہ ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مزید فرمایا: ''وَ ابْكِ عَلَى خَطِيئَتِكَ'' اپنے گناہوں پر روتے رہو۔ (ترمذی: ابواب الزھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان) انسان جانے انجانے میں کیسے کیسے گناہ کر بیٹھتا ہے جن کا اسے خود بھی شعور نہیں ہوتا، بزرگوں نے فرمایا ہے: غیبت ایسا گناہ ہے کہ اگر ایک شخص شروع کرے تو دوسرا تیسرا اور پھر پورا مجمع اسی میں شامل ہو جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جس کی غیبت ہو رہی ہے، اس کے لیے نیکیاں جمع ہو جاتی ہیں اور اس کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ اس کے لیے بڑا فائدہ ہے، مگر غیبت کرنے والے کے لیے سخت نقصان ہے کہ اپنی نیکیاں دوسروں کو دے رہا ہے۔ البتہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض مواقع پر کسی بات کہنے کی اجازت بھی دی ہے، جیسے ظلم کی شکایت کرنا یا حق بات کو ظاہر کرنا۔ (بخاری: کتاب المظالم، باب اعن اخاك ظالماً او مظلوماً) لیکن بلاوجہ زبان کھولنا اور دوسروں کی برائی کرنا انسان کو برباد کر دیتا ہے۔

عبداللہ ابن اُبی کی سازش اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت:

عبداللہ ابن اُبی جو منافقوں کا سردار تھا، ایک موقع پر اس نے حالات کو بگاڑنے کی کوشش کی، ہوا یوں کہ ایک غزوہ کے دوران ایک انصاری اور ایک مہاجر صحابی کے درمیان معمولی لڑائی ہو گئی، مہاجر صحابی نے انصاری کو طمانچہ مار دیا، یہ خبر مدینہ منورہ میں پھیل گئی اور چونکہ یہ دو بڑے گروہ تھے، ایک وہ جو مکہ سے ہجرت کر کے آئے (مہاجرین) اور دوسرے وہ جو مدینہ میں رہنے والے اور ان کے مددگار تھے (انصار) اس لیے تھوڑا سا انتشار پیدا ہو گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً وہاں تشریف لے گئے اور صحابہ کو اس جھگڑے سے روکا۔ (بخاری: کتاب التفسیر، سورۃ المنافقین، باب قولہ سواء علیھم استغفرت لھم) آپ نے ان کو یاد دلایا کہ یہ تفرقہ تمہارے لیے درست نہیں، اسی موقع پر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے احسان کو یاد دلاتے ہوئے فرمایا کہ: اللہ پاک نے تمہارے پاس ایک نبی بھیجا، تم پر اپنی نعمت کامل فرمائی، اس سے پہلے تم ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی اور تمہیں بھائی بھائی بنا دیا۔

اصلاح کے لیے جھوٹ کی اجازت:

خیر! آگے حضرت معاذؓ نے نبی اکرم ﷺ سے پوچھا: یا رسول اللہ! کیا زبان سے نکلنے والی باتوں پر بھی ہماری پکڑ ہوگی؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وھل یُکِبُّ النّاسَ في النّارِ علی وجوھِھم إلّا حصائدُ ألسنتِھم'' (ترمذی: ابواب الایمان، باب ماجاء فی حرمة الصلاة) لوگوں کو جہنم میں ان کے چہروں کے بل گرانے والی چیز ان کی زبان کے کاٹے ہوئے اعمال ہی ہیں، اس لیے زبان کی حفاظت نہایت ضروری ہے۔ اکثر لوگ کسی کو خوش کرنے کے لیے دوسرے کی برائی کرتے ہیں، ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کر کے جھگڑے بڑھاتے ہیں، نبی اکرم ﷺ نے اس سے سختی کے ساتھ منع فرمایا؛ لیکن اگر یہی زبان اصلاح اور صلح کے لیے استعمال ہو تو یہ پسندیدہ ہے، مثلاً میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو تو بیوی سے کہا جائے کہ تمہارا شوہر تمہاری تعریف کرتا ہے، اور شوہر سے کہا جائے کہ تمہاری بیوی تم سے محبت کرتی ہے، اس طرح دلوں میں نرمی پیدا ہو کر جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر صلح کے لیے کوئی جھوٹ بھی بولا جائے تو وہ معاف ہے۔ (ترمذی کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی یاصلاح ذات البین) کیونکہ یہ جھوٹ فساد کے لیے نہیں بلکہ بھلائی کے لیے ہے۔

ضرورت کے وقت حق بات بیان کرنے کی گنجائش:

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''لَا یُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ ؕ'' (نساء:۱۴۸) اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کھلم کھلا برائی کی بات کرے، سوائے اس کے جو مظلوم ہو۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی شکایت یا تکلیف لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لیے دوسروں کی برائی یا غیبت نہیں کرنی چاہیے، لیکن اگر کسی پر ظلم یا زیادتی ہوگئی ہے تو اسے اختیار ہے کہ وہ حکومت یا ذمہ دار اہلکاروں کے سامنے اپنا معاملہ پیش کرے اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اسی حالت کو استثناء کے طور پر بیان فرمایا، اسی طرح محدثین کرام نے بھی جب احادیث کی روایت نقل کرنی ہوتی

تھی تو راویوں کی تحقیق لازمی سمجھی، اس مقصد کے لیے انہوں نے بعض راویوں کے بارے میں کھل کر گفتگو کی، تاکہ دین کی حفاظت ہو سکے۔ اس تحقیق کی بنیاد بھی دراصل اسی اصول پر ہے کہ ضرورت اور حق کی حفاظت کے لیے بات کہنے کی اجازت ہے۔

مشورے میں امانت داری اور خوش اخلاقی:

آج کل آپ جانتے ہیں کہ شادی کے لیے جب کہیں سے رشتہ آتا ہے تو لوگ تحقیق کرتے ہیں کہ سامنے والا کون ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے، اس موقع پر جھوٹ بولنا جائز نہیں اور نہ ہی کسی مسلمان کی غیر ضروری برائی بیان کرنی چاہیے، لیکن اگر کوئی آپ سے مشورہ لے تو پھر آپ پر لازم ہے کہ امانت داری کے ساتھ صحیح بات بتائیں، تاکہ نہ کسی کو دھوکہ ہو اور نہ کسی کو تکلیف پہنچے۔ اسی بارے میں ایک واقعہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہؓ کے ساتھ بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا۔ آپ نے فرمایا: ''بِئْسَ أَخُو الْعَشِيرَةِ'' یہ اپنے خاندان کا بہت برا آدمی ہے، لیکن جب وہ قریب آیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کا استقبال فرمایا اور خوش اخلاقی سے پیش آئے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! آپ نے ابھی تو فرمایا تھا کہ یہ برا شخص ہے، اور اب اس کے آنے پر آپ نے اس کا استقبال کیا؟ آپ نے جواب دیا: اے عائشہ! تم نے مجھے بدگو کب پایا؟ (بخاری: کتاب الادب، باب من لم یکن النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فاحشا ولا متفحشا)

حضرت فاطمہ بنت قیسؓ کے نکاح کے لیے دو جگہ سے پیغام آیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مشورہ دیا اور فرمایا: فلاں آدمی ایسا ہے کہ ہاتھ میں لاٹھی لے کر پھرتا ہے یعنی سخت مزاج ہے، اور دوسرے کے بارے میں فرمایا کہ اس کے پاس مال نہیں ہے۔ (مستدرک حاکم: کتاب معرفة الصحابة، باب ذکر فاطمة بنت قیس) یہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حقیقت بیان کی، اس لیے یہ جھوٹ نہیں تھا۔ اسی اصول پر محدثین کرام نے بھی جب روایت کی چھان بین کی تو راویوں کے بارے میں صحیح بات بتائی تاکہ دین میں ملاوٹ نہ ہو، یہ تحقیق جھوٹ نہیں بلکہ امانت ہے۔ البتہ اگر کسی کے بارے میں بلاوجہ غلط بات کہی جائے یا ایسی برائی بیان کی جائے جس کا حقیقت

سے کوئی تعلق نہ ہو، تو یہ ضرور پکڑ میں آئے گا۔ دوستو اور بزرگو! یہی وہ باتیں ہیں جو ہماری سماجی زندگی کو کڑوا اور تلخ بنا دیتی ہیں۔ اس لیے ہمیں ان سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔

نیکیاں ضائع کرنے والا عمل:

حضرت سفیان ثوریؒ کی مجلس میں کھانا لایا گیا، ابھی کھانا رکھا ہی تھا کہ دو چار آدمیوں نے غیبت شروع کر دی، حضرت سفیان نے فرمایا: پہلے زمانے کے لوگ پہلے روٹی کھاتے تھے پھر گوشت کھاتے تھے، لیکن تم نے تو گوشت سے ہی ابتدا کر دی۔ یعنی غیبت شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا'' کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ حضرت سفیان نے اس جملے سے اشارہ دیا کہ غیبت گویا مردار بھائی کا گوشت کھانے کے مترادف ہے، اور افسوس یہ ہے کہ بڑے بڑے لوگ بھی اس میں شریک ہو جاتے ہیں، میں خود بھی اپنے آپ کو اس سے بری نہیں ٹھہراتا، ہم سے بھی کبھی غیبت، چغلی یا جھوٹی خبریں سرزد ہو جاتی ہیں، یہ چیزیں دراصل ہماری نیکیوں کو کھا جانے والی ہیں۔ اسی لیے حدیث شریف میں زبان کے بارے میں بہت تنبیہ فرمائی گئی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی زبان پکڑ کر روتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا: کیا ہوا؟ تو فرمایا: اسی زبان سے سب سے زیادہ ڈر لگتا ہے۔ (موطا مالک: کتاب الکلام، باب ماجاء فیما یخاف من اللسان) حدیث میں آتا ہے کہ بدن کے سارے اعضاء زبان سے کہتے ہیں: تو سیدھی رہی تو ہم بھی سلامت رہیں گے، اور اگر تو بگڑ گئی تو ہم سب برباد ہو جائیں گے۔ (ترمذی: ابواب الزھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان) اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں غیبت، چغلی اور جھوٹ جیسی برائیوں سے محفوظ رکھے اور ہمارے معاشرے کو پاکیزہ، پرامن اور سکون والا بنا دے۔ آمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۱۹)

دین و دنیا کا اجتماع؛ دین محمدی کا اختصاص

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين . قال الله تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد، امابعد!

اعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ (آل عمران:۳۱)

قَالَ النبی ﷺ: لا يُؤْمِنُ أحَدُكُمْ، حتّى أكُونَ أحَبَّ إلَيْهِ مِن والِدِهِ ووَلَدِهِ والنّاسِ أجْمَعِينَ. (بخاری: کتاب الایمان، باب حب الرسول من الایمان)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

اطاعتِ رسول ﷺ اور قوموں کا اپنے بڑوں کا احترام:

محترم و مکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جس آیتِ مبارکہ کی تلاوت کی گئی ہے، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب جناب نبی کریم ﷺ کی اطاعت اور فرماں برداری کا ذکر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی بیان فرمایا کہ اگر رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کی جائے تو اس پر کتنا عظیم اجر اور ثواب ملے گا، اور اگر نافرمانی کی جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب اور اس کی رحمت سے محرومی مقدر ہوگی۔

دوستو اور بزرگو! یہ ایک حقیقت ہے کہ دنیا کی ہر قوم، خواہ وہ سیاسی ہو، مذہبی ہو یا سماجی، کسی نہ کسی کو اپنا پیشوا اور بڑا مانتی ہے، خاص طور پر مذہب کے اعتبار سے جن بزرگوں یا رہنماؤں کے ساتھ ان کی نسبت جڑتی ہے، ان کا ذکر دل میں ادب اور احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے، سیاسی دنیا میں دیکھ لیجیے! فرانسیسی انقلاب کے بڑے سیکولر رہنما آج بھی عظمت سے یاد کیے جاتے ہیں، اسی طرح کمیونسٹ تحریک کے بانی کارل مارکس وغیرہ کا احترام ان کے ماننے والے کرتے ہیں، گویا دنیا کی ہر قوم اپنے بڑوں کو یاد رکھتی ہے اور ان کا ادب واحترام بجالاتی ہے۔

کامل رہنما اور حقیقی نمونۂ حیات:

لیکن قرآنِ کریم یہ فرما رہا ہے کہ ادب اور احترام اپنی جگہ ضروری ہیں، مگر اطاعت اور فرمانبرداری ایک ایسی خصوصیت ہے جو صرف اور صرف جناب نبی کریم ﷺ کے لئے ہے۔ دنیا میں جتنے بھی بڑے لوگ آئے، ان کے نام پر ایک دن منایا جاتا ہے یا ان کے بارے میں اچھے کلمات کہے جاتے ہیں، لیکن ان کی زندگیاں ایسی نہیں کہ جنہیں مکمل طور پر نمونہ اور آئیڈیل بنایا جاسکے، ان کے حالاتِ زندگی میں یہ جامعیت نہیں پائی جاتی کہ ایک انسان کو پیدائش سے لے کر موت تک جن سماجی، مذہبی، دینی، سیاسی اور خاندانی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ان سب میں وہ رہنمائی دے سکیں، اس کے برعکس ہمیں نبی کریم ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' (احزاب:۲۱) زندگی کے لئے بہترین نمونہ اور کامل آئیڈیل صرف اور صرف جناب نبی کریم ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔

نبی کریم ﷺ کے احترام کی قرآنی تعلیم:

دوستو اور بزرگو! مجھے آپ حضرات کے سامنے اس وقت جو بات عرض کرنی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے نبی کریم ﷺ کو صرف ماننا کافی نہیں ہے؛ بلکہ آپ کا ادب اور احترام بھی ہر حال میں ملحوظ رکھنا ضروری ہے، کتاب اللہ نے خود نبی اکرم ﷺ کے ادب کے بارے میں

فرمایا: ’’ لَا تَجْعَلُوْا دُعَآءَ الرَّسُوْلِ بَيْنَكُمْ كَدُعَآءِ بَعْضِكُمْ بَعْضًا ‘‘ (نور:۶۳) تم آپ ﷺ کے پکارنے اور آپ سے بات کرنے کو ایسا نہ بنالو جیسے تم آپس میں ایک دوسرے کو پکارتے ہو؛ بلکہ ادب واحترام کے ساتھ گفتگو کرو۔ اسی طرح قرآن کریم میں سورۂ حجرات میں فرمایا گیا: ’’ لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ ‘‘ (حجرات:۲) اپنی آواز کو نبی ﷺ کی آواز سے بلند مت کرو۔ یہ آیات بتاتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے بات کرنے اور برتاؤ کرنے کا جو ادب ہے، اس کو اللہ تعالیٰ نے خود بیان فرمایا۔ مزید برآں سورۂ اعراف میں فرمایا گیا: فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۵۷﴾ (اعراف:۱۵۷) جو لوگ اس رسول ﷺ پر ایمان لائیں گے، اس کی تعظیم کریں گے، اس کی مدد کریں گے اور اس نور کی پیروی کریں گے جو آپ ﷺ کے ساتھ اتارا گیا، تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نورِ قرآن اور رحمتِ محمدی ﷺ:

آپ ﷺ کا وقار اور احترام بھی لازم ہے، لیکن قرآن کریم میں فرمایا: ’’ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ ‘‘ (اعراف:۱۵۷) اور وہ اس نور کی پیروی کریں جو آپ ﷺ کے ساتھ اتارا گیا، یہ نور دراصل قرآنِ کریم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جو اہلِ ایمان اس طریقے کا ادب کریں گے، احترام بجالائیں گے، اور اس نور کی اتباع وفرمانبرداری کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں دنیا وآخرت میں کامیابی عطا فرمائے گا۔ پھر دیکھئے کہ اللہ نے اپنے محبوب ﷺ کو وہ خصوصیات عطا فرمائی ہیں جو کسی اور کو نصیب نہیں ہوئیں، انسانیت کے لئے آپ ﷺ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا اور یہ رحمت صرف انسانوں کے لئے نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ ‘‘ (انبیاء:۱۰۷) ہم نے آپ کو نہیں بھیجا مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر۔ یوں آپ ﷺ کی پوری تعلیم اور ہر حکم میں مخلوق اور امت کے لئے رحمت ہی رحمت جلوہ گر ہے۔

توحید کی تعلیم اور مخلوق سے بے خوفی:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے تو انسانیت پر بے شمار احسانات فرمائے، سب سے پہلا اور سب سے بڑا احسان یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کو ان کے خالق و مالک کی پہچان کروائی اور اللہ تعالیٰ کی معرفت بتلائی۔ قرآن کریم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا اور اس کی تشریح بھی اللہ تعالیٰ نے صرف اور صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وابستہ کی، جیسا کہ فرمایا: ''ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ'' (قیامہ:۱۹) قرآن اور حدیث، دین کے بنیادی ستون ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ خاص کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو یہ سمجھایا کہ وہ اپنی ہی جیسی مخلوق کے آگے جھک نہیں سکتے، نہ کسی کو نفع و نقصان کا مالک سمجھ سکتے ہیں؛ نفع و نقصان کا مالک صرف اور صرف ایک اللہ ہے، یہی تعلیمات تھیں جنہوں نے جزیرۂ عرب، یمن، عمان اور بحرین تک ایمان کی روشنی پھیلا دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کو توحید سکھائی اور یہ باور کروایا کہ اصل خوف صرف اللہ سے ہونا چاہئے، مخلوق سے نہیں۔ یہی وجہ تھی کہ دلوں سے توہمات اور بے جا خدشات نکل گئے۔ یہ احسان اتنا عظیم تھا کہ صحابہ کرام کے دور میں ہی دنیا کی بڑی طاقتیں ایران، روم اور مصر جیسی تہذیبیں اسلام کے سامنے جھک گئیں، دریا اور سمندر بھی ان کے لئے رکاوٹ نہ بن سکے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے فرمایا:

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے دلوں میں اللہ کا خوف راسخ کر دیا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مخلوق کے دلوں میں بھی صحابہ کا رعب بیٹھ گیا اور اللہ نے ان کے لئے دنیا کے دروازے کھول دیے۔

خوفِ خدا کے پیکر، مخلوق پر غالب:

اسی بنیاد پر دیکھئے! جب صحابہ کرام ایک مقام پر پہنچے جہاں آج قیروان (Kairouan)

نامی شہر آباد ہے (اب تیونس میں ہے جو شمالی افریقہ سے بھی جانا جاتا ہے)، اس وقت وہاں جنگل تھا، تاریخ میں آج بھی لکھا ہوا موجود ہے کہ صحابہ نے کہا: ''**ایھا الحشرات! نحن اصحاب محمد، و انا منزلون**'' اے جنگل کے جانورو! ہم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی اور شاگرد ہیں، اور ہم یہاں قیام کرنا چاہتے ہیں، لہٰذا ہمارے لئے یہ جگہ خالی کردو۔ مفسرین اور مؤرخین مثلاً ابن اثیر اور ابن کثیر نے ذکر کیا ہے کہ اللہ پاک نے صحابہ کی یہ کرامت ظاہر فرمائی کہ وہ تمام جانور وہاں سے ہٹ گئے اور بعد میں یہی جگہ قیروان شہر کی بنیاد بنی۔ یہ سب کچھ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لائے ہوئے دین کی برکت تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کے دلوں میں اللہ کا خوف اس قدر بٹھا دیا کہ مخلوق کے دلوں میں ان کا رعب بیٹھ گیا۔ جیسا کہ قرآن میں یہودِ بنو قریظہ کے بارے میں فرمایا گیا: ''وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۗ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ ۝'' (سورۂ حشر؛ ۲) اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا تھا کہ وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں سے اور مسلمانوں کے ہاتھوں سے اجاڑ رہے تھے۔ پس اے عقل والو! عبرت حاصل کرو۔

انسانی عظمت اور احترام کا اعلان:

توحید کے ذریعہ دوسرا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ انسان یہ سمجھنے لگا کہ کوئی کسی کو پیدا کرنے والا نہیں، کوئی کسی سے بڑا نہیں؛ صرف اور صرف اللہ کی ذات ہی سب سے بڑی ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانی بھائی چارگی، مساوات اور برابری قائم فرمائی، مذہب کے نام پر جن لوگوں نے اپنے آپ کو بڑا بنا لیا تھا اور دوسروں کو کمتر سمجھا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ سب انسان برابر ہیں، رومی اپنے آپ کو بڑا گردانتے تھے، چین میں بھی کچھ بادشاہوں نے خدائی القاب اپنا لئے تھے، اور جزیرۃ العرب سمیت مختلف خطوں میں انسانوں کو اس درجے تک بڑا سمجھا گیا کہ گویا وہ دوسروں کے نفع و نقصان کے مالک ہیں، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ توحید کا پیغام دے کر تمام انسانوں کو برابر قرار دیا اور انسان کے

احترام اور اس کی اصل عظمت کو واضح فرما دیا۔

خوف و وہم سے نجات:

قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ'' (اسراء:۷۰) اور بے شک ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی۔ انسان پہلے جانوروں سے ڈرتا تھا، کیڑوں مکوڑوں کی عبادت کرتا تھا، ہمیشہ مایوسی اور ناامیدی میں رہتا تھا، جنگلوں اور راستوں میں چلتے وقت بڑے سے بڑا مالدار بھی خوف زدہ ہو جاتا تھا۔ قرآن کریم نے سورۂ جن میں ذکر کیا ہے کہ سفر کے دوران لوگ جنات کی پناہ لیتے تھے: ''وَّاَنَّهٗ كَانَ رِجَالٌ مِّنَ الْاِنْسِ يَعُوْذُوْنَ بِرِجَالٍ مِّنَ الْجِنِّ فَزَادُوْهُمْ رَهَقًا ۝'' (جن:۶) اور کچھ انسان، جنات کے کچھ لوگوں کی پناہ لیتے تھے تو اس سے ان جنات کا غرور اور بھی بڑھ گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جنات خود اعتراف کرتے تھے کہ انسان ہم سے ڈرتے ہیں، یہ سارے خوف، وہم اور بدشگونیاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے بعد ختم ہو گئے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانیت کو ان خرافات اور گندی توہمات سے پاک کیا، یہ انسانیت پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک عظیم احسان ہے اور دراصل انسان کا اکرام ہے۔

دین و دنیا کا توازن:

اسی کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دوسرا بڑا احسان یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین اور دنیا کی جو مصنوعی تقسیم تھی، اسے ختم کر دیا۔ عیسائیت میں رہبانیت نے انسانوں کو گھروں اور معاشرت سے کاٹ کر غاروں میں بھیج دیا تھا، جبکہ یہودیت مادیت پرستی میں ڈوب چکی تھی، لوگوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ اگر دین پر چلنا ہے تو دنیا کو چھوڑنا ہوگا، اور اگر دنیا حاصل کرنی ہے تو دین کو نظر انداز کرنا ہوگا۔ اسی ذہنیت کے تحت یہ نظریہ مشہور ہوا۔

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

اے بابر! عیش کر، کیونکہ یہ زندگی دوبارہ نہیں ملے گی۔ یوں انہوں نے دنیا کو سب کچھ سمجھ لیا اور یہ مان لیا کہ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر نہیں چلا جا سکتا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر

اس گمراہی کو دور کیا اور بتایا کہ دین اور دنیا ایک دوسرے سے جُدا نہیں، بلکہ دین کے دائرے میں رہتے ہوئے دنیا کو بھی بہترین انداز میں گزارا جا سکتا ہے۔

بادشاہی اور بندگی کا امتزاج:

تاریخِ اسلام میں بعض بادشاہ ایسے بھی گزرے ہیں جن کے دامن میں اقتدار کی شوکت بھی تھی اور بندگی کا خضوع بھی۔ ان کے دلوں میں عدل و انصاف کی روشنی تھی اور راتوں کو اللہ کے حضور آنسوؤں کی نمی، انہی میں ایک نام سلطان شمس الدین التمشؒ کا بھی آتا ہے، جن کی زندگی ہمیں یاد دلاتی ہے کہ بادشاہی اور بندگی کا امتزاج ممکن ہے، اگر دل اللہ کے خوف سے معمور ہو۔ کہا جاتا ہے کہ جب حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کا وصال ہوا تو پورے ہند میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ نمازِ جنازہ کے لیے ایک وسیع میدان میں انسانوں کا سمندر امنڈ آیا۔ اس وقت ایک شخص مجمع سے آگے بڑھا اور اعلان کیا کہ وہ حضرت بختیار کاکیؒ کا وصی ہے اور ان کی وصیت سنانا چاہتا ہے۔ وصیت یہ تھی کہ میری نمازِ جنازہ وہ شخص پڑھائے جس کی تکبیرِ اولیٰ کبھی قضا نہ ہوئی ہو، جس کی تہجد کبھی فوت نہ ہوئی ہو، جس نے عصر کی سنتیں کبھی ترک نہ کی ہوں، اور جس نے غیر محرم پر کبھی بری نظر نہ ڈالی ہو۔ یہ سن کر مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ کوئی بھی آگے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکا۔ وقت گزرتا گیا، سورج ڈھلنے لگا۔ تب ایک شخص روتا ہوا آگے آیا، جنازے کی چادر ہٹائی، اور کہا: حضرت! آپ تو رخصت ہو گئے، مگر میرا راز ظاہر کر گئے۔ پھر اللہ کو حاضر ناظر جان کر کہا: الحمدللہ! یہ چاروں صفات اللہ نے مجھ میں رکھی ہیں۔ لوگوں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا یہ شخص وقت کے بادشاہ، سلطان شمس الدین التمشؒ تھے۔ یہ منظر محض حیرت کا نہیں بلکہ ایمان کا لمحہ تھا کہ بادشاہت کے جاہ و جلال کے باوجود، عبادت، پرہیزگاری اور ضبطِ نفس ان کے کردار میں رچی بسی تھی، تو پھر ہم عام انسانوں کے لیے راستہ کیوں بند ہو؟ یہ واقعہ ہمیں یہ سمجھاتا ہے کہ سلطنت اور سجدہ ایک دوسرے کے مخالف نہیں، بلکہ ایک دل میں جمع ہو سکتے ہیں۔ شمس الدین التمشؒ کے شب و روز عبادت، عدل اور خدمت سے بھرے ہوئے تھے۔ رات کو گدڑی

اوڑھ کر، چہرہ چھپا کر، ہاتھ میں سونے کے سکے لے کر، وہ غریبوں کے گھروں میں جاتے، ان کی حاجت پوری کرتے، مگر کسی پر احسان نہ جتاتے۔ اپنے ملازموں میں سے رات کے وقت کسی کو نہ جگاتے وہ فرمایا کرتے: جو سکون سے سو رہا ہے، میں اسے اپنے آرام کے لیے کیوں جگاؤں؟ ان کے دروازے پر ''زنجیرِ عدل'' لگی تھی، تاکہ کوئی مظلوم کسی وقت بھی آ کر اپنی فریاد سنا سکے۔ اور وہ خود کہا کرتے: اگر تم نے دنیا میں اپنی شکایت مجھ سے نہ کہی، تو قیامت کے دن تمہاری فریاد کا بوجھ میں کیسے اٹھاؤں گا؟ دوستو! یہ واقعہ ہمیں یاد دلاتا ہے کہ دین صرف مسجد میں نہیں، دل اور عمل میں بھی زندہ رہنا چاہیے۔ بادشاہ ہو یا مزدور، تاجر ہو یا طالب علم، اللہ ہر دل سے یہی چاہتا ہے کہ دنیا کی ذمہ داریوں کے ساتھ بندگی کا رشتہ کمزور نہ ہونے پائے۔

نماز جمعہ اور رزق:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جملے میں نہایت جامع اصول بیان فرمایا: ''**إنما الأعمال بالنيات**'' (بخاری: باب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اگر کوئی شخص نیت کے ساتھ کاروبار کرے، حلال کمائی کا ارادہ رکھے، خریدار کے ساتھ اچھا سلوک کرے، دھوکہ نہ دے اور خرید و فروخت کے اصول و ضوابط اختیار کرے تو یہ سب بھی دین کا حصہ بن جاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسانوں کو سمجھایا کہ دین اور دنیا کو ساتھ لے کر چلنا ممکن ہے۔ قرآن کریم میں سورۂ جمعہ کی آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ۭ'' (جمعہ:۹) اے ایمان والو! جب جمعے کے دن نماز کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف لپکو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ''فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ'' پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔ روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ جمعہ کے بعد یہ آیت پڑھتے اور دعا کرتے: یا اللہ! میں کاروباری آدمی ہوں، آپ نے حکم دیا کہ جمعہ کے

لیے جلدی آؤ، میں نے نماز پڑھ لی۔ اب آپ نے فرمایا ہے کہ نماز کے بعد اللہ کا فضل تلاش کرو۔ میں اپنے رزق کے لیے نکل رہا ہوں اور آپ کے فضل کا طالب ہوں۔ یقیناً روزی دینے والی ذات صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہے اور سب سے بہترین رزق وہی عطا فرماتا ہے۔

اسباب اور اصل رازق:

انسانوں کو، مشینوں کو، ملازموں کو اور کاروبار کو اللہ تعالیٰ نے صرف اسباب کے درجے میں رکھا ہے، اصل رازق صرف اور صرف اللہ تبارک وتعالیٰ ہیں؛ لیکن ساتھ ہی اسباب اختیار کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بڑا احسان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انسان کو یہ تعلیم دی کہ وہ دین پر بھی قائم رہ سکتا ہے اور دنیا کے کاموں کو بھی دین کا حصہ بنا سکتا ہے۔ حدیث شریف میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إنما الأعمال بالنيات'' اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔ اگر دنیاوی کام کر رہے ہو لیکن نیت اچھی ہے، تو یہی دنیا دین بن جاتی ہے۔ ایک اور حدیث میں فرمایا: ''طلب الحلال فريضة بعد الفريضة'' (معجم کبیر: رقم: ۹۹۹۳) حلال روزی کمانا ایک فرض کے بعد دوسرا فرض ہے، گویا نماز ادا کرنے کے بعد جب حلال طریقے سے کمائی کرے تو جیسے نماز کا ثواب ملتا ہے ویسے ہی حلال کمائی پر بھی ثواب ملے گا۔

جائز خواہش پر بھی اجر:

اسی طرح ایک روایت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کو فرمایا: جب شیطان کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر تمہارے دلوں میں غلط وسوسہ ڈالے، تو اپنی بیوی کے پاس جاؤ اور اپنی ضرورت پوری کرو، اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا۔ صحابہ کرام نے حیرت سے عرض کیا: یا رسول اللہ! کیا اپنی بیوی سے یہ ضرورت پوری کرنے پر بھی ثواب ملے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اگر یہی خواہش ناجائز راستے سے پوری کرتے تو کیا گناہ نہ ہوتا؟ اب جبکہ تم نے اللہ کی عطا کردہ حلال راہ اختیار کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اس پر اجر عطا فرمائیں گے۔ (مسلم: کتاب الزکاۃ، باب بیان ان اسم الصدقۃ یقع علی کل نوع من المعروف)

مال و وراثت میں اعتدال:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عراق کو فتح فرمایا، حجۃ الوداع کے موقع پر بیمار ہو گئے، انہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا: یا رسول اللہ! میری ایک ہی بیٹی ہے، اس کے علاوہ کوئی اور اولاد نہیں، میرے پاس بہت سا مال ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پورا مال مت خرچ کرو، انہوں نے کہا: آدھا مال؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: آدھا بھی نہیں، انہوں نے کہا: تو پھر ایک تہائی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''والثلث والثلث کثیر'' (بخاری: کتاب الوصایا، باب ان یترك ورثته اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس) ایک تہائی بھی بہت زیادہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکمت کے ساتھ یہ تعلیم دی کہ اگر تم اپنا سارا مال راہِ خدا میں دے دو اور تمہاری اولاد کل دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلائے اور بھیک مانگے، تو یہ مناسب نہیں۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنی اولاد کے لیے حلال کمائی میں سے کچھ چھوڑ کر جاؤ۔

نیت کے ساتھ محبت بھی عبادت:

دوسری روایت میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اگر تم اپنی بیوی کے منہ میں محبت اور ثواب کی نیت سے لقمہ ڈالو تو اس پر بھی تمہیں اجر ملے گا۔ (بخاری: کتاب الایمان، باب ماجاء ان الاعمال بالنیة) سوچئے! کون سا نبی ایسا ہے، اور کس کی تعلیمات ایسی ہیں، جو انسانوں کو دنیا کے معمولی اور فطری کاموں کو بھی جنت کا ذریعہ بتاتے ہیں؟ ہم اپنے دنیاوی کام کریں، نیتوں کو درست رکھیں اور ثواب ان سب پر بھی حاصل کریں۔ یہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانیت پر عظیم احسان ہے۔

دین کو رہبانیت اور دنیا کو بے دینی بنا دینے کا انجام:

دوستو اور بزرگو! اگر ہم تاریخ کے اوراق پلٹیں تو ہمیں ایک ایسا دور بھی ملتا ہے جب انسان زندگی کو دو حصوں میں بانٹ بیٹھا تھا، قدیم مذاہب میں، اور خاص طور پر مسیحیت کے پیروکاروں میں، یہ تصور عام ہو گیا تھا کہ انسان کی زندگی کے دو الگ حصے ہیں، ایک حصہ دین کے لیے مخصوص

سمجھا جاتا تھا، اور دوسرا دنیا کے کاموں کے لیے۔ اُس دور میں گویا زمین دو خیموں میں تقسیم ہو چکی تھی، ایک خیمہ اُن لوگوں کا تھا جو خود کو مذہبی کہتے تھے، جو عبادت اور کلیسا کی دنیا سے وابستہ تھے، اور دوسرا اُن لوگوں کا جو دنیاوی امور، تجارت اور سلطنت سے جڑے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایک گہری خلیج حائل تھی۔ یہ صرف نظریاتی جدائی نہیں تھی بلکہ دلوں اور ذہنوں میں بھی ایک آہنی دیوار کھڑی کر دی گئی تھی۔ اُن دنوں یہ عقیدہ عام تھا کہ دین اور دنیا ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ اگر کوئی شخص دین کا راستہ اختیار کرتا تو اُسے دنیا سے کنارہ کش ہونا پڑتا، اور اگر کوئی دنیا کے کاموں میں لگتا تو اُسے مذہب سے دوری اختیار کرنا لازمی سمجھا جاتا۔ یہ کہا جاتا تھا کہ ایک وقت میں دو کشتیوں پر سوار نہیں ہو سکتے۔ اُس زمانے کے لوگوں کا خیال تھا کہ دولت، خوشحالی اور حکومت صرف اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان اپنے رب کی یاد سے غافل ہو جائے۔ اسی طرح مذہبی زندگی کو رہبانیت سے جوڑ دیا گیا، یعنی دنیا اور اس کی نعمتوں سے مکمل کنارہ کشی۔ یوں عبادت گاہوں میں عبادت تو باقی رہی، مگر زندگی سے رابطہ ٹوٹ گیا۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ انسان فطرتاً آسانی چاہنے والا ہے۔ اللہ نے انسان کے اندر سہولت پسندی اور راحت کی چاہ پیدا کی ہے، جب کوئی دین یا مذہب انسان کو زندگی کی جائز نعمتوں سے، ترقی، عزت، اور طاقت کے حصول سے روکتا ہے، تو وہ انسان کی فطرت سے ٹکرا جاتا ہے۔ ایسے مذہبی نظام، جو مباح چیزوں سے فائدہ اٹھانے، یا دنیاوی کامیابی کی اجازت نہیں دیتے، وہ زیادہ دیر انسان کے دلوں میں نہیں ٹھہرتے؛ کیونکہ فطرت کو دبایا جا سکتا ہے، مٹایا نہیں جا سکتا، اسی لیے دوستو! جب بعض مذاہب نے زندگی کو سختیوں اور پابندیوں میں جکڑ دیا، تو اہلِ عقل اور علم رکھنے والے لوگ دنیا کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے سوچا کہ شاید دین انسان کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ یوں وہ دنیا کی آسائشوں، دولت، اور خوشحالی میں لگ گئے، اور روحانیت و ایمان کی روشنی مدھم پڑتی چلی گئی۔ اکثر لوگوں نے جب دین کو چھوڑا، تو وہ اس لیے نہیں کہ وہ خدا کو نہیں مانتے تھے، بلکہ اس لیے کہ انہیں لگا دین اور دنیا ایک دوسرے

کے مخالف ہیں۔ ادھر کلیسا کے پیشوا جو مذہب کے نمائندے سمجھے جاتے تھے انہوں نے بھی اعتدال چھوڑ دیا۔ لوگوں نے ان کے خلاف بغاوت کی، اور یوں دین کی گرفت کمزور پڑ گئی۔ پھر حکومتیں بھی ایسی بن گئیں جیسے کوئی بے مہار اونٹ یا زنجیریں توڑنے والا ہاتھی، جو کسی ضابطے کے بغیر دوڑتا چلا جائے۔ دین الگ، دنیا الگ، یہی جدائی انسانیت کی سب سے بڑی کمزوری بن گئی۔ دیندار اور دنیا دار ایک دوسرے کے دشمن ہو گئے، اور یہی دشمنی بے دینی اور الحاد کا دروازہ بن گئی۔ سب سے پہلے یہ زوال یورپ پر آیا، اور پھر وہ تمام قومیں اس کے پیچھے چل پڑیں جو علم و تہذیب میں اس کی مقلد تھیں۔

پھر کچھ انتہا پسند مذہبی گروہ بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اس زخم پر نمک چھڑک دیا، وہ انسان کی فطرت کو دشمن سمجھنے لگے۔ انہوں نے روحانیت کے نام پر سخت ترین احکام، ایسی تعلیمات اور ظلم نافذ کیے جنہوں نے لوگوں کو دین سے اور بھی بدظن کر دیا، انہوں نے دین کو ایسی خوفناک صورت میں پیش کیا کہ لوگ اس کے نام سے لرزنے لگے۔ یوں دین کا اثر سمٹنے لگا، اور انسانیت نفسانیت، لذت پرستی، اور خود غرضی کی دلدل میں اترتی چلی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا دو انتہاؤں میں جھولنے لگی، ایک طرف وہ لوگ جو صرف دنیا چاہتے تھے، اور دوسری طرف وہ جو دنیا کو مکمل چھوڑ بیٹھے تھے۔ ان دونوں کے بیچ اعتدال کی روشنی بجھ گئی۔ یوں رفتہ رفتہ انسان لادینیت، مادہ پرستی، اور اخلاقی انتشار کے گہرے گڑھے میں جا گرا۔ ظاہری ترقی تو بڑھی، مگر روحانیت مٹ گئی، اور انسان اپنے خالق سے دور ہو گیا۔

فصل کے بجائے وصل:

دوستو اور بزرگو! سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ابدی اور لازوال کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین اور دنیا کے درمیان حائل اُس وسیع خلیج کو مٹا دیا، جو صدیوں سے انسانوں کے درمیان فاصلے پیدا کر رہی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے انسان دو گروہوں میں بٹ چکے تھے، ایک وہ جو خود کو دین دار سمجھتے تھے، اور دوسرے وہ جو دنیا کے کاموں میں لگے ہوئے

تھے۔ یہ دونوں گروہ ایک دوسرے کے مخالف، نفرت اور دشمنی میں مبتلا تھے۔ مگر نبیِ رحمت ﷺ آئے تو آپ نے ان دونوں کو محبت، صلح، اور ہم آہنگی کے ساتھ ملا دیا۔ آپ ﷺ نے انسانیت کو امن و اتحاد کے ساتھ جینے کا درس دیا۔ آپ ﷺ نے سکھایا کہ دین اور دنیا دو الگ راستے نہیں، بلکہ ایک ہی زندگی کے دو پہلو ہیں، جو ایک دوسرے کے بغیر ادھورے ہیں۔ اسی عظیم کارنامے کی روشنی میں آپ ﷺ رسولِ وحدت کہلائے وہ نبی جنہوں نے تفرقے کو اتحاد میں بدلا، نفرت کو محبت میں ڈھالا، اور جدائی کو ہم آہنگی میں تبدیل کر دیا۔ آپ ﷺ بیک وقت بشیر بھی ہیں یعنی خوشخبری دینے والے، اور نذیر بھی ہیں یعنی برائی سے خبردار کرنے والے۔ آپ ﷺ نے انسانیت کو دو متصادم راستوں سے نکال کر ایمان، احتساب، انسان دوستی، اور اللہ کی رضا کے ایک ہی راستے پر لگا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس سوچ کو درست کرنے کے لیے دعا سکھلائی: ''رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّفِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً '' (بقرہ:۲۰۱) اے ہمارے پروردگار! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی بھلائی۔ یہ تعلیم دراصل دنیا کی طرف بھی رغبت دلانے والی ہے؛ کیونکہ اس وقت عیسائی مذہب میں مکمل سنیاسی پن آچکا تھا۔ قرآن کریم نے اس کو بیان کیا: '' وَرَهْبَانِيَّةَ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ '' (حدید:۲۷) اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کی تھی، ہم نے ان پر اسے لازم نہیں کیا تھا، مگر انہوں نے اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ایسا کیا، پھر اس کی ویسی رعایت نہ کر سکے جیسے اس کا حق تھا۔ یعنی عیسائیوں نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ جتنی زیادہ مشقت اور ریاضت کی جائے گی، اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بڑا طبقہ لمبے عرصے تک اپنی ذات پر بے جا مشقتیں اور پریشانیاں ڈالتا رہا۔

پوری زندگی عبادت اور کائنات عبادت گاہ:

دوستو اور بزرگو! مومن کی زندگی ٹکڑوں میں بٹی ہوئی نہیں ہوتی، اس کی زندگی عبادت، محنت، خدمت اور ایمان سب کو ملا کر ایک خوبصورت وحدت بناتی ہے۔ مومن کی زندگی کا ہر

لمحہ، ہر عمل، اور ہر کوشش اللہ کی رضا کے لیے ہوتی ہے، وہ چاہے مسجد میں سجدہ کر رہا ہو، یا گھر میں اپنے بچوں کے لیے محنت کر رہا ہو، چاہے تعلیم حاصل کر رہا ہو یا کاروبار میں مصروف ہو اگر نیت خالص ہے، دل میں اخلاص ہے، اور مقصد اللہ کی خوشنودی ہے، تو یہ سب کچھ عبادت بن جاتا ہے۔ ایمان والا بندہ اپنی زندگی کے کسی بھی حصے کو دین سے الگ نہیں سمجھتا۔ وہ جانتا ہے کہ سچی نیت اور صحیح طریقے سے دنیا کے کام بھی عبادت میں بدل جاتے ہیں۔ یہی ایمان کی طاقت ہے، یہی مومن کی پہچان ہے۔ یہی پیغام ہمیں ہمارے نبیِ کریم ﷺ نے دیا۔

آپ ﷺ انسانیت کو جوڑنے آئے، جنہوں نے دین اور دنیا کی اس خلیج کو مٹا دیا، آپ ﷺ نے بتایا کہ ایمان صرف مسجد کی چار دیواری میں نہیں، بلکہ زندگی کے ہر میدان میں جھلکنا چاہیے، آپ ﷺ نے پوری زندگی کو عبادت بنا دیا، اور ساری زمین کو سجدہ گاہ قرار دیا۔ آپ ﷺ نے انسان کو دو مخالف کیمپوں یعنی دنیا داروں اور دین داروں سے نکال کر ایک ہی میدان میں کھڑا کر دیا، جہاں محنت بھی عبادت ہے، خدمت بھی عبادت ہے، اور انصاف، محبت اور ایثار بھی عبادت ہیں۔ ایسے معاشرے میں، جہاں ایمان دل میں، عمل ہاتھوں میں، اور اخلاق چہروں پر جھلکیں، وہاں کے بادشاہ بھی عاجز بن جاتے ہیں، اور فقیروں کے پاس بھی وقار اور علم کی روشنی ہوتی ہے۔ وہ لوگ راتوں کو عبادت میں روتے ہیں اور دن میں انصاف، علم اور خدمت میں چمکتے ہیں۔ ان کی زندگیوں میں کوئی تضاد نہیں ہوتا، نہ عبادت الگ، نہ دنیا الگ؛ بلکہ دونوں ایک ہی مقصد کے تابع ہوتی ہیں: اللہ کی رضا اور انسانیت کی خدمت۔

حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت:

جب حضرت سلمان فارسیؓ اسلام قبول کر کے رسول اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی حیثیت مہاجر کی تھی۔ ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے مہاجرین و انصار کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم فرمایا، ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی قرار دیا جاتا تاکہ باہمی تعاون، محبت اور سماجی استحکام پیدا ہو، انہی اصولوں کے تحت حضور ﷺ نے حضرت سلمان

فارسیؓ کو حضرت ابوالدرداءؓ کا بھائی بنایا۔

حضرت ابوالدرداءؓ بیان کرتے ہیں کہ جب میں حضرت سلمانؓ کو اپنے گھر لے گیا تو انہوں نے گھر کے ماحول کو دیکھ کر محسوس کیا کہ میاں بیوی موجود ہیں، مگر ازدواجی تعلق میں وہ ہم آہنگی اور دل چسپی نہیں جو ہونی چاہیے۔ حضرت سلمانؓ نے اپنی بھاوج یعنی اُمّ الدرداءؓ سے دریافت کیا کہ تم نے زیب وزینت کیوں نہیں کی؟ انہوں نے جواب دیا: آپ کے بھائی کو دنیا کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں، میں کس کے لیے بناؤ سنگھار کروں؟

دوپہر کا وقت ہوا تو حضرت ابوالدرداءؓ نے حضرت سلمان فارسیؓ کے لیے دستر خوان بچھایا اور کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے ابوالدرداءؓ کو ساتھ بیٹھنے کے لیے کہا تو جواب دیا کہ میرا روزہ ہے اور میں بلا ناغہ روزہ رکھا کرتا ہوں۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے اصرار کیا تو انہیں روزہ توڑنا پڑا اور وہ روزہ توڑ کر کھانے میں شریک ہو گئے۔ نفلی روزہ تھا اور نفلی روزے کا حکم آج بھی یہ ہے کہ اگر مہمان کا اصرار ہو تو روزہ توڑ دے مگر مہمان کا دل نہ توڑے۔ اس لیے کہ اصول یہ ہے کہ فرائض و واجبات میں حقوق اللہ کو فوقیت حاصل ہے مگر نوافل اور مستحبات میں حقوق العباد مقدم ہوتے ہیں۔ رات عشاء کے بعد حضرت سلمان فارسی کے لیے بستر بچھایا گیا تو انہوں نے حضرت ابوالدرداءؓ سے پوچھا کہ آپ کا کیا پروگرام ہے؟ انہوں نے کہا کہ میں رات کو نوافل پڑھا کرتا ہوں اور سونے کا معمول نہیں ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ نے ان سے کہا کہ بستر لائیں اور آرام کریں۔ ابوالدرداءؓ نے پھر کہا کہ میں عبادت کروں گا تو حضرت سلمان فارسیؓ نے زور دے کر کہا کہ بستر لاؤ اور آرام کرو۔ ابوالدرداءؓ کہتے ہیں کہ میں اس خیال سے بستر لے آیا کہ تھوڑی دیر میں جب یہ سو جائیں گے تو اٹھ کر عبادت میں مشغول ہو جاؤں گا مگر تھوڑی دیر کے بعد جب میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو حضرت سلمان فارسیؓ نے پھر ڈانٹ دیا اور کہا کہ سو جاؤ، عبادت کا وقت ہوگا تو میں خود جگا دوں گا، وہ لیٹ گئے، جب سحری کا وقت ہوا تو حضرت سلمان فارسیؓ اٹھے اور حضرت ابوالدرداءؓ کو بھی جگایا۔ دونوں نے تہجد ادا

کی اور پھر نماز فجر کی ادائیگی کے لیے مسجد نبویؐ کی طرف روانہ ہوگئے۔ مسجد نبویؐ جانے سے پہلے حضرت سلمان فارسیؓ نے حضرت ابوالدرداء کو ایک نصیحت کی جس میں فرمایا کہ: ''ان لربك عليك حقًا، ولنفسك عليك حقًا، ولأهلك عليك حقًا، ولزورك عليك حقًا، فأعط كل ذي حق حقه'' تیرے رب کا تجھ پر حق ہے، تیرے نفس کا تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا تجھ پر حق ہے اور تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے، پس ہر حق والے کو اس کا حق ادا کرو۔ اس کے بعد جب دونوں حضرات مسجد نبویؐ پہنچے اور جناب نبی اکرم ﷺ کے پیچھے نماز فجر ادا کر کے حضرت ابوالدرداءؓ نے آنحضرتؐ کی خدمت میں گزشتہ روز وشب کی رپورٹ پیش کی اور حضرت سلمان فارسیؓ کی نصیحت کے بارے میں بتایا تو آپؐ نے فرمایا ''صدق سلمان'' (بخاری: کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع) سلمان نے جو کیا ٹھیک کیا اور جو کہا ہے سچ کہا ہے۔ ''صدق'' کا تعلق قول سے بھی ہوتا ہے اور فعل سے بھی ہوتا ہے، اس لیے حضورؐ نے یہ فرما کر حضرت سلمان فارسیؓ کے قول وعمل دونوں کی تصدیق وتوثیق فرمائی۔

دوستو اور بزرگو! اس واقعے میں ہمارے لیے ایک کامل پیغام پوشیدہ ہے، اسلام توازن اور اعتدال کا دین ہے، یہ نہ صرف عبادت کی دعوت دیتا ہے بلکہ انسانی حقوق اور معاشرتی ذمہ داریوں کو بھی اہمیت دیتا ہے۔ رب کی عبادت اپنے وقت پر کرو، اپنے نفس کو آرام دو، اپنے گھر والوں کے حقوق ادا کرو، اور مہمان نوازی کو نظر انداز نہ کرو۔ آج کے دور میں، جب انسان اپنی مصروفیتوں میں خالق کو اور خالق کی مخلوق کو دونوں کو بھولتا جا رہا ہے، حضرت سلمان فارسیؓ کی یہ نصیحت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ اصل دین، توازن اور انصاف کا نام ہے، خدا کے حق اور بندوں کے حق دونوں کی ادائیگی۔

مشقت میں اعتدال:

حضرت علامہ شاطبیؒ، جو قرآن وحدیث اور مقاصد شریعت کے بڑے جلیل القدر عالم ہیں، انہوں نے ایک نہایت اہم بات ذکر فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں کہ جب آدمی کوئی عبادت یا

نیکی کا کام کرتا ہے تو اس میں بعض اوقات قدرتی طور پر مشقت بھی آتی ہے۔ مثال کے طور پر رمضان کے روزے گرمی کے دنوں میں رکھنا، یا حلال وحرام کے درمیان فرق کرنا، کبھی مال اور سونا پاس آ رہا ہے لیکن وہ حرام طریقے سے ہے، اس وقت آدمی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر صرف حلال کو اختیار کرتا ہے۔ ظاہر ہے اس میں پریشانی اور تکلیف تو ہوتی ہے۔ علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں کہ ایسی مشقت جس کا سامنا عبادت کے ساتھ خود بخود ہو، اس پر ثواب ملتا ہے، لیکن یہ نیت نہ کرو کہ میں جان بوجھ کر اپنے نفس کو زیادہ مشقت میں ڈالوں تاکہ زیادہ ثواب ملے۔ جیسے کوئی شخص کھانا پینا چھوڑ دے، عبادتوں میں حد سے زیادہ وقت صرف کرے، یا سماج اور معاشرتی ذمہ داریوں سے کٹ کر الگ تھلگ ہو جائے، شریعتِ مطہرہ اس طرح کی خود ساختہ مشقت کو پسند نہیں کرتی۔

دلوں کا سکون ذکرِ الٰہی میں:

دوستو اور بزرگو! آج کا زمانہ مادیت میں ڈوبا ہوا ہے، انسان دنیا کی ظاہری تیاری اور جسم کی پرورش پر توجہ دیتا ہے، مگر دل کی دنیا اور روحانی کیفیت کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝۲۸'' (رعد:۲۸) آگاہ ہو جاؤ! اللہ کے ذکر ہی سے دلوں کو سکون ملتا ہے۔ آج انسان صبح سے شام تک محنت کرتا ہے، لیکن دنیا کا نظام اس قدر پیچیدہ ہو چکا ہے کہ بے شمار پریشانیاں ساتھ لیے ہوئے ہے، یہ اس لیے ہے کہ دل کی اصلاح اور ذکرِ الٰہی سے غفلت برتی گئی۔ عیسائی مذہب کے دو پہلو سامنے آئے: ایک دور میں وہ غاروں اور جنگلوں میں سنیاسی بن کر دنیا سے کٹ گئے، اور دوسرے دور میں وہ مکمل مادیت پرستی کی طرف جھک گئے، یہاں تک کہ بعض نے خدا کا بھی انکار کر دیا اور ارتقاء کے نظریے کو مان کر الحاد کی راہ اختیار کی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو یوں بے سہارا نہیں چھوڑا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو بھیجا اور بالخصوص جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر انسانیت کو توہمات اور بدشگونی سے نکالا۔ آپ ﷺ نے یہ حقیقت واضح کی کہ روزی، رشتے ناطے، تعلقات، کھانے پینے

اور دنیا کے معاملات ضرور ہیں، مگر اگر ان سب میں ہی انسان ڈوبا رہے اور اللہ کو بھول جائے تو دل میں بے قراری اور بے چینی پیدا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ تو اس کائنات کے بنانے والے اور اسے چلانے والے ہیں۔ جب وہ یہ فرما رہے ہیں کہ ''اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ﴿۲۸﴾'' تو یقیناً سکونِ قلب اسی میں ہے۔ ذکرِ الٰہی صرف مخصوص محفل یا مجلس کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ '' (آل عمران:۱۹۱) وہ لوگ جو اللہ کا ذکر کرتے ہیں کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلو کے بل۔ یعنی اللہ کا ذکر زندگی کے ہر حال میں آسان کر دیا گیا ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جُعِلَتْ لِيَ الْاَرْضُ مَسْجِدًا وَّطَهُوْرًا'' (بخاری: کتاب الصلاۃ، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وسلم: جعلت لی الارض مسجداً وطهوراً) پوری زمین میرے لیے مسجد اور پاکیزگی کا ذریعہ بنا دی گئی، یہ اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ جہاں پانی نہ ملے وہاں زمین سے تیمم کر کے بھی عبادت کی جا سکتی ہے۔

سنت سے دوری، زوال کی وجہ:

دوستو اور بزرگو! نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ ساری نعمتیں اور ہدایات لے کر تشریف لائے، افسوس کی بات یہ ہے کہ آج بہت سے مسلمان ایسے ہیں جنہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا کچھ علم ہی نہیں، یہ کتنی بڑی محرومی ہے کہ ایک کھلاڑی کا بایوڈاٹا ہمیں یاد ہوتا ہے، کسی فلمی ہیرو یا ایکٹریس کی زندگی کے واقعات ہمیں معلوم ہوتے ہیں، لیکن اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے ہم غافل ہیں! یاد رکھو! سیرت کا مطالعہ ضروری ہے، اس لیے کہ قرآن خود کہتا ہے: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ '' تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ جب بہترین نمونہ ہمیں سیرتِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی میں ملتا ہے تو اس سے بہتر رہنمائی کہاں ہو سکتی ہے؟ جرمنی کے ایک بڑے پروفیسر، جو بعد میں اللہ کے فضل سے ایمان لے آئے اور محمد اسد صاحب کے نام سے مشہور ہوئے، انہوں نے اپنی کتاب ''اسلام دو راہے پر'' اور دیگر تحریروں میں یہ دکھایا کہ انہوں نے عرب دنیا میں جا کر دیکھا کہ مسلمان نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

سنتوں اور اداؤں سے دور ہو چکے ہیں اور یورپی تہذیب، کلچر، فیشن اور مادیت کو اپنا چکے ہیں؛ حالانکہ ان چیزوں سے فائدہ اٹھانا اسلام نے منع نہیں کیا، خود قرآن کریم میں جگہ جگہ ٹیکنالوجی اور وسائل کا ذکر موجود ہے کہ اللہ نے یہ سب کچھ تمہارے لیے بنایا ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ دیکھ لو کہ کیسے اللہ نے ہواؤں کو ان کے تابع کیا، ان کا تخت ان کے حکم سے چلتا تھا، جنات کو ان کے تابع کر دیا گیا تھا، اور پرندوں کی بولیاں وہ سمجھتے تھے، یہ سب اس بات کی دلیل ہے کہ جب بندہ اللہ کا ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دنیا کی قوتوں اور وسائل کو اس کے تابع فرما دیتا ہے۔

سیرتِ نبوی؛ انسانیت کی رہائی کا پیغام:

دوستو اور بزرگو! یہ سیرت کا موقع ہے، لیکن خیال رکھنا چاہیے کہ یہ صرف دوسری قوموں کی طرح ایک دن منانے کا رسمی عمل نہ بن جائے، دوسری قوموں کے پاس تو کوئی آئیڈیل ہی نہیں، اس لیے وہ کسی شخصیت کا دن مناتے ہیں؛ لیکن اُمتِ محمدیہ کے پاس تو وہ نبی ہیں جن کی سیرت میں صبح سے لے کر شام تک، رات کو سونے سے بیدار ہونے تک، زندگی کے ہر موقع پر رہنمائی موجود ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں حکم بھی دیا اور جن چیزوں سے بچنا ہے ان سے روکا بھی، جیسا کہ قرآن میں ہے: ''یَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ'' نبی کی صفت پہلے ذکر کی گئی اور امت کی صفت بعد میں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتے ہیں، اور فرمایا: ''وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ'' گندی چیزوں کو آپ حرام قرار دیتے ہیں۔ پھر فرمایا: ''وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ط'' یہ عجیب جملہ ہے کہ انسان پر جو بوجھ ہے، خواہ مذہبی ہو، سماجی ہو، یا اپنی ذات کا ہو، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بوجھ کو ہٹانے کے لیے تشریف لائے۔ یہاں بیڑیوں سے مراد ہاتھ کی لوہے کی بیڑیاں نہیں بلکہ سوچ کی بیڑیاں ہیں؛ ایک ہی سوچ کہ اللہ کے سوا کسی کے آگے نہ جھکنا، ایک ہی یقین کہ نفع و نقصان کا مالک صرف اللہ ہے، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لیے آئے کہ تمہاری دنیاوی پریشانیاں بھی دور کریں، ایسے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ جن کے

بارے میں پیدا کرنے والی ذات خود فرما رہی ہے: ''وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ'' الغرض! کچھ لوگوں نے دنیا کو ہی سب کچھ سمجھ لیا، کچھ آخرت کی طرف اتنے بڑھے کہ سنیاسی پن اختیار کر لیا، عیسائیت ان دونوں انتہاؤں کا شکار ہوئی، مگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آ کر بتایا کہ دین اور دنیا دونوں ساتھ چل سکتے ہیں۔ اقبال نے اسی حقیقت کو بیان کیا ہے:

ہوئی دین و دولت میں جس دم جدائی ہوس کی امیری ہوس کی وزیری

علامہ اقبال یورپ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ وہاں جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور لوگوں کے حالات کا مشاہدہ کیا، اُسے انہوں نے اپنے اشعار میں بیان کیا۔ وہ فرماتے ہیں کہ یورپ میں مذہب ایک طرف کر دیا گیا ہے اور وہاں کی سیاست ظالم و جابر حکمرانوں کے قبضے میں ہے، جنہیں نہ دین کا علم ہے نہ انسانیت کی قدر۔ گزشتہ چار پانچ سو سال سے جب اسلامی حکومت کمزور ہوئی اور دوسری طاقتیں دنیا پر غالب آئیں، تب سے مادیت کا غلبہ ہے اور یہ مغربی اقوام اس لیے بھی بھٹک گئیں کہ ان کے پاس کوئی کامل نمونۂ حیات موجود نہ تھا۔

دوستو اور بزرگو! ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اُمتِ مسلمہ کے پاس تو سب سے اعلیٰ اور کامل نمونہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات اقدس میں موجود ہے۔ جیسا کہ اقبال نے فرمایا:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

اپنے آپ کو مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچاؤ، کیونکہ دین کی حقیقت سراسر اُنہی کی ذاتِ مبارکہ میں ہے، اگر تم اُن تک نہ پہنچے اور اُن کے اسوۂ حسنہ پر عمل نہ کیا تو تمہارے سارے اعمال محض ابولہب کی پیروی کے سوا کچھ نہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے نوجوانوں کو سیرتِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھنے اور اُس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۲۰)

غصہ کے نقصانات اور صبر کی فضیلت

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين . قال الله تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد. امابعد!

اعُوْذُ بِاللهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ۝ (شوریٰ:۳۷)

وقال تعالى:

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ۝ (آل عمران:۱۳۴)

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: ليسَ الشَّدِيدُ بالصُّرَعَةِ، إنَّما الشَّدِيدُ الذي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الغَضَبِ. (بخاری: کتاب الادب، باب الحذر من الغضب)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

غصہ ضبط کرنا، ایمان کی علامت:

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج آپ حضرات کے سامنے کلامِ پاک کی جن آیات کی تلاوت کی گئی ہے، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان والوں کی

مختلف صفات ذکر فرمائی ہیں، انہی میں سے ایک خصوصی صفت یہ بیان فرمائی کہ ایمان والے بڑے گناہوں اور برائیوں سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔ وہ فواحش، منکر اور برائی سے خود بھی پرہیز کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ''وَإِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝'' (شوریٰ:۳۷) جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں۔ ایک اور جگہ فرمایا: ''وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ط'' ایمان والے وہ ہیں جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے غصہ رکھا ہے، جب کوئی ناگوار یا ناخوشگوار بات سامنے آجائے، یا کسی معاملے میں ٹکراؤ ہو جائے، تو انسان فطری طور پر غصے میں آجاتا ہے؛ لیکن اصل کمال یہ ہے کہ انسان اس غصے کو قابو میں رکھے۔ اسی بات کو اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی حدیثِ مبارکہ میں بیان فرمایا: ''لَيْسَ الشَّدِيدُ بِالصُّرَعَةِ'' طاقتور وہ نہیں جو کشتی میں دوسرے کو گرا دے، بلکہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''إِنَّمَا الشَّدِيدُ الَّذِي يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الغَضَبِ'' (بخاری: کتاب الادب، باب الحذر من الغضب) اصل بہادر وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔

اخلاقِ زین العابدینؒ؛ قرآن کا عملی نمونہ:

دوستو اور بزرگو! انسان کی فطرت ہے کہ جب کوئی تکلیف پہنچے، کوئی نقصان ہو، یا کوئی اس کی عزتِ نفس کو چھو لے تو دل میں غصے کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اگر یہ غلطی کسی نوکر یا کمزور سے سرزد ہو جائے تو انسان کا غصہ مزید بڑھ جاتا ہے؛ لیکن یاد رکھو! ایمان والے وہ ہیں جو اپنے غصے پر قابو پاتے ہیں، نہ کہ اپنے غصے کے غلام بنتے ہیں، اسی حقیقت کو سمجھانے والا ایک ایمان افروز واقعہ حضرت علی بن حسین رحمہ اللہ المعروف امام زین العابدین کے اخلاقِ کریمانہ سے جھلکتا ہے۔ ایک دن آپؒ وضو فرما رہے تھے، خادمہ ہاتھ میں بھرا ہوا لوٹا لیے پانی لا رہی تھی۔ اچانک اُس کا پاؤں کسی چیز میں الجھ گیا، اور بھرا ہوا پانی کا لوٹا آپؒ کے چہرے پر گر گیا۔ چہرہ زخمی ہو گیا، کپڑے تر ہو گئے۔ سوچئے دوستو! ایسے وقت میں ایک عام انسان کا

حال کیا ہوتا؟ اگر بیٹے سے بھی ایسا ہو جائے تو غصہ آتا ہے مگر برداشت کر لیتے ہیں۔ بیوی سے ہو جائے تو بھی ضبط کر لیتے ہیں۔ مگر اگر نوکر سے، وہ بھی عورت سے، ایسا ہو جائے تو دل میں غصہ آگ بن جاتا ہے؛ لیکن حضرت زین العابدینؒ تو آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے تھے، جب خادمہ نے امامؒ کا چہرہ دیکھا تو وہ ڈر گئی، کانپنے لگی۔ لیکن اس کی زبان سے بے اختیار قرآن کی آیت نکلی: ''وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ'' ایمان والے وہ ہیں جو اپنے غصے کو پی جاتے ہیں، یہ سننا تھا کہ امام زین العابدینؒ نے فوراً اپنا غصہ ضبط کر لیا۔ چہرے پر سکون آ گیا، خادمہ نے آگے کہا: ''وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ'' اور وہ جو لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں تو حضرت زین العابدین نے فرمایا: میں نے تمہیں معاف کر دیا۔ پھر خادمہ نے آیت کا آگے کا ٹکڑا پڑھا: ''وَاللهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ'' اور اللہ نیکی کرنے والوں سے محبت کرتا ہے تو حضرت زین العابدینؒ نے فرمایا: جا، میں نے تجھے اللہ کی رضا کے لیے آزاد کر دیا۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے، تو ہمیں بھی اپنے غصے پر قابو پانا سیکھنا ہوگا۔ غصہ شیطان کی آگ ہے، اور ایمان والا اُس آگ کو بجھا دیتا ہے۔

امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا عفو درگزر:

امام ابوحنیفہؒ کے پڑوس میں ایک شخص رہتا تھا، وہ رات کے وقت گوشت خرید کر شوربہ بناتا، لوگوں کو بلاتا، محفل جماتا، اور پھر شراب وگانے کی مجلس برپا ہوتی، یہ سب کچھ امام صاحبؒ کے گھر کے قریب ہوتا مگر آپؒ نے کبھی شکایت نہ کی، کبھی گلہ نہ کیا، دن پر دن گزرتے گئے، شور وشرابہ بڑھتا گیا، مگر امام صاحبؒ خاموش رہے، ایک رات گورنر نے یہ حالت دیکھی کہ امام ابوحنیفہؒ جیسے بزرگ کے گھر کے پاس ایسی محفلیں ہو رہی ہیں، فوراً اپنے آدمی بھیجے، اُن سب کو گرفتار کر لیا، اور جیل میں ڈال دیا، صبح ہوئی، امام ابوحنیفہؒ نمازِ فجر کے بعد جب باہر نکلے تو کسی نے بتایا: حضرت! وہ آپ کے پڑوسی کو رات کو شراب نوشی کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے، امام صاحبؒ خاموشی سے سیدھے گورنر کے دروازے پر پہنچے۔ فرمایا: یہ میرا پڑوسی ہے، تم نے اسے

قید کر رکھا ہے؟ گورنر نے کہا: حضرت! وہ تو رات رات بھر شور وشرابہ کرتا ہے، آپ کی عبادت میں خلل ڈالتا ہے۔ ہم نے اسے سزا دینے کے لیے بند کیا ہے، امام ابوحنیفہؒ نے نہایت نرمی سے فرمایا: ہاں، وہ غلط کرتا تھا، لیکن پڑوسی کا شریعت میں بڑا حق ہے۔ ہم نے کبھی شکایت نہیں کی، برداشت کیا، آج کے دن تم اسے چھوڑ دو۔ وہ آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔ گورنر، امام صاحبؒ کی شفقت اور وقار سے متأثر ہوا، اور فوراً حکم دیا: حضرت کے کہنے پر سب کو رہا کر دو! جب وہ شخص قید سے نکلا اور امام ابوحنیفہؒ کے سامنے آیا تو کہنے لگا: حضرت! میں نے آپ کو اتنی اذیت دی، رات رات بھر شور کیا، مگر آپ نے نہ صرف معاف کیا بلکہ میری رہائی کے لیے خود گورنر کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ جیسے لوگ ہی اللہ کے مقرب بندے ہیں! دوستو! یہ ہے وہ اخلاقی بلندی جو ایمان والوں کا زیور ہے۔

سخت مزاجی نہیں، نرم خوئی ایمان کی شان:

تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے غصے کو ایک صفت کے طور پر ذکر فرمایا ہے، خود قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں اللہ پاک نے اپنے متعلق بھی غضب کا ذکر کیا ہے، جیسے کہ یہودیوں کے بارے میں فرمایا: ''وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ'' (آل عمران: ۱۱۲) وہ اللہ کے غضب کے ساتھ لوٹے۔ حدیث شریف میں بھی آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب کوئی ناگوار بات سنتے تو اللہ کے لیے آپ کی طبیعت میں غصہ ظاہر ہوتا؛ لیکن ساتھ ہی خود اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ صفت بھی بیان فرمائی ہے کہ جب لوگ آپ کے ساتھ برا سلوک کرتے تو آپ اس کے بدلے میں ہمیشہ اچھا ہی سلوک فرماتے۔ (بخاری: کتاب الادب، باب قول النبی ﷺ: یسروا ولا تعسروا) اسی حقیقت کو قرآنِ کریم نے یوں بیان کیا: ''وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ'' (آل عمران: ۱۵۹) اے نبی! اگر آپ کا مزاج سخت اور دل سخت ہوتا تو لوگ آپ کے اردگرد سے منتشر ہو جاتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ غصہ میں رہنے والا آدمی لوگوں کے دلوں سے دور ہو جاتا ہے اور اس کے قریب آنے سے لوگ کتراتے ہیں۔

الغرض! اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسانی فطرت میں یہ رکھا ہے کہ کبھی ناخوشگوار باتوں کی بنیاد پر غصہ آجاتا ہے، قرآن نے اس کا انکار نہیں کیا، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تعلیم دی کہ اصل بہادری یہ ہے کہ انسان غصے کے وقت اپنے نفس پر قابو پائے۔

قیادت اور ضبطِ نفس؛ حضرت عمرؓ کا نمونہ:

حضرت عمر فاروقؓ، جو امیر المؤمنین تھے، ان کے پاس ایک صحابی حضرت حرؓ رہا کرتے تھے۔ حضرت حر کے چچا، عُیَینہ بن حصن، جو قبیلے کے بڑے سردار تھے، انہوں نے اپنے بھتیجے سے کہا: تمہارا امیر المؤمنین سے قریبی تعلق ہے، مجھے بھی کبھی ان کی خدمت میں لے چلو؛ چنانچہ حضرت حر رضی اللہ عنہ اپنے چچا کو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس لے گئے، اب چونکہ عُیَینہ بن حصن ایک بدوی قبیلے کے آدمی اور کچھ سخت مزاج کے مالک تھے، انہوں نے بیٹھتے ہی کہا: آپ ہمیں بیت المال اور مالِ غنیمت میں سے کچھ نہیں دیتے، حالانکہ اللہ نے آپ کو کثرت سے مال عطا فرمایا ہے! یہ سخت کلامی سن کر حضرت عمرؓ کی طبیعت میں غصہ پیدا ہوا اور آپ کچھ ارشاد فرمانا ہی چاہتے تھے کہ اتنے میں حضرت حرؓ نے فوراً قرآن کریم کی یہ آیت پڑھ دی: ''خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ﴿۱۹۹﴾'' ایمان والے وہ ہیں جو غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کرتے ہیں۔ بس یہ آیت سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا غصہ فوراً ٹھنڈا ہوگیا؛ کیونکہ آپ کی زندگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی کہ جیسے ہی قرآن کریم کی کوئی آیت سامنے آتی، آپ اسی پر رک جاتے اور اسی کے مطابق عمل کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ فرماتے ہیں: حضرت عمرؓ ''کان وقّافاً عند کتاب اللہ'' تھے، (بخاری: کتاب التفسیر، باب خذ العفو وامر بالعرف) یعنی قرآن کے سامنے اپنی خواہش اور مزاج کو چھوڑ کر فوراً قرآن کے حکم کو اپنا لیتے۔ دوستو! یہی ہے ایک مومن کی شان کہ جب قرآن ہمیں کسی بات کی طرف متوجہ کرے تو ہم اپنی طبیعت، اپنی ضد اور اپنے غصے کو پسِ پشت ڈال کر اللہ کے حکم کے سامنے جھک جائیں، یہی اصل ایمان کی علامت ہے، اور یہی صفت ہمیں اپنے اندر پیدا کرنی ہے۔

غصہ بگاڑتا ہے، حلم سنوارتا ہے:

دوستو اور بزرگو! غصہ انسانی فطرت میں رکھا گیا ہے، لیکن اگر دیکھا جائے تو انسان کو سب سے زیادہ نقصان غصہ ہی پہنچاتا ہے، آج دنیا کی یونیورسٹیوں میں مختلف کورسز Cources پڑھائے جاتے ہیں، جن میں مینجمنٹ Management اور کاروبار کے اصول سکھائے جاتے ہیں۔ وہاں یہ بات لکھی جاتی ہے کہ کامیاب تاجر وہ ہے جو اپنے غصے پر قابو رکھے، وہی کامیاب ہوتا ہے، وہی بڑے پروجیکٹ حاصل کرتا ہے اور اسی کے قریب لوگ آتے ہیں، یہ تو دنیاوی اعتبار سے کامیابی کے اصول ہیں، لیکن آخرت کی کامیابی کے لیے بھی انسان کو اپنے غصے پر قابو پانا لازم ہے۔

رات دن ہم دیکھتے ہیں کہ میاں بیوی کے جھگڑے اور طلاق کا سبب زیادہ تر غصہ ہی بنتا ہے، لوگ بعد میں کہتے ہیں: ہم نے تو غصے میں طلاق دی تھی، بھلا خوشی میں کون طلاق دیتا ہے! یہی غصہ ہے جو میاں بیوی کو جدا کراتا ہے، اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے کوئی بات سنی اور بغیر تحقیق کے کسی پر غصہ نکال دیا، بعد میں پتہ چلا کہ اس بیچارے کا تو کوئی قصور ہی نہ تھا، اب پچھتاوا باقی رہتا ہے، لیکن زبان سے نکلا ہوا جملہ واپس نہیں آتا۔ شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

جراحات السنان لها التئام ولا یلتام ماجرح اللسان

زبان کا تیر کا تلوار کا تو گھاؤ بھرا لگا جو زخم زباں کا رہا ہمیشہ ہرا

جسم پر لگنے والی چوٹ وقت کے ساتھ مندمل ہو جاتی ہے، مگر دل پر لگنے والا زخم سالہا سال انسان کو تڑپاتا رہتا ہے۔ جس شخص پر آپ نے غصے میں جملہ کہا، وہ تنہائی میں بیٹھ کر بار بار آپ کے الفاظ کو یاد کرتا رہتا ہے، اور دل کا زخم تازہ ہی رہتا ہے۔

نبوی نصیحت:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے غصے کے سلسلے میں متعدد آیات نازل فرمائی ہیں اور صحابۂ کرام نے نبیٔ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس بارے میں رہنمائی طلب کی، ایک معروف روایت میں ہے: ایک

صحابی آئے اور عرض کیا: ''أَوْصِنِي'' مجھے کوئی نصیحت کیجئے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''لا تَغْضَب'' غصہ مت کرو۔ صحابی نے سوچا، شاید تفصیل بعد میں دی جائے گی، اس لیے بار ہا پوچھا، تو ہر بار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہی مختصر مگر جامع حکم دہرایا: ''لا تَغْضَب'' (بخاری: کتاب الادب، باب الحذر من الغضب) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غصہ کس قدر مضر اور بری صفت ہے۔

غصے کی کیفیت اور اس کے نقصانات:

دوستو اور بزرگو! غصے کے اسباب مختلف ہیں۔ صوفیائے کرام نے جو محسوس کیا اور بتلایا کہ غصے کی بڑی وجہ انسان کے دل میں تکبر کا ہونا ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر غصے میں اصل وجہ تکبّر ہی ہو، عام طور پر جب کوئی ناخوشگوار بات سامنے آتی ہے تو انسان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، دل کی دھڑکن تیز، خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے، چہرہ بگڑ جاتا ہے اور آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ ایسے لمحوں میں زبان بے قابو ہو کر وہ جملے ادا کر دیتی ہے جو بعد میں شرمندگی اور پچھتاوے کا سبب بنتے ہیں۔

غصے کی اقسام اور اصل بہادری:

حدیث مبارک میں غصہ کرنے والوں کی مختلف قسمیں بیان کی گئی ہیں: (۱) ایک وہ شخص جسے غصہ دیر سے آتا ہے اور جلدی ختم ہو جاتا ہے، یہ سب سے اعلیٰ اور پسندیدہ صفت ہے۔ (۲) دوسرا وہ جسے ذرا سی بات پر فوراً غصہ آتا ہے اور دیر تک ختم نہیں ہوتا۔ یہ سب سے بُری حالت ہے۔ (۳) کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جنہیں جلدی غصہ آتا بھی ہے اور جلدی ختم بھی ہو جاتا ہے۔ یہ نہ قابلِ تعریف ہیں نہ قابلِ مذمت۔ (۴) اور کچھ ایسے ہوتے ہیں جنہیں دیر سے غصہ آتا ہے مگر دیر ہی سے جاتا ہے۔ یہ بھی قابلِ تعریف نہیں اور نہ ہی قابلِ مذمت۔ ان سب میں سب سے پسندیدہ اور بہترین صفت پہلی ہے کہ آدمی کو غصہ دیر سے آئے اور جلدی ختم ہو جائے۔ (ترمذی: ابواب الفتن، باب ما جاء ما اخبر النبی بما ھو کائن الی یوم القیامۃ) اگر اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو یہ خوبی عطا کر دے تو اس کے گھر، کاروبار، خاندان اور سماج کے معاملات میں بہت سی برائیاں ختم ہو جاتی ہیں، کبھی اگر کسی نے آپ کو غصہ دلایا تو چند لمحے دل

میں جواب دینے کا خیال آتا ہے مگر آپ ضبط کر کے خاموش ہو جائیں، یہی اصل بہادری ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اصل پہلوان وہ نہیں جو دوسروں کو پچھاڑ دے، بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے آپ پر قابو پالے۔

انبیاء علیہم السلام کی حکمت بھری روش:

قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات تفصیل سے بیان فرمائے ہیں، انبیاءؑ کو ان کی قوموں نے عجیب وغریب الزامات دیے؛ کسی نے جادوگر کہا، کسی نے ساحر کہا، کسی نے شاعر کہا اور کسی نے مجنون کہا۔ یہ سب کچھ صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہی نہیں ہوا بلکہ پچھلے تمام انبیاء مثلاً حضرت ہود علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام اور دیگر انبیاء کے ساتھ بھی یہی رویہ اختیار کیا گیا؛ لیکن قرآن ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام نے کبھی غصے کے ساتھ ردِّعمل نہیں دیا، بلکہ وہ اپنے جواب کا رُخ حکمت کی طرف موڑ دیتے اور سکون واطمینان کے ساتھ اپنی بات پیش کرتے۔ یہ انبیاء کی وہ عظیم صفت ہے جسے قرآن نے ہمارے سامنے رکھا تاکہ ہم سیکھ سکیں کہ غصہ انسان کو مشکلات اور پریشانیوں میں ڈال دیتا ہے، جبکہ صبر اور سکون انسان کو کامیابی اور عزت عطا کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کا واقعہ:

کبھی کبھی انسان محض غلط فہمی کی بنیاد پر غصے میں آجاتا ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ جب ان کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے شوہر کا انتقال ہوا تو وہ چاہتے تھے کہ ان کی بیٹی کا نکاح کسی نیک اور موزوں شخص سے ہو جائے، سب سے پہلے وہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے اور ان سے اپنی بیٹی کے نکاح کی بات کی، حضرت ابوبکرؓ نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے، اس کے بعد حضرت عمرؓ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ فی الحال میرا نکاح کا ارادہ نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے تو صاف جواب دے دیا

لیکن حضرت ابوبکرؓ کی خاموشی پر مجھے غصہ آنے لگا، کچھ دن بعد نبی اکرم ﷺ نے خود حضرت عمرؓ کو پیغام بھیجا کہ وہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنا چاہتے ہیں، یوں حضرت حفصہؓ کا نکاح حضور اکرم ﷺ سے ہو گیا، بعد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حضرت عمرؓ کے پاس آئے اور کہا: عمر! جب تم نے اپنی بیٹی کا نکاح مجھ سے کرنے کی بات کی تھی تو مجھے یاد آیا کہ ایک مجلس میں رسول اللہ ﷺ نے خود تمہاری بیٹی کا ذکر کیا تھا، جس سے اندازہ ہوا کہ شاید آپ ﷺ ان سے نکاح کا ارادہ رکھتے ہیں؛ لیکن چونکہ آپ ﷺ نے مجھے صاف طور پر کچھ نہیں فرمایا تھا، اس لیے یہ راز میرے لیے امانت تھا، اگر میں اس وقت ہاں کہہ دیتا یا انکار کرتا تو یہ راز افشا ہو جاتا، اسی لیے میں خاموش رہا اور جب حضور ﷺ نے نکاح فرما لیا تو اب وہ راز باقی نہ رہا، اس لیے میں نے تمہیں وضاحت کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرا دل بالکل مطمئن ہو گیا۔ (نسائی: کتاب النکاح، باب انکاح الرجل ابنته الکبیرة) اس واقعے سے معلوم ہوا کہ اکابر صحابہ کے درمیان بھی وقتی طور پر غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں، لیکن وہ ہمیشہ حسنِ نیت اور وضاحت کے ذریعے دور ہو جاتیں۔

فتنے سے بچنے کا طریقہ:

اس روایت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی سے بات کرنا چاہیں اور فی الحال پوری بات کہنا مناسب نہ ہو، فتنے کا اندیشہ ہو تو پہلے اشارتاً اصل نکتہ واضح کر دیں، پھر مناسب موقع پر تفصیل بیان کریں، ورنہ ذہنوں میں یہی رہ جاتا ہے کہ فلاں نے میرے ساتھ یہ کیا، اور لوگ غصے میں آ جاتے ہیں۔ کتابُ اللہ نے اسی سلسلے میں فرمایا: ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا'' (حجرات:۶) اگر کوئی شخص تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو اس کی تحقیق کرو۔ آج کل ہوتا یہ ہے کہ فلاں آپ کے متعلق یہ کہتا ہے، بس اتنا سنا اور فوراً لڑنے کو تیار ہو گئے؛ حالانکہ قرآن کہتا ہے: ''فَتَبَیَّنُوْٓا'' جلدی فیصلہ نہ کرو؛ کوئی بھی خبر آئے تو پہلے تحقیق کر لو اور ہو سکتا ہے کہ تحقیق میں بھی تم سے خطا ہو جائے؛ اسی لیے حضرت عمرؓ کے واقعے

سے یہ سبق ملتا ہے کہ امانت اور راز کی باتیں راز ہی رکھی جائیں، لیکن جب موقع گزر جائے تو حقیقت کی وضاحت بھی کر دی جائے، مزید یہ کہ اسی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہم اکثر غلط فہمی کی بنیاد پر لوگوں سے دشمنی مول لیتے ہیں وہ جانتے بھی نہیں، ان کے تصور میں بھی نہیں ہوتا، اسی لیے جناب نبیٔ اکرم ﷺ نے ایسی روایات کے ذریعے ہمیں سمجھایا کہ غصہ کتنا بُرا وصف ہے؛ یہ آدمی کو گناہوں، پریشانیوں اور تکلیفوں میں مبتلا کر دیتا ہے۔

خاموشی کا کمال اور نجات:

آج ہم سب جانتے ہیں کہ انسانوں کی طبیعت میں برداشت بہت کم رہ گئی ہے، کبھی حالات کی سختی کی وجہ سے، کبھی ٹینشن اور کبھی ڈپریشن کے اثر سے آدمی کچھ نہ کچھ کہہ دیتا ہے، اسی لیے شریعتِ اسلامیہ نے غصے کے وجود کی نفی نہیں کی، لیکن غصے پر قابو پانے کا حکم ضرور دیا ہے۔ نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف روایات میں ہمیں یہی تعلیم دی ہے، آپ ﷺ سے پوچھا گیا، تو آپ نے فرمایا: غصہ نہ کرو۔ اللہ پاک نے کتاب اللہ میں مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴿۶۳﴾'' (فرقان: ۶۳) جب ایسے لوگوں سے واسطہ پڑے جن کی عقل وفہم کمزور ہو، اور وہ آپ کے سامنے الٹی سیدھی باتیں کرنے لگیں، تو ان سے الجھنے کے بجائے صرف ''سلام'' کہہ کر گزر جائیے، زیادہ واسطہ رکھنے کی ضرورت نہیں؛ کیونکہ بعض اوقات سامنے والے کی بات اس کی سمجھ کے مطابق ہی ہوتی ہے اور آپ کی بات اس کے فہم سے باہر ہوتی ہے، ایسے موقع پر قرآن ہمیں خاموشی اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ جنابِ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا: ''مَن صَمَتَ نَجا'' (ترمذی: ابواب صفة القیامة، رقم: ۲۵۰۱) جو خاموش رہا، اس نے نجات پائی۔ خاموشی اس لیے بہتر ہے کہ اکثر ہماری باتوں میں کسی کی غیبت شامل ہو جاتی ہے، کبھی چغلی ہو جاتی ہے، کبھی کسی کو نیچا دکھانے کا جذبہ ہوتا ہے، یا کبھی ہم کچھ اور کہتے ہیں اور آگے جا کر اس کو دوسری شکل دے کر پہنچا دیا جاتا ہے، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جھگڑے اور فساد کھڑے ہو جاتے ہیں۔

زبان کی لغزش، زندگی کا پچھتاوا:

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالی عنہ ایک مرتبہ تنہائی میں بیٹھے تھے اور آپؓ نے اپنی زبان پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، اسی دوران حضرت عمر رضی اللہ تعالی عنہ کا گزر ہوا تو انہوں نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: یہی زبان سارے گناہوں اور سارے فتنوں کی جڑ ہے۔ حدیث شریف میں بھی فرمایا گیا: ''اِمْلِكْ عَلَيْكَ لِسَانَكَ'' (ترمذی: ابواب الزھد، باب ماجاء فی حفظ اللسان) اپنی زبان پر قابو رکھو۔ غصے کی سب سے بڑی وجہ بھی یہی زبان بنتی ہے، جب آدمی کسی کو کچھ کہہ دیتا ہے تو دوسرا فوراً بھڑک اٹھتا ہے، اسی لیے غصے کی وجوہات میں سب سے بڑی وجہ ''کبر'' بیان کی گئی ہے یعنی دوسروں کو برداشت نہ کرنا اور فوراً الجھ جانا۔ کبھی انسان کے دل میں یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے یہ کیوں کہا گیا؟ اور بعض اوقات چند ساتھی بھی ورغلاتے ہیں کہ فلاں نے تمہارے ساتھ یہ کیا اور تم چپ چاپ رہے؟ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: جو جتنا زیادہ خاموش رہے گا، اسے اتنا ہی سکون و اطمینان نصیب ہوگا۔ آج ہم سب اپنی گھریلو زندگیوں میں، معاملات میں، لین دین میں اور تعلقات کے اندر دیکھتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں پر جھگڑے اور الجھاؤ پیدا ہوجاتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان دباؤ میں آجاتا ہے، پھر دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے، اور ایسی باتیں زبان سے نکل جاتی ہیں جن پر زندگی بھر افسوس رہتا ہے کہ کاش میں نے یہ جملہ نہ کہا ہوتا، اس موقع پر یہ بات نہ کی ہوتی! لیکن جب بات زبان سے نکل جائے تو واپس نہیں آتی۔

معافی؛ سکون کی کنجی:

کتاب وسنت نے ہمیں بتایا ہے کہ معافی تلافی کر لینا سب سے آسان اور بہتر راستہ ہے۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ جو آدمی معافی مانگ لیتا ہے، وہ سکون اور اطمینان کے ساتھ سوتا ہے اور جو اپنے ساتھی سے معافی نہیں مانگتا، اس کے دماغ میں نئے نئے خیالات اور وسوسے آتے رہتے ہیں، ایک طرف کاروبار پر بھی اس کا اثر پڑتا ہے اور دوسری طرف عبادتوں

میں بھی، نماز کے دوران شیطان دل میں وسوسے ڈالتا ہے کہ فلاں نے یہ کہا، یا اس نے میرے ساتھ یہ سلوک کیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی لوگوں کی ایسی باتیں سنیں، مگر کبھی جواب نہ دیا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ہمیں یہی تعلیم دی ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم میں ارشاد فرمایا: ''وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾'' (فرقان:۷۲) رحمٰن کے بندے جب کسی لغو بات کے پاس سے گزرتے ہیں تو بزرگی اور عزت کے ساتھ گزر جاتے ہیں، الجھتے نہیں ہیں۔ قرآن نے یہ صفت بیان کر کے ہمیں سمجھایا ہے کہ مومن کی پہچان یہی ہے؛ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ ذرا سی بات پر دلوں میں رنجشیں پیدا ہو جاتی ہیں، اور انہی رنجشوں کی وجہ سے بڑے بڑے فتنے جنم لیتے ہیں، اسی لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شریعتِ مطہرہ نے ہمیں صبر کی تعلیم دی ہے، اگر آپ دو چار منٹ صبر کر لیں تو یہی چند منٹ کی خاموشی بڑے سے بڑا مسئلہ ختم کر دیتی ہے۔

ذات کے لیے معافی، دین کے لیے غیرت:

اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت میں بھی ایسے مواقع آئے جب آپ کو غصہ آیا، لیکن آپ کا غصہ ہمیشہ حق اور دین کے معاملے میں ہوتا تھا، صحابۂ کرامؓ فرماتے ہیں کہ جب معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے متعلق ہوتا، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی بدلہ نہیں لیا؛ لیکن جب دین اور شریعت کے خلاف کوئی معاملہ ہوتا تو وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کبھی پیچھے نہیں ہٹے۔ ہاں! آپ دیکھیں گے کہ جہاں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غصے کا ذکر آتا ہے، وہ صرف دین کے معاملے میں ہوتا ہے، اپنی ذات کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمیشہ معاف فرما دیتے۔ (بخاری: کتاب الادب، باب قول النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم: یسروا ولا تعسروا) ایک دیہاتی آیا اور اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گردن میں اپنی کھردری چادر ڈال کر زور سے کھینچا، یہاں تک کہ گردن پر نشان پڑ گئے۔ پھر وہ گستاخی سے کہنے لگا: مجھے وہ مال دیجئے جو اللہ نے آپ کو دیا ہے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناراض نہ ہوئے، بلکہ مسکرا کر اسے دیا اور جتنا دینا تھا اس سے بھی زیادہ عطا فرمایا۔ (بخاری: کتاب فرض الخمس، باب ما کان النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعطی المؤلفة قلوبهم وغیرهم) اسی طرح ایک یہودی نے تورات میں پڑھا

تھا کہ آخری نبی وہ ہوں گے جو سختی برداشت کرنے والے اور انتہا درجے کے بردبار ہوں گے، جتنا ان کے ساتھ بدسلوکی کی جائے گی، اتنے ہی وہ حسنِ سلوک کے ساتھ جواب دیں گے۔ اس نے آزمانے کے لیے بار بار بدتمیزی کی، مگر ہر موقع پر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبر و برداشت سے کام لیا۔ آخر کار اس نے اقرار کیا کہ: یقیناً آپ ہی وہ سچے نبی ہیں جن کا ذکر تورات میں آیا ہے۔ پس! اگر ہم بھی چند لمحے برداشت کر لیں، تو یہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔

صبر کے نتائج اور اللہ کی نعمتیں:

آج کے دور میں ہمارا پورا سماج، بلکہ سارا انسانی معاشرہ، اس بیماری میں مبتلا ہے، اگر ہم اپنے معاشرے کا جائزہ لیں، یا اپنی ذاتی زندگی پر غور کریں تو ہمیں کئی ایسے مواقع ملیں گے جہاں اگر ہم غصے نہ ہوتے تو مسئلہ آسانی سے حل ہو جاتا اور کئی مواقع ایسے بھی ہوں گے جہاں ہم نے صبر سے کام لیا تو بعد میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں اپنی خاص نعمتوں اور انعامات سے نوازا۔ اسی لیے حدیث شریف میں بار بار فرمایا گیا ہے کہ غصے والے انسان کے ساتھ اللہ کی مدد نہیں ہوتی، غصے والا انسان اپنی حالت سے پہچانا جاتا ہے، جیسے ابھی بتلا چکا کہ غصہ میں آدمی کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں، چہرہ بگڑ جاتا ہے، اور وہ ایسی باتیں زبان سے نکال دیتا ہے جو کبھی نہ کہنی چاہیے۔ برسوں کی چھپی ہوئی باتیں، جو اس نے راز رکھیں ہوتی ہیں، غصے کے لمحے میں زبان پر آجاتی ہیں اور پھر وہ بڑے فتنے اور فساد کا سبب بن جاتی ہیں۔

رحمۃ للعالمین کی بعثت کا مقصد:

دوستو اور بزرگو! رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں صبر کی تلقین فرمائی اور معاملات کو صبر اور حکمت کے ساتھ سلجھانے کے اصول بتائے، یہی آپ کی وہ عظیم صفت ہے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ آپ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا گیا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود ارشاد فرمایا: میں اخلاق کو مکمل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔ دوسرے انبیاء کرام علیہم السلام نے بھی اخلاق کی تعلیم دی، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے ان تمام اخلاق کا

تکملہ اور اعلیٰ درجہ عطا کر کے بھیجا ہے۔ اسی لیے جہاں ایک طرف قرآنِ مجید میں اللہ تعالیٰ کے غضب کا ذکر آتا ہے، وہیں دوسری طرف احادیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غصہ ہونے کا ذکر بھی ملتا ہے؛ لیکن غور کیجیے! یہ غصہ کب آیا؟ ہمیشہ وہ مواقع تھے جب دین کے خلاف کوئی عمل سامنے آیا یا اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی گئی۔ قرآن کریم میں بھی جہاں اللہ کے غضب کا ذکر ہے، وہاں ان اعمال کا بیان ہے جو اللہ کو ناراض کرنے والے ہیں۔

غصہ بجھانے کے نبوی طریقے:

اللہ پاک نے ایمان والوں کی صفت کو نہایت عجیب انداز میں بیان فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ'' وہ لوگ جو بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں۔ پھر آگے ارشاد فرمایا: ''وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝'' اور جب وہ غصے میں آتے ہیں، تو اسی وقت معاف کر دیتے ہیں، یہ کتنا عجیب اور ایمان افروز جملہ ہے! کیونکہ عام طور پر تو انسان غصے کے بعد ٹھنڈا ہو کر معاف کرتا ہے یا پھر دوسرا معافی مانگ لیتا ہے، لیکن قرآن بتا رہا ہے کہ ایمان والوں کی شان یہ ہے کہ جس وقت غصے کی کیفیت طاری ہو، اسی وقت درگزر کر دیتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ ختم کرنے کے کئی طریقے بتلائے: آپ نے فرمایا کہ غصہ شیطانی اثر ہے، اور شیطان آگ سے پیدا کیا گیا ہے؛ اس لیے جب غصہ آئے تو وضو کر لو، آگ بجھ جائے گی۔ (ابو داود: کتاب الادب، باب مایقال عند الغضب) اسی طرح دو رکعت نماز پڑھ لو، غصہ ختم ہو جائے گا۔ اگر کھڑے ہو تو بیٹھ جاؤ، اور اگر بیٹھے ہو تو لیٹ جاؤ۔ (ابو داود: کتاب الادب، باب مایقال عند الغضب) کیونکہ جسم کی کیفیت نیچے کرتے ہی غصہ بھی کم ہو جاتا ہے۔

غصہ؛ شیطان کا وار، صبر؛ ایمان کا ہتھیار:

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے دو صحابہ کا آپس میں جھگڑا ہو گیا، یہاں تک کہ ان کی رگیں پھول گئیں اور وہ غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کو براہِ

راست نہیں کہا؛ بلکہ اپنے صحابہ سے فرمایا: میں ایک کلمہ جانتا ہوں، اگر یہ کہہ دیں تو ان کا سارا غصہ ٹھنڈا ہوجائے گا۔ پھر آپ نے ارشاد فرمایا: جب کسی کو غصہ آئے تو کہے: **اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم**. (بخاری: کتاب بدء الخلق، باب صفة ابلیس وجنوده) اس لیے کہ غصہ دراصل شیطان ہی کی طرف سے ہوتا ہے، اور شیطان اللہ کے ذکر اور اللہ کا نام لینے سے دور ہوجاتا ہے۔ اسی لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا: ''وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾'' مومنوں کی صفت یہ ہے کہ عین غصے کے موقع پر وہ معاف کردیتے ہیں۔ صحابۂ کرام، تابعین اور انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات اس پر شاہد ہیں کہ انہوں نے لوگوں کو معاف کیا اور اللہ نے ان کے درجات بلند فرمائے، بے چینی اور پریشانی دور فرمائی۔ آج ہمارے معاشرے میں بھی اگر ڈپریشن، بیماریاں اور تعلقات کا بگاڑ ہے تو اس کی ایک بڑی وجہ یہی بے قابو غصہ ہے؛ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے نفس پر قابو پائیں، صبر کریں اور اللہ کی رضا کے لیے غصے کو پی جائیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو صبر کی دولت عطا فرمائے، اپنے نفس پر قابو پانے کی توفیق عنایت فرمائے، اور غصے کے بارے میں جو سخت وعیدیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں ان سے پوری امت کو محفوظ رکھے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۱)

عقل، نقل اور سند کے اعتبار سے اسلام کی صداقت

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين . قال الله تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد. امابعد!

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ﴿۸۲﴾ (نساء:۸۲)

وقال تعالى:

وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۹۲﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ﴿۱۹۳﴾ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾ (شوریٰ:۱۹۲-۱۹۵)

وقال تعالىٰ:

اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۴﴾ (احقاف:۴)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

نزولِ قرآن کی سندِ آسمانی:

محترم ومکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! میں نے آپ کے سامنے قرآنِ پاک کی جو آیات تلاوت کی ہیں، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ پوری انسانیت کو خطاب فرمارہے

ہیں، یہ پیغام صرف مسلمانوں کے لیے نہیں، بلکہ ساری دنیا کے انسانوں کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن مجید، یہ کتاب اللہ، اللہ ہی کی طرف سے نازل کی گئی ہے، اگر یہ اللہ کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتی تو تم اس میں کئی قسم کے اختلاف پاتے؛ کہیں خارجی تضاد ہوتا اور کہیں اندرونی اختلاف؛ لیکن یہ کتاب ہر لحاظ سے یکساں اور ہم آہنگ ہے۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کے نزول کی سند بیان فرمائی۔ فرمایا: ''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' یہ قرآن رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے۔ ''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ'' اسے حضرت جبرئیل امین لے کر نازل ہوئے، ''عَلٰى قَلْبِكَ'' یہ آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل کیا گیا، ''بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ﴿۱۹۵﴾'' اور یہ خالص اور واضح عربی زبان میں اتارا گیا۔ پھر فرمایا: ''وَاِنَّهٗ لَفِيْ زُبُرِ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۹۶﴾'' پچھلی آسمانی کتابوں اور صحیفوں میں بھی اس قرآن کا ذکر موجود ہے، یہ دو عظیم آیات ہیں جو قرآن کی صداقت اور اس کے الٰہی کلام ہونے کی کھلی گواہی دیتی ہیں۔

قرآن اور حدیث؛ ایک ہی سرچشمہ:

دوستو اور بزرگو! یہ ہر مسلمان کے لیے جاننا ضروری ہے کہ جس خداوندِ قدوس پر وہ ایمان لاتا ہے، اس ایمان کی بنیاد وحیِ الٰہی ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں بلکہ اللہ پاک کی ذاتِ عالی کی طرف سے نازل کردہ کلام ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ قرآنِ کریم کی تفسیر اور وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے رسولِ اکرم ﷺ کو ذریعہ بنایا، آپ ﷺ نے جو کچھ فرمایا، وہ آپ کی اپنی طرف سے نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ﴿۳﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ﴿۴﴾'' (نجم: ۳) وہ (نبی ﷺ) اپنی خواہش سے کچھ نہیں فرماتے، یہ تو وحی ہے جو ان پر نازل کی جاتی ہے۔ اسی لیے جب آپ کے ارشادات اور ملفوظات کو صحابۂ کرامؓ لکھتے تھے تو وہ بھی وحی کے زمرے میں آتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ ہر بات کو لکھ لیا کرتے تھے، کچھ لوگوں نے کہا کہ آپ ﷺ کبھی نجی گفتگو بھی کرتے ہیں، کبھی دنیاوی معاملات کا ذکر

بھی آتا ہے، اس لیے سب کچھ نہ لکھا جائے، اس پر انہوں نے لکھنا چھوڑ دیا، جب نبی اکرم ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے پوچھا: تم نے لکھنا کیوں بند کر دیا؟ انہوں نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگوں نے کہا ہے کہ آپ کبھی نجی گفتگو بھی کرتے ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا: نہیں! تم لکھتے رہو، میری ہر بات اللہ کی طرف سے ہے۔ (جامع بیان العلم: ۱/۷۶) چاہے وہ خاندانی معاملات ہوں، سماجی باتیں ہوں، عقائد کا ذکر ہو یا احکامِ شریعت کی وضاحت، یہ سب اللہ تعالیٰ کے حکم اور وحی کے تحت ہے، میری ذاتی خواہش یا رائے سے نہیں۔

شرک کرنے والوں کے لیے کھلا سوال:

دوستو اور بزرگو! میں آپ کے سامنے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ایک مسلمان کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی چیز یہ ہے کہ وہ اللہ پاک کی ذاتِ عالی پر کامل ایمان رکھے، کتاب اللہ نے اس ایمان کی دلیلیں، مثالیں اور بے شمار واقعات ذکر فرمائے ہیں، انہی کی روشنی میں تین بنیادی عقائد میں سے پہلا عقیدہ یعنی عقیدۂ توحید بالکل صاف اور نکھر کر سامنے آتا ہے، قرآن کریم میں سینکڑوں مثالیں موجود ہیں، جیسے وہ آیت جو میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''قُلْ اَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِيْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۭ '' (اے نبی ﷺ) ان سے کہہ دیجیے: کیا تم نے غور کیا ان چیزوں پر جنہیں تم اللہ کے سوا پکارتے ہو؟ مجھے دکھاؤ تو سہی کہ انہوں نے زمین میں کیا پیدا کیا ہے؟ یا آسمانوں کی تخلیق میں ان کا کوئی حصہ ہے؟ جو لوگ کفر اور شرک کرتے ہیں اور اللہ کے علاوہ دوسروں کو نفع و نقصان یا عزت و ذلت کا مالک سمجھتے ہیں، ان سے اللہ تعالیٰ نے یہ چیلنج کیا: ''اِيْتُوْنِيْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝'' (احقاف: ۴) میرے پاس کوئی ایسی کتاب لے آؤ جو اس قرآن سے پہلے کی ہو، یا پھر علم کی بنیاد پر کوئی ٹھوس دلیل پیش کرو، اگر تم واقعی سچے ہو۔ یہ اعلان توحید کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اللہ ہی خالق و مالک ہے، اس کے سوا نہ کوئی رب ہے، نہ کارساز، نہ حاجت روا اور نہ مشکل کشا۔

علم کی تبدیلی اور وحی کا استحکام:

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ قرآنِ کریم میں فرماتے ہیں: ''اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ'' کیا یہ لوگ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے؟ پھر آگے فرمایا: ''وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا'' اگر یہ قرآن اللہ پاک کے علاوہ کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔ یہ قرآن نے اپنے سچا اور برحق ہونے کی ایسی دلیل پیش کی ہے جس کا آج تک کوئی جواب نہیں دے سکا، قرآن کی کسی آیت اور سورہ میں آپس میں تضاد نہیں۔ ایک آیت جو مضمون بیان کرتی ہے، دوسری آیت اس کی تائید کرتی ہے، کہیں تفصیل سے بات بیان کی گئی ہے اور کہیں اختصار سے، لیکن معانی ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں، یہی خدا کے کلام اور انسانوں کے کلام کا سب سے بنیادی فرق ہے، انسان کا علم وقت کے ساتھ بدلتا رہتا ہے، بچپن میں جو خیالات ہوتے ہیں، بڑے ہوکر انہیں رد کردیتا ہے، پھر علم وتجربہ بڑھتا ہے تو پرانی باتیں غلط ثابت ہوتی ہیں اور نئی باتیں سچی ماننی پڑتی ہیں؛ لیکن اللہ کا کلام ایسا ہے کہ آغاز سے لے کر انجام تک اس میں کہیں کوئی تضاد یا اختلاف نہیں، یہی قرآن کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اس کے برعکس جو کتابیں اللہ کی طرف سے نہیں، بلکہ انسانوں کی تصنیف ہیں، ان کے ماننے والے بھی خود یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ وہ آسمانی کتابیں نہیں ہیں، جیسے ہمارے ملک کے ہندو بھائیوں کی کتابیں: وید، اپنیشد، پران، مہابھارت اور رامائن، سب میں صاف لکھا ہے کہ یہ فلاں فلاں شخص نے فلاں دور میں لکھی، حتیٰ کہ گیتا جو مہابھارت کا حصہ ہے، اس کی بھی تصنیف انسانوں کی طرف منسوب کی گئی ہے؛ لیکن قرآن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' یہ ربّ العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور فرمایا: ''وَاِنَّہٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ ﴿۱۹۶﴾'' اور یہ پچھلے صحیفوں میں بھی لکھا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں یہ جملہ بھی آیا: ''وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی ۚ'' کوئی جان کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ اصول بھی پچھلے

صحیفوں میں لکھا گیا تھا۔

خیر! گفتگو یہ ہے کہ جو کتاب انسانوں کی لکھی ہوتی ہے، وہ کبھی کامل اور مکمل نہیں ہوسکتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا علم ناقص اور ادھورا ہے، انسان ابتدا میں چھوٹا ہوتا ہے، اس وقت اس کا علم محدود ہوتا ہے، پھر وقت کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ جیسے جیسے تجربہ اور مشاہدہ ہوتا ہے، علم میں اضافہ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی وہ مکمل نہیں ہوتا۔ سائنس کی دنیا کو ہی دیکھ لیجیے۔ ایک سائنسدان کسی چیز پر ریسرچ کرتا ہے، اور ایک نظریہ پیش کرتا ہے، کچھ مدت کے بعد دوسرا ماہر اسی شعبے میں آکر کہتا ہے کہ پہلی بات درست نہیں تھی، اب حقیقت یہ ہے، وہ پہلے نظریے سے رجوع کرلیتا ہے اور نیا نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ سب انسانی عقل کی کمی اور اس کے محدود علم کی دلیل ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ایک آیت میں واضح فرمایا: ''وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ﴿۸۵﴾'' (اسراء:۸۵) تمہیں جو علم دیا گیا ہے وہ بہت ہی تھوڑا ہے۔ انسان کا علم ہمیشہ ناقص اور محدود رہے گا، جب کہ مکمل اور کامل علم صرف اور صرف اللہ ربّ العزت ہی کے پاس ہے۔

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِم - قرآن کا اعلانِ تحریف:

دوستو اور بزرگو! قرآن کریم نے اپنی حقانیت کی ایک اور مضبوط دلیل پیش کی ہے، اور وہ یہ ہے کہ دوسری آسمانی کتابوں میں اختلاف اور تضاد موجود ہے۔ اختلاف کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم یہ ہے کہ کتاب کے مضامین آپس میں ایک دوسرے کے مخالف ہوں، مثال کے طور پر انجیل اور بائبل کو دیکھیے، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی، لیکن بعد میں لوگوں نے اپنی طرف سے اس میں تبدیلیاں کردیں۔ عیسائیت کی تاریخ بڑی طویل ہے، کہ کس طرح مختلف مذہبی کتابوں کو کبھی شامل کیا گیا اور پھر نکال دیا گیا، کبھی کسی نے ایک حصہ شامل کیا، پھر دوسرے نے اسے خارج کردیا۔ چاہے وہ عہد نامۂ قدیم ہو یا عہد نامۂ جدید، دونوں میں تبدیلی کو خود یہودی اور عیسائی علماء نے تسلیم کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ'' (مائدہ:۱۳) انہوں نے کلامِ الٰہی کو اس کے اصل

مقام سے ہٹا دیا اور اس میں سے ایک بڑے حصے کو بھلا دیا۔

اظہارِ حق اور بائبل سے قرآن تک:

دوستو اور بزرگو! اس بات کو ہمارے بزرگوں نے بھی بڑی وضاحت سے بیان کیا ہے، حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ ایک جلیل القدر عالم گزرے ہیں۔ انگریز جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو انہوں نے ایک بڑا پادری (فنڈر) اسلام کے مقابلے پر بھیجا جو عیسائیت کی تبلیغ کرتا اور مسلمانوں کو چیلنج دیا کرتا تھا۔ حضرت مولانا نے اس کا بھرپور جواب دیا، پھر وہ پادری ترکی گیا، اور وہاں عثمانی سلطنت کے علماء سے مباحثہ کیا، تو مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ بھی ہجرت کر کے وہاں پہنچے اور دوبارہ اس سے مناظرہ کا اعلان کیا؛ لیکن وہ بھاگ گیا۔ مولانا نے ایک عظیم کتاب لکھی ''اظہارِ حق''، جس میں دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ تورات اور انجیل میں تبدیلیاں کی گئی ہیں۔ بعد میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس پر مزید تحقیق کر کے ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے تین جلدوں پر مشتمل شرح لکھی، جس میں انہوں نے عیسائی علماء کے اپنے اعترافات نقل کیے کہ واقعی ہماری کتابوں میں تحریف ہوئی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کا اعلان قرآن صدیوں پہلے کر چکا ہے: ''یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ'' وہ کلامِ الٰہی کو اس کے اصل مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔

انسانی کلام کی کمزور بنیاد:

تو مجھے یہ بتلانا ہے کہ ایک طرف اُن کی کتابیں بدل دی گئیں، اور دوسری طرف وہ کتابیں خود ہی یہ اعلان کرتی ہیں کہ ہم آسمانی نہیں ہیں، تو پھر اُن کی بنیاد کیا ہے؟ انسانی کلام! اور انسان کا کلام ایسا ہوتا ہے کہ خوشی کے موقع پر کچھ اور کہتا ہے اور غم کے موقع پر کچھ اور۔ کبھی ایک بات کرتا ہے اور کچھ ہی دنوں بعد اسی سے پلٹ جاتا ہے، چاہے وہ بات درست ہی کیوں نہ ہو، اُس کی غرض کبھی اپنا فائدہ ہوتا ہے، کبھی نقصان سے بچنا ہوتا ہے۔ جب محبت ہوتی ہے تو بات کو دور تک لے جاتا ہے، اور جب دشمنی ہوتی ہے تو نظریات ہی بدل دیتا ہے۔

سیکولرازم کا کھوکھلا دعویٰ:

دن رات آپ خود بھی دنیا میں دیکھتے ہیں، دنیا دعویٰ کرتی ہے سیکولرازم کا، اور گزشتہ ڈیڑھ سو-دوسو برسوں سے اس کا ہوّا کھڑا کیا گیا ہے، لیکن حقیقت کیا ہے؟ جو کچھ ہم اور آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ سیکولرازم ناکام ہو رہا ہے، نام تو ہے سیکولرازم، مگر حقیقت میں یہ ہے کیا؟ انسانوں کی ایک بڑی آبادی پر چند لوگوں کی حکومت! یہی تو کمیونزم ہے اور یہی فرق ہے انسانی کلام میں کہ اُس کے اندر وقت اور حالات کے ساتھ تضاد اور تبدیلی پائی جاتی ہے۔

انجیل نویس اور حضرت عیسیٰؑ کی عدم ملاقات:

خیر! میں بائبل کی مثال دے رہا تھا، انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے بارے میں ذکر ملتا ہے، لیکن ایک جگہ آپ کا نام کچھ اور ہے، دوسری جگہ کچھ اور، اور تیسری جگہ پھر مختلف انداز سے لکھا ہوا ہے یعنی یہ سب بیانات ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ دوسری سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو چار مشہور انجیلیں دنیا میں معروف ہیں، اُن میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اُس کے لکھنے والے کی حضرت عیسیٰؑ سے ملاقات ہوئی ہو۔ اس کے مقابلے میں قرآن کریم کی عظمت دیکھئے کہ وہ براہِ راست حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے خود اس میں چیلنج دیا: ''وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ﴿۴۴﴾'' (حاقۃ:۴۴) رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اختیار نہیں کہ قرآنِ کریم میں اپنی طرف سے کوئی بات شامل کرسکیں اور اگر بالفرض ایسا کرنے کی کوشش بھی کی جاتی تو اللہ پاک نے سخت وعید سنائی، اس سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس نے کبھی بھی اپنی طرف سے کسی بات کو قرآن میں شامل نہیں کیا۔

مذہب کے سچا ہونے کی تین بنیادیں:

کسی بھی مذہب کے سچا ہونے اور اپنے ماننے والوں کے لیے سہولت پیدا کرنے کے لیے تین بنیادیں ضروری ہیں: پہلی انسانی عقل، دوسری نقل (یعنی الہامی کلام یا روایت)، اور

تیسری صحیح سند کا ہونا۔ قرآنِ کریم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان تینوں بنیادوں کے اعتبار سے بالکل واضح اور سب کے سامنے ظاہر کر دیا ہے، جیسا کہ قرآنِ کریم کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے یہ قرآن آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر حضرت جبرئیلؑ کے واسطے سے نازل کیا: ''فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ'' (دخان: ۳) برکت والی رات میں۔ قرآن مجید میں اوقات کا بھی ذکر ہے، اور حضور ﷺ کے بارے میں بار بار تذکرہ ملتا ہے۔ پھر قرآن کریم نے جو دلائل دیے، وہ داخلی دلائل ہیں، اور اُن میں کوئی تضاد یا ٹکراؤ نہیں۔ داخلی دلیل سے مراد یہ ہے کہ قرآن کے ایک حصے کی بات قرآن کے دوسرے حصے سے ٹکراتی نہ ہو۔ ہاں! کبھی کسی کو اشکال ضرور محسوس ہوسکتا ہے، مگر حقیقت میں اس میں کوئی تناقض نہیں پایا جاتا۔

''دَحو'' کا مفہوم اور حقیقت:

قرآنِ کریم میں ایک جگہ فرمایا گیا کہ ہم نے پہلے زمین بنائی، اور دوسری آیت میں فرمایا: ''وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ۝'' (نازعات: ۳۰) ہم نے آسمان بنایا، پھر اس کے بعد زمین کو دَحو کیا۔ اب دَحو کا مطلب یہ ہے کہ زمین تو پہلے ہی پیدا کی گئی تھی لیکن اُس پر ابھی کچھ موجود نہیں تھا۔ پھر اللہ پاک نے زمین کے اندر اور اس کے اوپر درخت، سبزہ اور وہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں جو پھیلی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اسی کو ''دَحو'' کہا جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس ایک شخص آیا اور کہا کہ مجھے قرآن کی بعض آیات میں اشکال ہے، اُس کا اشکال یہی تھا کہ ایک آیت کہتی ہے کہ اللہ نے پہلے آسمان بنایا اور دوسری آیت میں ہے کہ پہلے زمین بنائی گئی۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا کہ پہلی آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ پاک زمین کو وجود میں پہلے لایا، پھر آسمان کو بنایا، اور بعد میں زمین کا ''دَحو'' یعنی اُس پر درختوں اور دوسری چیزوں کو پیدا فرمایا۔ اس لیے دونوں آیات میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ زمین کے اندر اور اوپر جو کچھ ہے وہ تدریجی طور پر وجود میں آیا۔ پوری کائنات (Universal system) اسی ترتیب کی گواہی دے رہی ہے۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ

پہلے زمین بنی، پھر آسمان، اور بعد میں زمین کو دَحو کیا گیا۔ یہ واقعہ اس بات کی روشن دلیل ہے کہ قرآن کریم اللہ تعالیٰ کی ایسی کتاب ہے جس کے مضامین میں کوئی تضاد نہیں۔

شرک پر آسمان وزمین کا احتجاج:

دوستو اور بزرگو! میں یہ مضمون اس لیے ذکر کر رہا ہوں کہ آنے والے دنوں میں جب ہماری اسکول (School) کے بچوں کو مذہب کی کتابیں، مثلاً گیتا وغیرہ پڑھائی جائیں گی، تو ہمارے مسلم طلبہ یہ سمجھ سکیں کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں اصل فرق کیا ہے، سب سے پہلی اور سب سے بڑی چیز توحید ہے۔ یہودیت اور عیسائیت میں بھی توحید تھی، لیکن افسوس! بعد میں کسی نے حضرت عزیرؑ کو اللہ کا بیٹا بنا دیا، اور کسی نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا بنا دیا، اس کے مقابلے میں قرآن کریم نے انتہائی شدت کے ساتھ ان باطل عقائد کی تردید کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۂ مریم میں فرمایا: ''تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ۝ اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ۝'' (مریم:۹۰) قریب ہے کہ اس بات پر آسمان پھٹ پڑیں، زمین شق ہو جائے اور پہاڑ ٹوٹ کر گر پڑیں کہ لوگوں نے خدائے رحمن کے لیے اولاد ہونے کا دعویٰ کیا۔ دوستو! سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ کے لیے بیٹا تجویز کیا جاتا ہے تو آسمان وزمین لرز جاتے ہیں، یہ کتنی بڑی گستاخی ہے جسے قرآن نے بار بار رد کیا ہے؛ لہٰذا ہمارے طلبہ کو یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہیے کہ دوسری کتابیں خود اپنے بارے میں یہ تسلیم کرتی ہیں کہ وہ آسمانی کتابیں نہیں ہیں، بلکہ انسانوں کی لکھی ہوئی ہیں اور انسان چونکہ جذبات اور کمزوریوں والا ہے، اس کے کلام میں کمی، تضاد اور اختلاف پیدا ہو جاتا ہے؛ لیکن اللہ کا کلام یعنی قرآن ایسا ہے جس میں کسی قسم کا کوئی اختلاف اور تضاد نہیں۔

قرآن کا اعجاز؛ تاریخ کی سچائی کو محفوظ رکھنا:

دوستو اور بزرگو! اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے میں آپ کو ایک اور مثال دیتا ہوں، قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ دونوں کے قصے بیان کیے گئے ہیں، دونوں کے مقابلے

میں ایک بادشاہ تھا؛ لیکن فرق یہ ہے کہ قرآن کریم حضرت موسیٰؑ کے زمانے کے بادشاہ کو ''فرعون'' کہتا ہے، جب کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے کے بادشاہ کے لیے لفظ ''ملک'' استعمال کرتا ہے۔ ہمارے حفاظ وقراء حضرات جانتے ہیں کہ بار بار تلاوت میں ''فرعون'' کا ذکر آتا ہے۔ یہ لقب خاص طور پر موسیٰؑ کے زمانے کے بادشاہ کے لیے ہے؛ لیکن جب یوسفؑ کا قصہ بیان ہوتا ہے تو وہاں قرآن لفظ ''ملک'' استعمال کرتا ہے، یعنی بادشاہ۔ اس کے مقابلے میں بائبل میں دونوں جگہ یعنی حضرت یوسفؑ اور حضرت موسیٰؑ کے بادشاہ کے لیے یکساں لفظ ''فرعون'' لکھا گیا ہے، یہ ایک انسانی غلطی اور تاریخی تحریف ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کے زمانے میں جو بادشاہ تھا وہ مصر کا مقامی حکمران نہیں تھا بلکہ شام کے چرواہوں کے قبیلے سے تعلق رکھنے والا ایک عرب تھا۔ اس لیے قرآن نے اسے ''ملک'' کہا، کیونکہ عرب بادشاہوں کے لیے یہی لقب استعمال ہوتا تھا۔ دوسری طرف حضرت موسیٰؑ کے وقت کا بادشاہ واقعی مصر کا مقامی حکمراں تھا، اسی لیے قرآن نے اسے ''فرعون'' کہا۔ یعنی قرآن نے تاریخی حقیقت کو بالکل درست انداز میں بیان کیا، جب کہ بائبل کے لکھنے والوں نے دونوں کو ''فرعون'' کہہ کر ایک واضح غلطی کر دی۔ یہ قرآن کی صداقت اور اس کے اعجاز کی ایک چھوٹی سی مثال ہے۔

اسلام میں رسالت اور غیر مسلموں کا اوتار کا تصور:

دوستو اور بزرگو! جہاں تک توحید، رسالت اور آخرت کے مسئلے کا تعلق ہے، ہمارے دین میں رسول کو اوتار نہیں کہا جاتا، ہمارے غیر مسلم بھائیوں کے ہاں رسول کا جو تصور ہے وہ یہ ہے کہ جب زمین پر ظلم وزیادتی بڑھ جائے، لوگ بگڑ جائیں اور برائیاں پھیل جائیں تو بھگوان خود انسانی روپ اختیار کر کے اوتار کی صورت میں دنیا میں آتے ہیں، اسی وجہ سے وہ جنہیں بھگوان یا اوتار کہتے ہیں، ان کے نزدیک وہ آسمانی شخصیت ہے؛ لیکن اسلام کا عقیدہ اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہمارے نزدیک رسول انسانوں میں سے ہی ہوتے ہیں۔ قرآن کریم میں اللہ پاک نے صاف فرمایا: ''وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ ۖ'' (انبیاء:۳۴) ہم نے آپ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی کسی انسان کو ہمیشگی نہیں دی۔ یہاں قرآن نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے لفظ ''بشر'' ذکر کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی کوئی ماوراء الفطرت یا خدائی مخلوق نہیں ہوتے بلکہ وہ بھی انسانوں ہی میں سے ہوتے ہیں، تاکہ ان کی زندگی ہمارے لیے عملی نمونہ بن سکے، ہم ان کی اتباع کرسکیں اور ان کے ہر عمل کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنا سکیں۔

قدیم انسانوں کا اعتراض اور آج کی سائنس کا جواب:

دوستو اور بزرگو! دوسرے نمبر پر رسالت کا مسئلہ ہے، یعنی وحی کا نزول۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے نیک اور صالح بندوں پر وحی نازل فرماتے ہیں، پہلے زمانے کے انسانوں کو یہ اعتراض تھا کہ بھلا خدا اور بندے کے درمیان کس طرح گفتگو ہوسکتی ہے؟ کوئی تار ہے، کوئی وائرلیس ہے جو یہ پیغام پہنچائے؟ لیکن آج کی سائنس نے انہی سوالات کے جوابات خود فراہم کردیے ہیں، کتنی باریک اور نازک چیزیں آج انسان کی آنکھوں اور آلات کے ذریعے نظر آنے لگی ہیں! جانوروں کو دیکھ لیجیے، کیسے مہذب اور تربیت یافتہ بنا لیے گئے ہیں، ایئرپورٹ پر کتے کرنسی کو سونگھ کر فوراً بتا دیتے ہیں کہ فلاں شخص کے پاس مقررہ مقدار سے زیادہ کرنسی ہے، اور اسی جگہ جا کر اشارہ کرتے ہیں، یہ سب اللہ کی بنائی ہوئی صلاحیتیں ہیں جنہیں انسان اپنی عقل کے ذریعے استعمال کرتا ہے۔ اسی طرح مکھی کی آواز! وہ آواز ہمیں اور آپ کو سنائی نہیں دیتی، لیکن سائنس نے ایسے آلات بنا لیے ہیں کہ ایک کلومیٹر دور اگر مکھی بھنبھنا رہی ہو تو اس کی آواز بھی قید کر کے سنی جاسکتی ہے۔ یہ سب نہایت لطیف اور باریک چیزیں ہیں، اور یہ سب حضرت انسان کی محدود عقل اور تجربے کی بدولت ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان خود کمزور ہے: جب پیدا ہوتا ہے تو بھی ناتواں، بڑھاپے میں بھی ناتواں، صرف بیس سے پچاس سال تک کی درمیانی عمر میں کچھ طاقتور اور جوان ہوتا ہے، ان تیس سالوں کے علاوہ انسان ہر حال میں عاجز اور محتاج ہے۔ ایسا انسان کہاں تک رسائی حاصل کرسکتا ہے؟ کتنی چیزیں ہیں جو اسے آج بھی معلوم نہیں ہیں، یہی انسانی حقیقت ہے۔

قرآن کی گفتگو؛ انسان نہیں، خالق کائنات کی آواز:

تو عقل کے اعتبار سے بھی قرآن کریم نے انسان کو چیلنج کیا ہے۔ جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ بیان فرمایا وہ سب انسانی ضرورت کے مطابق ہے، قرآن کریم جس انداز میں گفتگو کرتا ہے، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کامل بادشاہت اور مالکیت کو واضح فرماتے ہیں، جب دوسری کتابیں پڑھتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے ہم کلام ہے، لیکن جب قرآن پڑھا جاتا ہے تو دل گواہی دیتا ہے کہ کوئی عظیم و برتر ذات کلام فرما رہی ہے، یہ میرا اور آپ کا محض تصور نہیں ہے، بلکہ ان لوگوں کا مشاہدہ ہے جو اسلام میں داخل ہوئے۔ انہوں نے مختلف مذاہب کی کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد جب قرآن پڑھا تو فوراً یہ احساس ہوا کہ اس کی آواز آسمان کی بلندیوں سے آرہی ہے۔ ایک مشہور مستشرق نے کہا: جب دوسری کتابیں پڑھتا ہوں تو لگتا ہے انسان انسان سے بات کر رہا ہے، لیکن جب قرآن پڑھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت بلندی سے کوئی غیر معمولی ذات گفتگو فرما رہی ہے، اور اس کا نشانہ صرف انسان نہیں بلکہ انسان، جنات اور پوری کائنات ہے۔ آپ سورۃ الرحمٰن میں دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ۚ'' اگر اے انسانو اور جنو! تم آسمان وزمین کی سرحدوں سے نکل جانا چاہو تو بغیر اللہ کے حکم اور قوت کے ہرگز نہیں نکل سکتے۔ یہ ایک کھلا چیلنج ہے کہ آسمان ہم نے بنایا، زمین ہم نے بچھائی، پہاڑ ہم نے گاڑے۔ یہی وہ اسلوب ہے جو صرف اللہ کے کلام میں ہے۔ اتنی قوت، اتنی طاقت، اور ساتھ ساتھ اپنی رحمت اور شفقت کا امتزاج یہ سب صرف قرآن میں ہے۔ دنیا کی باقی کتابیں اس شان سے خالی ہیں، ان میں وہ تاثیر نہیں جو قرآن میں ہے۔

اسلامی علوم میں سند کی غیر معمولی اہمیت:

تیسری بات جو میں آپ کے سامنے ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ ہے سند کا مسئلہ۔ قرآن کریم نے اپنی سند بیان کرتے ہوئے فرمایا: ''وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ'' یہ کتاب رب العالمین کی

طرف سے نازل کردہ ہے۔ دنیا میں اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرے کہ فلاں کتاب اتنے ہزار سال پرانی ہے تو لوگ تحقیق کے بغیر اس کو ماننے پر تیار نہیں ہوتے، کیونکہ آج کا دور ریسرچ اور تحقیق کا ہے، ہر بات کی چھان بین کی جاتی ہے۔ قرآن نے بھی اسی پہلو سے انسانوں کو چیلنج دیا کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں بلکہ رب العالمین کا اتارا ہوا ہے، یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے ہی میں نازل ہو کر مکمل ہو گئی تھی، پھر صحابۂ کرامؓ نے اس کو لکھ کر محفوظ کر دیا۔ یہی قرآن آج تک ایک حرف کے فرق کے بغیر امت کے پاس محفوظ ہے۔ اسی طرح احادیث مبارکہ پر نظر ڈالیے، یہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات ہیں، ہمارے محدثین نے ان کی حفاظت کے لئے ایسی قربانیاں دیں اور اتنی باریک بینی کے ساتھ محنتیں کیں کہ تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی، ایک ایک روایت کی تحقیق کی گئی کہ یہ کس نے کس سے بیان کی؟ راوی کی زندگی کیسی تھی؟ وہ قابل اعتماد ہے یا نہیں؟ اگر معمولی سا بھی شبہ ہوا تو اس روایت کو ترک کر دیا گیا۔ مشہور واقعہ ہے کہ امام بخاری رحمہ اللہ طویل سفر کر کے ایک محدث کے پاس حدیث لینے پہنچے، دیکھا کہ وہ اپنے جانور کو دامن پھیلا کر بلا رہا ہے جیسے کھانے کے لئے بلا رہے ہوں، حالانکہ دامن میں کچھ نہ تھا۔ امام بخاری نے کہا: یہ شخص جانور کو دھوکہ دے رہا ہے، ممکن ہے کہ حدیث میں بھی دھوکہ کرے، چنانچہ آپ نے اس سے حدیث لینا چھوڑ دیا اور واپس پلٹ گئے۔ یہ ہے وہ معیار جس کے بعد صحیح احادیث ہم تک پہنچیں۔ امام بخاریؒ، امام مسلمؒ، امام ترمذیؒ، امام دارمیؒ اور دیگر بڑے بڑے محدثین نے اپنی عمریں اسی کام کے لئے وقف کیں اور دین کی یہ امانت ہم تک پہنچائی۔

حدیث کے راستے کا درخت اور علم کی امانت:

امام ترمذیؒ کو اللہ تعالیٰ نے کمال کا حافظہ عطا فرمایا تھا، اپنی آخری زندگی میں وہ نابینا ہو چکے تھے، ایک سفر کے دوران اونٹ پر سوار تھے کہ اچانک اپنا سر جھکا لیا، ساتھیوں نے حیران ہو کر عرض کیا: حضرت! یہاں تو کوئی درخت یا شاخ نہیں ہے کہ جس سے سر ٹکرا جائے، پھر آپ نے سر کیوں جھکایا؟ امام ترمذیؒ نے فرمایا: ایک زمانہ تھا جب میں اسی راستے سے حدیث لینے

جایا کرتا تھا۔ اس جگہ ایک درخت تھا، جس کے نیچے سے گزرتے وقت سر جھکانا پڑتا تھا، ورنہ شاخ لگ جاتی تھی، اگر یہاں کبھی درخت موجود نہ رہا ہو تو مجھے اپنے حافظے پر شک ہے، اور میں اپنی تمام روایتیں واپس کرنے کو تیار ہوں۔ پھر جب تحقیق کی گئی تو معلوم ہوا کہ واقعی یہاں ایک درخت تھا، لیکن گاؤں کے لوگوں نے اسے کاٹ دیا تھا کیونکہ وہ آنے جانے والوں کے لئے رکاوٹ بن گیا تھا۔

ہدایت کا زندہ اور ابدی سرچشمہ:

یہ وہ عظیم محدثین ہیں جنہوں نے اپنی زندگیاں محنت اور مشقت میں گزاریں۔ آج بھی اگر آپ دنیا کے کسی بھی عالمِ دین یا مدرسے سے فارغ ہونے والے طالب علم سے پوچھیں کہ آپ کی جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک کی سند کیا ہے؟ تو وہ پوری سند بیان کر دے گا، ہم جب بخاری شریف اپنے اساتذہ سے پڑھتے ہیں تو وہ ہمیں اپنی سند بتاتے ہیں، اور وہ سند پھر اُن کے اساتذہ تک جا پہنچتی ہے، یہاں تک کہ براہِ راست نبیٔ اکرم ﷺ تک یہ سلسلہ پہنچ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے پاس علمِ حدیث کی مکمل اور معتبر سند موجود ہے۔ اس کے برعکس عیسائیت کو دیکھ لیجیے، حضرت عیسیٰ ؑ کے ماننے والے چار اشخاص کے نام پر انجیلیں ہیں: انجیل متی، انجیل مرقس، انجیل لوقا اور انجیل یوحنا؛ لیکن ان میں سے کسی انجیل میں براہِ راست حضرت عیسیٰ ؑ کی سند نہیں ملتی۔ ہمارے قرآن کی شان یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ فرمایا: ''وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ۝'' ''لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ'' باطل نہ اس کے آگے سے داخل ہو سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ جب بھی باطل اس سے ٹکرائے گا، پسپا ہو کر واپس جائے گا۔ قرآن کو کبھی بھی باطل شکست نہیں دے سکتا۔

قرآن وحدیث؛ زندگی کا سہارا و نجات کا ذریعہ:

دوستو اور بزرگو! ہمیں ایسا پیارا دین اور اتنی حسین تعلیمات عطا کی گئی ہیں، اتنی مضبوط اور ٹھوس حقیقتیں ہمارے حوالے کی گئی ہیں، کہ جن پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرنا لازم ہے،

اس لیے ہمیں چاہئے کہ قرآن اور حدیث کو مضبوطی سے تھامیں اور اپنی پوری زندگی کی بنیاد انہی پر رکھیں۔ سوچیے! جو انسان خود بیت الخلا کے معاملات میں دوسروں کا محتاج ہو، وہ بھلا انسانیت کی رہنمائی کیسے کرسکتا ہے؟ اصل رہنمائی اور ہدایت صرف اللہ ہی کی ذاتِ عالی کی طرف سے ہے، وہی ہے جس نے انسان کو پیدا فرمایا اور اسے سب نعمتیں عطا کیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو کہی اور سنی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، اور ہمارے نوجوان جو اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہے ہیں ان کے ایمان وعقیدہ کی حفاظت فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۲۲)

تفسیر سورۂ نحل، سورۂ کہف اور حالت حاضرہ

الحمد لله رب العالمين و الصلاه و السلام على سيد المرسلين و على اله و اصحابه اجمعين. اما بعد! قال الله تبارك و تعالى في الكلام المجيد و الفرقان الحميد، اما بعد!

اعوذ بالله من الشيطان الرجيم بسم الله الرحمن الرحيم

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْيَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَزِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾ (کہف:۱۳)

وقال تعالى:

اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَالَتْ اَوْدِيَةٌۢ بِقَدَرِهَا فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ ﴿۱۷﴾ (رعد:۱۷)

وقال تعالى:

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ وَيُبَشِّرُ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا كَبِيْرًا ﴿۹﴾ (اسراء:۹)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين

سورۃ الرعد کا سبق آموز پیغام:

محترم ومکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج کی تراویح میں آپ حضرات کے سامنے جو آیاتِ کریمہ تلاوت کی جائیں گی، ان سے پہلے کل کی تراویح میں جو آیات پڑھی گئیں ان کا تسلسل بھی ہمارے سامنے ہے۔ آج کی تراویح میں پندرہواں پارہ مکمل ہو رہا ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے سورۂ کہف میں، جو اس سورت کا بنیادی موضوع اور اس کا اصل قصہ ہے، ویسے چار اہم واقعات کا ذکر فرمایا ہے۔ ان میں سے جس واقعے کو سب سے نمایاں اور بنیادی حیثیت حاصل ہے، اسی کے نام پر اس سورت کا نام "کہف" رکھا گیا۔ اس سے پہلے والی سورت، سورۃ الرعد میں، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایمان اور کفر، حق اور باطل کے درمیان فرق کو واضح فرمایا۔ اس فرق کو بیان کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے نہایت پر اثر مثالیں بیان فرمائیں، تاکہ اہلِ ایمان کے دل مضبوط ہوں اور اہلِ کفر پر حق کی وضاحت ہو جائے۔

اصحابِ کہف اور حق و باطل کا پیغام:

دوستو اور بزرگو! اصحابِ کہف کا قصہ دراصل حق اور باطل کے مقابلے ہی کا قصہ ہے، اسی لیے قرآن کریم نے ہمیں یہ بتلایا ہے: "اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ" اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ قرآن ایسا راستہ دکھاتا ہے جو بالکل سیدھا اور درست ہے، قرآن کریم نے جو باتیں ذکر فرمائیں، جو مثالیں بیان کیں، اور جو واقعات سنائے، یہ سب ہمیں اسی راہِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ روئے زمین پر سب سے بہتر، سب سے مضبوط اور سب سے درست طریقۂ زندگی وہی ہے جس کی طرف یہ قرآن کریم ہمیں لے کر جاتا ہے۔

باطل کی جھاگ، حق کی پائیداری:

سب سے پہلے قرآن کریم نے مثال ذکر فرمائی: "اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً" اللہ پاک نے وہ مثالیں ہمارے سامنے رکھی ہیں جو آنکھوں سے دیکھی جا سکتی ہیں۔ قرآن نے فلسفیانہ یا محض عقلی دلائل بیان نہیں فرمائے، بلکہ وہ مثالیں دی ہیں جنہیں ایک امیر شہر کا رہنے والا بھی

سمجھ سکے اور ایک غریب دیہات یا جنگل میں رہنے والا بھی سمجھ سکے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' بارش کا پانی ہم سب دیکھتے ہیں کہ آسمان سے برستا ہے۔ ''اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً'' پھر وہ پانی وادیوں، کھڈوں اور تالابوں میں جمع ہوتا ہے، اور ہر جگہ اپنی گنجائش کے مطابق پانی کو جذب کر لیتی ہے۔ ''فَاحْتَمَلَ السَّيْلُ زَبَدًا رَّابِيًا ؕ'' پھر جب پانی بہتا ہے تو وزنی اور قیمتی چیز نیچے رہتی ہے، اور اوپر کی سطح پر کوڑا کرکٹ اور جھاگ جمع ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً ۚ'' کچرا اور جھاگ وقت کے ساتھ بہہ کر کنارے کی طرف چلا جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ ''وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ ؕ'' اور جو چیز انسانوں کے لیے نفع مند ہے وہ پانی کے اندر باقی رہتی ہے؛ قیمتی موتی، سیپ اور دوسری بیش قیمت چیزیں نیچے ہی رہتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا: ''كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ ؕ'' حق اور باطل کی مثال بھی اسی طرح ہے؛ باطل اوپر کی سطح پر کچرے اور جھاگ کی طرح بظاہر نمایاں دکھائی دیتا ہے، مگر حقیقت میں وہ بے حقیقت ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے، جبکہ حق ہمیشہ باقی رہتا ہے، فائدہ دیتا ہے اور زمین میں قائم رہتا ہے۔

خالص اور کھوٹے کی تمیز:

جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں، اصلی سونا اور نقلی سونا دونوں میں فرق ہے۔ بسا اوقات نقلی سونے کی چمک اصلی سونے سے زیادہ نظر آتی ہے، آدمی دھوکہ کھا لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَمِمَّا يُوْقِدُوْنَ عَلَيْهِ فِي النَّارِ ابْتِغَآءَ حِلْيَةٍ اَوْ مَتَاعٍ زَبَدٌ مِّثْلُهٗ ؕ'' جب آگ پر سونا یا قیمتی دھاتیں ڈالی جاتی ہیں تو جو چیز خالص اور اصلی ہوتی ہے وہ باقی رہتی ہے، اور میل کچیل الگ ہو جاتا ہے، اسی طرح ہم اپنے گھروں میں بھی دیکھیں، عورتیں جب چاول پکاتی ہیں تو پانی کے اوپر کچرا اور ہلکی چیزیں آ جاتی ہیں، جبکہ اصل چاول اور قیمتی چیزیں نیچے ہی رہتی ہیں، گوشت پکانے میں بھی یہی حال ہوتا ہے؛ اوپر جھاگ اور فضول چیزیں جمع ہو جاتی ہیں اور اصل فائدہ مند غذا نیچے محفوظ رہتی ہے۔

پیاسے کی مثال اور ایمان کی حقیقت:

اس کے بعد والی آیت میں اللہ پاک نے ایک اور نہایت بلیغ مثال دی: ''لَهٗ دَعْوَةُ الْحَقِّ ؕ وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا يَسْتَجِيْبُوْنَ لَهُمْ بِشَيْءٍ اِلَّا كَبَاسِطِ كَفَّيْهِ اِلَى الْمَآءِ لِيَبْلُغَ فَاهُ وَمَا هُوَ بِبَالِغِهٖ ؕ وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ۝۱۴'' (رعد:۱۴) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ مثال اس شخص کی ہے جسے پانی کی شدید ضرورت ہے، مگر پانی اس سے دور ہے۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ پانی کی طرف پھیلاتا ہے تاکہ وہ پانی اس کے منہ تک آجائے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جب تک وہ خود پانی کے پاس جا کر اسے لانے اور استعمال کرنے کے طریقے پر عمل نہ کرے، پانی کبھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔ اسی طرح وہ لوگ جو ایمان کی محنت نہیں کرتے، ایمان کے راستے پر نہیں چلتے، اور اپنے آپ کو اس سے دور رکھتے ہیں، ان کی حالت بھی بالکل اسی پیاسے انسان کی طرح ہے۔ وہ کتنا ہی پکاریں، ان کی پیاس کبھی نہیں بجھ سکتی۔ اسی لیے اللہ پاک نے فرمایا: ''وَمَا دُعَآءُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ'' کافروں کی پکار گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔ یوں اللہ پاک نے سورۃ الرعد میں تین عظیم مثالیں ذکر فرمائیں، تاکہ حق اور باطل کے فرق کو واضح کر دیا جائے۔

وحی، نعمتیں اور قدرتِ خداوندی:

اس کے بعد سورۃ النحل میں اللہ پاک نے اپنے بے شمار انعامات کا ذکر فرمایا۔ سب سے پہلا اور سب سے بڑا انعام قرآنِ کریم کا ہے۔ ارشاد ہوا: ''اَتٰۤى اَمْرُ اللّٰهِ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْهُ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝۱ يُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ'' (نحل:۱،۲) اللہ ربّ العزت نے فرشتوں کے ذریعے قرآن کا نزول فرمایا، جبرئیل امین قرآن لے کر آتے رہے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی چیزوں کا ذکر کیا، جانوروں اور سواریوں کا ذکر کیا۔ پھر بتایا کہ انسان جب اپنی ماں کے پیٹ سے نکلا تو کچھ نہیں جانتا تھا؛ لیکن اللہ پاک نے اس کو سننے کے لئے کان، دیکھنے کے لئے آنکھیں، اور سمجھنے کے لئے دل عطا فرمایا: ''وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ

وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ ''(نحل:۷۸) اسی طرح اولاد دینا، پوتے دینا، سایہ عطا فرمانا، عمدہ کھانے پینے کی چیزیں دینا، یہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ جانوروں کے بارے میں فرمایا: ''وَاِنَّ لَكُمْ فِي الْاَنْعَامِ لَعِبْرَةً ۭ '' (نحل:۶۶) پھر دودھ کے عجیب وغریب نظام کو بطور نشانی بیان فرمایا: ''مِنْۢ بَيْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَاۗىِٕغًا لِّلشّٰرِبِيْنَ۝۶۶'' جانور کے پیٹ میں گوبر بھی ہے، خون بھی ہے، اور بے شمار رطوبتیں بھی ہیں، مگر انہی کے درمیان سے اللہ تعالیٰ ایسا خالص دودھ نکالتے ہیں جس میں نہ خون کی بو ہے، نہ گوبر کی بُو، بلکہ نہایت پاکیزہ اور خوشگوار ہے۔ یہ منظر ایک عام دیہاتی آدمی بھی دیکھ کر ایمان میں اضافہ پاتا ہے، اور سائنس دان اپنی تحقیق کے ذریعے اس حقیقت کو سمجھ کر اور زیادہ حیران ہوتا ہے، یوں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے یہ انعامات بیان کر کے واضح کر دیا کہ ساری نعمتیں اسی کی عطا کردہ ہیں اور سب انسانوں کو اسی کے سامنے جھکنا ہے۔

شہد؛ فطری الہام اور شفا کا خزانہ:

اسی طرح اللہ پاک نے شہد کی مکھی کا ذکر فرمایا، اور اسی نسبت سے پوری سورت کا نام ''نحل'' رکھا گیا، یہ آیات کل کی تراویح میں تلاوت کی گئیں، اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''وَاَوْحٰى رَبُّكَ اِلَى النَّحْلِ '' آپ کے رب نے شہد کی مکھی کے دل میں بات ڈالی۔ یہاں وحی کا مطلب وہ وحی نہیں جو انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی ہے، بلکہ فطری اور طبعی الہام ہے، جو اللہ نے نیچر کے طور پر اس کے دل میں ڈال دیا۔ اللہ پاک نے فرمایا: ''اَنِ اتَّخِذِيْ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوْتًا وَّمِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا يَعْرِشُوْنَ۝۶۸'' (نحل:۶۸) پہاڑوں میں، درختوں پر اور اونچی نیچی جگہوں میں مکھی اپنے چھتے بناتی ہے، پھر مختلف پھلوں اور پھولوں کا رس چوستی ہے اور ایک عجیب وغریب نظام کے تحت شہد تیار کرتی ہے، یہ سارا نظام کس نے مکھی کے دل میں ڈالا؟ یہ اللہ تعالیٰ ہی ہیں جو اس ننھے کیڑے کو بھی یہ الہام فرماتے ہیں کہ ایسی چیز تیار کر جو انسان کے لیے مفید ہو۔ مفسرین لکھتے ہیں کہ مکھیوں کا بھی ایک نظام ہے، ان کا ایک سردار ہوتا ہے، اگر

کوئی مکھی زہریلا مادہ لے کر آتی ہے تو نہ وہ مادہ قبول کیا جاتا ہے اور نہ وہ مکھی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ثُمَّ كُلِي مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ'' ہر پھل سے رس لے اور اسے انسان کے لیے محفوظ کر۔ پھر فرمایا: ''فِيْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ ط'' اس شہد میں انسانوں کے لیے شفا ہے، یہ دراصل اللہ پاک انسان کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ کائنات کا ذرہ ذرہ تیری خدمت میں لگا ہوا ہے، مگر تو صرف اور صرف اللہ کے لیے ہے، لہٰذا یہ سب کچھ اللہ کی نعمتیں ہیں اور ان کا شکر ادا کرنا لازم ہے۔

مومن کی زندگی کا منشور:

سورج اور چاند کا نظام، بارش کا آنا، دھوپ کا نکلنا یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے مظاہر ہیں۔ کاشتکار اچھی طرح جانتے ہیں کہ اناج اور غلّہ اُگانے کے لیے ان سب چیزوں کی کتنی ضرورت ہوتی ہے، سورۃ النحل میں اللہ پاک نے ان تمام تفصیلات کا ذکر فرمایا ہے۔ پھر اسی سورت میں ایک نہایت عظیم آیت آئی ہے جو آج کی تراویح میں تلاوت کی جائے گی: ''اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝'' (نحل:۹۰) ہمارا ہر نمازی بھائی اس آیت سے واقف ہے، کیونکہ اسی پر خطبہ ختم ہوتا ہے اور نماز شروع کی جاتی ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے اس آیت کو اپنے خطبے کے آخر میں شامل کیا تاکہ ہر مومن اسے یاد کرے اور سمجھے، کیونکہ پوری زندگی کا خلاصہ اس ایک آیت میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے عدل اور انصاف کا۔ انصاف صرف عدالتوں یا کچہریوں کا نام نہیں، بلکہ یہ ہر بندے کا دوسرے بندے کے ساتھ، اور سب سے بڑھ کر اپنے رب کے ساتھ تعلق کا تقاضا ہے۔ اللہ کو ایک ماننا، اس کی ذات، صفات اور عبادت میں کسی کو شریک نہ کرنا، یہی عدل ہے، اگر اس میں کمی کی گئی تو اللہ نے اسے ظلم قرار دیا: ''اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝'' (لقمان:۱۳) اسی طرح عدل کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی، خاتم النبیین مانا جائے، ان کی تعلیم کو زندگی کا نمونہ سمجھا جائے، ان کی سنت پر عمل کیا جائے، اور ان سے حقیقی محبت کی جائے، جیسا کہ

قرآن میں آیا: ''وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ط '' (فتح:۹) علماء فرماتے ہیں کہ اس محبت میں عقل بھی ہو، جذبات بھی ہوں، قلبی میلان بھی ہو، اور عشق بھی ہو۔ پھر عدل کا یہ دائرہ انسانوں کے باہمی تعلقات تک پھیلتا ہے: والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، بھائی بہنوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ، اور سبھی معاملات میں۔ یوں یہ ایک آیت بندے کی پوری زندگی کا خلاصہ اور رہنمائی ہے۔

احسان کی حقیقت اور بندگی کا شعور:

''والاحسان'' یعنی دوسروں سے اچھا سلوک کرنا اور اللہ کے ساتھ ایسا تعلق قائم کرنا جو کامل بندگی اور خشیت پر مبنی ہو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا: ''ما الاحسان؟'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''**أن تعبد الله كأنك تراه، فإن لم تكن تراه فإنه يراك**'' (بخاری: کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام) احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسی عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ یقین رکھو کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ یہی تصور انسان کے ہر عمل پر نگران بنا دیتا ہے۔ قرآن کریم میں حضرت لقمان علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو نصیحت فرمائی: ''يٰبُنَيَّ اِنَّهَآ اِنْ تَكُ مِثْقَالَ حَبَّةٍ مِّنْ خَرْدَلٍ'' (لقمان:۱۶) اے میرے بیٹے! رائی کے دانے کے برابر کوئی عمل بھی اگر زمین یا آسمان میں چھپ جائے، اللہ اس کو بھی حساب کے لئے لے آئے گا۔ اسی طرح قیامت کے بارے میں فرمایا: ''وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ ۝ اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَلَّنْ نَّجْمَعَ عِظَامَهٗ ۝ بَلٰى قٰدِرِيْنَ عَلٰٓى اَنْ نُّسَوِّيَ بَنَانَهٗ ۝'' (قیامہ:۲-۴) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: کیا انسان سمجھتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں اکٹھی نہیں کریں گے؟ کیوں نہیں! ہم تو اس کی انگلیوں کے پور تک دوبارہ بنا دینے پر قادر ہیں۔ یہ بتانا مقصود ہے کہ کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ کے قبضے میں ہے، اور ہر شے اس کی قدرت و طاقت کے ماتحت ہے۔ پس احسان کی صفت یہ ہے کہ بندہ اپنے ہر عمل میں یہ تصور کرے کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہی کیفیت عبادت کو بھی نکھارتی ہے اور بندگی کو بھی۔

رشتہ جوڑو، برائی چھوڑو:

اللہ تعالیٰ نے اس عظیم آیت (نحل:۹۰) میں تین چیزوں کا حکم دیا اور تین چیزوں سے منع فرمایا۔ تیسرا حکم ہے: ''وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی'' قریبی رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ صلہ رحمی کے بہت بڑے فضائل ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ صلہ رحمی کرنے والے کی روزی میں برکت ہوتی ہے اور عمر میں اضافہ ہوتا ہے۔ (بخاری: کتاب الادب، باب من بسط لہ فی الرزق بصلۃ الرحم) اس کے برعکس جو رشتہ توڑتا ہے، اسے ''القاطع'' کہا گیا ہے یعنی تعلق کاٹنے والا۔ اور ایسے شخص کے بارے میں سخت وعیدیں آئی ہیں۔ (بخاری: کتاب الادب، باب إثم القاطع) پھر فرمایا: ''وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ'' اللہ تعالیٰ بے حیائی، برائی اور ظلم سے روکتے ہیں۔ چاہے وہ گناہ آنکھ سے صادر ہوں، زبان سے نکلیں، ہاتھوں اور پیروں سے ہوں یا معاشرے میں ظلم و زیادتی کی صورت میں ہوں، ہر طرح کی منکر چیز سے اللہ نے منع فرمایا۔ آخر میں فرمایا: ''یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ'' ایمان والوں کو یہ نصیحت کی جاتی ہے تاکہ وہ یاد رکھیں اور اس پر عمل کریں۔

معراج سے دجال تک؛ قرآن کی ہدایت اور ڈھال:

اس کے بعد جو سورت آج کی تراویح میں پڑھی جائے گی، وہ ہے سورۂ بنی اسرائیل، جو واقعۂ معراج سے شروع ہوتی ہے: ''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ'' (اسراء:۱) اللہ تعالیٰ نے یہاں اپنے نبی کریم ﷺ کے سفرِ معراج کا ذکر فرمایا، پھر آگے حضرت نوح علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کی سرگذشت بیان فرمائی۔ ان کو سمجھایا گیا کہ اگر تم سیدھے راستے پر رہو گے تو اللہ کی مدد شامل حال ہوگی، اور اگر بغاوت کرو گے تو ''وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا'' کے مطابق پھر اللہ کی طرف سے سزا آئے گی۔ یہی کچھ ان کے ساتھ ماضی میں ہوا اور یہی سلسلہ آئندہ تک چلتا رہے گا۔ خیر! اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ نبی کریم ﷺ کو مسجد اقصیٰ تک اس لیے لے جایا گیا کہ یہود کے قبلے پر آپ کو امامت کروائی جائے، تاکہ واضح ہو جائے کہ

اب ہدایت کا مرکز صرف اور صرف قرآن اور محمد رسول اللہ ﷺ کی اتباع ہے۔ مسجد حرام میں بھی انبیاء کو جمع کیا جا سکتا تھا، لیکن مسجد اقصیٰ میں امامت کروا کر یہود پر حجت قائم کر دی گئی۔ اسی کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ '' یہ قرآن وہ سیدھا راستہ دکھاتا ہے جس پر چلنے والا کبھی ناکام نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورۂ بنی اسرائیل میں بار بار قرآن کی عظمت اور اس کی رہنمائی کو بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا: ''وَلَقَدْ صَرَّفْنَا لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۚ '' (اسراء:۸۹) انسانوں کے لیے ہر طرح کی مثالیں قرآن میں بیان کر دی گئی ہیں؛ توحید کی، کفر کی، منافقین کی، خرچ کرنے والوں کی، اور ریاکاروں کی؛ تاکہ ایک سمجھدار انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اس کے بعد سورۂ کہف شروع ہوتی ہے، جس میں چار واقعات ذکر کیے گئے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص سورۃ کہف پڑھے گا، اللہ تعالیٰ اسے دجال کے فتنے سے محفوظ رکھے گا۔ (الاحادیث المختارۃ: ۲/ ۵۰) بعض روایتوں میں ہے کہ جو اس کے ابتدائی دس آیات پڑھے گا یا آخری دس آیات، اللہ تعالیٰ اسے سب سے بڑے فتنے یعنی دجال کے فتنے سے بچائیں گے۔ (مسلم: کتاب المساجد، باب فضل سورۃ الکھف وآیۃ الکرسی) نبی کریم ﷺ نے فرمایا: مجھ سے پہلے ہر نبی نے اپنی امت کو دجال سے ڈرایا، اور میں بھی تمہیں اس کی حقیقت اور خطرے سے خبردار کرتا ہوں۔ (معجم کبیر: ۲۴/ ۱۷۴) اس لیے سورۂ کہف کو دجال سے بچنے کے لیے ایک ڈھال قرار دیا گیا ہے۔

ایمان پر حملے کی مختلف صورتیں:

قرآن کریم نے چار واقعات بیان کر کے ہمیں یہ سبق دیا ہے کہ دجالی فتنہ ہمیشہ ایمان پر حملہ کرے گا، جیسے اصحابِ کہف کے ایمان پر حملہ کیا گیا تھا، آج بھی ہندوستان کے حالات ہمارے سامنے ہیں، یہاں ایمان اور کفر کے مسائل بار بار مختلف شکلوں میں سامنے آرہے ہیں، شرک اور کفر کبھی بچوں کی تعلیم اور اسکولوں کے ذریعے، کبھی آپسی تعلقات اور لین دین میں، اور کبھی سماجیات اور کلچر کے پردے میں لوگوں کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں

ہے۔ اکبر کے دور میں بھی یہی کچھ ہوا تھا، جب دین الٰہی کے نام پر شرک کو فروغ دینے کی کوشش کی گئی، مگر اُس وقت اللہ تعالیٰ نے مجدد الف ثانیؒ اور علماء کی محنتوں کے ذریعے اُس کی کوششوں کو ناکام بنا دیا، آج بھی وہی منظر نامہ دہرایا جا رہا ہے، اور امت کے علماء اسی طرح توحید کی طرف امت کو بلا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس وضاحت اور صراحت کے ساتھ قرآنِ کریم نے توحید کو بیان کیا ہے، دنیا کی کوئی اور کتاب اُس انداز میں توحید کو نہیں بیان کرتی۔

ثابت قدمی کی زندہ مثال:

اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف بلایا اور مثال کے طور پر بتایا کہ جیسے ان چند نوجوانوں کا قصہ ہے، اُس وقت کا پورا ماحول کفر و شرک سے بھرا ہوا تھا اور بادشاہ دقیانوس نہایت ظالم اور جابر تھا، لیکن اللہ کے یہ چند بندے حق پر قائم رہے۔ قرآن کریم میں فرمایا گیا: ''نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ'' (کہف: ۱۳) ہم تمہارے سامنے ان کا واقعہ ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہیں۔ یہ واقعہ اس لیے ذکر کیا گیا کہ یہود نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا امتحان لینا چاہا۔ مکہ والوں نے نضر بن حارث اور چند دوسرے لوگوں کو بھیجا اور کہا کہ مسلمانوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے، کچھ کرنا ہوگا، یہودی علماء نے کہا کہ اُن سے کچھ سوالات کرو، اگر جواب دے دیں تو یہ سچے نبی ہیں، ورنہ نہیں، انہی سوالات میں سے ایک یہ تھا کہ وہ چند نوجوان کون تھے جو غار میں رہے اور طویل مدت تک اللہ نے انہیں سلائے رکھا؟ یہ واقعہ عمان، اردن یا ترکی کے کسی علاقے میں پیش آیا، جو مکہ سے بہت دُور ہے، اور مکہ والوں کو اس کا کوئی علم نہ تھا۔ اس موقع پر قرآن نے اعلان کیا: ''اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيْمِ ۙ كَانُوْا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۝'' (کہف: ۹) کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ اصحاب کہف اور رقیم ہماری نشانیوں میں سے کوئی عجیب بات تھے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں ۳۰۹ سال تک سلائے رکھا۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ ایمان والوں کی حفاظت اللہ کس طرح فرماتا ہے، لیکن قرآن ساتھ ہی یہ بھی یاد دلاتا ہے: ''وَفِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝'' (ذاریات: ۲۱) اپنی ذات پر غور کیوں نہیں کرتے؟ اللہ نے

تمہیں پیدا کیا اور بے شمار نعمتوں سے نوازا، پھر بھی تم کفر و شرک میں لگے ہوئے ہو اور اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو حاجت روا سمجھتے ہو۔ اصحاب کہف کے واقعے میں بھی یہی سبق ہے کہ پہلے انہیں لالچ دیا گیا: حکومت، عہدے اور کرسی کی پیشکش کی گئی، لیکن انہوں نے قبول نہ کیا۔ جب لالچ کام نہ آئی تو دھمکیاں دی گئیں، یہی طریقہ باطل طاقتوں کا ہمیشہ سے رہا ہے۔ فرعون نے بھی حضرت موسیٰؑ کو دعوت دی، اور مکہ والوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ایک مہینہ ہمارے بتوں کی عبادت کر لو اور ایک مہینہ ہم تمہارے رب کی عبادت کریں گے۔ ایسے موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی: ''قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝'' (کافرون:۱) اے کافرو! تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے۔ یہ اعلان اس بات کا ثبوت ہے کہ ایمان اور کفر میں کبھی سمجھوتہ نہیں ہو سکتا، اگر سمجھوتہ کر لیا جائے تو ایمان اور کفر برابر ہو جاتے ہیں۔ اصحاب کہف نے ایمان پر ثابت قدمی دکھائی، غار کی پناہ لی اور کہا: ''رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (کہف:۱۴) ہمارا رب وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کا رب ہے۔ یہ اصل سبق ہے کہ روزی اور معیشت پر انسانوں کا قبضہ نہیں، بلکہ زمین و آسمان کا مالک صرف اللہ ہے۔

ایمان کا لازوال سبق:

دوستو اور بزرگو! ہندوستان کے مسلمانوں کو یہ آیت سبق دے رہی ہے: ''رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' (الکہف:۱۴) ہمارا رب وہی اللہ ہے جو آسمان و زمین کے نظام کو چلا رہا ہے۔ ایک انسان کو روزی دینا کیا مشکل ہے اُس کے لیے! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' زمین پر کوئی چلنے پھرنے والی، رینگنے والی، سمندر کی گہرائیوں میں رہنے والی یا جنگلوں کے اندر موجود مخلوق ایسی نہیں جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔ وہ سب کی حفاظت کرتا ہے اور سب کو رزق عطا فرماتا ہے، اسی لیے اللہ نے فرمایا: ''رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ'' یہ اصحاب کہف کے قصے میں سب سے بنیادی پیغام ہے۔

ہمیں اور آپ کو ان نوجوانوں سے سب سے بڑا سبق یہ ملتا ہے کہ ایمان ہی سب سے

بڑی آزمائش ہے، اصل حملہ ہمیشہ ایمان پر ہوتا ہے، اگر ایمان کو محفوظ کر لیا جائے تو اللہ تعالیٰ کائنات کے نظام کو بھی ایمان والوں کے لیے بدل دیتے ہیں۔ اصحاب کہف کے ساتھ یہی ہوا، جب وہ غار میں آرام کر رہے تھے تو اللہ تعالیٰ نے سورج کے نظام کو ان کے حق میں بدل دیا۔ فرمایا: ''وَتَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَت تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ '' (کہف:۱۷) جب سورج طلوع ہوتا تو دائیں جانب ہٹ جاتا، اور جب غروب ہوتا تو بائیں طرف ہٹ کر گزرتا۔ غور کیجیے! یہ ایک دن، دو دن نہیں، بلکہ مسلسل ۳۰۹ سال تک ہوا۔ چاند کے حساب سے یہ ۳۰۹ سال بنتے ہیں اور سورج کے حساب سے ۳۰۰ سال۔ قرآن نے دونوں کا ذکر فرمایا: ''ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِيْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾'' یہ واقعات کوئی عام کہانیاں نہیں بلکہ اللہ کا سچا کلام ہے۔ قرآن خود کہتا ہے: ''لَقَدْ كَانَ فِيْ قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ط '' (یوسف:۱۱۱) ان واقعات میں عقلمندوں کے لیے بڑا سبق ہے۔ یہ کوئی من گھڑت قصے کہانیاں نہیں، بلکہ تورات و انجیل کی تصدیق ہیں اور مہر شدہ حقیقت ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں اتنی تاکید کے ساتھ بیان فرمایا۔

اصحابِ کہف کی نیند؛ اللہ کی قدرت کا کرشمہ:

اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا: ''وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُوْدٌ ج '' (کہف:۱۸) تم دیکھو گے کہ وہ جاگ رہے ہیں حالانکہ وہ سوئے ہوئے ہیں۔ ان کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن اللہ پاک نے انہیں نیند میں رکھا ہوا تھا، باہر سے دیکھنے والا یہ سمجھے کہ یہ بیدار ہیں، مگر حقیقت یہ تھی کہ اللہ پاک نے انہیں ۳۰۹ سال تک سلائے رکھا۔ اس پورے عرصے میں نہ کوئی درندہ قریب آیا، نہ پانی کا سیلاب ان تک پہنچا، نہ تیز ہوائیں رکاوٹ بنیں۔ اللہ تعالیٰ نے مزید فرمایا: ''وَّنُقَلِّبُهُمْ '' ہم ان کی کروٹیں بدلتے رہے تاکہ زمین ان کے جسم کو نہ کھا جائے، یہ سب کچھ اللہ کی قدرت سے ہوا، پھر اللہ تعالیٰ نے چوکھٹ پر ایک کتے کو بٹھا دیا تاکہ رعب قائم رہے اور کوئی اندر داخل نہ ہو سکے۔

ایمان والوں کے قدموں پر جھکتی فطرت:

دوستو اور بزرگو! یہ سورہ کہف مجھے اور آپ کو بتلاتی ہے ''من کان للہ کان اللہ لہ'' کہ جب بندہ اللہ کا ہوجاتا ہے تو کائنات کی ساری مخلوق کو اللہ پاک بندے کے تابع کردیتے ہیں، صحابی راستہ بھول گئے اور کہا شیر کو کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا غلام ہوں، اس نے آگے چل کر راستہ بتلایا۔

دشت تو دشت دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے
بحر ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

سمندر کے اندر گھوڑے دوڑائے صحابہ کرام نے، عراق کے فاتح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالی عنہ اور ان کے ساتھیوں نے اور افریقہ کے قیروان کے جنگل میں اعلان کیا تین دن کے اندر جنگل کھالی کرو، ان سب نے خالی کردیا، ابن کثیرؒ اور اسی طرح البدایہ والنہایہ ابن اثیرؒ؛ یہ سب اس واقعے کو نقل فرماتے ہیں، اسلامی مؤرخین نے اس کو ذکر فرمایا ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۳)

جرائم کی کثرت کا اسلامی حل

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین. اما بعد!

قال اللہ تبارک و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید.

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝۲۷ (مائدہ:۲۷)

وقال تعالیٰ:

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۚۛ كَتَبْنَا عَلٰي بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا ۭ (مائدہ:۳۲)

وقال النبي ﷺ: ألا وإنَّ في الجَسَدِ مُضْغَةً، إذا صَلُحَتْ صَلُحَ الجَسَدُ كُلُّهُ، وإذا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، ألا وهي القَلْبُ. (بخاری: کتاب الایمان، باب فضل استبرأ لدینہ)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی الکریم و نحن علی ذلک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمدللہ رب العالمین.

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جن آیات کی ابھی تلاوت کی گئی، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے سیدنا حضرت آدمؑ کے دو بیٹوں کی گفتگو اور ان کے

آپس کے معاملے کا ذکر فرمایا ہے۔ سب سے پہلے فرمایا: ''اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ط'' اس زمانے میں قربانی یوں پیش کی جاتی تھی کہ اسے پہاڑی پر رکھ دیا جاتا، پھر اللہ کی طرف سے آسمان سے آگ آتی اور جس قربانی کو قبول کرنا ہوتا، اسے اٹھا لیتی۔ اللہ پاک نے قانون بتایا: ''اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝۲۷'' اللہ تعالیٰ صرف پرہیزگاروں اور اخلاص والوں کی قربانی قبول کرتے ہیں۔ جب دونوں بھائیوں نے قربانی کی، تو ایک کی قبول ہوئی اور دوسرے کی نہیں ہوئی۔ جس کی قبول نہ ہوئی، اس نے حسد و تکبر میں کہا: میں تجھے ضرور قتل کروں گا، دوسرے بھائی نے جواب دیا کہ اگر تو اخلاص اور تقویٰ کے ساتھ قربانی کرتا تو تیری بھی قبول ہوتی؛ کیونکہ اللہ صرف متقیوں کی قربانی قبول فرماتے ہیں۔ پھر اس نے کہا: ''لَئِنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۝۲۸'' (مائدہ:۲۸) اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ بڑھائے گا، تب بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

اللہ پاک کا خوف؛ برائی سے روکنے کی ڈھال:

دوستو اور بزرگو! آج کی اس مجلس میں جو سب سے بنیادی بات کہنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں بے شمار گناہ اور برائیاں پھیل چکی ہیں، پہلے زمانے کے انسان بھی گناہ کرتے تھے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کا واقعہ اسی کی مثال ہے کہ روئے زمین پر سب سے پہلا قتل ہوا، اللہ تعالیٰ نے اس قصے کو بیان کر کے ہمیں یہ سمجھایا کہ گناہ کی جڑ کیا ہے اور گناہ سے بچنے کا اصل ذریعہ کیا ہے، ایک بھائی نے دوسرے کو کہا: ''اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ۝۲۸'' اگر تو مجھے قتل بھی کرے گا، تب بھی میں تجھے قتل کے لیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا، کیونکہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ گناہوں سے روکنے کا سب سے بڑا اور بنیادی ذریعہ اللہ کا خوف اور آخرت کے حساب کا یقین ہے۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس کے بغیر انسان گناہوں سے باز نہیں آ سکتا، اگر دل میں اللہ کا خوف بیدار ہو جائے اور آخرت کی

جواب دہی کا یقین پختہ ہو جائے، تو انسان ہر برائی اور گناہ سے رک سکتا ہے۔

جاہلیت کی برائیاں اور نبی ﷺ کی اصلاحی محنت:

جناب نبی اکرم ﷺ اس وقت دنیا میں تشریف لائے جب جاہلیت کی تاریکی چھائی ہوئی تھی، وہ تمام برائیاں جو اس دور میں موجود تھیں، آج بھی پائی جاتی ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ پہلے یہ پرانے انداز میں ہوتی تھیں، اور آج جدید ٹیکنالوجی اور سائنس کے ذریعے نئی نئی شکلوں میں ظاہر ہو رہی ہیں، اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ انسانیت کو رحمت کا پیغام پہنچایا۔ سب سے پہلے اللہ پاک نے اپنے پاک کلام میں گناہوں کو روکنے کے جتنے ذرائع ہو سکتے تھے، سب پر بندش لگا دی۔ آپ ﷺ تشریف لائے اور انسانیت کو گناہ اور برائی کی حقیقت سے آگاہ کیا، لوگوں کے دلوں میں اللہ کا ایسا خوف بٹھا دیا کہ رات کی تنہائی میں بھی گناہ کرنے والا یہ سوچنے پر مجبور ہو جائے کہ میرا رب مجھے دیکھ رہا ہے۔ یہی پیغام اس آیت کریمہ میں دیا گیا: ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾'' انسانی قوانین، کیمرے، پولیس، حکومت کی مشینری گناہوں کو روکنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جتنے زیادہ یہ وسائل بڑھتے ہیں، انسان گناہ کے نئے طریقے ایجاد کر لیتا ہے۔ آج اخبارات، سوشل میڈیا اور روزمرہ کی خبریں اٹھا کر دیکھ لیجئے، ہر طرف قتل و غارت، فتنہ و فساد، زنا کاری، شراب نوشی اور نشہ آور چیزوں کی بھرمار نظر آتی ہے؛ لیکن رسول اکرم ﷺ نے آ کر انسانوں کے دلوں میں اللہ کی عظمت پیدا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّہٗ مَنۡ یَّتَّقِ'' (یوسف:۹۰) جو تقویٰ اختیار کرے گا، اللہ اسے کامیاب فرمائیں گے۔ اور فرمایا: ''اِنَّہٗ مَنۡ یَّاۡتِ رَبَّہٗ مُجۡرِمًا فَاِنَّ لَہٗ جَہَنَّمَ ؕ'' (طہ:۷۴) جو اپنے رب کے پاس جرم کے ساتھ آئے گا، اس کے لیے جہنم ہے۔ آپ ﷺ نے انسانوں کے دلوں سے گناہوں کو نکالنے کے لیے دن رات محنت فرمائی۔

زنا سے بچانے کا نبوی اسلوب:

ایک صحابیؓ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ! میں زنا کا گناہ کرنا چاہتا ہوں، صحابہ کرامؓ کو یہ سن کر سخت ناگوار گزرا، مگر نبی اکرم ﷺ نے

شفقت اور حکمت کے ساتھ ان کو سمجھانا شروع کیا، آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرو گے کہ کوئی شخص تمہاری ماں کے ساتھ یہ عمل کرے؟ صحابیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہرگز نہیں، میں یہ گوارا نہیں کرسکتا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: اسی طرح جس عورت کے ساتھ تم یہ گناہ کرنا چاہتے ہو، وہ بھی تو کسی کی ماں ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا: کیا تم یہ پسند کرو گے کہ تمہاری بہن کے ساتھ کوئی ایسا کرے؟ صحابیؓ نے کہا: نہیں، یارسول اللہ! آپ ﷺ نے فرمایا: تو جس کے ساتھ تم زنا کرنا چاہتے ہو، وہ بھی کسی کی بہن ہے۔ یوں نبی کریم ﷺ نے مثالوں کے ذریعے ان کے دل میں یہ بات بٹھادی کہ زنا کتنا بڑا اور برا گناہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے ان کے لیے دعا فرمائی اور ان کے دل سے وہ میل کچیل نکل گیا۔ (مسند احمد: ۲۲۲۱۱ (۳۶/۵۴۵) حدیث ابی امامة الباهلی) یہی دراصل نبی اکرم ﷺ کا طریقہ تھا کہ آپ نے سب سے پہلے انسانوں کے دلوں میں اللہ کا ڈر پیدا کیا۔ اور ڈر تب پیدا ہوتا ہے جب بندہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور صفات کو پہچان لے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام کے بیٹے نے کہا تھا: ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾'' میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

اسی طریقے سے آپ کے زمانہ میں ایک صحابی ماعز اسلمیؓ سے گناہ ہو چکا، کسی کو معلوم نہیں تھا، وہ خود آپ ﷺ کے پاس آئے اور آکر اپنے گناہ کا اقرار کیا، کوئی بھی گواہ نہیں ہے، انہوں نے خود ہی اقرار کیا، آپ نے چہرا پھیر لیا، دوسری طرف آئے، پھر اس گناہ کا اقرار کیا، مختلف جہتوں میں آپ نے چہرا پھیرا؛ لیکن وہ آتے رہے اور اپنے گناہ کا اقرار کرتے رہے، آپ نے یہ پوچھا: ''ابك جنون؟'' کیا تم پاگل تو نہیں ہو گئے ہو؟ ہوش وحواس تمہارے برابر ہے؟ انہوں نے کہا: جی ہاں! اللہ کے رسول مجھے گندگی سے صاف کر دیجئے۔ (مسلم: کتاب الحدود، باب من اعترف علی نفسه بالزنا) یہ ہے ''اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۲۸﴾''، اللہ کے رسول ﷺ نے اللہ تعالیٰ کا خوف اور خشیت لوگوں کے دلوں میں ڈالی، اللہ پاک کی طاقت اور قدرت کو اس طریقے سے سمجھائی۔

اللہ کا خوف؛ لوگوں کا اصل کیمرہ:

ایک نیک بادشاہ کا واقعہ ہے کہ اس کے بیٹے اور رشتہ داروں نے ایک عورت کا حق مار لیا اور اس کی چیز پر قبضہ کر لیا، وہ بڑھیا فریاد کرتی ہوئی اس پل کے کنارے آ پہنچی جہاں سے بادشاہ کی سواری گزر رہی تھی، اس نے بادشاہ کو روک کر کہا: مجھے اسی پل پر انصاف دے دو، میرا حق واپس کرو! ورنہ میں پل صراط پر تم سے میرا حق لوں گی۔ بادشاہ نیک تھا، اللہ کا خوف دل میں رکھتا تھا۔ اس نے فوراً کہا: نہیں، وہاں (پل صراط پر) میرا کوئی بس نہیں چلے گا اور اسی دنیا میں اس بڑھیا کو انصاف دلا دیا، اس کا حق واپس کر دیا۔ یہی دراصل خوفِ آخرت ہے، جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا: ''وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝'' اہل ایمان آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔ یہی آخرت کا خوف انسان کو رات کے اندھیروں میں بھی گناہوں سے بچا لیتا ہے؛ ورنہ جن معاشروں میں اللہ کا خوف نہیں بلکہ صرف انسانوں اور کیمروں کا خوف ہے، وہاں نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ جیسے امریکہ کے شہر Los Angeles میں جب بجلی چلی جاتی ہے اور کیمرے بند ہو جاتے ہیں تو بڑے بڑے مالز (Malls) لوٹ لیے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہاں لوگوں کے دل میں اللہ کا ڈر نہیں، صرف کیمروں کا خوف ہے۔

دنیا کی عدالت نہیں، آخرت کی پکڑ کا خوف:

ایک عورت، حضرت غامدیہؓ نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا ہے، آپ مجھے پاک کر دیجئے۔ آپ ﷺ نے دیکھا کہ وہ حاملہ ہیں، فرمایا: ابھی نہیں، جب بچہ پیدا ہو جائے تب آنا۔ یاد رہے! نہ ان کا نام کسی رجسٹر میں درج تھا، نہ کوئی صحابی ان کے جرم کو لکھ کر محفوظ کر رہا تھا، نہ کسی عدالت کا مقدمہ تھا؛ لیکن یہ اللہ کا خوف تھا جس نے اس عورت کو آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر کر دیا۔ وقت گزرا، بچہ پیدا ہوا، وہ پھر خدمتِ اقدس میں آئیں اور عرض کیا: یا رسول اللہ! اب میرا بچہ ہو گیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ابھی نہیں! جب تک یہ بچہ تمہارا محتاج ہے، تم پر حد جاری نہیں کی جائے

گی۔ چند سال گزر گئے، جب بچہ اپنی ماں کے بغیر کھانے پینے کے قابل ہو گیا، اس عورت نے روٹی کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں پکڑا کر نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا: یا رسول اللہ! یہ اب میرا محتاج نہیں رہا۔ (ابو داود: کتاب الحدود، باب المرأة الی امر النبی ﷺ بر جمها) یہ ہے ایمان اور خوفِ خدا کی حقیقی کیفیت کہ نہ کوئی دنیاوی ریکارڈ، نہ کوئی انسانی قانون، صرف اور صرف آخرت کے ڈر نے اس عورت کو بار بار اللہ کے نبی ﷺ کی بارگاہ میں حاضر کیا۔

دنیاوی ٹیکنالوجی نہیں، تقویٰ ہی اصل تحفظ ہے:

دوستو اور بزرگو! یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ انسان کو گناہوں سے روکنے والی اصل چیز انسانی قانون یا دنیاوی خوف نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کا خوف ہے۔ انسان جتنی بھی نئی نئی ٹیکنالوجی ایجاد کرے، جتنے بھی طریقے بنائے گناہوں کو پکڑنے کے، اتنے ہی لوگ نئی نئی شکلوں میں جرائم سامنے لے آتے ہیں۔ جیسے کہا گیا: چور کو لوہاڑی کا فن سکھا دیا۔ آج دیکھ لیجیے، روزانہ ہزاروں قسم کے گناہ ہو رہے ہیں: عورتوں اور بچوں پر ظلم، سیاسی اور مذہبی جھگڑے، فساد اور عیاشیاں سب اس بات کی علامت ہیں کہ دلوں سے اللہ کا خوف نکل گیا ہے۔

نبی اکرم ﷺ جب دنیا میں تشریف لائے تو سب سے پہلے ایسا ماحول بنایا جس میں انسان کو اللہ کی عظمت اور قدرت کا احساس ہو۔ قرآن میں فرمایا: ''وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝۵۹'' (انعام:۵۹) نہ کوئی پتّا گرتا ہے اور نہ کوئی دانہ زمین کی تاریکیوں میں ہے مگر اللہ کے علم میں ہے۔ اسی طرح فرمایا: ''لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ'' (سبا:۳) اللہ سے ذرّے کے برابر بھی کوئی چیز چھپی نہیں۔ یعنی بندہ دن میں کرے یا رات کے اندھیرے میں، چھپ کر کرے یا سب کے سامنے، لوگوں سے تو چھپ سکتا ہے مگر اللہ سے نہیں چھپ سکتا۔ یہی تصور نبی اکرم ﷺ نے امت کے دلوں میں بٹھایا کہ اللہ کا خوف ہی گناہ سے روکنے والی اصل قوت ہے۔ قانون اور انتظامیہ اپنی جگہ ضروری ہیں، لیکن ان کا اثر وقتی اور محدود ہوتا ہے، اصل قوت

وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے پیدا کی کہ لوگ جہنم کے کنارے پر کھڑے تھے اور آپ ﷺ نے انہیں وہاں سے بچالیا: ''وَ كُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ط'' (آل عمران: ۱۰۳) وہ لوگ جو بچیوں کو زندہ دفن کرتے تھے، شراب نوشی، جوا، زنا اور ظلم میں ڈوبے ہوئے تھے، انہی کو نبی اکرم ﷺ نے اللہ کے خوف اور قرآن کی روشنی سے بدل کر بہترین انسان بنا دیا۔ یہی آج بھی دنیا کا سب سے بڑا حل ہے: اللہ کے قانون سے وابستہ ہونا، ورنہ گناہوں کی نئی نئی شکلیں روز سامنے آتی رہیں گی۔

بے خوف مجرم اور بے بس قانون:

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم ایک قصہ سناتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ کینیڈا کے ایک سفر میں میں نے جہاز میں وہاں کا مشہور اخبار پڑھا، اس میں ایک لرزہ خیز واقعہ درج تھا: ایک مجرم نے ۱۰، ۱۴ اور ۱۸ سال تک کے بچے اور بچیوں کو قید کر رکھا، ان کے ساتھ زیادتی کی اور پھر انہیں قتل کر دیا۔ جب وہ گرفتار ہوا اور اس پر قتل، اغوا اور بچوں کے ساتھ ظلم کی دفعات لگائی گئیں تو پولیس نے اس سے پوچھا: جن بچوں کو تو نے مارا ہے ان کی لاشیں کہاں چھپائی ہیں؟ اس نے ڈھٹائی سے جواب دیا: ایک بچے کی لاش کی نشاندہی کے بدلے مجھے ۱۰ ہزار ڈالر دو، اگر دس بچوں کی لاشیں بتاؤں تو ایک لاکھ ڈالر لوں گا اور گیارہویں کی لاش کا پتہ مفت میں بتا دوں گا۔ پولیس نے قانون کی کمزوری کی وجہ سے اس شرط کو مان لیا۔ ایک ایک بچے کی لاش نکلوانے کے لیے دس دس ہزار ڈالر دیے، اس کے ساتھ ہی اس مجرم نے اپنے تحفظات اور مزید سہولتیں مانگیں، وہ بھی دی گئیں۔ والدین نے احتجاج کیا کہ یہ رقم ہمیں دی جائے، مگر قانون کے سہارے وہ مجرم چند سال بعد رہا کر دیا گیا۔ یہ واقعہ اس حقیقت کی واضح مثال ہے کہ انسانی قانون کتنا کمزور ہے! اتنا بڑا جرم کرنے کے بعد بھی مجرم کو احساسِ ندامت تک نہیں ہوا، بلکہ مزید پیسے بٹورتا رہا۔ اصل روک تو وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے دلوں میں ڈالی تھی: خوفِ خدا اور آخرت کا یقین۔ جہاں

یہ نہیں ہوگا وہاں کوئی قانون جرم کو روک نہیں سکتا۔

عدل کی شفافیت؛ حضرت عمرؓ کی دور اندیشی:

اللہ کے نبی ﷺ کی مجالس میں ہی فیصلے ہوا کرتے تھے، جہاں مقدمات پیش آتے اور آپ ﷺ عدل و انصاف کے مطابق فیصلہ فرماتے، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ اور تابعین کے دور میں ہزاروں واقعات اور مسائل پیش آئے، مگر اسلامی عدالت کا نظام اتنا مضبوط اور مستحکم تھا کہ ہر جگہ عدل کا بول بالا رہا۔ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے دورِ خلافت میں ایک نہایت اہم اصول قائم فرمایا: سلطنت کا نظام اور انتظامیہ خلیفہ کے ہاتھ میں رہے، لیکن سزاؤں اور فیصلوں کا نظام ایک الگ قاضی کے سپرد کیا جائے۔ چنانچہ قاضی شریحؒ کو یہ ذمہ داری دی گئی۔ حضرت علیؓ کے دور میں بھی یہی سلسلہ جاری رہا۔ اس طرح انتظامیہ اور عدلیہ کو الگ کر کے انصاف کو مزید واضح، شفاف اور سب کے لیے عام کر دیا گیا، یہی وہ اصول ہے جس پر آج دنیا کی عدالتیں اور جدید نظامِ انصاف بھی عمل کر رہے ہیں۔

اسلامی ضابطے؛ برائی سے پہلے اسباب کاٹ دو:

اسلام نے سب سے پہلے انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کا یقین دلایا، تاکہ بندہ رات کی تنہائیوں میں بھی اپنے رب سے ڈرتا رہے۔ پھر دوسرے نمبر پر، نبی اکرم ﷺ کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے ان تمام راستوں اور ذرائع کو بھی بند کر دیا جو گناہ تک لے جاتے ہیں۔ قرآن پاک میں فرمایا گیا: ''وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ'' زنا کے قریب بھی نہ جاؤ۔ اس مقصد کے لیے نگاہوں کی حفاظت کا حکم دیا گیا، مردوں اور عورتوں کے الگ رہنے کے اصول بنائے گئے، اور بہت سے ضابطے طے کیے گئے تاکہ گناہ تک پہنچنے کا ذریعہ ہی ختم ہو جائے۔ اسی طرح نبی اکرم ﷺ نے شراب اور نشہ آور چیزوں کے بارے میں فرمایا کہ صرف پینے والا ہی نہیں بلکہ پلانے والا، بیچنے والا، اٹھانے والا، سپلائی کرنے والا، اور یہاں تک کہ اس کا حساب کتاب کرنے والا بھی سب جہنم کے مستحق ہیں۔ آپ ﷺ نے دس افراد کا ذکر فرمایا جو اس

گناہ میں شریک سمجھے جاتے ہیں۔(ترمذی: ابواب البیوع، باب النھی ان یتخذ الخمر خلاً) مقصد یہ تھا کہ جب سماج سے شراب کے تمام دروازے بند ہو جائیں تو یہ برائی جڑ سے ختم ہو جائے۔ اسی طرح سود کے بارے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سود لینے والا، دینے والا، لکھنے والا اور اس پر گواہی دینے والا سب گناہ میں برابر کے شریک ہیں۔ (مسند احمد: رقم: ۲۸۰۲) یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سماج میں برائی کے ہر راستے پر بریک لگا دی، انسان چاہے بھی تو وہ برائی اس تک نہ پہنچ سکے کیونکہ اس کے اسباب اور ذرائع ہی کاٹ دیے گئے۔

انسانی تاریخ کا پہلا قتل اور پہلا قانون:

تیسرے نمبر پر اسلام نے سزاؤں کے قانون اور ضوابط کو واضح کیا۔ میں نے آپ حضرات کے سامنے جس رکوع کی دو آیات تلاوت کی، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہی اصول بیان فرمایا ہے۔ روئے زمین پر سب سے پہلا قتل حضرت آدمؑ کے بیٹے قابیل نے کیا، جب اس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کر دیا تو لاش کو دفن کرنے کا طریقہ تک نہیں جانتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس واقعے کا ذکر فرمایا: ''فَبَعَثَ اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ط'' (مائدہ: ۳۱) اللہ نے ایک کوّا بھیجا، وہ زمین کریدنے لگا اور اپنے مردہ ساتھی کو دفن کیا، اس منظر کو دیکھ کر قابیل کو دفن کا طریقہ سمجھ آیا اور اس نے بھی اپنے بھائی کی نعش کو زمین میں چھپا دیا۔ یہ واقعہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جرم اور سزا کا تصور انسان کے ساتھ ابتدا ہی سے ہے، اور اللہ نے اس کے لیے واضح اصول بنائے تاکہ زمین پر ظلم اور فساد کو روکا جا سکے۔

حدیث پاک میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: جو بھی شخص روئے زمین پر کسی انسان کو ناحق قتل کرے گا، اس کا گناہ اور اس کی سزا حضرت آدمؑ کے اس بیٹے پر بھی آئے گی، کیونکہ سب سے پہلے اسی نے ناحق خون بہا کر انسانیت میں قتل کا برا طریقہ رائج کیا تھا۔ (بخاری: کتاب احادیث الانبیاء، باب قول اللہ تعالیٰ: واذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفة)

جرم کا سد باب اور سزا کا تعین:

آیت میں آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''مِنۡ اَجۡلِ ذٰلِكَ ۚۛ'' ایک انسان دوسرے انسان پر ناحق ہاتھ نہ اٹھائے، ہابیل اپنے بھائی سے کہتا ہے: ''لَئِنۡۢ بَسَطۡتَّ اِلَىَّ يَدَكَ لِتَقۡتُلَنِىۡ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِىَ اِلَيۡكَ لِاَقۡتُلَكَ ۚ اِنِّىۡۤ اَخَافُ اللّٰهَ رَبَّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝۲۸'' کہ اگر تو اپنا ہاتھ مجھے قتل کرنے کے لیے بڑھائے گا، تو بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا، کیونکہ میں رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔ یہ آیت ہمیں سبق دیتی ہے کہ انسانوں کو گناہوں سے بچانے کا سب سے پہلا ذریعہ یہی ہے کہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف ڈالا جائے۔ اسی لیے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''**ألا وإن في الجسد مضغة إذا صلحت صلح الجسد كله، وإذا فسدت فسد الجسد كله، ألا وهي القلب**'' (بخاری: کتاب الایمان، باب فضل من استبرأ لدینه) یعنی بدن میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست ہو جائے تو سارا بدن درست ہو جاتا ہے، اور اگر وہ خراب ہو جائے تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، سن لو! وہ دل ہے۔ جب دل میں اللہ کا خوف اور آخرت کا یقین پیدا ہو جائے: ''وَبِالۡاٰخِرَةِ هُمۡ يُوۡقِنُوۡنَ ۝۴'' تو یہی انسان کو گناہوں سے روکتا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مَنۡ قَتَلَ نَفۡسًۢا بِغَيۡرِ نَفۡسٍ اَوۡ فَسَادٍ فِى الۡاَرۡضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ وَمَنۡ اَحۡيَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحۡيَا النَّاسَ جَمِيۡعًا ؕ'' (مائدہ:۳۲) کہ جس نے ایک جان کو ناحق قتل کیا گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کیا، اور جس نے ایک جان کو بچایا گویا اس نے پوری انسانیت کو بچا لیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان مجرموں کی سزا بھی متعین فرمائی جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں: ''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيۡنَ يُحَارِبُوۡنَ اللّٰهَ وَرَسُوۡلَهٗ وَيَسۡعَوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ فَسَادًا'' (مائدہ:۳۳) یوں یہ تیسرا اصول سامنے آتا ہے: ''سزا کا تعین''۔ پہلے اللہ کا خوف، پھر دل کی اصلاح، اور پھر سزا کا واضح قانون۔

عبادت اور معاشرت؛ گناہوں سے بچاؤ کے دو ستون:

اسی طرح اسلام نے سماج اور معاشرے کو بھی گناہوں سے روکنے کا ایک مضبوط ذریعہ

بنایا ہے۔آپ جانتے ہیں کہ اسلام میں عبادتیں دو طرح کی ہیں: انفرادی (Invidual) بھی اور اجتماعی (Social) بھی۔نماز اجتماعی عبادت ہے، حج اجتماعی عبادت ہے، جہاں لاکھوں مسلمان اکٹھے ہوتے ہیں، یہ سب کیا ہے؟ انسان کو ایک مضبوط سماج اور معاشرے میں باندھنے کا نظام۔مطلب انسان کے دل کی دنیا درست ہو جائے، اس کے بعد اگر سب سے زیادہ کوئی چیز گناہوں سے روکنے والی ہے تو وہ ہے سماج؛ ایسا سماج جہاں گناہ کرنے والے کو گناہ کرتے ہوئے شرم محسوس ہو، جہاں برائی کو برائی سمجھا جائے؛ لیکن آپ جانتے ہیں کہ گذشتہ تین چار سو سال سے دنیا کا نظام لادین اور ملحد لوگوں کے ہاتھ میں چلا گیا، انہوں نے نئی نئی شکلوں میں گناہ کے راستے کھولے اور سزاؤں کو کم کرنے کے بہانے تراشے، یہاں تک کہ جرائم کے نتائج بھی ہلکے کر دیے گئے۔اسلام میں اگرچہ سزائیں مقرر ہیں، لیکن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی یہ سزائیں بہت کم مرتبہ نافذ ہوئیں؛ دو یا تین مواقع پر۔اصل زور معاشرے کی اصلاح، دلوں کی تربیت اور گناہ کے ذرائع بند کرنے پر تھا۔

مرحوم شاہ فیصل کا امریکہ میں تاریخی جواب:

مرحوم شاہ فیصل جب پہلی مرتبہ امریکہ گئے، اور اس وقت وہ سعودی عرب کے بادشاہ بنے تھے، تو انہیں پہلے ہی معلوم تھا کہ وہاں سب سے پہلا سوال پردے کے بارے میں ہوگا اور دوسرا اسلامی سزاؤں کے بارے میں؛ چنانچہ وہ اپنے ساتھ دو ریکارڈ لے گئے: ایک سعودی عرب کا دس سال کا جرائم ریکارڈ اور دوسرا امریکہ کا صرف ایک مہینے کا جرائم ریکارڈ، جب وہاں صحافیوں نے پردے اور سزاؤں پر سوالات اٹھائے تو شاہ فیصل نے دونوں ریکارڈ سامنے رکھ دیے اور کہا: یہ ہمارے ملک کے دس سال کا ریکارڈ ہے اور یہ تمہارے ملک کے صرف ایک مہینے کا۔ ہمارے ہاں دس برس میں اتنے جرائم نہیں ہوئے جتنے تمہارے ملک میں ایک ہی مہینے میں ہو گئے، یہی فرق ہے ایک ایسے نظام میں جہاں اللہ کا خوف دلوں میں ڈالا گیا ہو اور ایک ایسے معاشرے میں جہاں قانون تو بنتے ہیں مگر انسان اپنی ہوس کے مطابق انہیں بدل کر

نئی نئی صورتوں میں گناہ ایجاد کرتا رہتا ہے؛ حتیٰ کہ خود قانون ساز ماہرین بھی حیران ہیں کہ قوانین تو بنتے ہیں مگر انسانیت ہر بار نئے طریقے سے انہیں توڑ دیتی ہے۔

عدل اور توازن کا نظام:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن وحدیث کے ذریعے ہر اس دروازے کو بند کر دیا جو فساد اور گناہ کی طرف کھلتا تھا۔ آپ ﷺ نے اسلامی نظام کے مطابق ایسا ماحول بنایا کہ کسی کو پریشانی نہ ہو، بلکہ ہر شخص اپنے حق تک آسانی سے پہنچ سکے۔ قرآن نے ہمیں آخرت کا تصور دیا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پوری فہرست بیان کی، انسانوں کے جھگڑوں کی ایک بڑی وجہ غربت اور معاشرتی عدم توازن ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نظام میں کچھ کو مالدار اور کچھ کو غریب بنایا گیا ہے، تاکہ آزمائش اور امتحان ہو؛ لیکن جب انسان اس خدائی نظام میں خلل ڈالتا ہے، حقوق کو ضائع کرتا ہے اور ناانصافی کرتا ہے تو پھر تصادم اور جھگڑے جنم لیتے ہیں۔

سود نفرت بڑھاتا ہے، زکوٰۃ محبت پیدا کرتی ہے:

بزرگوں نے لکھا ہے کہ سود (Interest) دراصل نفرت اور دشمنی کو جنم دیتا ہے، سود لینے والا اور دینے والا دونوں کے درمیان ناچاقی پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک مالدار جب سود سے طاقتور ہوتا ہے تو غریب کے دل سے بددعائیں نکلتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں اسلام نے زکاۃ کا نظام رکھا، جب ایک مالدار اپنی زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو غریب کے دل سے اس کے لیے دعا نکلتی ہے: یا اللہ! اس کے کاروبار کو برکت دے تاکہ یہ اگلے سال بھی ہمیں زکوٰۃ دے سکے۔ یوں غریب کے دل سے حسد اور نفرت نکل جاتی ہے اور اس کی جگہ محبت اور خیر خواہی آ جاتی ہے، یہی اسلامی نظام کی برکت ہے کہ وہ دلوں کو جوڑتا ہے، توڑتا نہیں۔

مال کی گردش اور قرآن کا قانون:

زکوٰۃ کا جو نظام اسلام نے قائم فرمایا ہے، وہ درحقیقت آج دنیا کے سب سے بڑے مسئلے افراط وتفریط کا حل ہے۔ آج مالدار، اور زیادہ مالدار بنتے جا رہے ہیں جبکہ غریب طبقہ دن بدن

پستی میں جارہا ہے۔قرآنِ کریم نے اس حقیقت کو یوں بیان فرمایا:''کَیۡ لَا یَکُوۡنَ دُوۡلَۃًۢ بَیۡنَ الۡاَغۡنِیَآءِ مِنۡکُمۡ ؕ ''(حشر:۷) یہ مال صرف مالداروں کے درمیان ہی گردش نہ کرتا رہے۔ اسلام نے اس عدم توازن کو ختم کرنے کے لیے زکوٰۃ کا نظام نافذ کیا۔جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بازاروں میں گشت فرمایا اور معاملات کو اصول و ضابطہ کے ساتھ درست کروایا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عدل دیکھئے کہ ایک مرتبہ آپ گزرے تو گیہوں کی ایک بوری نظر آئی، جو اوپر سے خشک اور صاف دکھائی دے رہی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ اندر ڈالا تو نیچے کا حصہ گیلا پایا، تاکہ وزن زیادہ ہو۔آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً ارشاد فرمایا:''من غش فلیس منا'' (ترمذی:ابواب البیوع، باب ماجاء فی کراھیۃ الغش فی البیوع) جو دھوکا دے، اس کا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔

اللہ کی عطا اور منع پر کسی کا اختیار نہیں:

بزرگو اور دوستو! جتنا زیادہ تقویٰ ہمارے اندر پیدا ہوگا، اللہ پاک کا خوف اور خشیت بھی اتنی زیادہ آئے گی اور آج بھی ہم بار بار اللہ پاک کی قدرت اور طاقت کو دیکھ رہے ہیں۔وہ علیم وخبیر ذات ہے، کائنات کے سارے خزانے جس کے قبضے میں ہیں، وہ جب چاہے جسے دے دے، اور جب چاہے جس سے چاہے چھین لے، دن رات ہم یہ مشاہدہ کر رہے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:''وَاِنۡ یَّمۡسَسۡکَ اللّٰہُ بِضُرٍّ فَلَا کَاشِفَ لَہٗۤ اِلَّا ہُوَ ؕ ''(انعام:۱۷) اگر اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچادے تو اس کے سوا کوئی اس کو دور کرنے والا نہیں اور اگر اللہ کچھ عطا فرما دے تو کوئی اس کے دینے کو روک نہیں سکتا۔

مظلوم کی بے چینی اور انتقام کی آگ:

اگر انسان کا اپنے اللہ سے سچا تعلق نہ ہو تو وہ دوسروں کے حقوق پر دعویٰ کرنے لگتا ہے۔ جیسے کہ پہلے ذکر ہوا کہ ایک بادشاہ وقت نے کہا تھا: پل صراط پر میری ہمت نہیں کہ تیرا حق دوں، آؤ! یہیں دنیا میں تمہیں انصاف دیتا ہوں۔یہی تصورِ آخرت اور اللہ کا خوف ہے جس نے اسے فوری عدل پر آمادہ کیا۔اسلام نے عدل و انصاف کو قائم کرنے کے لیے عدلیہ اور قانون میں

آسانیاں فراہم کیں، مگر دنیا کے عام ممالک میں صورتحال مختلف ہے، لمبے لمبے مقدمات چلتے رہتے ہیں۔ خصوصاً ہندوستان میں تو ویسے ہی ججوں کی کمی ہے، ہر دس لاکھ افراد پر بمشکل ایک جج ہے، اسی بنیاد پر ہزاروں لاکھوں کیس سالہا سال سے زیر التواء (Pending) پڑے رہتے ہیں، جب انصاف میں تاخیر یا محرومی ہوتی ہے تو مظلوم کے دل میں بے چینی اور انتقام کی آگ بھڑکتی ہے، اور وہ کسی نہ کسی طریقے سے اس آگ کو بجھانے کی کوشش کرتا ہے۔

دیت اور قصاص کا عادلانہ اختیار:

اللہ پاک نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا: ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ '' (بقرہ:۱۷۸) کوئی شخص کسی کو قتل نہ کرے، نہ بھول سے اور نہ قصداً؛ لیکن اگر ایسا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ اس کا فیصلہ اسلامی حکومت کرے گی۔ اس کا انتقام انسانوں کے ہاتھ میں نہیں چھوڑا گیا، تاکہ معاشرے میں لاقانونیت نہ پھیلے۔ آج ہم دیکھتے ہیں کہ کسی کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے تو لوگ تحقیق و تفتیش کے بغیر ہی مارنے کے لیے دوڑ پڑتے ہیں، قصور کس کا ہے؟ یہ جانے بغیر ایک کو مظلوم اور دوسرے کو ظالم قرار دے دیا جاتا ہے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرزِ عمل کو ختم فرمایا اور عدل کا نظام دیا، اگر مرنے والے کے ورثا دیت پر راضی ہوں تو ان کو اختیار ہے، لیکن یہ ہرگز درست نہیں کہ وہ دیت بھی لیں اور پھر قتل کا انتقام بھی لیں، اسلام نے ایسے ظلم کو ختم کر کے عدل و انصاف کا راستہ قائم فرمایا۔

تقویٰ اور خوفِ الٰہی سے مضبوط معاشرہ:

اللہ پاک نے اس رویے کو روکنے کے لیے ارشاد فرمایا کہ جس نے قتل کیا وہ بھی تمہارا بھائی ہے اور جس کو قتل کیا گیا وہ بھی تمہارا بھائی۔ قرآن کریم نے لفظ ''اَخ'' استعمال فرمایا: ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ'' اتنی بڑی زیادتی کے باوجود بھی اسلام نے یہ تصور دیا کہ: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'' یقیناً مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اس سے واضح ہوا کہ جتنا زیادہ ہمارے دلوں میں اللہ کا خوف اور تقویٰ پیدا ہوگا، اتنا ہی ہمارا تعلق اللہ پاک سے مضبوط

ہوگا۔ پھر محبت اور بھائی چارے کی بنیاد پر انسان گناہوں کے خلاف کھڑا ہوگا، اسی لیے اسلام نے سماجی زندگی کو قائم رکھا اور ایک مضبوط سوسائٹی کا تصور دیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا'' (انعام:۱۲۳) اگر قوم کے بڑے گناہ کرتے ہیں تو ساری قوم تباہی کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ اور مزید فرمایا: ''كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ'' (مائدہ:۷۹) یہود کے علماء پر لعنت کی گئی کیونکہ وہ ایک دوسرے کو برائی سے روکتے نہیں تھے۔

انسانی معاشرے کا بگاڑ اور گناہوں کی آندھی:

دوستو اور بزرگو! آج کے انسانی سماج پر نظر ڈالیں تو گناہوں کی کثرت ہر طرف دکھائی دیتی ہے۔ یہ صرف کسی ایک قوم یا طبقے کا مسئلہ نہیں، بلکہ پورے انسانی معاشرے میں گناہوں کا سیلاب بہہ رہا ہے، اور انہی برائیوں نے ہمیں بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اس کے نتیجے میں ہمارے درمیان مالیاتی مسائل، سماجی بگاڑ اور سیاسی انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ یہ سب وہ بیماریاں ہیں جو باہر سے آئیں اور ہم نے انہیں اپنا لیا۔ اسی لئے میں نے آپ کے سامنے یہ آیت تلاوت کی: ''اِنَّهٗ مَنْ يَّاْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَاِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ'' (طہٰ:۷۴) جو اپنے رب کے پاس مجرم ہو کر جائے گا، اُس کے لیے جہنم ہے۔ اور جو نیک اعمال کے ساتھ حاضر ہوگا، اس کے لیے جنت کی خوشخبری ہے۔

دوستو اور بزرگو! یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کمالِ فضل ہے کہ جنت کی طلب انسان کو گناہوں سے روکتی ہے، اور جہنم کی ہولناکی اور اس کا خوف انسان کو رات کی تنہائیوں میں بھی برائی سے باز رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمارے سماج کو ان برائیوں سے محفوظ فرمائے، ہمیں گناہوں سے بچنے والا بنائے، اور پوری انسانیت تک نبی اکرم ﷺ کا رحمت بھرا پیغام پہنچانے کی عملی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۴)

حسد کی قباحت و مذمت

الحمدلله رب العالمین و الصلوٰۃ و السلام علی سید المرسلین و علی آلہ و اصحابہ اجمعین. اما بعد!

قال اللہ تبارك و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید.

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۰﴾ (حشر:۱۰)

وقال تعالیٰ:

اَمْ يَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰى مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ فَقَدْ اٰتَيْنَآ اٰلَ اِبْرٰهِيْمَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاٰتَيْنٰهُمْ مُّلْكًا عَظِيْمًا ﴿۵۴﴾ (نساء:۵۴)

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم: إیاکم والحسدَ فإن الحسدَ یأکلُ الحسناتِ کما تأکلُ النارُ الحطبَ. (ابو داود: کتاب الادب، باب فی الحسد)

صدق اللہ العظیم و صدق رسولہ النبی کریم و نحن علی ذالک لمن الشاھدین و الشاکرین و الحمدللہ رب العالمین

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج آپ حضرات کے سامنے میں نے جو آیاتِ قرآنی اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت پیش کی ہیں، اُن کے اندر اللہ تبارک و تعالیٰ نے ہماری ایک بڑی روحانی بیماری کی طرف توجہ دلائی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اصول اور

آداب کے ذریعے رہنمائی عطا فرماتے ہیں، گزشتہ جمعہ کے خطبے میں ہم نے غیبت اور چغلی کے بارے میں گفتگو کی تھی، آج اسی سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ایک اور باطنی مرض کی طرف توجہ دلاتا ہوں، اور وہ ہے حسد۔ یہ وہ بیماری ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے دل میں کینہ رکھے اور اُس کی نعمت یا کامیابی کو اپنے لیے بوجھ سمجھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اس مرض کی شدید مذمت فرمائی اور اس کے بُرے نتائج کو واضح کیا ہے۔

اہلِ ایمان کا شیوہ؛ قربانی اور ایثار:

قرآن کریم کی مختلف آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے حسد رکھنے سے سختی کے ساتھ منع فرمایا ہے؛ بلکہ حیرت کی بات یہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں حسد کا ذکر آیا ہے، وہاں اسے کبھی مومن کی صفت کے طور پر بیان نہیں کیا گیا؛ بلکہ یہود، نصاریٰ، منافقین اور مشرکین کی صفات میں شمار کیا گیا ہے، اس کے برعکس جب ایمان والوں کا ذکر آیا تو اللہ تعالیٰ نے ایک بالکل مختلف انداز اختیار فرمایا۔ مثال کے طور پر فقراء مہاجرین کا ذکر کیا، وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جنہوں نے دین کی خاطر اپنی جان و مال سب کچھ قربان کر دیا، اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے ان کی تعریف فرمائی۔ پھر انصار کی عظمت کو بیان کیا جنہوں نے مہاجرین کو خوش دلی کے ساتھ اپنے گھروں اور مالوں میں جگہ دی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ دعا سکھائی: ''وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ'' جو لوگ ان کے بعد آئیں وہ یہ دعا کریں: ''رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ'' اے ہمارے رب! ہمیں اور ہمارے اُن بھائیوں کو بخش دے جو ہم سے پہلے ایمان کی حالت میں دنیا سے رخصت ہوئے۔ پھر فرمایا: ''وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا'' ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے بارے میں کوئی کینہ، کوئی بغض اور کوئی حسد نہ رہنے دے۔ دوستو! یہ وہ دعا ہے جو اللہ تعالیٰ نے خود ہمیں سکھائی تاکہ ہم اپنے دلوں کو حسد، کینہ اور بغض سے پاک رکھیں اور ایمان والے بھائیوں کے ساتھ اخوت اور محبت کے رشتے کو مضبوط بنائیں۔

حسد کی اصل بیماری؛ نعمت نہ دیکھ پانا:

روئے زمین پر سب سے پہلا جو گناہ ہوا، بلکہ آسمان کی دنیا میں بھی سب سے پہلا گناہ، وہ حسد ہی کی بنیاد پر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کریں۔ سب نے سجدہ کیا، ''اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط '' مگر شیطان نے سجدہ نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ نے شیطان کا جواب نقل کیا: ''خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ ﴿۱۲﴾'' (اعراف:۱۲) آپ نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور آدم کو مٹی سے بنایا۔ پھر کہا: ''اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ ج '' میں اس سے بہتر ہوں، اس لیے میں سجدہ نہیں کروں گا، یہ آسمانی دنیا کا پہلا گناہ تھا جو شیطان نے کیا، اور یہ تکبر اور حسد ہی کی بنیاد پر تھا، اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسرے کو حقیر جاننا، یہی حسد کی جڑ ہے۔ دوستو! حسد ہمیشہ اس وقت جنم لیتا ہے جب ایک انسان دوسرے کے پاس اللہ کی دی ہوئی نعمت دیکھ کر برداشت نہیں کر پاتا، چاہے وہ مال و دولت ہو، عہدہ و منصب ہو، حسن و جمال ہو یا اچھے اخلاق اور صفات ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مختلف لوگوں کو مختلف انعامات سے نوازا ہے، اور ایک مومن کو یہ سکھایا گیا ہے کہ کبھی اللہ کے بندے پر کی گئی نعمت پر حسد نہ کرو۔ ہاں! یہ دعا ضرور کر سکتے ہو: اے اللہ! جس طرح آپ نے اس بندے کو نوازا ہے، مجھے بھی اپنی نعمت سے نواز دیجئے۔ یہ جائز اور پسندیدہ دعا ہے۔

اللہ کے فیصلوں پر ناراضگی:

لیکن جب حسد کا مسئلہ آیا تو یہودیوں نے نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو اپنی کتابوں میں صاف اور واضح نشانیوں کی صورت میں پایا، اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر دیا۔ اللہ پاک نے ارشاد فرمایا: ''حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ج '' (بقرہ:۱۰۹) ان کے سامنے حق بالکل واضح ہو چکا تھا، یہ جانتے تھے کہ ان کی آسمانی کتابوں میں جس نبی کا ذکر ہے وہ یہی نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؛ لیکن اللہ پاک فرماتے ہیں کہ یہ محض حسد کی بنیاد پر تھا؛ کہ بنی اسماعیل میں سے نبی کیوں بھیجا گیا اور بنی اسرائیل میں سے کیوں نہیں؟ اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا: ''اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ

عَلٰی مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۚ ''کیا یہ لوگ اس پر حسد کرتے ہیں کہ اللہ پاک نے اپنے فضل سے کسی کو نواز دیا؟ یعنی حقیقت میں یہ حسد کسی انسان سے نہیں؛ بلکہ اللہ کے فیصلے پر ناراضگی ہے اور انسان ہو کر بندہ اللہ تعالیٰ کے فیصلوں پر ناراض ہو! یہ کتنا بڑا جرم ہے!

حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: حسد کی جڑ تکبر ہے۔ آدمی اپنے ہم عصر یا ہم پلہ شخص کو اپنے سے آگے دیکھنا برداشت نہیں کرتا؛ چاہے وہ مالی اعتبار سے ہو یا علمی اعتبار سے، اور اسی بنیاد پر اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی لیے قرآن وحدیث نے حسد سے بچنے کی سخت تاکید فرمائی ہے۔

نعمت چھپاؤ، حسد سے بچو:

حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں کے درمیان جو واقعہ پیش آیا، اس کی وجہ بھی یہی تھی کہ ایک نے اپنے آپ کو دوسرے سے بڑا سمجھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تقسیم ہوئی تھی، اسے قبول نہ کیا۔ اللہ پاک نے چھوٹے بھائی کی قربانی قبول فرمائی اور بڑے کی قربانی قبول نہ ہوئی، تو اس پر وہ حسد میں مبتلا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو ذکر کر کے ہمیں بتلایا کہ روئے زمین پر سب سے پہلا گناہ تکبر اور حسد ہی کی بنیاد پر ہوا تھا۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرت یوسفؑ کا قصہ بھی ذکر ہوا ہے۔ حضرت یوسفؑ نے اپنا خواب اپنے والد حضرت یعقوبؑ کے سامنے بیان کیا، حضرت یعقوبؑ نے فرمایا: ''لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ '' (یوسف:۵) اپنے بھائیوں کے سامنے اپنا خواب بیان نہ کرنا۔ اس آیت کریمہ کی روشنی میں مفسرین فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائے، خواہ وہ دنیوی ہو یا اخروی، تو ہر جگہ اس کا اظہار نہ کرے، ورنہ حسد کرنے والے پیدا ہوں گے۔

نعمت کا تذکرہ شکر بنے، فخر نہیں:

حضرت مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ نے کسی بندے کو کوئی نعمت عطا فرمائی ہو تو اس کو لوگوں کے سامنے بہت زیادہ کھول کر بیان نہ

کرے۔لوگوں کے سامنے فخر اور تکبر کے انداز میں اس کا اظہار نہ کرے؛ بلکہ عمومی طور پر اللہ پاک کی دی ہوئی نعمتوں کو چھپانا بہتر ہے۔البتہ ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمایا: ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ ﴿۱۱﴾'' (ضحیٰ:۱۱) اور اپنے رب کی نعمت کا تذکرہ کرو۔اگر نعمت کا ذکر ہو بھی تو وہ تکبر اور غرور کے انداز میں نہیں بلکہ شکر کے انداز میں ہونا چاہیے، ذکر اس لیے ہو کہ دل میں شکر پیدا ہو اور سننے والے بھی اللہ کی نعمتوں کو پہچانیں۔

حسد نعمت چھیننا چاہتا ہے، رب نعمت بڑھاتا ہے:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کے قصے میں بھی اشارہ فرمایا کہ ان کے بھائیوں نے حسد کیا اور جتنا ان کے بس میں تھا سب کچھ کیا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو وہی مرتبہ عطا فرمایا جس کا خواب آپ نے دیکھا تھا۔اللہ پاک نے آپ کو عزیز مصر کے دربار تک پہنچا دیا اور وہاں آپ کو پورے ملک کا ذمہ دار بنا دیا۔ظاہری اور باطنی ہر نعمت سے آپ کو نوازا، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''وَكَذٰلِكَ يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ'' (یوسف:۶) اسی طرح تیرا رب تجھے برگزیدہ کرے گا اور تجھے خوابوں کی تعبیر کا علم عطا فرمائے گا۔ابھی حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں تھے اور اسی وقت اللہ کی طرف سے بشارت آ گئی کہ انجام کار بلندی ہی ملے گی۔پس، یہ حسد ہی تھا جس نے ان کے بھائیوں کو اس پر آمادہ کیا کہ اپنے بھائی کو کنویں میں ڈال دیں اور پھر مصر کے بازار میں بیچنے تک لے آئے، مگر ان کے تمام حسد کے باوجود وہی کچھ ہوا جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے چاہا تھا۔اسی لئے قرآن کریم ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے: ''وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ'' اللہ کے فضل سے مانگو۔اگر تم اپنے کسی بھائی کے پاس کوئی نعمت دیکھو تو حسد کرنے کے بجائے اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہیں بھی اپنی رحمت سے نوازے؛ لیکن یہ دعا کرنا کہ اس کی نعمت زائل ہو جائے، یہی حسد ہے اور یہ ناجائز ہے، اسی لئے کتاب اللہ نے بار بار حسد کا ذکر فرمایا ہے، کبھی منافقین کے تعلق سے، کبھی یہود و نصاریٰ کے بارے میں اور کبھی مشرکین کے ضمن میں۔

انسان کی تدبیر اور رب کی تقدیر:

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ایک واقعہ نقل کرتے ہیں کہ بادشاہ کے دربار میں دو آدمی بڑے مرتبے پر فائز تھے، ان میں سے ایک دوسرے سے حسد کرتا تھا، حسد کرنے والے نے سازش رچی اور اپنے ساتھی کو نیچا دکھانے کے لئے ایک منصوبہ بنایا، اس نے اپنے ساتھی کو کھانے پر بلایا اور کھانے میں جان بوجھ کر زیادہ لہسن ڈال دیا۔ پھر بادشاہ سے جا کر کہا: یہ شخص جب دربار میں آپ کے سامنے آتا ہے تو منہ پر کپڑا رکھ لیتا ہے، کیونکہ وہ آپ کی منہ کی بدبو برداشت نہیں کرتا، جب وہ شخص دربار میں حاضر ہوا تو واقعی اس نے لہسن کھایا ہوا تھا، اس لئے اس نے منہ ڈھانپ لیا، بادشاہ کو شک ہو گیا کہ یہ سب باتیں درست ہیں۔ بادشاہ نے ایک خط لکھ کر ایک وزیر کے نام بھیجا کہ: اس شخص کو قتل کر دیا جائے اور اس کی نعش چمڑے میں بھر کر ہمارے پاس بھیجی جائے، بادشاہ نے وہ خط اس شخص کے حوالے کیا، یہ دربار سے نکلا تو اس کا حاسد ساتھی سمجھا کہ یقیناً بادشاہ نے اسے انعام واکرام کے لئے بھیجا ہے، اس نے کہا: یہ خط مجھے دے دو، میں پہنچا دیتا ہوں، خط لے کر وہ خوشی خوشی چلا گیا۔ وزیر نے خط کھولا تو اس میں قتل کا حکم تھا، وزیر نے کہا: یہی حکم بجالانا ہے، اس نے لاکھ کہا کہ یہ خط میرا نہیں تھا، میں کسی کی طرف سے لایا ہوں، مگر وزیر نے کہا: بادشاہ کا حکم واپس نہیں جا سکتا، چنانچہ اسے قتل کر دیا گیا۔ کچھ دن بعد وہ شخص، جس کے خلاف سازش ہوئی تھی، دوبارہ دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ کو تعجب ہوا کہ جسے قتل کا حکم دیا تھا وہ تو زندہ سلامت ہے، اور اسی وقت دوسرے کی لاش بھی دربار میں پہنچ گئی، بادشاہ نے حقیقت جان کر کہا: گھبراؤ مت! یہ اللہ کا فیصلہ ہے۔ تمہارا ساتھی تم سے حسد کرتا تھا اور میرے پاس بار بار تمہارے خلاف باتیں کرتا تھا اور تمہارا منہ ڈھانپنے کا سبب اس نے یہ بتایا کہ تم مجھے ناپسند کرتے ہو، اس شخص نے عرض کیا: حقیقت یہ ہے کہ اس نے مجھے ایسا کھانا کھلایا تھا جس میں لہسن کی بدبو تھی، دربار کا وقت قریب تھا اس لئے میں منہ ڈھانپ کر آ گیا۔

حضرت امام غزالیؒ یہ قصہ ذکر کیا کہ جس نے حسد کیا، وہی اپنی چال میں پھنس کر ہلاک

ہوگیا، اس نے لالچ میں سمجھا کہ نعمت ملنے والی ہے، مگر نتیجہ یہ ہوا کہ وہی قتل کر دیا گیا۔ اس واقعے سے کئی عبرتیں ملتی ہیں: سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص آپ کے پاس کسی کے بارے میں کوئی خبر لائے تو فوراً یقین نہ کریں، بلکہ اس کی اچھی طرح تحقیق کریں، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن جَاءَكُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا أَن تُصِيبُوا قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلَىٰ مَا فَعَلْتُمْ نَادِمِينَ'' (حجرات:۶) اے ایمان والو! اگر کوئی فاسق تمہارے پاس خبر لائے تو اس کی تحقیق کر لو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم نادانی میں کسی قوم کو نقصان پہنچا بیٹھو اور بعد میں پچھتاتے رہ جاؤ۔ تو حضرت امام غزالیؒ یہ فرمانا چاہتے ہیں کہ حسد کرنے والا دراصل اپنی ہی آگ میں جلتا ہے، اسے کبھی سکون نہیں ملتا۔ اسی لئے حضرت معاویہؓ فرمایا کرتے تھے: میں اپنے سب دشمنوں کو راضی کر سکتا ہوں، لیکن حاسد کو راضی نہیں کر سکتا کیوں کہ وہ جس نعمت پر حسد کر رہا ہے، وہ اللہ کی دی ہوئی ہے اور جب تک وہ نعمت میرے پاس ہے، اس کا حسد باقی رہے گا۔ (تاریخ ابن عساکر: حرف المیم، معاویۃ بن صخر ابی سفیان: ۵۹/۲۰۰)

دل کی پاکیزگی اور سچی دعا:

دوستو اور بزرگو! قرآن کریم نے ہمیں ان آیات میں یہ سبق دیا ہے کہ ہمارے آپسی جھگڑوں اور لڑائیوں کی جڑ اکثر جھوٹی خبریں اور بے جا وسوسے ہوتے ہیں، کوئی خبر دینے والا بات پہنچا دیتا ہے اور ہم تحقیق کے بغیر مان لیتے ہیں، پھر دل کا نفس بھی اس وقت بیدار ہوتا ہے جب ہم کسی کو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں دیکھتے ہیں اور یہ سوچنے لگتے ہیں کہ یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے، چاہے ہمیں ملے یا نہ ملے۔ یہی اصل میں حسد ہے؛ لیکن اگر کسی کو اللہ نے کوئی نعمت عطا کی ہو اور ہم اللہ سے دعا کریں کہ یا اللہ! مجھے بھی ایسی نعمت عطا فرما، تو یہ حسد نہیں بلکہ رشک ہے۔ جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ، جو خود بڑے محدث اور شارح حدیث تھے، انہوں نے کعبۃ اللہ کے پردے کو پکڑ کر دعا کی: اے اللہ! مجھے امام ذہبیؒ جیسا حافظہ عطا فرما؛ کیونکہ امام ذہبیؒ بہت تیزی سے یاد کر لیتے تھے، یہ رشک ہے، جو دل کو پاکیزہ بناتا ہے اور اللہ سے

مانگنے کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔اسی طرح اگر آپ دیکھیں کہ کسی کا بیٹا حافظ ہے، عالم ہے، ڈاکٹر ہے یا انجینئر ہے تو اللہ سے دعا کریں: یا اللہ! میرے بیٹے کو بھی ایسا بنا دے۔ یہ دعا ہے، رشک ہے؛ لیکن اگر دل میں یہ خیال آئے کہ بس یہ نعمت اس کے پاس نہ رہے، تو یہ اللہ کی تقسیم پر اعتراض ہے۔ یاد رکھیے! اللہ ہی بہتر جانتے ہیں کہ کس کو کون سی نعمت عطا کرنی ہے اور کس سے کیا لینا ہے۔اسی لئے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إیّاکم و الحسدَ، فإن الحسدَ یأکلُ الحسناتِ کما تأکلُ النارُ الحطبَ.'' حسد سے بچو، اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اسی طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو جلا کر راکھ بنا دیتی ہے۔(ابو داود: کتاب الادب، باب فی الحسد)

دل کی صفائی؛ جنت کا راستہ:

جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: انس! تم اس طرح صبح اور شام گزارو کہ تمہارے دل میں کسی کے لئے ذرہ برابر بھی کینہ یا حسد نہ ہو۔(ترمذی: ابواب العلم عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، باب الاخذ بالسنة و اجتناب البدع) اسی مضمون کی ایک اور حدیث میں مزید وضاحت ہے، مسلم شریف میں آتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کے درمیان بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک صحابی وضو کر کے، اپنے ہاتھ میں چپل لئے، وہاں سے گزر رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ابھی تمہارے پاس سے ایک جنتی شخص گزرے گا، اگلے دن بھی وہی صحابی گزرے تو پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ جنتی ہیں۔تیسرے دن بھی یہی منظر ہوا اور تین مرتبہ آپ نے ان کے جنتی ہونے کی بشارت دی، یہ صحابی حضرت سعد بن مالک انصاری رضی اللہ عنہ تھے۔حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ آخر ایسا کون سا عمل ہے جس کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنتی قرار دیا ہے، وہ ان کے پاس گئے اور کہا: میرے والد سے کچھ رنجش ہوگئی ہے، میں چند دن آپ کے ہاں رہنا چاہتا ہوں، حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے تین دن تک ان کی عبادتیں دیکھیں، کچھ تہجد پڑھتے، ذکر کرتے، پانچ وقت کی نماز باجماعت ادا کرتے، لیکن کوئی غیر معمولی عبادت نظر نہ

آئی۔ تین دن بعد انہوں نے کہا: حقیقت یہ ہے کہ میرا والد سے کوئی جھگڑا نہیں تھا، میں تو صرف یہ جاننے آیا تھا کہ وہ کون سا عمل ہے جس کی بنیاد پر رسول اللہ ﷺ نے تین دن لگاتار آپ کے جنتی ہونے کی بشارت سنائی، حضرت سعدؓ نے فرمایا: تم نے جو کچھ دیکھا، وہی میرا عمل ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، حضرت عبداللہؓ نے اصرار کیا کہ ضرور کوئی خاص بات ہے، اس پر حضرت سعدؓ نے کہا: ہاں، ایک چیز ہے، میرے دل میں کبھی کسی مسلمان کے متعلق حسد نہیں آتا اور نہ ہی میں کسی کے لئے برائی چاہتا ہوں، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ نے کہا: بس یہی وہ عمل ہے جس کی بنیاد پر نبی اکرم ﷺ نے تمہارے جنتی ہونے کی بشارت دی۔ (مسند احمد: رقم: ۱۲۸۹۴)

اللہ کی عطا ناقابلِ زوال:

میں نے آپ کے سامنے جو آیت پڑھی، اس میں اللہ تعالیٰ جنتیوں کی ایک عظیم صفت ذکر فرماتے ہیں ''وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِّنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَىٰ سُرُرٍ مُّتَقَابِلِينَ ﴿٤٧﴾'' (حجر: ۴۷) ہم ان کے دلوں سے ہر طرح کا کینہ اور رنجش نکال دیں گے، اور وہ سب بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ یہاں اللہ نے بتایا کہ جنت میں داخل ہونے والوں کے دل بالکل صاف ہوں گے، وہاں نہ حسد ہوگا، نہ بغض، نہ کینہ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کی دعا بھی قرآن میں ذکر فرمائی: ''رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا'' (حشر: ۱۰) اے ہمارے رب! ہمیں بخش دے اور ہمارے ان بھائیوں کو بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے، اور ہمارے دلوں میں ایمان والوں کے لئے کوئی کینہ نہ رکھ۔ احادیث میں بھی ایک طرف حسد سے بچنے کی بار بار تلقین کی گئی ہے اور دوسری طرف یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگو کہ ہمارے دل صاف رہیں۔ اس کا علاج یہی ہے کہ انسان توبہ کرے، رجوع کرے اور یہ یقین رکھے کہ اللہ علیم وحکیم ہے، وہ جانتا ہے کہ کس کو کون سی نعمت دینی ہے اور کس کو روکنی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے دعاؤں میں ہمیں یہ

الفاظ سکھائے: ''اللّٰهُمَّ لا مَانِعَ لِمَا أَعْطَيْتَ، وَلَا مُعْطِيَ لِمَا مَنَعْتَ، وَلَا يَنْفَعُ ذَا الْجَدِّ مِنْكَ الْجَدُّ.'' (بخاری: کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلاۃ) اے اللہ! جو تو عطا کرے اسے کوئی روکنے والا نہیں، اور جسے تو روک دے اسے کوئی دینے والا نہیں، اور کسی کی کوشش اور زور تیرا فیصلہ نہیں بدل سکتا۔ لہٰذا کوئی کتنا ہی حسد کرے، اللہ کی عطا ہوئی نعمت زائل نہیں ہوسکتی۔ اصل ضرورت یہ ہے کہ ہم اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں اور دلوں کو پاکیزہ رکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی میں یہ دعا سکھائی: ''وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ ۝'' (فلق:۵) اور حسد کرنے والے کے شر سے جب وہ حسد کرے، میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں۔ جناب نبیٔ اکرم ﷺ پر یہود نے حسد کی بنیاد پر جادو کیا، اور اس کے علاج کے لئے اللہ تعالیٰ نے دو عظیم سورتیں، سورہ فلق اور سورہ ناس نازل فرمائیں، اس میں واضح پیغام دیا کہ بندہ اللہ کی پناہ مانگے، کیونکہ حسد جب عملی شکل اختیار کرتا ہے، تو وہ دوسروں کو نقصان پہنچانے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لئے قرآن نے ہمیں یہ دعا سکھائی کہ ہم حاسد کے شر سے اللہ کی حفاظت میں آجائیں۔

ظالم بھی مظلوم؛ حاسد کی بے سکونی:

ایک عرب شاعر کہتا ہے: دنیا میں اس شخص سے زیادہ مظلوم کوئی نہیں جو خود ظالم ہے۔ حاسد ہمیشہ اپنی آگ میں جلتا رہتا ہے، جس پر حسد کیا جارہا ہے، وہ تو سکون سے سوتا ہے، اس کا کاروبار چلتا ہے، کھیتوں میں برکت ہوتی ہے، لوگ اس سے خوش رہتے ہیں؛ لیکن حاسد راتوں کو کروٹیں بدلتا ہے اور اس کا دل جلتا رہتا ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ جتنی وہ دوسرے کے نقصان کی تمنا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اکثر اسی کے مقابلے میں اُس کو اور زیادہ نعمت عطا فرماتے ہیں، آج ہماری سوسائٹی میں بھی یہی حال ہے، کوئی مال کی وجہ سے حسد کرتا ہے، کوئی عہدے پر، کوئی کپڑوں اور زیب و زینت پر، کوئی حسن و جمال پر اور کوئی کسی صلاحیت پر، مگر اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا سکھائی کہ ہم اس کے فیصلے پر راضی رہیں اور اس کی تقسیم پر اعتراض نہ کریں، یہی اصل سکون اور سب سے بڑی نعمت ہے۔

ترقی، مقابلہ اور دل کا امتحان:

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حسد کے کئی اسباب ہوتے ہیں۔ سب سے پہلی وجہ عناد اور تکبر ہے۔ جیسا کہ قرآن میں آیا: ''حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ '' (بقرہ: ۱۰۹) یہودیوں نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد کیا، اس کی بنیاد یہی عناد اور تکبر تھا، وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان برداشت نہ کر سکے۔ اسی طرح بعض اوقات دو آدمی ہم عمر اور ہم مرتبہ ہوتے ہیں، ایک ساتھ پڑھتے ہیں، کالج میں جاتے ہیں، یا کاروبار شروع کرتے ہیں؛ لیکن جب ایک آگے بڑھ جاتا ہے اور دوسرے کا کام پیچھے رہ جاتا ہے تو دل میں حسد پیدا ہوتا ہے۔ ایک سبب یہ بھی ہے کہ کوئی شخص دوسرے کا دوست یا ماتحت ہو، اس کے ساتھ رہتا ہو، اس کی بات مانتا ہو، لیکن جب اللہ تعالیٰ اس کو ترقی دے دیتا ہے تو یہ برداشت نہیں کر پاتا کہ وہ اپنے سے اوپر چلا گیا۔ اسی طرح مکہ کے مشرکین کا رویہ بھی یہی تھا، انہوں نے کہا: ''أَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَسُولًا'' کیا اللہ نے انہی کو رسول بنا دیا؟ اور ان کا اعتراض یہ تھا: ''لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْآنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيمٍ '' یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہ اتارا گیا؟ یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم یتیم تھے، یہی چیز ان کے دل میں حسد کا سبب بنی۔ قرآن کریم نے بار بار ان کی اس حسد بھری سوچ کو بیان کیا ہے۔

سماج کی کڑواہٹ:

حسد کی ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ انسان خود ترقی نہیں کر پاتا، اس کی ساری سوچ اور محنت اس بات پر لگتی ہے کہ دوسروں کو کس طرح نقصان پہنچائے، کس طرح کسی کو نیچا دکھائے، جس پر حسد کیا جا رہا ہے، وہ تو بے خبر اپنی محنت کرتا ہے اور ترقی کی منزلیں طے کرتا جاتا ہے، لیکن حاسد اپنی ہی آگ میں جل کر پیچھے رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی غیبتوں، چغلیوں اور حسد کی وجہ سے کڑواہٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں اصل مقابلے کا معیار یہ بتایا ہے: ''وَفِيْ ذٰلِكَ فَلْيَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ ۝۲۶'' (مطففین:

۲۶) اگر مقابلہ کرنا ہے تو نیکیوں اور اچھے کاموں میں آگے بڑھنے کے لئے کرو۔

صحبت کا اثر اور دل کی راحت:

حضرت عبداللہ ابن مبارک رحمۃ اللہ علیہ بڑے محدث اور عالم تھے۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے میں مالدار لوگوں کی مجلس میں بیٹھتا تھا، وہاں گفتگو کروڑوں اور اربوں کی ہوتی تھی، اور میرے پاس کچھ بھی نہ ہوتا تو دل پر بوجھ سا آجاتا تھا، پھر میں نے ان کی صحبت چھوڑ دی اور غریبوں اور عام لوگوں کی مجلس اختیار کی، وہاں بات ہوتی تھی سو، ہزار کی، اور دل کو سکون ملتا تھا۔ یہی اصل راز ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جس کو جو نعمت عطا کی ہے، وہ اس کی حکمت اور فیصلہ ہے۔ ہمارا کام یہ ہے کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں، دوسروں پر حسد کے بجائے اپنے لئے دعا کریں اور حلال طریقے سے جو اللہ نے دیا ہے، اس کو استعمال کریں۔ یہی شکر گزاری ہے اور یہی دل کا سکون ہے۔

مال آزمائش ہے، کامیابی کا معیار نہیں:

ہمارے سماج میں اکثر کڑواہٹ کی بنیاد مال و دولت ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ مال اللہ کی دی ہوئی نعمت ہے، اور اس کے ملنے یا نہ ملنے سے جنت یا اللہ کی محبت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ جس سے محبت کرتے ہیں، اسے بھی مال دے دیتے ہیں، اور جسے آزمائش میں ڈالنا چاہتے ہیں، اسے بھی مال عطا فرما دیتے ہیں۔ اصل فضیلت اس میں ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی بندے کو مال عطا فرمائے اور وہ اس کے باوجود متواضع رہے، کبر اور حسد سے بچا رہے، تو یہ اللہ کا خاص فضل ہے۔ اسی لئے قرآن نے سکھایا: ''وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ'' اللہ کے فضل کو اللہ ہی سے مانگو، لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہیں، اور دلوں کو حسد و کینہ سے پاک کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کہی اور سنی باتوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، اس بیماری یعنی حسد سے ہماری حفاظت کرے، ہمارے دلوں کو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرح صاف فرمائے، ہماری دنیا بھی درست کرے اور ہماری آخرت بھی سنوار دے۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ

(۲۵)

وقف کی اہمیت اور وقف بورڈ کی ذمہ داریاں

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و اصحابه اجمعين، اما بعد!

قال الله تبارک و تعالیٰ فی الکلام المجید و الفرقان الحمید.

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ○ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ (نساء:۹۲)

و قال تعالیٰ:

هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ ﴿۳۸﴾ (محمد:۳۸)

و قال النبی ﷺ: إذا ماتَ الإنسانُ انقَطَعَ عنه عَمَلُه إلّا مِن ثَلاثةٍ: إلّا مِن صَدَقةٍ جارِيةٍ، أو عِلْمٍ يُنتَفَعُ به، أوْ وَلَدٍ صالِحٍ يَدْعُو له. (نسائی: کتاب الوصایا، فضل الصدقة عن الميت، مسلم کتاب الوصية، باب مايلحق الانسان من الثواب بعد وفاته)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

کامل نیکی کا راز؛ قربانی اور انفاق:

محترم ومکرم حضراتِ علماء کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جن آیات کی ابھی آپ حضرات کے سامنے تلاوت کی گئی، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ ایمان والوں کو نہ صرف حقوق

اللہ کی طرف متوجہ فرماتے ہیں بلکہ ساتھ ہی حقوق العباد کی بھی تاکید فرماتے ہیں۔ بالخصوص اللہ تعالیٰ کمزور، ضعیف، ناتواں اور پریشان حال بندوں کی خدمت اور ان کی مدد کرنے پر زور دیتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ ''تم ہرگز کامل نیکی کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنی پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ نہ کردو، اور جو کچھ بھی تم اللہ کے راستے میں خرچ کروگے، اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

دوسری آیت جو تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں: ''هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ ''اے لوگو! تمہیں بلایا جارہا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس موقع پر قرآن کریم نے ایمان والوں اور منافقین کے درمیان واضح فرق بیان کیا۔ منافقین کی عادت بخل اور تنگ دلی ہے، جبکہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی پہچان سخاوت اور فیاضی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ ۚ ''تم میں سے کچھ بخل کرتے ہیں اور کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر کے بخل سے کام نہیں لیتے، آگے اللہ تعالیٰ نے ایک سخت تنبیہ فرمائی: ''وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ''اگر تم منہ موڑو گے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کردے گا جو اس کے حکم کو بجالائے گی۔ پھر یاددہانی کروائی گئی: ''وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ ۚ ''اللہ غنی اور بے نیاز ہے، جبکہ تم سب محتاج اور فقیر ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے ہر مسئلے میں انسان اللہ پاک کا محتاج ہے۔

زندگی کے بعد ثواب کا جاری خزانہ:

دوستو اور بزرگو! جو روایت میں نے تلاوت کی، اس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب انسان دنیا سے رخصت ہوتا ہے تو اس کے تمام اعمال منقطع ہوجاتے ہیں، وہ نماز پڑھتا تھا، نماز ختم ہوگئی، وہ روزے رکھتا تھا، روزے بند ہوگئے، الغرض تمام عبادات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے؛ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إلّا مِن ثَلاثةٍ'' مگر تین چیزیں ایسی ہیں کہ انسان کے انتقال کے بعد بھی ان کا ثواب جاری رہتا ہے: ''صَدَقةٍ جارِيةٍ'' ایسا صدقہ جو مسلسل جاری رہے، جس سے لوگ برابر

فائدہ اٹھاتے رہیں۔ ''عِلْمٍ یُنتَفَعُ بہ'' وہ علم جو انسان چھوڑ جائے، چاہے کتابوں کی صورت میں ہو، دروس و بیانات کے ذریعے ہو یا مدارس و ادارے قائم کر کے ہو؛ ایسا علم جس سے لوگ فائدہ حاصل کریں۔ ''وَلَدٍ صالِحٍ یَدْعُو لہ'' نیک اولاد جو اپنے والدین کے لیے دعا کرتی رہے۔ یہ تین اعمال ایسے ہیں جو انسان کے مرنے کے بعد بھی اس کے نامۂ اعمال میں جاری رہتے ہیں۔

شیطان کا خوف اور رب کا وعدہ:

دوستو! آپ کے سامنے جو آیاتِ مبارکہ کی تلاوت کی گئی، ان کے علاوہ بھی قرآنِ کریم کی مختلف سورتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی بھرپور ترغیب دی ہے، قرآن میں فرمایا: ''اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ'' شیطان تمہیں فقر اور تنگ دستی سے ڈراتا ہے، یعنی یہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو تمہارے پاس کمی ہو جائے گی؛ لیکن آگے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَاللّٰہُ یَعِدُکُمْ مَّغْفِرَۃً مِّنْہُ وَفَضْلًا ط'' (بقرہ:۲۶۸) اللہ تمہیں اپنے فضل اور مغفرت کا وعدہ دیتا ہے۔ تم خرچ کرو گے تو اللہ تمہارے گناہ بھی معاف فرمائیں گے اور اپنے خزانے سے مزید عطا بھی فرمائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلا کام مسجد کے لیے زمین خریدنا تھا، جسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خرید کر وقف کر دیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں مدینہ منورہ کے اندر کم از کم گیارہ مساجد تعمیر ہوئیں، جنہیں مختلف صحابہ کرامؓ اور قبائل کے لوگوں نے بنایا اور پھر اللہ کی راہ میں وقف کر دیا۔ اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ سب کے حالات میں آتا ہے کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں اپنے اموال کو کثرت سے خرچ کیا اور مختلف چیزیں وقف فرمائیں۔

اسلامی اوقاف کا سنہری ماڈل:

دوستو اور بزرگو! سب سے پہلا وقف جس کی بنیاد رکھی گئی، وہ مسجدِ نبوی تھی، اس کے بعد جب خیبر کی فتح ہوئی اور بہت سا مالِ غنیمت مسلمانوں کو حاصل ہوا، تو حضرت عمر فاروقؓ کے

پاس بھی کچھ مال آیا، وہ اس کو لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے خیبر سے جو کچھ ملا ہے، میں چاہتا ہوں کہ اسے اللہ کی راہ میں دے دوں، اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کلمات ارشاد فرمائے، وہی آج ہمارے تمام اوقاف (وقف کے اداروں) کی بنیاد، ان کی شرطیں اور ان کے فوائد کا تعین کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إن شئتَ حبَستَ أصلَها وتصدَّقتَ بها'' اگر چاہو تو اصل کو روک لو (یعنی وہ چیز اپنی جگہ باقی رہے) اور اس کے نفع کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرتے رہو؛ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسی ہدایت کے مطابق زمین کو وقف کیا۔ امام بخاریؒ نے بخاری شریف میں نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے اعلان فرمایا: ''لایُباع، ولایُوھب، ولایُورث'' (بخاری: کتاب الشروط، باب الشروط فی الوقف) وقف کی ہوئی چیز نہ بیچی جائے گی، نہ کسی کو ہدیہ کی جائے گی، اور نہ وراثت میں تقسیم ہوگی۔ اس کے بعد فقہاء نے اسی بنیاد پر یہ اصول قائم کیا کہ کوئی شخص اپنی جائیداد، مکان، زمین، کنواں، مدرسہ یا مسافر خانہ وقف کرے تو وہ اللہ کے لیے مخصوص ہو جاتا ہے، اصل چیز باقی رہتی ہے اور اس کے منافع، آمدنی اور فوائد اللہ کی راہ میں خرچ کیے جاتے ہیں۔

باغِ ابوطلحہؓ: کامل نیکی کا عملی نمونہ:

خیر! جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی: ''لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ'' تم اپنی محبوب اور پسندیدہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ کیے بغیر کامل ایمان اور کامل نیکی تک نہیں پہنچ سکتے۔ اسی آیت پر عمل کرتے ہوئے حضرت ابوطلحہ انصاریؓ نے اپنا سب سے قیمتی باغ اللہ کی راہ میں پیش کیا، یہ باغ مسجدِ نبوی کے سامنے واقع تھا (جواب مسجد کے احاطے میں شامل ہو چکا ہے)۔ آج اگر کوئی باب فہد (۲۵ نمبر گیٹ) سے مسجدِ نبوی میں داخل ہو تو بائیں جانب صفوں کے بعد کونے پر ایک سفید ماربل کا پتھر نظر آتا ہے جس پر لکھا ہے: ''بیئر حاء'' یہی وہ کنواں ہے جو حضرت ابوطلحہؓ کے باغ میں تھا، اس باغ میں چھ سو کھجور کے درخت تھے، جب انہوں نے اللہ کی راہ میں یہ باغ پیش کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: میں نے

تمہارا یہ صدقہ قبول کیا، لیکن بہتر یہ ہے کہ تم اس کو اپنے رشتہ داروں میں تقسیم کرو؛ چنانچہ حضرت ابوطلحہؓ نے اپنے رشتہ داروں پر یہ باغ وقف کر دیا۔ (بخاری: کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علی الاقارب) یہ بتاتا ہے کہ اسلام میں وقف کی بنیاد صرف اجتماعی رفاہی کاموں کے لیے ہی نہیں بلکہ اقربا اور رشتہ داروں کی بھلائی کے لیے بھی رکھی گئی۔ درحقیقت، وقف کا تصور اسلام سے پہلے بھی دیگر مذاہب میں مختلف شکلوں میں موجود رہا ہے، اور آج بھی دنیا کے مختلف مذاہب کے ماننے والے اپنے مذہبی اور رفاہی مقاصد کے لیے وقف کرتے ہیں۔

وقف کا مفہوم اور موجودہ چیلنجز:

لیکن وقف اپنی حقیقت میں ایک مستقل اور الگ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ کتاب وسنت سے ثابت شدہ حکم ہے، ہمارے ملک میں ۱۹۳۷ء میں مسلم پرسنل لا ایکٹ بنایا گیا، جس میں وراثت کے اصول بھی مرتب کیے گئے، اسی پرسنل لا کا ایک اہم حصہ وقف بھی ہے، جس طرح پرسنل لا میں نکاح وطلاق کے مسائل آتے ہیں، اسی طرح وقف اور ہبہ کے مسائل بھی شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی مختلف آیات میں ایمان والوں کو بار بار ترغیب دی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرو، عام طور پر جب کوئی مال خرچ کرتا ہے تو وہ دوسروں کے کام آکر ختم ہو جاتا ہے، لیکن وقف کی نوعیت مختلف ہے۔ وقف کا مطلب ہی ''حَبْسُها علی مِلْك الله'' یعنی کسی چیز کو روک دینا کہ وہ اللہ کی ملکیت میں رہے۔ اصل چیز باقی رہتی ہے، مگر اس کا نفع ہمیشہ اللہ کی راہ میں استعمال ہوتا رہتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ آج بہت سے مسلمان بھی وقف کے صحیح مفہوم سے ناواقف ہیں، حال ہی میں جب پارلیمنٹ میں وقف سے متعلق بحث ہوئی تو اسے ملتوی کر دیا گیا تاکہ دوبارہ غور کیا جا سکے، اس موقع پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے علمائے کرام نے امت کو متوجہ کیا کہ سب سے پہلے خود امت مسلمہ کو یہ سمجھنا چاہیے کہ وقف کیا ہے، اس کی دینی حیثیت کیا ہے، اور حکومت اس میں کس قسم کی ترمیم لانا چاہتی ہے جس کی ہم مخالفت کر رہے ہیں۔

گنگا جمنی تہذیب اور وقف کا کردار:

دوستو اور بزرگو! سب سے پہلی بات یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی جو فضیلت قرآنِ کریم نے بیان فرمائی ہے، اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا فرق نہیں رکھا گیا، رشتہ داروں، کمزوروں اور حاجت مندوں سبھی کا ذکر کیا گیا ہے، اسی لیے آج بھی وقف کی بے شمار جائیدادوں کی آمدنی سے نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم بھائی بھی روزگار اور دیگر ذرائع سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ کسی زمانے میں جب بادشاہوں نے مساجد کے لیے زمینیں وقف کیں تو ساتھ ہی رعایا کے مذہبی اور سماجی امور کے لیے بھی جائیدادیں دیں، حتیٰ کہ غیر مسلم بادشاہوں نے بھی اپنی خوشی اور رواداری کے طور پر مسلمانوں کو زمینیں اور جائیدادیں عطا کیں، تاکہ وہ انہیں وقف کریں، یہ دراصل اس ملک کی گنگا جمنی تہذیب کی روشن مثال ہے جہاں سب ایک دوسرے کے تعاون سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں۔ آج بھی اگر آپ کسی مدرسے یا دارالعلوم کو دیکھیں تو وہاں چالیس پچاس کا اسٹاف ہوتا ہے جن میں پانچ چھ غیر مسلم بھی ملازمت کرتے ہیں، حساب کتاب دیکھنے والے الگ ہوتے ہیں، اور خرید و فروخت کے ذریعے بھی غیر مسلم بھائی اس نظام سے فائدہ اٹھاتے ہیں، گویا وقف کی برکت صرف مسلمانوں تک محدود نہیں رہتی بلکہ دوسروں تک بھی پہنچتی ہے۔ یہی قرآن کا اصل منشا ہے کہ بندہ اپنے اللہ کے حق کو بھی ادا کرے اور اللہ کے بندوں کے حقوق کا بھی پورا خیال رکھے۔ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی صحابہ کرامؓ کے اوقاف کو قبول فرمایا اور پھر ان کے اموال کو وقف کی شرائط کے ساتھ تقسیم فرمایا؛ لیکن افسوس کہ آج پروپیگنڈے کے طور پر یہ بات پھیلائی جاتی ہے کہ گویا وقف بورڈ ایک کمیٹی ہے اور اس کی ساڑھے آٹھ لاکھ جائیدادیں اس کی ذاتی ملکیت ہیں، حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔

شیر شاہ سوری اور وقف کی تاریخی مثال:

دوستو اور بزرگو! وقف کی چیز کسی ایک فرد کی ملکیت نہیں ہوتی، نہ متولی، نہ وقف بورڈ کے ٹرسٹی اور نہ ہی Central یا State وقف بورڈ کے ذمہ داران اس کے مالک ہوتے ہیں، جیسے ہی

کوئی چیز اللہ کی راہ میں وقف کر دی جاتی ہے، فقہائے کرام حضرت امام ابو یوسفؒ، امام محمدؒ اور امام شافعیؒ کے مطابق وہ فوراً واقف کی ملکیت سے نکل کر اللہ تعالیٰ کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے، اسی لیے وقف کی جائیداد کسی انسان کی ملک نہیں ہوتی، ہمارے ملک میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ سب سے زیادہ زمین وزارتِ دفاع کے پاس ہے، دوسرے نمبر پر ریلوے کے پاس اور تیسرے نمبر پر مسلمانوں کے اوقاف ہیں، جو پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں۔ یہ اوقاف کسی ایک فرد کی ملک نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی ملک ہیں، جہاں بھی مساجد، مدارس، خانقاہیں اور اوقافی املاک ہیں، وہ سب اللہ کی راہ میں وقف ہیں۔ ہندوستان کی تاریخ میں شیر شاہ سوری کی مثال لیجیے۔ وہ ایک عظیم بادشاہ تھے جنھوں نے چھ سو (۶۰۰) سرائے یا مسافر خانے تعمیر کرائے، اس زمانے میں ہندوستان تجارت کا مرکز تھا اور دنیا بھر سے لوگ یہاں آتے تھے، شیر شاہ سوری نے نہ صرف بنگال سے لے کر موجودہ پاکستان کے علاقوں تک جانے والی عظیم سڑک تعمیر کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چھ سو سرائے بھی قائم کیے، ان میں مسافروں کے لیے کھانے پینے اور دیگر سہولیات کا انتظام کیا گیا، اور وہاں مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہ کیا جاتا۔ اسی سے فقہائے کرام نے یہ تعریف اخذ کی کہ وقف کی چیز کسی شخص کی ملکیت نہیں رہتی، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی ملک قرار پاتی ہے۔ البتہ دوستو! وقف کے سلسلے میں کچھ آداب اور اصول ہیں جنہیں مسلمانوں کے لیے جاننا ضروری ہے۔ متولی حضرات، یا جو کسی بھی ٹرسٹ کے ذمہ دار ہیں، چاہے وہ مسافر خانے ہوں، مساجد ہوں، مکاتب ہوں یا مسلمانوں کے اسکول و کالجز کے لیے وقف کی گئی جائیدادیں ہوں، ان سب کا کوئی ذاتی مالک نہیں ہوتا، یہ سب شرعی مسائل کی روشنی میں اللہ تعالیٰ کی ملک قرار دی گئی ہیں۔

حضرت عثمانؓ کا عظیم ایثار اور کنویں کی خریداری:

اللہ کے نبی ﷺ نے وقف کی ترغیب دی اور خلفائے راشدین نے بھی اس پر عمل کیا، مدینہ منورہ میں جب مسلمان ہجرت کر کے آئے تو ایک بڑی پریشانی سامنے آئی۔ وہاں میٹھے پانی

کا ایک کنواں تھا جو ایک یہودی کی ملکیت میں تھا۔ غریب مسلمان اس سے پانی خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتے تھے، اور پانی کی شدید کمی کا سامنا تھا۔ اس موقع پر اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد پر خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ابن عفان ؓ نے وہ کنواں بیس ہزار درہم کی بھاری قیمت پر خرید لیا۔ (ترمذی: ابواب المناقب، رقم: ۴۰۳۲) کنواں اصل میں اتنی قیمت کا نہیں تھا، لیکن یہودی نے یہ دیکھ کر کہ مدینہ میں اور کوئی میٹھے پانی کا کنواں نہیں ہے، جان بوجھ کر بہت زیادہ قیمت وصول کی۔ حضرت عثمان ؓ نے دین کی خدمت اور مسلمانوں کی سہولت کے لیے اتنی بڑی رقم ادا کی اور یہ کنواں وقف کر دیا تاکہ سب لوگ اس سے فائدہ اٹھا سکیں، بعد کے ادوار میں بھی جب بادشاہوں کا دور آیا تو انہوں نے اپنے اپنے طریقے سے مختلف مقامات پر اوقاف قائم کیے۔ عوام الناس نے بھی اپنی استطاعت کے مطابق جائیدادیں وقف کیں۔ دوستو! حقیقت یہی ہے کہ وقف کا مقصد ہی یہ ہے کہ ملکیت کسی فرد کے پاس نہ رہے، بلکہ باقی رہنے کے باوجود اس کا فائدہ دین اسلام اور اللہ کے بندوں تک پہنچتا رہے، یہی وقف کا حقیقی مفہوم ہے۔

وقف ایکٹ کی قانونی حیثیت:

دوستو اور بزرگو! وقف کا نظام انگریزوں کے دور میں بھی موجود تھا۔ ۱۹۲۳ سے ۱۹۲۷ کے درمیان وقف کے حوالے سے کچھ ضوابط بنائے گئے۔ پھر ملک کی آزادی کے بعد ۱۹۵۴ میں اُس وقت کے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے وقف ایکٹ کو باقاعدہ قانونی شکل دی۔ اس کے بعد اس قانون میں وقتاً فوقتاً تبدیلیاں کی جاتی رہیں، بعض تبدیلیوں سے امت مسلمہ کو فائدہ ہوا اور کچھ سے نقصان بھی پہنچا۔ پھر ۲۰۱۰ اور ۲۰۱۳ میں اس ایکٹ میں مزید ترامیم اور اضافے کیے گئے، اس طرح وقف ایکٹ ایک زیادہ منظم شکل میں ہمارے سامنے آیا، یہ قانون اب اردو، ہندی، گجراتی اور انگریزی سمیت مختلف زبانوں میں دستیاب ہے۔ یہ مسلم پرسنل لا کا حصہ ہے لیکن اسے الگ سے بھی شائع کیا گیا ہے تاکہ وضاحت ہو۔ اس میں متولیان اور ذمہ دار حضرات کے فرائض و ذمہ داریاں واضح طور پر بیان کی گئی ہیں۔ یوں وقف

بورڈ ایک باقاعدہ قانونی محکمہ بن چکا ہے، جس کا حساب کتاب آڈٹ (Audit) بھی ہوتا ہے۔

قوانین میں تبدیلی: ہماری کوتاہیوں کا نتیجہ:

دوستو اور بزرگو! ایک کڑوا سچ جو ہم سب جانتے ہیں، وہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے قوانین میں ترمیم اور تبدیلی اکثر ہماری کمزوریوں کی وجہ سے ہی آتی ہے۔ مثال کے طور پر تین طلاق کے مسئلے کو دیکھ لیجیے۔ ہمارے اپنے رویے نے لڑکیوں پر ظلم کیا، اسلام کے قانون پر صحیح عمل نہیں ہوا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں جب ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاق دی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: میں تمہارے درمیان موجود ہوں اور تم اللہ کی کتاب کے ساتھ مذاق کر رہے ہو؟ (نسائی: کتاب الطلاق، باب الثلاث المجموعة وما فیه من التغلیظ) یہی حال ہمارے وقف کا ہے، ملک بھر میں جو پروپرٹیاں وقف کے تحت تھیں، ہم نے ان کا صحیح انتظام نہیں کیا، کچھ لوگوں نے امانت داری سے کام لیا لیکن زیادہ تر زمینیں اور جائیدادیں سرکار کی تحویل میں چلی گئیں۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی ایسا ہوا اور آزادی کے بعد بھی۔ آج یہ کہا جاتا ہے کہ وقف کی پچاس فیصد سے زیادہ جائیداد یا تو حکومت کے قبضے میں ہے، یا غیر مسلم افراد کے ہاتھوں میں، یا کسی کمپنی کی ملکیت میں، اور ایک حصہ مسلمانوں کے پاس ہے؛ لیکن افسوس! مسلمانوں نے بھی اس کی مناسب حفاظت نہیں کی، اسی وجہ سے بے شمار مسائل پیدا ہوئے، مقدمات سپریم کورٹ تک پہنچے، حکومت کے پاس شکایتیں آئیں، متولیوں کے آپسی اختلافات اور مسجد و اوقاف کے جھگڑوں نے ماحول کو خراب کر دیا؛ یہاں تک کہ لوگ کہنے لگے کہ وقف مسلمانوں کی اپنی خصوصیت ہے اور اس ملک میں دو الگ قانون کیسے چلیں گے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وقف کی جائیداد اللہ کی ملکیت ہے، اور متولی صرف نگران ہوتا ہے، اس کی حفاظت کرنا اُس کی سب سے بڑی ذمہ داری ہے۔ ہمارے اسلاف نے اپنی خون پسینے کی کمائی اللہ کے دین کے لیے وقف کر دی، ہم سے اگر وقف کرنا ممکن نہ بھی ہو تو کم از کم جو اوقاف موجود ہیں اُن کی حفاظت تو لازمی ہے، ہمارے بڑے نقصانات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ متولی حضرات وقف

کے مسائل اور وقف بورڈ کے قوانین سے ناواقف ہیں، کاغذی کارروائی اور دستاویزات مکمل نہ کرنے کی وجہ سے بہت سی زمینیں اور جائیدادیں ہم سے نکل گئیں۔

وقف کی جائیداد کا تحفظ؛ وقت کی اہم ضرورت:

اس وقت سب سے بڑا پروپیگنڈہ یہ کیا جارہا ہے کہ وقف بورڈ گویا حکومت سے بھی بڑا ادارہ ہے؛ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وقف بورڈ کی ذمہ داری صرف یہ طے کرنا ہے کہ جو زمینیں وقف کے تحت رجسٹر ہوچکی ہیں یا وقف بورڈ کی تحویل میں آگئی ہیں، وہ شرعی اور قانونی طور پر محفوظ رہیں، ان زمینوں کے کاغذات بھی وقف بورڈ کے پاس موجود ہوتے ہیں اور ان کے متولی بھی مقرر ہوتے ہیں، ہوتا یہ ہے کہ بہت سی جگہوں پر صحیح کاغذات تیار نہیں کیے گئے یا ان کی حفاظت نہیں کی گئی۔ ۲۰۱۳ء میں جو ترمیمات کی گئیں، وہ مولانا منت اللہ رحمانیؒ کے صاحبزادے مولانا ولی رحمانی اور مولانا ارشد مدنی کی کوششوں سے ہوئیں، اور اس وقت سلمان خورشید (وزیر برائے اوقاف، UPA دورِ حکومت) نے انہیں قانونی شکل دی، سب سے بڑی ترمیم یہ تھی کہ وقف کی جائیداد کسی بھی حال میں بیچی نہیں جاسکتی؛ کیونکہ کچھ لوگوں نے وقف کی املاک بیچ دی تھیں اور ان پر شکایات آئیں، تو اس کے بعد وقف بورڈ نے ان املاک کو دوبارہ وقف میں شامل کیا۔

اس وقت جو بڑا مسئلہ سامنے آیا ہے، وہ یہ ہے کہ حکومت نئی ترامیم کے ذریعے وقف کے تمام جھگڑوں کا اختیار وقف ٹریبیونل سے لے کر حکومت کو دینا چاہتی ہے، جبکہ حکومت یا سرکاری افسران شرعی مسائل سے واقف نہیں ہوتے، اس لیے وہ صحیح فیصلہ نہیں کرسکیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ وقف مسلمانوں کی ذاتی ملکیت نہیں، بلکہ اللہ کی ملک ہے۔ کوئی متولی نہ اسے کسی کو دے سکتا ہے اور نہ بیچ سکتا ہے، اور اگر ایسا کرے تو وہ شرعاً گنہگار ہے۔ اسی بنیاد پر آج ہماری دو تین بڑی تاریخی مساجد کے مقدمات سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ میں زیرِ سماعت ہیں، اور بہت سی مساجد و درگاہوں کے مسائل بھی موجود ہیں، اس لیے امت مسلمہ کے لیے سب

سے پہلی ذمہ داری یہ ہے کہ وقف کے مسائل کو سمجھے اور سنجیدگی سے لے، جس مال و زمین کو ہمارے آباء واجداد نے اللہ کی راہ میں دیا تھا، ہم اس کے صرف متولی ہیں، مالک نہیں، لہٰذا ضروری ہے کہ وقف کی پرانی دستاویزات کو درست، انگلش کروا کر اور باقاعدہ قانونی شکل دے کر وقف بورڈ میں جمع کرایا جائے، تاکہ یہ اوقاف ہمیشہ محفوظ رہیں۔

ملکیت نہیں، حفاظت:

یہ بھی ایک پروپیگنڈہ ہے کہ وقف بورڈ جس زمین کو بھی اپنا کہہ دے گا، وہ اسی کی ملکیت ہو جائے گی، پچھلے دس پندرہ دنوں سے یہی بات بار بار دہرائی جارہی ہے؛ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ وقف بورڈ صرف ان زمینوں کے کیس لڑتا ہے جن پر دوسروں نے ناجائز قبضہ کیا ہوتا ہے۔ جب قواعد وضوابط اور قانونی دستاویزات کے مطابق یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ زمین وقف کی ہے، تب ہی اسے وقف بورڈ میں شامل کیا جاتا ہے۔ اس عمل میں کسی غیر کی زمین چھینی نہیں جاتی، جو پروپیگنڈہ پھیلایا جارہا ہے وہ دراصل انہی زمینوں کے بارے میں ہے جو پہلے سے وقف تھیں لیکن متنازع ہوگئیں۔ جب ان زمینوں کے صحیح کاغذات وقف بورڈ کے پاس پہنچ جاتے ہیں، تو ان کا اندراج وقف نامے میں کردیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ زمینیں مسلمانوں کے مقامی وقف بورڈ کے حوالے کی جاتی ہیں، ملکیت کے لیے نہیں بلکہ حفاظت کے لیے۔

وقف اور صدقہ میں فرق:

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے وقف کی بڑی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں، میں نے آپ کے سامنے احادیث بھی ذکر کیں اور قرآنِ کریم کی کئی آیات میں بھی اللہ پاک نے وقف کی ترغیب دی ہے، چنانچہ حضراتِ صحابہ کرامؓ، خلفائے راشدینؓ اور ان کے بعد کے ادوار میں وقف کا سلسلہ رہا۔ ہندوستان میں بھی چھ سو سات سو سال تک مسلم حکومت رہی، اور اس دوران بہت سی چیزیں وقف کی گئیں، تاج محل، چاہے لوگ کچھ بھی سمجھیں، حقیقت یہ ہے کہ یہ بھی وقف ہے، دہلی کی جامع مسجد اور قطب مینار بھی وقف کی مثالیں ہیں، قطب مینار سب سے پہلے مسلمانوں

نے حکومت کے آغاز میں یادگار کے طور پر بنایا تھا۔ یہ سب چیزیں پیسوں سے خرید کر وقف کی گئی تھیں، نہ کہ زبردستی قبضہ کیا گیا تھا۔ اسلام میں وقف کا مطلب یہ ہے کہ جو چیز دی جائے وہ اللہ کی ملکیت میں چلی جائے۔ اسی لیے وقف کرنے والا عاقل، بالغ اور سمجھدار ہونا چاہیے، اگر کوئی پاگل یا کم عقل شخص وقف کرے تو وہ معتبر نہیں ہوتا، اسی طرح بچوں کا وقف بھی معتبر نہیں۔ مزید یہ کہ وقف کرنے والا مسلمان ہو اور وہ چیز ہمیشہ کے لیے اللہ کے نام وقف کرے۔ یہی وقف کہلاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی کھانا کھلا دے یا پیسے دے دے تو وہ وقف نہیں بلکہ صدقہ یا اپنی نیت کے مطابق دیگر اعمال میں شمار ہوتا ہے۔

صحابہ کرامؓ اور وقف کی عظیم روایت:

حضراتِ صحابہ کرامؓ نے اپنے اپنے زمانوں میں بکثرت وقف فرمائے۔ (احکام الوقف: ص ۱۷/) حضرت جابرؓ فرماتے ہیں: میری نگاہ میں کوئی ایسا صحابی نہیں تھا جس کے پاس تھوڑا سا بھی مال آیا ہو اور اس نے وقف نہ کیا ہو۔ (احکام الوقف: ص ۶/) حضرت امام شافعیؒ، حضرت علیؓ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ جب مالِ غنیمت سے بہت سی زمینیں ان کے پاس آئیں تو آپؓ نے انہیں اللہ کے لیے وقف کر دیا، ''ینبع'' نام کا ایک شہر ہے، جو آج بھی مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان راستے میں آتا ہے، حضرت علی ابن ابی طالبؓ نے اس پورے علاقے کو اللہ کے لیے وقف کر دیا۔ (احکام الوقف: ص ۱۰/) حضرت امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں نے اتنے وقف کیے کہ ایک موقع پر میرے دل میں بھی خیال آیا کہ میں کچھ زمین خرید کر وقف کروں؛ لیکن جب تحقیق کی گئی تو پتا چلا کہ مدینہ منورہ سے لے کر مکہ مکرمہ تک کوئی زمین ایسی باقی نہیں رہی تھی جسے خرید کر وقف کیا جا سکے۔ ساری زمین پہلے ہی وقف ہو چکی تھی۔ یہ دوسری صدی ہجری کا حال تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے تسلسل کے ساتھ اللہ کے دین کے لیے اپنی املاک وقف کیں، اور یہ وقف صرف مسلمانوں کے لیے نہیں بلکہ مختلف طبقات اور مذاہب کے لوگ بھی اس سے مختلف طریقوں سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

وقف میں تأبید اور تسلسل کی شرط:

اس لیے وقف کے قانون میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دینے والا اپنی چیز اللہ کی ملکیت میں دے دیتا ہے، جب وہ چیز اللہ کی ملک میں داخل ہوجاتی ہے تو وہ باقی رہتی ہے اور اس کا فائدہ لوگوں تک پہنچتا ہے۔فقہاء کرام نے ''کتاب الوقف'' کے عنوان سے مستقل ابواب قائم کیے ہیں اور اس موضوع پر تفصیلی مسائل لکھے ہیں، ان تمام مسائل کو غور سے دیکھیں تو ایک ہی بات سامنے آتی ہے کہ وقف کی حفاظت مقصود ومطلوب ہے۔فقہی کتب میں دو بنیادی اصول بیان کیے گئے ہیں: وقف ہمیشہ کے لیے ہو اور اس وقف سے مسلسل فائدہ اٹھایا جائے۔حضرت قاضی مجاہدالاسلام جو ایک بڑے عالم اور ہندوستان میں اسلامی فقہ اکیڈمی کے بانی تھے اور جن کے ساتھ ہزاروں مفتیانِ کرام وابستہ رہے، وہ فرماتے ہیں: میں نے وقف سے متعلق جتنی بھی کتابیں پڑھیں، ان سب میں یہی دو چیزیں نمایاں نظر آئیں کہ وقف کرنے والا تو دنیا سے چلا جاتا ہے، مگر وقف کی چیز سے فائدہ اٹھانے والے باقی رہتے ہیں؛ اس لیے وقف کی زمین ضائع نہ ہونے دی جائے تاکہ مرنے والے کو اس کا ثواب ہمیشہ ملتا رہے، اسی لیے وقف میں تسلسل اور نگرانی ضروری ہے۔اس کی نگرانی کرکے صحیح طریقے سے اس سے فائدہ اٹھایا جائے اور اس کو اس انداز سے رکھا جائے کہ یہ وقف ہمیشہ کے لیے باقی رہے۔اللہ تعالیٰ ہم سب کو اوقاف کی حفاظت کرنے اور اپنی زندگی میں اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ وقف کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۶)
وقف ایکٹ، وقف بورڈ اور وقف ٹربیونل پر ہونے والے اعتراضات کے جوابات

الحمد لله رب العالمين و الصلوٰة و السلام على سيد المرسلين و على اٰله و اصحابه اجمعين. اما بعد!

قال الله تبارك و تعالى في الكلام المجيد و الفرقان الحميد. اما بعد!

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾ اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾ (کہف: ۴۵، ۴۶)

وقال النبي صلى الله عليه وسلم: الكَيِّسُ مَن دان نفسَه وعمِل لما بعدَ المَوتِ. (ترمذی: ابواب صفة القيامة والرقائق، رقم: ۲۴۵۹)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

دنیا کی حقیقت؛ بارش سے خاک تک:

محترم و مکرم حضرات علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جس آیتِ مبارکہ کی ابھی تلاوت کی گئی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ اپنے محبوب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وحی کے ذریعے یہ حکم فرماتے ہیں: ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' آپ لوگوں کے سامنے

دنیا کی زندگی کی مثال بیان کیجیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی ایسی ہے ''كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ'' جیسے آسمان سے بارش برستی ہے، اور پھر اس پانی سے زمین کا سبزہ اگتا ہے، بیج کونپل بن کر کھڑی کھیتی سے مل جاتا ہے، کھیتیاں سرسبز و شاداب لہلہانے لگتی ہیں، باغات اور درختوں پر پھل آجاتے ہیں اور انسان ان کو دیکھ کر خوش ہو جاتا ہے؛ لیکن آگے ارشاد ہوتا ہے: ''فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ؕ'' پھر اچانک وہی سبزہ سوکھ جاتا ہے، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا ہے اور ہوائیں اس کو اِدھر اُدھر اڑا کر لے جاتی ہیں۔ آخر میں فرمایا گیا: ''وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا'' اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے؛ وہ چاہے تو خشک زمین کو سرسبز کر دے، اور چاہے تو لہلہاتے باغات کو لمحوں میں ویران کر دے۔ یہ مثال ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ دنیا کی ظاہری رونقیں عارضی ہیں، اصل حقیقت وہی ہے جو ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور وہ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی رضا۔

عارضی رونقیں اور باقی رہنے والی نیکی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے پہلے دنیا کی زندگی کی مثال دی، پھر ان چیزوں کا ذکر فرمایا جن پر انسان سب سے زیادہ بھروسہ کرتا ہے اور جن کے لئے یہ دنیا بساتا ہے یعنی مال اور اولاد۔ انسان کو ان دونوں سے فطری محبت ہوتی ہے، اور یہ محبت خود اللہ پاک نے دلوں میں رکھی ہے۔ اسی حقیقت کو قرآن کریم کی ایک اور آیت میں بیان فرمایا: ''زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ'' (آل عمران: ۱۴) لوگوں کے دلوں میں خواہشات کی محبت ڈال دی گئی، پھر اسی آیت میں ان خواہشات کی تفصیل بھی ذکر فرمائی: عورتیں، اولاد، مال ومتاع، کھیتی باڑی، سواریاں، گھوڑے، سونے اور چاندی کے خزانے یہ سب انسان کے دل کو بھاتے ہیں۔

دنیا کی ناپائیدار حقیقت:

خیر! قرآن کریم بار بار کھیتی باڑی کی مثال سے یہ حقیقت سمجھاتا ہے: ''اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ'' (یونس: ۲۴) دنیا کی زندگی کی مثال اس پانی کی طرح ہے جو

ہم نے آسمان سے اتارا، زمین کچھ ہی مہینوں میں خشک ہونے کے بعد سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے، لیکن پھر تھوڑے ہی عرصے بعد وہی زمین دوبارہ خشک ہوجاتی ہے اور اس کی ساری سرسبزی مرجھا جاتی ہے۔ آج انسان اپنی آنکھوں سے بھی یہ منظر دیکھتا ہے۔ کل ہی کا واقعہ ہے کہ ہمارے کمپاؤنڈ میں زیادہ کچرے کی وجہ سے دوائی چھڑکی گئی، اور راتوں رات ہری بھری گھاس پیلی ہوگئی۔ اللہ پاک نے دنیا کی چیزوں کو اسی طرح بنایا ہے کہ ان کی رونق اور تازگی پل بھر میں زائل ہوجاتی ہے۔ خشک مصالحہ پانی میں ڈالا تو فوراً اپنا رنگ بدل لیتا ہے، یہ سب دنیا کی تیز رفتاری اور ناپائیداری کی طرف اشارہ ہے۔

دائمی نفع بخش اعمال:

پھر ان آیات کے بعد اللہ تعالیٰ نے مال اور اولاد کا ذکر فرمایا: ''وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلًا'' مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ باقیاتِ صالحات سے مراد وہ مختصر دعائیں اور اذکار ہیں جو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں سکھائے: سبحان اللہ، الحمد للہ، لا الٰہ الا اللہ، لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ یہ اذکار زبان پر جاری رہیں تو دل کو سکون اور طمانینت نصیب ہوتی ہے۔ خالی اوقات کو لغویات میں ضائع کرنے کے بجائے اللہ کے ذکر سے معمور کیا جائے، جہاں جہاں قرآن کریم نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر دشمنوں کی اذیتوں کا ذکر کیا، وہاں ساتھ ہی فرمایا: ''فَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ''، اور اس کے فوراً بعد حکم دیا: ''وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ'' (ق:۳۹) مفسرین فرماتے ہیں کہ جب بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہوجائے تو مخلوق کی تکالیف اور دنیا کی اذیتیں اس کے لئے بے معنی ہوجاتی ہیں، اگر اللہ راضی ہے تو پھر دنیا کی چھوٹی بڑی آزمائشیں کیا حیثیت رکھتی ہیں! اس لئے باقیاتِ صالحات کے ایک معنی یہی تسبیح اور ذکر اللہ ہے۔ مفسرین نے اس کا دوسرا مطلب نیک اور صالح اولاد بھی بتایا ہے۔ ایک شخص کے انتقال کے بعد اس کی نیک بیٹیاں استقبال کے لئے موجود تھیں، پوچھا گیا: تم اپنے والد کے لئے کیوں آئی ہو؟ جواب ملا: والد نے میری اچھی تربیت کی، تعلیم دی، دین

سکھایا، اس احسان کا بدلہ یہ ہے کہ میں ان کے لئے جنت کا ذریعہ بنوں۔ پس باقیاتِ صالحات میں نیک اولاد بھی شامل ہے۔ اسی طرح ''باقیاتِ صالحات'' سے مراد وہ اچھے کام بھی ہیں جو انسان چھوڑ جائے اور اس کے مرنے کے بعد بھی جاری رہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''إذا ماتَ الإنسانُ انقَطَعَ عنه عَمَلُهُ إلّا مِن ثَلاثَةٍ: صَدَقَةٍ جارِيَةٍ، أَوْ عِلْمٍ الايُنتَفَعُ بِهِ، أَوْ وَلَدٍ صالِحٍ يَدْعُو له'' (مسلم: کتاب الوصیۃ، باب مایلحق الانسان من الثواب بعد وفاتہ) جب انسان کا انتقال ہوجاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے، مگر تین چیزوں کا ثواب جاری رہتا ہے: ایسا صدقہ جو باقی رہنے والا ہو، ایسا علم جس سے لوگ نفع اٹھائیں، اور نیک اولاد جو والدین کے لئے دعا کرے، یہ ہیں باقیاتِ صالحات ایسے اعمال جن کا اجر قبر میں بھی پہنچتا ہے اور قیامت تک انسان کے لئے ذخیرۂ آخرت بنتے رہتے ہیں۔

نیکی کا صحیح معیار:

دوستو اور بزرگو! اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم کی متعدد آیات میں نیکی اور تقویٰ کا ذکر فرمایا ہے؛ لیکن قابلِ غور بات یہ ہے کہ وہاں صرف روزے، نماز اور عبادات کو نیکی نہیں کہا گیا، بلکہ ایک آیت ہے جسے قرآن میں ''آیت البر'' یعنی نیکی والی آیت کہا جاتا ہے: ''لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ'' مکہ والوں نے بیت اللہ کے قبلے کو اور یہودیوں نے بیت المقدس کے قبلے کو بڑا مسئلہ بنادیا تھا، حالانکہ اللہ پاک نے یہ تبدیلی اپنے حکم سے کروائی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اللہ کے نزدیک قبلے کا ادھر یا ادھر ہونا اصل نیکی نہیں ہے؛ بلکہ اصل نیکی یہ ہے کہ بندہ اللہ پر ایمان لائے اور پھر اس ایمان کا عملی ثبوت دے۔ اسی لئے اس آیت کے بعد قرآن کریم نے نیکی کی جو تفصیل بیان کی، اس میں غریبوں، محتاجوں، بیواؤں، یتیموں، کمزوروں اور ضعیفوں کا خاص طور پر ذکر فرمایا۔ مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ نے تاکید فرمائی: ''اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ'' (بقرہ: ۲۶۷) ہم نے جو پاکیزہ رزق تمہیں عطا کیا ہے، اس میں سے خرچ کرو۔ اور فرمایا: ''وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝'' ایمان والوں کی ایک بڑی فضیلت یہ

ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔اس سے معلوم ہوا کہ نیکی صرف عبادت کا نام نہیں، بلکہ اپنے اردگرد ضرورت مندوں کی خبر گیری اور ان پر خرچ کرنا بھی اصل نیکی کا اہم حصہ ہے۔

وقف کی برکتیں انسانوں سے پرندوں تک:

امت مسلمہ نے ہمیشہ اپنی خوشنودی اور سب سے بڑھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رضا کے لئے بڑے بڑے اموال وقف کیے ہیں، تاکہ وہ قیامت تک ''باقیاتِ صالحات'' بن کر ان کے لئے صدقۂ جاریہ کا ذریعہ بنتے رہیں۔مسلمانوں کی تاریخ ایسے عظیم واقعات سے بھری ہوئی ہے۔ حضرت مولانا سجاد صاحب فرماتے ہیں کہ مدینہ یونیورسٹی میں ایک کتاب موجود تھی جو شام کے اوقاف کی تفصیل بیان کرتی تھی، لکھا ہے کہ ایک شخص وقف کے ذمہ داروں کے پاس آیا اور کہا کہ میں کچھ چیز اللہ کے لئے وقف کرنا چاہتا ہوں، جواب دیا گیا: انسانوں کے لئے ہر طرح کے اوقاف موجود ہیں، ضرورتیں پوری ہیں، البتہ سردیوں میں سائبیریا سے پرندے شام کے نسبتاً گرم علاقوں میں آتے ہیں، ان کے لئے غلہ اور دانے کا انتظام نہیں ہے، آپ چاہیں تو یہ وقف کریں۔سبحان اللہ! یہ ہے اسلام کی وسعت کہ صرف انسانوں ہی کے لئے نہیں بلکہ پرندوں تک کے لئے اوقاف قائم کیے گئے۔اسی طرح ایک اور بزرگ نے عمدہ پیالے وقف کر دیے، وجہ یہ تھی کہ اُس دور میں اگر کسی غلام یا باندی سے آقا کی خدمت کے دوران پیالہ ٹوٹ جاتا تو غریب نوکر کے لئے اسے بدلنا ممکن نہ ہوتا، اس بزرگ نے وقف رکھا کہ ہر ایسا ملازم یا غلام میرے پاس سے پیالہ لے جائے تاکہ اس پر بوجھ نہ پڑے۔یہی نہیں بلکہ تاریخِ اسلام میں ہسپتال، شفاخانے، یتیم خانے، قبرستان، مساجد اور مدارس یہ سب اوقاف کی بنیاد پر چلتے رہے۔یہ ہے وقف کی برکت کہ انسان کے جانے کے بعد بھی اس کے نیک اعمال جاری رہتے ہیں اور اس کے لئے آخرت کا سرمایہ بنتے ہیں۔

اوقاف کے بارے میں پھیلائی گئی غلط فہمیاں:

اس وقت اوقاف کے سلسلے میں جو مسائل کھڑے کیے جا رہے ہیں، ان میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ بہت سی حقیقتیں نہ ہمارے مسلمان بھائی اچھی طرح جانتے ہیں اور نہ غیر مسلم

بھائی، اسی لاعلمی کی بنیاد پر طرح طرح کے اعتراضات اور پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں۔ گزشتہ جمعہ کو بھی عرض کیا گیا تھا کہ سب سے زیادہ زور وشور سے یہ بات پھیلائی جاتی ہے کہ وقف کے پاس ساڑھے آٹھ لاکھ اوقاف ہیں اور یہ ہندوستان کی تیسری سب سے بڑی پراپرٹی ہے، اب حقیقت یہ ہے کہ یہ بات سننے میں تو بڑی لگتی ہے، مگر اس کی حقیقت کچھ اور ہے۔ مثال کے طور پر ہماری یہ مسجد لے لیجیے یہ ایک ٹرسٹ ہے۔ مسجد کی آمدنی کیا ہے؟ جتنا اللہ کے بندے عطیہ دیتے ہیں، اسی سے مسجد کے اخراجات چلتے ہیں۔ اس طرح ہندوستان کی لاکھوں مسجدیں ہیں جن کے پاس اپنی کوئی بڑی آمدنی نہیں ہوتی۔ کہا جاتا ہے کہ ہندوستان میں اس وقت سات لاکھ مساجد ہیں، ان میں سے بیشتر مسجدیں، مدرسے، قبرستان، یتیم خانے، مسافر خانے اور درگاہیں وقف کی زمینوں پر قائم ہیں؛ لیکن ان سے کوئی باقاعدہ انکم یا منافع حاصل نہیں ہوتا۔ یہ تمام اوقاف الگ الگ گاؤں، قصبے اور شہروں میں اپنی اپنی جگہ پر موجود ہیں۔ ہر جگہ کا ٹرسٹ علیحدہ ہے، ہر علاقے کا وقف علیحدہ ہے۔ یہ پراپرٹی کسی ایک شخص کی نہیں، نہ ہی وقف بورڈ کی ملکیت ہے۔ وقف بورڈ کا کام صرف نگرانی اور دیکھ بھال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اوقاف اللہ کے لئے وقف ہیں اور امت کی اجتماعی امانت ہیں۔

سادہ مثال سمجھ لیجیے! پورے بھروچ ضلع کے جتنے مکانات، دکانیں اور زمینیں ہیں، سب معاملت دار آفس اور کلیکٹر آفس میں رجسٹر ہوتی ہیں، ان دفاتر کا کام صرف انتظام اور حفاظت ہے، دستاویزات محفوظ رکھنا اور قانونی تحفظ دینا ان کی ذمہ داری ہے؛ لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ پورے ضلع کی زمین کلیکٹر کی اپنی ہے؟ ہرگز نہیں! وہ صرف نگرانی اور انتظام کرتا ہے۔ اسی طرح وقف بورڈ بھی صرف ایک نگران ہے، مالک نہیں۔

وقف کی نگرانی کا نظام:

یہ بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ وقف کوئی ذاتی چیز نہیں، ۱۹۵۴ء میں کانگریسی سرکار، جواہر لال نہرو کے دور میں، اس کو ایکٹ کی شکل میں رکھا گیا، اس سے پہلے انگریزی دور میں بھی وقف

موجود تھا اور شریعت اپلیکیشن ایکٹ کے ماتحت چلتا تھا، آج بھی وقف ''مسلم پرسنل لاء'' کے دائرے میں شامل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی آپ پرسنل لاء کی کتابیں دیکھیں، چاہے انگلش، ہندی، گجراتی یا اردو میں، وہاں وقف کا ذکر ضرور ملے گا؛ لہٰذا یہ سمجھ لینا چاہیے کہ وقف نہ تو وقف بورڈ کی ملکیت ہے اور نہ کسی فرد کی۔ یہ ان مسلمانوں کی دی ہوئی زمین ہے جنہوں نے اللہ کی رضا کے لئے اسے وقف کیا یا پھر عوام نے چندہ دے کر مساجد اور مدارس تعمیر کروائے، یہ وہی مسلمانوں کا پیسہ ہے جو انہی کی عبادت گاہوں، مکاتب اور یتیم خانوں پر لگایا گیا ہے۔ ہمارے مدارس اور مساجد اسی اصول پر کھڑے ہیں، اکثر کے پاس آمدنی کے اپنے ذرائع نہیں ہوتے، اگر کسی جگہ کسی وقف کے پاس آمدنی کا کوئی ذریعہ ہے تو وہ بھی مسلمانوں کی ضرورت پوری کرنے ہی میں خرچ ہوتا ہے۔ یہی وقف کا اصل مقصد اور حقیقت ہے۔

چیریٹی کمشنر سے وقف بورڈ تک کا سفر:

اکثر کہا جاتا ہے کہ اتنی بڑی بڑی زمینیں اور جائیدادیں وقف کے نام پر موجود ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا مالک نہ وقف بورڈ ہے، نہ مسجد کا متولی۔ وقف کی تعریف ہی یہ ہے: ''حبسها لله'' کسی چیز کو اللہ کے لئے روک دینا، اس کی ملکیت اللہ کے حوالے کر دینا اور اس کے نفع کو اللہ کے بندوں پر خرچ کرنا۔ اس اعتبار سے نہ متولی مالک ہے، نہ وقف بورڈ، نہ وقف ٹریبونل اور نہ ہی مرکزی وقف کونسل۔ یہ سب صرف ذمہ دار اور نگران ہیں، اصل مالک اللہ ہے۔

دوسری بات یہ سمجھنی چاہیے کہ ہمارے گجرات میں جتنے مدرسے، مسجدیں اور درگاہیں ہیں، وہ پہلے چیریٹی کمشنر کے تحت رجسٹر تھیں۔ میں اپنی مثال دوں کہ ہمارا مدرسہ ''رجسٹر بی (B)'' میں درج تھا۔ ۱۹۹۵ میں جب یہ ادارے وقف بورڈ کو منتقل ہوئے تو وہی رجسٹریشن نمبر جوں کا توں منتقل کر دیا گیا، بس بی (B) نکال دیا گیا اور اسے وقف میں درج کر لیا گیا، گویا پہلے یہ سب چیریٹی کمشنر کے پاس تھے، محصول اور ٹیکس بھی لیا جاتا تھا، پھر بعد میں یہ ذمہ داری

وقف بورڈ کو منتقل کر دی گئی۔ اب وقف بورڈ کی حیثیت بھی چیریٹی کمشنر جیسی ہے۔ جیسے پہلے وہ اداروں کی نگرانی کرتے تھے، اب یہ ذمہ داری وقف بورڈ کو دے دی گئی ہے، وقف بورڈ ریاستی سطح پر بھی ہوتا ہے اور مرکزی سطح پر بھی۔ انہیں کچھ ذمہ داریاں اور اختیارات دیے گئے ہیں۔ انہی میں ایک اختیار یہ بھی ہے کہ جہاں وقف کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے وہاں سے وقف بورڈ ایک مخصوص رقم ٹیکس کی شکل میں لیتا ہے تاکہ اپنا نظام چلا سکے۔ یعنی وقف بورڈ خود انہی اوقاف سے رقم لے کر اپنے انتظامات کرتا ہے۔

پروسیجر اور قانون کے تحت تنازعات کا حل:

حکومت کی طرف سے وقف بورڈ کو ایک اتھارٹی کے طور پر قائم کیا گیا ہے، پہلے جب ہمارے مدارس، مساجد یا دیگر اوقاف کے معاملات میں کوئی تنازعہ پیدا ہوتا تھا تو یہ کیسز (Cases) چیریٹی کمشنر کے پاس جاتے تھے اور وہاں سے سول کورٹ میں حل کیے جاتے تھے؛ لیکن اب یہ نظام تبدیل کر دیا گیا ہے۔ اب اوقاف کے مسائل براہِ راست وقف بورڈ کے تحت آتے ہیں۔ مزید یہ کہ حکومت نے وقف بورڈ کے اوپر ایک اور ادارہ بنایا ہے جسے وقف ٹربیونل کہا جاتا ہے، یہ بھی ایک پوری ٹیم ہے جو حکومت نے ہی تشکیل دی ہے تاکہ اوقاف کے جھگڑے اور مسائل قانونی طریقے سے حل کیے جا سکیں۔ یعنی آج جو کچھ بھی انتظام چل رہا ہے وہ ایک مکمل پروسیجر کے ساتھ چل رہا ہے، ہندوستان کے قوانین کے تحت، چاہے وہ وقف کے ہوں، چیریٹی کے ہوں یا حکومت کے انتظامی امور کے، انہی کی روشنی میں تمام مسائل حل کیے جاتے ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ان چیزوں کو صحیح نظر سے سمجھا جائے اور بلا وجہ کے شبہات و اعتراضات میں نہ پڑا جائے۔

ہجرت کے بعد جائیدادوں کی حقیقت:

دوسرا بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ جو لوگ ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے، انہوں نے یہاں جو زمینیں یا جائیدادیں وقف کی تھیں، وہ اب وقف بورڈ کے پاس آ گئی ہیں، یہ بات بھی بالکل بے

بنیاد ہے، ہمارے بزرگ حضرات جو آزادی کے وقت یا اس کے بعد کے زمانے کے حالات جانتے ہیں، وہ اس حقیقت کے گواہ ہیں کہ جن دیہاتوں سے لوگ پاکستان گئے، ان کے نام پر اگر کوئی زمین، کھیت یا مکان تھا تو وہ سب حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا، پھر اس کی نیلامی کی گئی اور عوام نے قیمت دے کر اسے خریدا۔ ایک صاحب نے مجھے خود واقعہ سنایا کہ ان کے چچا پاکستان ہجرت کر گئے، ان کے نام پر جو جائیداد تھی، حکومت نے اپنے قبضے میں لے لی اور پھر خاندان کو کہا گیا کہ اگر خریدنا چاہو تو مقررہ قیمت دے کر خرید لو؛ چونکہ زمین بالکل قریب ہی تھی اور ایک ہی خاندان کی تھی، اس لئے انہوں نے پیسے دے کر خرید لی؛ لہٰذا یہ پروپیگنڈا کہ ہجرت کرنے والوں کی زمینیں وقف بورڈ کے پاس چلی گئیں، سراسر غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وقف بورڈ کے پاس اس طرح کی ایک مربع میٹر زمین بھی نہیں آئی اور نہ آج تک ایسا کوئی کیس ثابت ہوا ہے۔

وقف بورڈ کے اختیارات پر اعتراض اور حقیقت:

تیسری بات یہ پروپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ وقف بورڈ کے پاس اتنا اختیار ہے کہ جس زمین پر بھی وہ دعویٰ کر دے کہ یہ وقف کی ہے، تو وہ فوراً وقف بن جاتی ہے۔ یہ سراسر غلط ہے! اس ملک میں ایسا کوئی قانون موجود ہی نہیں ہے؛ البتہ یہ ضرور ہے کہ بہت سی زمینیں ایسی ہیں جن پر ناجائز قبضے کر لیے گئے ہیں، ان قبضوں میں بعض مسلمان بھی شامل ہیں، کئی بڑے بلڈرز بھی شریک ہیں، کچھ زمینیں مختلف حکومتوں اور ریاستوں کے قبضے میں ہیں، کچھ مافیا گروہوں نے دبوچ رکھی ہیں اور کہیں کہیں متولیوں نے بھی غلط طریقے سے قبضہ کیا ہوا ہے، اب جب وقف بورڈ کے پاس ایسے معاملات آتے ہیں تو ان کا فیصلہ صرف اور صرف قانونی دستاویزات کی روشنی میں کیا جاتا ہے، اگر کاغذات سے یہ ثابت ہو جائے کہ یہ زمین واقعی کسی بزرگ نے سو سال، دو سو سال پہلے وقف کی تھی، مگر اس پر ناجائز قبضہ ہو گیا، تو پھر وہ زمین وقف ہی مانی جاتی ہے۔ اسی لئے ہمارے بزرگوں نے وقف نامے کو ہمیشہ ایک باقاعدہ قانونی شکل دی تاکہ آئندہ کسی کو شک وشبہ کی گنجائش نہ رہے۔

صرف نیت نہیں، قبضہ بھی چھوڑنا ضروری:

ہماری فقہی کتابوں میں صاف لکھا ہوا ہے کہ صرف زبانی طور پر کچھ کہہ دینے سے یا تحریر کر دینے سے وقف نہیں ہوتا، جب تک آدمی اپنی ملکیت کا قبضہ ہٹا کر اللہ کے لئے مخصوص نہ کر دے، وقف مکمل نہیں ہوتا۔ وقف کا مطلب ہی یہ ہے کہ ملکیت اللہ کے حوالے کر دی جائے۔ مثال کے طور پر اگر کسی نے اپنی زمین پر مسجد تعمیر کر دی اور اس میں نماز ادا ہو گئی، تو اب وہ جگہ ہمیشہ کے لئے مسجد بن گئی، اب مالک واپس لینا چاہے تو نہیں لے سکتا، کیونکہ وہ اللہ کی ملکیت ہو چکی ہے۔ اسی لئے ہمارے بزرگوں نے وقف نامے کے ساتھ تمام کاغذی اور قانونی کاروائیاں بھی لازم قرار دیں تاکہ آئندہ کوئی شبہ باقی نہ رہے۔ اگر کسی نے ناجائز قبضہ کیا ہے اور اصل وقف ٹرسٹ یا متولی کاغذات کے ساتھ دعویٰ کرے تو وقف بورڈ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان دستاویزات کی روشنی میں کارروائی کرے اور یہ اختیار بھی وقف بورڈ کو حکومت ہی کی طرف سے دیا گیا ہے۔

متولی اور علماء کے لیے ضروری آگاہی:

وقف بورڈ دراصل حکومت ہی کا ایک شعبہ ہے، جو اوقاف کے معاملات کو منظم کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، افسوس یہ ہے کہ ہم مسلمانوں کی اکثریت خود بھی وقف کے مسائل سے ناواقف ہے؛ چونکہ وقف کے ساتھ براہِ راست تعلق کم رہ گیا ہے، اس لئے ہمارے بہت سے علماء کرام بھی ان مسائل سے آگاہ نہیں ہوتے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم تین چیزوں کو اچھی طرح سمجھیں: وقف کے بنیادی شرعی مسائل، وقف بورڈ کے قوانین اور اصول، اور حکومت کے چیریٹی کمشنر کے نظام۔ یہ سب جاننا نہ صرف متولیوں کے لئے ضروری ہے بلکہ علماء کرام کے لئے بھی ناگزیر ہے، تاکہ ہم وقف کے نظام کو صحیح طور پر سمجھ سکیں۔

کوتاہیاں ہمارے اپنے دامن میں:

دوستو اور بزرگو! اب تک جو باتیں ہوئیں ان کا تعلق زیادہ تر قانون اور نظام سے تھا؛ لیکن حکومت نے سب سے بڑا اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ وقف میں گڑبڑیاں ہوتی ہیں اور وقف کی

زمینوں پر ناجائز قبضے ہوجاتے ہیں، دوسرے لوگ اگر قبضہ کریں تو وہ اپنی جگہ پر گنہگار ہیں، مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے اپنے مسلمان بھائی، متولیان اور ذمہ داران بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں ہیں۔ آج بڑی تعداد میں کیسز (Cases) عدالتوں میں پہنچے ہوئے ہیں، کچھ وقف بورڈ کے سامنے ہیں اور کچھ چیریٹی قوانین کے تحت سول کورٹ میں زیرِ سماعت ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت سی وقف کی پراپرٹیاں ایسی ہیں جن پر خود مسلمانوں نے ناجائز قبضے کیے ہیں، یہی کوتاہیاں ہیں جو اللہ کے غیبی نظام کو حرکت میں لے آتی ہیں، جب بھی ہم اللہ کی امانت میں خیانت کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ ضرور سامنے آتا ہے اور ہمیں جھنجھوڑنے کے لئے کوئی نہ کوئی ہتھوڑا چلتا ہے، میں اپنے بھروچ ضلع کی ایک مثال دوں: کچھ بزرگوں نے اپنی زمینیں اللہ کی راہ میں وقف کردی تھیں، سب کو معلوم تھا کہ یہ زمین وقف ہے؛ لیکن کاغذات ان بزرگوں کے نام پر ہی رہے، جب وہ دنیا سے رخصت ہوگئے تو ان کے پوتوں کو یہ لگا کہ چونکہ زمین دادا کے نام پر ہے تو یہ ہماری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے متولی یا ٹرسٹ کو اطلاع دیے بغیر سیدھی زمین بیچ دی، بعد میں جب مسجد والوں کو پتہ چلا تو بہت دیر ہوچکی تھی، یہی وہ کمزوریاں ہیں جو ہمارے اوقاف کو کمزور کررہی ہیں اور دوسروں کو انگلی اٹھانے کا موقع دیتی ہیں۔

نئے قوانین اور اوقاف کا مستقبل:

یہ اللہ والے تھے جنہوں نے ''باقیات صالحات'' کو سامنے رکھ کر اپنی زمینیں اور جائیدادیں وقف کیں، وہ تو ثواب کے لئے چھوڑ گئے تھے، مگر افسوس! ہم نے اس کو غلط طریقے سے استعمال کیا، انہوں نے اللہ کی رضا کے لئے دیا تھا، اور ہم نے اپنی غفلت اور خودغرضی سے اس امانت میں خیانت کی۔ یہ ہرگز جائز نہیں۔ اسی لئے وقف کے مسائل کو جاننا ہم سب کے لئے ضروری ہے۔ آج حکومت کی طرف سے یہ کوشش ہورہی ہے کہ وقف بورڈ کے بہت سے اختیارات ختم کردیے جائیں اور ان کو دوسرے اداروں میں بانٹ دیا جائے، اگر ایسا ہوا تو لازمی طور پر وقف کی دوبارہ رجسٹریشن کرنی پڑے گی اور نئے قوانین کی سختیاں بڑھا دی

جائیں گی، فی الحال اس قانون کو تین مہینے کے لئے ملتوی کر کے جانچ کمیٹی کے حوالے کیا گیا ہے؛ لیکن اگر یہ قانون منظور ہو گیا تو آنے والے وقت میں لوگ جائیدادیں وقف کرنے سے ہچکچائیں گے۔ وہ سوچیں گے کہ ہم نے تو اللہ کے لئے دیا، مگر اگر ہماری زمینیں صحیح مقاصد کے لئے استعمال نہ ہوسکیں تو کیوں نہ رک جائیں؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ نئے اوقاف کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا؛ لہٰذا ہم حکومت سے کہتے ہیں: یہ اوقاف ہمارے اسلاف کی امانت ہیں، ان کا اصل مقصد باقی رکھو، ورنہ یہ امت کے دینی، تعلیمی اور سماجی نظام کو سخت نقصان پہنچائے گا۔

دینی امانت اور مسلمانوں کی ذمہ داری:

اس لئے ضرورت ہے کہ ایسے قوانین بنائے جائیں جن میں وقف کا پورا نظام مسلمانوں کے ہاتھ میں رہے؛ کیونکہ یہ خالص مسلمانوں کا مذہبی مسئلہ ہے۔ وقف صرف زمین اور جائیداد کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مسلمان کا اپنے رب کے ساتھ تعلق ہے، غیر مسلم بھائیوں کے اپنے ٹرسٹ ہیں، ان میں وہ خود ذمہ دار ہوتے ہیں، اسی طرح وقف چونکہ مسلمانوں کی دینی امانت ہے، اس کے ذمہ دار بھی مسلمان ہی ہونے چاہئے، جو متولی بنائے جائیں وہ اپنی ذمہ داریاں صرف قانونی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے ادا کریں، اور اس امانت کو اللہ کی رضا کے ساتھ نبھائیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ آنے والے دنوں میں وقف کے سلسلے کی تمام پریشانیاں دور فرمائے، ان مسائل کو آسان کرے اور ہمیں اوقاف کی امانتوں کو صحیح طور پر ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۷)

زلزلے کے اسباب اور علاج نبوی

الحمد لله رب العالمين و الصلاه و السلام على سيد المرسلين و على آله و اصحابه اجمعين. اما بعد!

قال الله تبارك و تعالى في كلامه المجيد و الفرقان الحميد

اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم

قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ (انعام:۶۵)

وقال تعالى:

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ﴿۱﴾ وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ﴿۲﴾ وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ﴿۳﴾ يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ﴿۴﴾ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ﴿۵﴾ يَوْمَئِذٍ يَّصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا ۙ لِّيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ ﴿۶﴾ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ﴿۷﴾ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ﴿۸﴾ (زلزال)

وقال النبي صلى الله عليه وسلم : لا تَقومُ السَّاعةُ حَتَّى يُقبَضَ العِلمُ، وتَكثُرَ الزَّلازِلُ، ويَتَقارَبَ الزَّمانُ. (بخاری: کتاب الاستسقاء، باب ماقیل فی الزلازل والآیات)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاكرين و الشاهدين و الحمد لله رب العالمين.

نصیحت یا غفلت کا پردہ؟

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! کلامِ پاک کی جن آیات کی تلاوت آپ کے سامنے کی گئی، ان میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنی قدرت اور اپنی طاقت کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ پاک ارشاد فرماتے ہیں: ''قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ط'' اللہ پاک اپنی قدرت سے تمہارے اوپر آسمان سے کوئی عذاب نازل فرما سکتا ہے، یا زمین کے نیچے سے تم پر عذاب بھیج سکتا ہے، یا تمہیں آپس میں لڑائی جھگڑوں میں مبتلا کر سکتا ہے۔ پھر اللہ پاک آگے فرماتے ہیں: ''اُنْظُرْ'' آپ دیکھئے کہ ہم کس طرح لوگوں کو سمجھا رہے ہیں، مگر افسوس! لوگ ہیں کہ سمجھنا نہیں چاہتے، کاش کہ وہ عبرت پکڑیں۔ اسی طرح ایک اور آیت جسے ہم سب نماز میں پڑھتے ہیں: ''اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا ۝۱'' جب زمین کو سخت زلزلے کے ساتھ ہلایا جائے گا۔ ''وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا ۝۲'' اور زمین اپنے اندر سے سب کچھ نکال دے گی؛ مردوں کو، سونا چاندی کو، اور جانے کن کن خزانوں کو باہر لے آئے گی۔ اس وقت انسان گھبرا کر کہے گا: ''وَقَالَ الْاِنْسَانُ مَا لَهَا ۝۳'' اس زمین کو کیا ہو گیا ہے؟ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا ۝۴ بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝۵'' اس دن زمین اپنی خبریں بیان کرے گی، کیونکہ تیرے رب نے اسے حکم دیا ہوگا۔ یعنی زمین کے ذرّے ذرّے میں جو کچھ تم نے کیا ہوگا، وہ اللہ کے حکم سے ظاہر کر دے گی۔ یہ آیات اور قرآن کی بہت سی دوسری آیات بندوں کے سامنے اللہ کی قدرت اور اس کی بے پایاں طاقت کو بیان کرتی ہیں، تاکہ ہم عبرت حاصل کریں اور اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔

غفلت کی نیند اور اچانک گرفت:

ایک آیت میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَفَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا بَيَاتًا وَّهُمْ نَآئِمُوْنَ ۝۹۷'' (اعراف:۹۷) کیا بستیوں کے رہنے والے اس بات سے بے خوف ہو گئے

ہیں کہ ہم اچانک رات کو، جب وہ گہری نیند سو رہے ہوں، ان پر اپنا عذاب نازل کر دیں؟ یا دن کے وقت، جب وہ اپنے کاروبار اور مشاغل میں مشغول ہوں، اچانک ان پر ہماری گرفت آجائے؟ پھر اللہ تعالیٰ آگے فرماتے ہیں: ''اَفَاَمِنُوْا مَكْرَ اللّٰهِ ۚ''(اعراف:۹۹) کیا لوگ اللہ کی تقدیر اور اس کے عذاب سے مطمئن ہو کر بے خوف ہو گئے ہیں؟ یاد رکھو! جو اللہ کی گرفت سے بے خوف ہو جائیں، وہی دراصل خسارے میں پڑنے والے ہیں۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا یہ معمول تھا کہ جب کبھی سخت آندھی چلتی، یا زوردار بارش ہوتی، یا بجلی اور گرج کڑک سنائی دیتی تو آپ ﷺ گھبرا جاتے اور فوراً مسجد کی طرف متوجہ ہوتے۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! لوگ تو بارش اور بادل دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور آپ کو میں دیکھتی ہوں کہ آپ غمگین اور پریشان ہو جاتے ہیں؟ جناب نبی کریم ﷺ نے فرمایا: عائشہ! اگلی قوموں پر اللہ تعالیٰ نے اسی طرح کا عذاب نازل فرمایا تھا۔ (بخاری: کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ تعالیٰ: فلما رأو عارضا مستقبل اودیتھم)

پچھلی قومیں آئینہ، ہمارے لئے تنبیہ:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ۚ''(عنکبوت:۴۰) ہم نے ہر ایک کو اس کے گناہوں کی وجہ سے اپنی گرفت میں لیا؛ چنانچہ ان میں سے کچھ پر ہم نے پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیجی، کچھ کو ایک زبردست چنگھاڑ نے آپکڑا، کچھ کو ہم نے زمین میں دھنسا دیا، اور کچھ کو ہم نے سمندر میں غرق کر دیا۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝'' ''اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، بلکہ یہ لوگ خود اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے۔ دوستو اور بزرگو! یہ آیات ہمیں متنبہ کر رہی ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ قوم عاد، ثمود اور فرعون جیسے بڑے بڑے لشکر رکھنے والے بھی اپنے گناہوں کی وجہ سے مٹا دیے گئے، یہ سب واقعات اس بات کی نشانی ہیں کہ قیامت آنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ دنیا میں ایسے حالات پیدا کرتا ہے جو ہمیں جھنجھوڑ دیں، تاکہ ہم اپنی غفلت سے جاگیں اور اپنے

رب کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

قدرتی اسباب اور اعمالِ انسانی کا تعلق:

دوستو اور بزرگو! یہ جو زلزلہ ہے، اس کے بارے میں ہر زمانے کے لوگ اپنے اپنے انداز سے بات کرتے آئے ہیں، پہلے زمانے کے انسان، جب دین اور شریعت سے ناواقف تھے، تو جہالت کی بنیاد پر عجیب وغریب تصورات رکھتے تھے، وہ کہتے تھے کہ زمین کو کوئی بڑی گائے اپنے سینگوں پر اٹھائے ہوئے ہے، جب وہ ایک طرف کا سینگ ہلاتی ہے تو زمین ہلنے لگتی ہے، اور جب دوسری طرف کا سینگ حرکت کرتا ہے تو دوسری جانب زمین لرزنے لگتی ہے، یہ ان کی لاعلمی اور نادانی کی باتیں تھیں۔ پھر زمانہ آگے بڑھا، سائنس نے ترقی کی اور تحقیق نے نئی شکل اختیار کی، آج کے اکثر سائنسدان اس بات پر متفق ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو مختلف پلیٹوں (Plates) پر بنایا ہے۔ زمین کا یہ نچلا حصہ، جو تہہ در تہہ بنا ہے، کبھی قدرتی نظام کے تحت اور کبھی انسانی بگاڑ اور فساد کی وجہ سے اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے، پلیٹوں کا یہ ادھر سے ادھر ہونا یا اوپر نیچے سرک جانا بڑے بڑے زلزلوں کا سبب بنتا ہے، یہ سائنسی اور طبعی اسباب اپنی جگہ درست ہیں، اسلام ان کی نفی نہیں کرتا؛ لیکن ساتھ ہی دین ہمیں یہ حقیقت بھی بتاتا ہے کہ زلزلے صرف طبعی اسباب کی وجہ سے نہیں آتے، بلکہ اس کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی مشیت اور بندوں کے اعمال کا بھی تعلق ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب انسان گناہوں میں بڑھ جاتے ہیں، جب نافرمانیاں عام ہوجاتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ کے طور پر زلزلے آتے ہیں، (مسند احمد: رقم: ۲۷۲۳۹) تاکہ بندے سنبھل جائیں اور اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔

پندرہ علامات؛ امت کے لئے تنبیہ:

حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پندرہ ایسی علامتیں بیان فرمائیں جو جب کسی قوم میں ظاہر ہوجائیں تو وہ اللہ کی گرفت کے قریب ہوجاتی ہے۔ امام ترمذیؒ نے اس

حدیث کو نقل کیا ہے۔ان علامات میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ناچ گانا عام ہوجائے، جوا اور سٹہ کھیلنا پھیل جائے، اولاد ماں باپ کی نافرمانی کرے، لوگ اپنے دوستوں اور بھائیوں سے مشورہ لیں مگر باپ کو نظر انداز کریں، باپ کے بجائے دوسروں کو زیادہ اکرام دیا جانے لگے، چھوٹے بڑے کی عزت نہ کریں اور بڑوں کے متعلق بدگوئی کریں، اگلے بزرگوں کی برائیاں کی جائیں، امانت میں خیانت عام ہوجائے، مالِ غنیمت یا اجتماعی مال میں خیانت ہونے لگے، لوگ امانتوں کو ادا نہ کریں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جب یہ سب گناہ پھیل جائیں گے تو آسمان پر سرخی نمودار ہوگی اور زلزلے آنے لگیں گے۔ (ترمذی: ابواب الفتن، باب ماجاء فی علامۃ حلول المسخ والخسف) یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تنبیہ ہوگی کہ بندے اپنی حالت درست کریں۔

قیامت کا منظر:

دوستو اور بزرگو! میں نے آپ کے سامنے سورۂ زلزال کی جو آیت تلاوت کی تھی، اس کا تعلق تو قیامت کے دن سے ہے؛ لیکن قیامت کے آنے سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ نے سورۂ حج میں ایک بڑی ہولناک حقیقت ذکر فرمائی: ''اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ ①'' (حج:۱) یقیناً قیامت کا زلزلہ بہت ہی سخت ہوگا۔ اللہ پاک فرماتے ہیں کہ اس وقت ایسی ہیبت اور خوف کی کیفیت ہوگی: ''وَتَضَعُ كُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا وَتَرَى النَّاسَ سُكٰرٰى وَمَا هُمْ بِسُكٰرٰى وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِیْدٌ ②'' (حج:۲) کہ حاملہ عورتیں ڈر کے مارے اپنے حمل گرادیں گی اور لوگ اس حال میں دکھائی دیں گے گویا وہ نشے میں ہیں، حالانکہ وہ نشے میں نہیں ہوں گے، بلکہ یہ اللہ کے سخت عذاب کی ہیبت ہوگی۔ پھر سورۂ قمر میں فرمایا: ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ①'' قیامت قریب آ گئی ہے اور چاند پھٹ گیا۔ یہ معجزہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاتھ پر دکھایا گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے پوری سورۂ قمر میں اپنی قدرت کا ذکر فرمایا کہ کس طرح عاد، ثمود اور پچھلی قوموں کو ان کے گناہوں کی وجہ سے عبرتناک انجام تک پہنچایا۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں تاکہ انسان عبرت حاصل کرے اور اپنی اصلاح کرے۔

زمین کا خاموش فرش قیامت کے دن بولے گا:

قرآن کریم نے اس بڑے زلزلے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب وہ آئے گا تو زمین اپنے اندر چھپے ہوئے خزانے باہر نکال دے گی، سونا، چاندی اور قیمتی دھاتیں سب ظاہر ہو جائیں گی۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ جب یہ خزانے نکلیں گے تو لوگ پچھتائیں گے اور کہیں گے: کاش یہ خزانہ پہلے نکل آتا تو ہم مال و جائداد کی وجہ سے ایک دوسرے سے لڑائی اور جھگڑا نہ کرتے، لیکن اس وقت حالات ایسے ہولناک ہوں گے کہ انسان دولت کو بھی بوجھ سمجھنے لگے گا۔ کافر اس دن کہے گا: کاش میں اپنے رشتہ دار کو مال کی خاطر قتل نہ کرتا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا ۝'' تیرے رب کے حکم سے زمین یہ سب کچھ ظاہر کرے گی اور پھر فرمایا: ''يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا'' اُس دن زمین اپنی خبریں سنائے گی۔ مفسرین لکھتے ہیں: جس زمین پر نیکی کی گئی ہوگی، وہ نیکی کی گواہی دے گی، اور جس زمین پر گناہ کیا گیا ہوگا، وہ اس گناہ کی شہادت دے گی۔ یہ منظر ہمیں یاد دلاتا ہے کہ یہ زمین جو ہمیں بے جان لگتی ہے، قیامت کے دن زبانی گواہ بنے گی۔

سائنس کے اندازے اور اللہ کا فیصلہ:

دوستو اور بزرگو! قرآن اور نبی کریم ﷺ نے ہمیں یہ بتایا کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک بڑی نشانی زلزلے ہیں۔ سائنسدان اپنی تحقیقات سے یہ ضرور بتاتے ہیں کہ زمین کے مختلف زون ہیں جہاں زلزلے زیادہ آسکتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ زلزلے کے آنے کے وقت اور لمحے کا علم آج بھی کسی کو نہیں، یہاں تک کہ جدید سائنس اور اربوں ڈالر کے منصوبوں کے باوجود وہ صرف اندازے ہی لگا سکتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی دعوے کرتے ہیں کہ بعض مشینوں کے ذریعے زمین کے اندر مصنوعی زلزلے پیدا کیے جاتے ہیں، لیکن اصل حقیقت یہی ہے کہ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے تو زمین لرزنے لگتی ہے۔ یہ سب اللہ پاک کی قدرت کے مظاہر ہیں تاکہ انسان عبرت پکڑے اور اپنے رب کی طرف رجوع کرے۔

نبوت کی دلیل معجزہ، ولایت کی دلیل تقویٰ واتباع شریعت:

دوستو اور بزرگو! ایک مومن اور مسلمان کی آخری نگاہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہونی چاہیے۔ دنیا کے اسباب کو اختیار کرنا اور ان پر عمل کرنا اپنی جگہ ضروری ہے، لیکن یقین اور بھروسہ صرف اللہ پاک پر ہونا چاہیے۔ آج کی سائنس خود اس حقیقت کو مانتی ہے کہ اب تک کوئی ایسی مشینری ایجاد نہیں ہوسکی جو زمین میں اپنی مرضی سے زلزلہ پیدا کر سکے، ہاں! جب اللہ تعالیٰ کا دشمن، اور پوری انسانیت کا دشمن دجال ظاہر ہوگا تو اللہ پاک اسے امتحان کے طور پر کچھ خاص قوت عطا فرمائیں گے، یہ اس کی ذاتی طاقت نہیں ہوگی بلکہ اللہ کی طرف سے عارضی آزمائش ہوگی، اسی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ حضرت عیسیٰ ؑ کو بھی ایسی طاقت عطا فرمائیں گے کہ جیسا کہ حدیث شریف میں ہے: دجال حضرت عیسیٰؑ کو دیکھتے ہی اس طرح پگھلنے لگے گا جیسے پانی میں نمک گھل کر ختم ہوجاتا ہے۔ (مسلم: کتاب الفتن، باب فی فتح قسطنطنیة وخروج الدجال ونزول عیسی ابن مریم)

یاد رکھو! یہ سب انسان یا نبی کی ذاتی قوت نہیں ہوتی، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا معجزہ ہوتا ہے، تاکہ انبیاء علیہم السلام کی نبوت کی تصدیق ہو اور لوگوں پر اللہ کی حجت قائم ہو، اسی لیے انبیاء کرام علیہم السلام کو معجزات دکھانا ضروری ہے کیونکہ یہ ان کی نبوت کی علامت ہیں؛ لیکن اولیاء اللہ سے جو کرامت ظاہر ہو، وہ ان کی ولایت کی دلیل نہیں، اور نہ ہی ان کے لیے اپنی کرامت کو لوگوں کے سامنے بیان کرنا ضروری ہے۔ اصل دلیل ہمیشہ ایمان، تقویٰ اور اتباعِ شریعت ہے۔

حضرت بایزید بسطامیؒ کا واقعہ:

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے محدث اور عظیم صوفی بزرگ گزرے ہیں۔ ایک صاحب کئی سال تک آپ کی خانقاہ میں رہنے کے بعد جانے لگے اور عرض کیا: حضرت! میں اب رخصت ہونا چاہتا ہوں، کیونکہ اتنے عرصے میں میں نے آپ سے کوئی کرامت ظاہر ہوتے نہیں دیکھی۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: جانا چاہو تو جا سکتے ہو، لیکن جانے سے پہلے ایک سوال کا جواب دو، کیا تم نے میری زندگی میں کوئی ایسا عمل

دیکھا ہے جو جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے خلاف ہو؟ اس شخص نے فوراً کہا: نہیں حضرت! میں نے ایسا کوئی عمل نہیں دیکھا، حضرت بایزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: بس، یہی سب سے بڑی کرامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے عمل کو اپنے نبی کے عمل کے ساتھ جوڑ دیا ہے۔ دوستو اور بزرگو! یاد رکھئے، کرامتیں اپنی جگہ، لیکن سب سے بڑی کرامت یہ ہے کہ انسان کی زندگی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق گزرے؛ کیونکہ اصل طاقت اللہ کی ہے، اور وہی اپنے خاص بندوں کے ذریعے اپنی قدرت ظاہر فرماتا ہے۔

قدرتِ الٰہی کی جھلک:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ'' پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رات کے ایک حصے میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک کا سفر کرایا اور وہاں سے آسمانوں کی سیر کروائی۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا'' یہ سب کچھ رات کے تھوڑے سے حصے میں ہوا۔ پھر سورۃ النجم میں فرمایا: ''فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی ﴿۱۰﴾ مَا کَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰی ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَہٗ عَلٰی مَا یَرٰی ﴿۱۲﴾'' (نجم: ۱۰-۱۲) نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ آسمانوں میں دیکھا، وہ بالکل حق تھا، دل نے جو دیکھا اس میں کوئی شک نہیں۔ دوستو اور بزرگو! انسانوں کے لیے زمین کی گہرائی میں جانا مشکل ہے، آسمانوں پر جانا اور بھی مشکل ہے، لیکن اللہ پاک نے یہ واقعہ ''سبحان'' کے لفظ سے شروع فرمایا؛ تاکہ یہ بات واضح ہوجائے کہ بندوں کے لیے تو ہزار رکاوٹیں ہیں، لیکن اللہ پاک کی ذات کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں، وہ ہر عیب اور ہر کمی سے پاک ہے، اس کے لیے زمین کی تہہ بھی کوئی رکاوٹ نہیں، آسمان کی بلندی بھی کوئی رکاوٹ نہیں۔

گناہوں کا پھیلاؤ اور زمین کا لرزنا:

دوستو اور بزرگو! یہ جو زلزلے آتے ہیں، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت سے پہلے یہ کثرت سے آئیں گے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے ساتھ کچھ اعمال کا ذکر فرمایا جب امت ان

میں مبتلا ہو جائے گی تو یہ نشانیاں ظاہر ہوں گی، آپ ﷺ نے فرمایا: امانتیں ضائع ہو جائیں گی، شراب عام ہو جائے گی، لوگ جوا کھیلنے میں ڈوب جائیں گے، علم اٹھا لیا جائے گا، زلزلے کثرت سے آنے لگیں گے۔ اور پھر تیسری بڑی علامت بیان فرمائی: ''وَيَتَقَارَبُ الزَّمَانُ'' یعنی وقت میں برکت نہیں رہے گی، زمانہ تیزی سے گزرنے لگے گا۔ انسان چاہے گا کہ فلاں کام کر لوں، لیکن وقت اس کے ہاتھ سے نکل جائے گا، ایک دن دوسرے دن کے قریب لگے گا، ایک مہینہ دوسرے مہینے کی طرح لگے گا، یہ وہ نشانیاں ہیں جن کی خبر نبی اکرم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی دے دی تھی تاکہ ہم غفلت سے نکل آئیں اور اللہ کی طرف رجوع کریں۔

زمین کا پھٹنا اور قرآن کی پیشین گوئی:

اللہ تبارک وتعالیٰ نے مکہ والوں کو چیلنج کرتے ہوئے فرمایا: ''اَوَاَمِنَ اَهْلُ الْقُرٰٓى اَنْ يَّاْتِيَهُمْ بَاْسُنَا'' (اعراف:۹۸) کیا بستی والے، مکہ مکرمہ کے لوگ اس بات سے مطمئن ہو گئے ہیں کہ ہم ان پر اچانک اپنا عذاب نازل نہ کریں گے؟ اسی طرح ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ ۝'' (طارق:۱۲) قسم ہے پھٹنے والی زمین کی! یہ آیت کریمہ چودہ سو سال پہلے رسولِ اکرم ﷺ کے قلبِ مبارک پر نازل ہوئی، اس وقت کسی کو معلوم نہ تھا کہ ''ذَاتِ الصَّدْعِ'' یعنی پھٹنے والی زمین کا کیا مطلب ہے۔ بعد میں سائنس اور ارضیات کے ماہرین نے ریسرچ کے ذریعے بتایا کہ زمین واقعی اپنے اندر سے پھٹتی ہے، تختے سرکتے ہیں اور یہی زلزلے کا سبب بنتا ہے، مگر قرآن نے یہ حقیقت اُس وقت بیان کر دی جب دنیا کو اس کا علم ہی نہ تھا۔ حضرت عبداللہ ابنِ عباسؓ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا: ''اس سے مراد ہے ہلنے والی زمین'' یعنی زلزلہ۔

حضرت عمرؓ کے دور کا زلزلہ اور عدل کا اثر:

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں ایک مرتبہ زلزلہ آیا۔ آپؓ نے زمین پر پیر مار کر فرمایا: اے زمین! کیا عمر تیرے اوپر انصاف نہیں کر رہا؟ یعنی اللہ کے بندوں پر اگر میں نے کوئی ظلم کیا ہے تو بتا

دے! روایت کرنے والے لکھتے ہیں کہ زمین فوراً تھم گئی۔ (طبقات الشافعیۃ الکبری: ۲/۳۲۴) یہ پہلا بڑا زلزلہ تھا جو حضرت عمرؓ کے زمانے میں آیا، بعض اہلِ علم فرماتے ہیں کہ حضور نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں بھی ایک مرتبہ زلزلہ آیا تھا، اُس وقت آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! جب اللہ تعالیٰ راضی ہوتے ہیں تو خیر کے فیصلے فرماتے ہیں، اور جب ناراض ہوتے ہیں تو اس طرح کے عذاب ظاہر فرماتے ہیں۔ (العقوبات، ابن ابی الدنیا: ص/۲۹، رقم:۱۷)

آزمائشوں کے پسِ پردہ حکمت:

تو یہ زلزلے دراصل اُس بڑے زلزلے کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو قیامت کے دن آنے والا ہے، ہماری آنکھوں نے دیکھ لیا کہ کس طرح شاندار محل کاغذ کے پتوں کی طرح بکھر گئے، اور کتنی ہی انسانی جانیں لمحوں میں ضائع ہوگئیں، جب صحابۂ کرامؓ نے اس بارے میں رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: یہ زلزلے اللہ کے نافرمان بندوں کے لیے عذاب ہیں، لیکن ایمان والوں کے لیے رحمت ہیں۔ (العقوبات:ابن ابی الدنیا، ص/۲۹، رقم:۱۷) حدیث شریف میں آیا ہے کہ بعض اوقات کسی کے اعمال جنت کے بلند درجات کے قابل نہیں ہوتے، مگر اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے عظیم جنت تیار فرمائی ہوتی ہے، تو اللہ تعالیٰ دنیا میں اس بندے کو آزمائشوں میں ڈالتا ہے تاکہ وہ اس انعام کا اہل بن جائے، اس لیے جب کسی علاقے میں زلزلہ آتا ہے تو ہمیں محض یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ صرف ایک سائنسی یا طبیعیاتی امر ہے، یا محض نیچرل امر ہے جس سے زمین ہلتی ہے اور مکانات گر جاتے ہیں۔ ایک مؤمن اور مسلمان کی نگاہ اس سے آگے بڑھتی ہے کہ یہ سب اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، اسے سوچنا چاہیے کہ یہ کیوں پیش آتے ہیں اور ہمیں کس طرح کے اسباب اور اعمال اختیار کرنے چاہیے تاکہ اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ سکیں۔

توبہ واستغفار کا سہارا:

جنابِ نبی اکرم ﷺ نے ہمیشہ اپنی امت کو توبہ اور استغفار کی طرف رغبت دلائی۔ (مسند احمد:رقم:۱۸۵۸۳) آپ ﷺ نے حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دعاء بھی تعلیم فرمائی

جوانہوں نے اندھیروں میں اللہ کو پکار کر مانگی تھی: ''لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّىْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝'' (ترمذی: ابواب الدعوات، رقم: ۳۵۰۵) قرآن کریم آگے فرماتا ہے: ''وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِى الْمُؤْمِنِيْنَ ۝'' (انبیاء: ۸۸) یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے نجات دی، اسی طرح اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو بھی ہر قسم کی پریشانی اور مصیبت سے نجات عطا فرماتے ہیں، بشرطیکہ وہ دل سے رجوع کریں اور استغفار کے ساتھ اللہ کو پکاریں؛ لہٰذا زلزلے اور دیگر حادثات ہمارے لیے محض ایک دنیوی واقعہ نہیں، بلکہ یہ ہمیں اس بڑے زلزلے، یعنی قیامت کی یاد دلاتے ہیں، یہ ہمیں اپنی موت کی تیاری اور توبہ واستغفار کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ درحقیقت یہ بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں سے ہیں کہ آپ نے پہلے ہی خبر دی تھی کہ ایسے حالات آئیں گے تاکہ امت عبرت حاصل کرے۔ ایمان والوں کے لیے یہ زلزلے رحمت اور شہادت کا ذریعہ بنتے ہیں، اور باقی لوگوں کے لیے نصیحت اور تنبیہ کا سامان۔ اس لیے ہمیں چاہیے کہ ہم ان سے سبق حاصل کریں، اللہ کی طرف رجوع کریں اور اپنی اصلاح کی فکر کریں۔ آخر میں سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ ہم دعا کریں۔ ہم براہِ راست مدد کرنے کی استطاعت نہ رکھتے ہوں، لیکن دعا ہر ایک کے اختیار میں ہے، چنانچہ ہم اپنے ان مسلمان بھائیوں کے لیے دعا کریں کہ اللہ پاک ان کی مصیبت کو راحت میں بدل دے، ان کے دکھ کو دور فرمائے اور ان کو سلامتی عطا کرے۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۸)

۲۶ جنوری کا پیغام ہندوستانیوں کے نام

الحمد لله رب العالمين و الصلوٰة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين. اما بعد!

قال الله تعالى فى كلامه المجيد و الفرقان الحميد۔

اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم ○ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾

(حجرات: ۱۳)

و قال النبى صلى الله عليه وسلم: ايها الناس! إن ربكم واحد و إن اباكم واحد، الا لا فضل لعربي على عجمي و لا لعجمي على عربي، و لا أحمر على اسود و لا اسود على أحمر الا بالتقوى. (مسند أحمد: رقم: ۲۳۴۸۹)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

آزادی سے آئین تک کا سفر:

محترم ومکرم اساتذۂ کرام، عزیز طلبہ اور معزز مہمانانِ گرامی! آج ہم سب یہاں ۲۶ جنوری کے موقع پر جمع ہوئے ہیں، ہمارے پروفیسر صاحب نے بڑی وضاحت کے ساتھ ۱۵ اگست اور ۲۶ جنوری کے فرق کو بیان کیا، جیسا کہ آپ جانتے ہیں، ۱۵/اگست ۱۹۴۷ کو ہم انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہوئے؛ لیکن یہ آزادی صرف عملی اور اجمالی تھی، قانونی اعتبار سے

ابھی بھی انگریزوں کا بنایا ہوا قانون ہی اس ملک میں نافذ تھا، اس کے بعد مسلسل دو سال، گیارہ مہینے اور اٹھارہ دن کی شب و روز محنت کے بعد بالآخر ہندوستان کا اپنا آئین تیار ہوا، اور یوں ۲۶ رجنوری ۱۹۵۰ کو یہ ملک قانونی اور دستوری اعتبار سے بھی مکمل طور پر آزاد ہوا۔ پہلے ہم نے جسمانی آزادی کا جشن منایا، لیکن اس آزادی کو دائمی تحفظ دینے کے لیے ایک قانون، ایک دستور اور ایک مضبوط نظامِ مملکت کی ضرورت تھی، یہ عظیم دستور ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی سربراہی میں تیار کیا گیا۔

ہندوستان کا دستور دنیا کے دیگر ملکوں کے دساتیر سے بالکل منفرد ہے، پروفیسر صاحب نے بتایا کہ دنیا کے سات بڑے ممالک اس سے پہلے آزاد ہو چکے تھے، لیکن ہر ملک نے اپنے اپنے انداز سے قانون بنایا، مثال کے طور پر: برطانیہ کا سیاسی نظام بالکل الگ ہے۔ امریکہ میں صدارتی نظام نافذ ہے، وہاں عوام صدر کا بھی براہِ راست انتخاب کرتے ہیں، جبکہ ہمارے ملک میں عوام وزیر اعظم کا انتخاب کرتے ہیں اور صدر بالواسطہ منتخب ہوتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ میں جب بادشاہوں نے ظلم کیے تو سب سے پہلے فرانس سے انقلاب کی آواز بلند ہوئی، جسے دنیا ''فرانسیسی انقلاب'' کے نام سے جانتی ہے۔ اس کے بعد یہ سلسلہ امریکہ تک پہنچا اور پھر ہندوستان میں بھی آزادی کی تحریک کامیاب ہوئی۔ یوں کہا جا سکتا ہے کہ ۱۵ راگست نے ہمیں انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائی، جبکہ ۲۶ رجنوری نے ہمیں ایک ایسا آئین دیا جو ہماری آزادی کی حفاظت کرتا ہے۔ اب جب بھی ہم پر کوئی ظلم ہو یا کوئی شخص ملک کے قانون کے خلاف کوئی کام کرے، تو یہی آئین ہمیں انصاف دلانے کے لیے ہماری ڈھال اور سہارا بنتا ہے۔

شیخ الہندؒ اور دیوبند کی تحریکِ حریت:

دوستو! ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگِ آزادی کے بعد جب امتِ مسلمہ شکست و مایوسی کے اندھیروں میں ڈوب گئی، تب اہلِ ایمان کے چند باہمت علماء نے یہ فیصلہ کیا کہ اب امت کی بقا کے لیے تلوار کے ساتھ علم اور کردار کی ضرورت ہے۔ یوں ۱۸۶۶ء میں دارالعلوم دیوبند کی بنیاد

رکھی گئی، یہ صرف ایک مدرسہ نہیں، بلکہ ایک ایسی تحریک تھی جس کا مقصد ایمان، علم، اور آزادی کے سپاہی تیار کرنا تھا۔ یہاں دین کی تعلیم کے ساتھ ملت کی فکری رہنمائی اور حریتِ وطن کی روح پروان چڑھائی گئی۔ بانیٔ دارالعلوم حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ کے ایماء پر تعلیم کے ساتھ عمل کو جوڑنے کے لیے ثمرۃ التربیت کے نام سے ایک انجمن قائم فرمائی گئی، تاکہ فارغین دارالعلوم ایک منظم جماعت بن کر امت کی خدمت کریں۔ آپ کے بعد حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے اسی مشن کو آگے بڑھایا۔ انہوں نے تیس برس تک خاموشی سے علم، ایمان، اور آزادی کی اس تحریک کی آبیاری فرمائی۔ ان کے شاگردِ خاص علامہ عبیداللہ سندھیؒ نے سندھ میں دارالرشاد نامی مدرسہ قائم کیا اور اس پیغام کو عام کیا۔ شیخ الہندؒ خود بھی سندھ کا سفر فرما کر آزادیٔ ہند کی اس خفیہ تحریک کو پروان چڑھاتے رہے۔ ۱۳۲۷ھ میں آپؒ نے جمعیۃ الانصار کے نام سے ایک نئی تنظیم قائم کی اور علامہ سندھیؒ کو دیوبند طلب فرمایا۔ ۱۹۱۱ء میں دارالعلوم میں ایک عظیم جلسۂ دستار بندی منعقد ہوا جس میں ۳۰ ہزار علماء وعوام شریک ہوئے۔ یہ اجتماع علم کا بھی تھا اور عزمِ حریت کا بھی۔ بعد میں دہلی میں نظارۃ المعارف کے نام سے اس تحریک کا مرکز قائم کیا گیا۔ جب ۱۹۱۴ء میں برطانیہ و جرمن میں جنگِ عظیم شروع ہوئی، تو شیخ الہندؒ نے اسے موقع سمجھا اور عملی جدوجہد کا آغاز کیا۔ انہوں نے علامہ سندھیؒ کو افغانستان روانہ کیا اور خود خلافتِ عثمانیہ سے رابطے کے لیے حجاز تشریف لے گئے۔ وہاں ۱۹ / اکتوبر ۱۹۱۵ء کو ترکی کے گورنر غالب پاشا سے ملاقات کی اور ان کے ذریعے ہندوستان کے مسلمانوں کے نام انگریز کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کا پیغام جاری کیا جو ''پیغامِ غالب پاشا'' کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا۔

دوستو! جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ نے انگریز کے خلاف جدوجہد کا علم بلند کیا، تو دوسری طرف ان کے شاگردِ خاص مولانا عبیداللہ سندھیؒ نے افغانستان پہنچ کر وہاں جلاوطن حکومتِ ہند کی بنیاد رکھی۔ اس حکومت کے صدر کے طور پر مہاراجہ پرتاپ سنگھ کو نامزد کیا گیا،

تا کہ ہندو اور مسلمان مل کر انگریز کی غلامی کا طوق توڑ سکیں؛ لیکن دوستو! اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہمیشہ غالب آتا ہے، جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا: ''وکان امر اللہ قدرا مقدورا'' اللہ کا حکم ایک طے شدہ فیصلہ ہے۔ ترکی اور جرمنی کی جنگ کا پانسہ پلٹ گیا، امریکہ کی مداخلت، اور روس و برطانیہ کی مدد سے ترک و جرمن فوجیں پسپا ہوگئیں۔

ادھر ایک اور بڑی آزمائش آئی انگریزوں کی چالوں کے نتیجے میں شریف مکہ نے ترک خلافت کے خلاف بغاوت کردی۔ یوں عرب علاقوں سے خلافت کی حمایت ختم ہوگئی اور ترکوں کی مدد رک گئی، اب انگریزوں نے اپنی سازشوں کا رخ علماء کی طرف موڑ دیا۔ شیخ الہندؒ کے خلاف جال بچھایا گیا۔ مولانا عبید اللہ سندھیؒ کا ایک خط، جو آپ نے ریشمی رومال پر لکھ کر بھیجا تھا، انگریز کے ایک ایجنٹ رب نواز کے ہاتھ لگ گیا۔ اسی خط نے تحریک کی خفیہ تدابیر ظاہر کر دیں۔ انگریزوں نے اس کا فائدہ اٹھایا، انہوں نے ایک ہندوستانی ایجنٹ مبارک علی کے سہارے شریفِ مکہ کے ذریعے علمائے حرم سے ترکوں کے خلاف فتویٰ تیار کروایا، تا کہ ان کی سیاسی بغاوت کو مذہبی رنگ دیا جاسکے۔ یہ فتویٰ جب شیخ الہندؒ کے سامنے پیش کیا گیا، تو آپؒ نے فرمایا: میں ان محسن ترکوں کے خلاف قلم نہیں اٹھا سکتا جنہوں نے اسلام کی حفاظت کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔ یہی انکار، دراصل قید و بند کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ سب سے پہلے حضرت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنیؒ گرفتار کیے گئے، پھر انگریزوں نے دھمکی دی کہ اگر شیخ الہندؒ خود پیش نہ ہوئے تو ان کے ساتھی مولانا عزیز گلؒ اور حکیم نصرت حسین خانؒ کو گولی ماردی جائے گی۔ شیخ الہندؒ نے اپنے رفقاء کو بچانے کے لیے خود کو انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ ۱۲ جنوری ۱۹۱۷ء کو آپؒ کو قاہرہ لے جایا گیا، جہاں شہر جیزہ کے قید خانے میں سخت تفتیش کی گئی۔ مگر ان مجاہدینِ ایمان کے جوابات ایک جیسے تھے کوئی کمزوری، کوئی ندامت نہیں، بلکہ ہر سوال کا جواب عزم اور یقین سے دیا گیا۔ انگریزوں کی تمام کوششوں کے باوجود انہیں کوئی ایسی بات نہ مل سکی جس کی بنیاد پر سزا دی جاسکے۔ ورنہ پھانسی کا فیصلہ یقینی تھا۔ بالآخر ۱۲ فروری ۱۹۱۷ء

کوانہیں مالٹا کی جیل میں منتقل کر دیا گیا جہاں وہ سخت قید و مشقت میں تقریباً تین سال تک رہے۔ ۱۲ مارچ ۱۹۲۰ء کو اللہ تعالیٰ نے ان محب وطن، باایمان بزرگوں کو قید سے آزادی عطا فرمائی۔ یہ رہائی محض جسموں کی نہیں تھی، بلکہ ایک تحریکِ ایمان وحریت کی تجدید تھی۔ دوستو! یہ داستان کسی افسانے کی نہیں یہ ان عظیم ہستیوں کی قربانیوں کی حقیقت ہے جنہوں نے غلامی کی زنجیریں توڑنے کے لیے اپنی آزادی قربان کر دی۔

دوستو! شیخ الہندؒ وہ مردِ آہنی تھے جن کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء کی شکست کے بعد نئے عزم وحوصلے کے ساتھ دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی تھی، اور اسی مشن کو آپؒ نے مالٹا کی اسیری کے بعد نئی جہت عطا کی۔ قید و بند کے طویل اور صبر آزما ایام گزارنے کے بعد جب آپؒ وطن واپس آئے، تو امت کے دلوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا۔ بمبئی کے ساحل پر جب شیخ الہندؒ کا جہاز رکا، تو ہزاروں مسلمانوں نے والہانہ استقبال کیا۔ ان میں مہاتما گاندھی جی بھی موجود تھے اور وہ عالمِ باعمل مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ بھی جنہوں نے گاندھی جی کو ''مہاتما'' کا خطاب دیا تھا۔ یہ استقبال محض ایک شخص کا نہیں، بلکہ ایمان، علم، اور آزادی کی تحریک کا استقبال تھا۔ شیخ الہندؒ نے وطن پہنچتے ہی تحریکِ ترکِ موالات کا اعلان فرمایا یعنی انگریز حکومت سے مکمل بائیکاٹ! آپؒ نے فرمایا: جو قوم اپنے ظالم آقاؤں سے رشتہ توڑ نہیں سکتی، وہ کبھی آزادی کی نعمت نہیں پا سکتی۔ اسی تحریک کے زیرِ اثر جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کی بنیاد پڑی۔ یہ ادارہ دراصل ترکِ موالات ہی کی برکتوں کا نتیجہ تھا۔ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہندؒ کے دستِ مبارک سے جامعہ ملیہ کا افتتاح ہوا، یہ اس بات کی علامت تھی کہ علم اور آزادی ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ دوسری طرف، آپؒ کے باکمال شاگرد حضرت مفتی کفایت اللہ دہلویؒ اور دوسرے جید علماء نے ۱۹۱۹ء میں جمعیۃ علماء ہند کے نام سے ایک باضابطہ دینی وسیاسی جماعت کی بنیاد رکھی۔ یہ تنظیم خلافت کانفرنس دہلی کے موقع پر وجود میں آئی، اور اس کا پہلا اجلاس مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کی صدارت میں منعقد ہوا۔ یوں علماء کی قیادت میں ایک منظم قومی وملی تحریک وجود میں آئی جو

آگے چل کر تحریکِ آزادی کا روحانی مرکز بن گئی۔ اسی دوران جمعیۃ علماء کا دوسرا عظیم اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس کی صدارت خود شیخ الہندؒ کے نام سے منسوب تھی؛ مگر افسوس! شدید ضعف کی وجہ سے آپؒ بنفسِ نفیس شرکت نہ کر سکے۔ اجلاس کے صرف نو دن بعد، ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو یہ مردِ مؤمن، یہ قائدِ حریت، یہ وقارِ علماء اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ دوستو! شیخ الہندؒ کا وصال اگرچہ امت کے لیے ایک صدمہ تھا، مگر آپؒ کا مشن ختم نہ ہوا؛ بلکہ آپؒ کے شاگردوں اور رفقاء نے اس مشن کو خونِ دل سے آگے بڑھایا۔ ۱۹۲۶ء میں کلکتہ کے اجلاسِ جمعیۃ علماء ہند میں ایک تاریخ ساز فیصلہ ہوا اور وہ یہ کہ اب ہندوستان کی مکمل آزادی کے سوا کسی چیز پر اکتفا نہیں کیا جائے گا۔ یاد رکھئے دوستو! اس سے پہلے مختلف رہنماء جزوی آزادی کی بات کرتے تھے، نہرو رپورٹ کی مخالفت بھی جمعیۃ نے اس لئے کی تھی کہ موتی لال نہرو کی قیادت میں جو مسودہ تیار ہوا تھا اس میں مکمل آزادی سے بچتے ہوئے حکومت سے کچھ رعایات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تھا، مگر علماء دیوبند نے سب سے پہلے ''کامل آزادی'' کا نعرہ بلند کیا۔ یہی نعرہ آگے چل کر ۱۹۲۹ء میں لاہور کے اجلاسِ کانگریس میں گونجا، جب انہوں نے بھی جمعیۃ علماء کی پیروی میں ''پُورے ہندوستان کی آزادی'' کی قرارداد منظور کی۔ اس طرح کانگریس کے ۵ سال پہلے جمعیۃ علماء نے کامل آزادی کا اعلان کر کے کلیدی حیثیت حاصل کی۔ یوں تاریخ گواہ ہے کہ جس تحریک کا آغاز دارالعلوم دیوبند سے ہوا، اور جسے شیخ الہندؒ نے ایمان وعلم کے نور سے سینچا، وہی تحریک آگے چل کر آزادیٔ وطن کی بنیاد بنی۔

ہر مذہب، ہر طبقے کے لیے مساوی حقوق:

محترم حضرات اور عزیز طلبہ! یہ حقیقت ہے کہ ۲۶ رجنوری نے ہمیں اس ملک میں جینے کا حق دیا، اس سرزمین پر آزادی اور برابری کے ساتھ زندگی گزارنے کا حق دیا۔ ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر صاحب اور ان کے ساتھ دستور ساز کمیٹی کے بہت سے معزز اراکین نے مل کر ایسا آئین مرتب کیا جس نے ہندوستان کو ایک سیکولر ملک کی بنیاد عطا کی، اس دستور نے ہر شہری کو

اپنے مذہب پر عمل کرنے، اپنی مذہبی رسومات ادا کرنے، اپنی تعلیم حاصل کرنے اور اپنی عزت و وقار کے ساتھ جینے کا حق دیا۔ خاص طور پر عورتوں کی عزت وحرمت کی حفاظت اور سماج کے کمزور طبقوں کو ترقی کے مواقع دینا اسی آئین کی ضمانت ہے۔ ہندوستان کی تمام عدالتیں، لاء کمیشن سے لے کر پارلیمنٹ اور پھر سپریم کورٹ تک، اسی دستور کی روشنی میں فیصلے کرتی ہیں۔ اس طرح ملک کا عدالتی اور قانونی نظام ہر شہری کے بنیادی حقوق کی حفاظت کرتا ہے۔ آج بھی ہمارا یہ آئین ہمیں یہ حق دیتا ہے کہ ہم اپنی تمام آزادیوں کے ساتھ اس ملک میں برابر کے شہری کی حیثیت سے زندگی گزار سکیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ ڈاکٹر امبیڈکر صاحب کے ساتھ ساتھ اس دستور کی تیاری میں بہت سے دوسرے دانشور اور قانون دان بھی شریک تھے۔ اور یہاں میں اپنے مسلمان طلبہ اور طالبات سے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمیں یہ حقیقت کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اس ملک کی آزادی کی جدوجہد میں مسلمانوں نے بھی بہت بڑا اور نمایاں حصہ لیا۔ انگریزوں کے خلاف تحریکِ آزادی کی قربانیوں اور کوششوں میں مسلمان صفِ اول میں شامل رہے۔

جے ہند اور ترنگا؛ قربانیوں کی یادگار:

آپ سب جانتے ہیں کہ ''جے ہند'' کا نعرہ کس نے دیا؟ یہ نعرہ سبھاش چندر بوس اور ان کی فوج کے ذریعے دنیا بھر میں گونجا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ نعرہ ان کی فوج کے کرنل ''عابد حسن صفرانی'' نے پیش کیا، مشہور مصنف نریندر لوتھرا اپنی کتاب ''لیجنڈ ڈوٹس آف حیدرآباد'' میں لکھتے ہیں کہ سبھاش چندر بوس نے عوام اور آزاد ہند فوج کے لیے ایک نعرہ تیار کرنے کی ذمہ داری صفرانی صاحب کو دی، انہوں نے سب سے پہلے ''ہیلو'' کا لفظ تجویز کیا، جس پر نیتا جی ناراض ہو گئے، اس کے بعد صفرانی صاحب نے ''جے ہند'' تجویز کیا، جو نیتا جی کو پسند آیا اور انہوں نے اسی کو آزاد ہند فوج کا نعرہ بنا لیا، یہ نعرہ صرف ایک لفظ نہیں بلکہ ایک جذبہ بن گیا، آزادی کی ایک پکار بن گیا، نیتا جی نے اس نعرے کو عوام کے دلوں میں آزادی کی

تڑپ جگانے کے لیے استعمال کیا، یہ اتنا مقبول ہوا کہ پنڈت نہرو، مہاتما گاندھی اور تمام بڑے رہنماؤں نے بھی اسے اپنا لیا۔ اور آج بھی ''جے ہند'' کی صدا جب گونجتی ہے تو ہر محب وطن شہری کے دل میں فخر اور جوش تازہ ہو جاتا ہے۔

اسی طرح آپ کے سامنے یہ ترنگا پرچم ہے۔ اس کے رنگ اور ڈیزائن کو حتمی شکل دینے میں کئی تجاویز آئیں، مختلف لوگ مختلف ڈیزائن لے کر آئے، لیکن آخر کار جس شخصیت نے اسے موجودہ شکل دی وہ تھیں ثریا طیب جی۔ انہی کی محنت اور کاوش سے آج ہمارا پرچم اپنی موجودہ ہیئت میں آیا، جسے دیکھ کر ہم فخر محسوس کرتے ہیں اور جسے ہم آزادی کے دن اپنی گاڑیوں، اپنے گھروں اور اپنے ساتھ بڑے وقار کے ساتھ لہراتے ہیں۔ یہ بھی ایک قربانی اور خدمت تھی جسے ہمیں ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے۔

قربانی سے قانون تک؛ مسلمانوں کا تاریخی کردار:

عزیز طلبہ! جس طرح ملک کی آزادی میں مسلمانوں نے بے شمار قربانیاں دی ہیں، اسی طرح ہندوستان کے آئین کو بنانے میں بھی مسلمانوں کا نمایاں کردار رہا ہے، ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر صاحب کی صدارت میں ایک دستوری کمیٹی بنائی گئی تھی، اس میں تقریباً پینتیس مسلمان اراکین شامل تھے، جو اس ملک کے آئین کی تیاری میں شریک رہے، ان میں تین بزرگوں کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں: مولانا ابوالکلام آزادؒ ''ہندوستان کے پہلے وزیرِ تعلیم''، آپ نے آئین سازی کے عمل میں سب سے زیادہ اور سب سے نمایاں حصہ لیا۔ مولانا حفظ الرحمن سیوہارویؒ یہ پارلیمنٹ کے رکن بھی تھے اور دستوری کمیٹی کے بھی، آپ نے آئین کو سیکولر بنانے اور سب کے حقوق کو محفوظ رکھنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ مولانا حسرت موہانیؒ ''عظیم مجاہدِ آزادی اور پارلیمنٹ کے رکن''۔ آپ نے مساوات، آزادی اور جمہوریت کے اصولوں کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ یہ تینوں بزرگ اور ان کے ساتھ دوسرے اراکین اس بات پر متفق تھے کہ ہندوستان ایک رنگا رنگ تہذیب اور مختلف ثقافتوں کا گہوارہ ہے، یہاں سبھی

طبقات بستے ہیں، کمزور بھی اور طاقتور بھی، اور یہاں نسل پرستی یا فرقہ واریت کی کوئی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، اسی بنیاد پر انہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر صاحب کے ساتھ مل کر ایک ایسا آئین تیار کیا جو دنیا میں سب سے بڑا اور سب سے جامع ہے۔ یہ آئین ہم سب کو مساوات دیتا ہے، مذہبی آزادی دیتا ہے، تعلیم کا حق دیتا ہے، عورتوں کی عزت و وقار کی ضمانت دیتا ہے، اور سب کے ساتھ انصاف کا وعدہ کرتا ہے۔ یہی آئین ہمارے ملک کو ایک جمہوری اور سیکولر ریاست کے طور پر دنیا کے سامنے کھڑا کرتا ہے۔

وشوگرو بننے کی کنجی:

پیارے طلبہ! ہمیں یہ سمجھنا ہے کہ جب تک ہم اس آئین پر مکمل عمل نہیں کریں گے تب تک ہم ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکتے۔ دنیا میں جو قومیں آگے بڑھی ہیں وہ صرف اپنی ڈسپلن (Discipline) کی وجہ سے بڑھی ہیں۔ ہمارے پروفیسر صاحب نے بالکل بجا فرمایا کہ یورپ اور امریکہ میں چھوٹے سے چھوٹا شہری بھی لائن میں کھڑا ہوتا ہے، اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ وہاں کا صدر یا وزیر اعظم بھی اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرے تو پولیس اس پر کارروائی کرتی ہے؛ لیکن ہمارے یہاں اگر کوئی چھوٹا وزیر بھی گزر جائے تو سڑکیں بند کر دی جاتی ہیں اور عوام کو روک دیا جاتا ہے۔ یہی فرق ہے جو ہمیں سمجھنا ہوگا۔ اگر ہم واقعی چاہتے ہیں کہ ہندوستان ایک وشوگرو (World Leader) بنے، ایک سپر پاور ملک بنے تو ہمیں اپنے آئین کی قدر کرنی ہوگی، اس پر عمل کرنا ہوگا، اور ڈسپلن کو اپنی زندگی کا حصہ بنانا ہوگا۔ یہی اصل آزادی ہے اور یہی ہمارے ملک کا مستقبل ہے۔

خدمتِ خلق کا پہلا چراغ:

محترم سامعین! میں نے ابھی آپ کے سامنے قرآنِ کریم کی ایک آیت تلاوت کی، جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اخلاقِ حسنہ کا سب سے اعلیٰ معیار بنا کر بھیجا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پوری زندگی انسانیت کے لیے ایک کامل نمونہ ہے، جب پہلی مرتبہ وحی نازل

ہوئی اور آپ ﷺ گھبرا کر گھر تشریف لائے، تو اُمّ المؤمنین حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا: اللہ آپ کو کبھی ضائع نہیں فرمائے گا، اس وقت تک نہ اسلام کا ظہور ہوا تھا اور نہ آپ ﷺ نے کسی کو دعوت دی تھی؛ لیکن حضرت خدیجہؓ نے آپ کے اخلاق اور خدمتِ خلق کی بنیاد پر یہ کہا، انہوں نے گواہی دی کہ آپ ﷺ غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مسکینوں کا سہارا بنتے ہیں، یتیموں اور ضعیفوں کا بوجھ اٹھا کر ان کے گھروں تک پہنچا دیتے ہیں، سماج کے کمزور اور نچلے طبقے کی خدمت آپ کی عادت تھی۔ یہی خدمت اور یہی اعلیٰ اخلاق وہ بنیاد تھے جس پر حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ اللہ کبھی ایسے شخص کو تنہا نہیں چھوڑے گا جو انسانوں کے لیے رحمت اور خدمت کا پیکر ہے۔

انسان آزاد پیدا ہوا ہے؛ حضرت عمرؓ کا اعلان:

محترم سامعین! مصر کی فتح کے بعد وہاں کے گورنر حضرت عمرو بن العاصؓ مقرر کیے گئے، ایک مرتبہ مصر میں گھوڑوں کی دوڑ کا مقابلہ ہوا، اس مقابلے میں حضرت عمرو بن العاصؓ کے بیٹے کا گھوڑا پیچھے رہ گیا اور ایک مقامی قبطی شخص کا گھوڑا آگے نکل گیا، فاتح کا بیٹا اپنی بڑائی میں آ گیا اور اس قبطی کو روک کر کوڑے مارنے لگا۔ یہ مظلوم شخص مدینہ منورہ پہنچا اور خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دربار میں فریاد کی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً خط لکھا اور حکم دیا کہ عمرو بن العاصؓ اور ان کا بیٹا مدینہ حاضر ہوں، جب وہ آئے تو حضرت عمرؓ نے اس قبطی سے فرمایا: یہ کوڑا لو اور جس طرح اس نے تمہیں مارا تھا، تم بھی اسی طرح اسے مارو، اس نے بدلہ لیا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اب گورنر کو بھی مارو، کیونکہ اس کے بیٹے کو یہ جرأت اسی وجہ سے ہوئی کہ اس کا باپ گورنر ہے۔ قبطی نے کہا: امیر المؤمنین! مجھے جو تکلیف پہنچی تھی اس کا بدلہ لے لیا، اب اور سزا دینے کی ضرورت نہیں، اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ نے وہ تاریخی جملہ فرمایا جو آج بھی انسانی آزادی کا منشور ہے: اللہ نے انسانوں کو آزاد پیدا کیا ہے، تم کون ہوتے ہو جو انہیں غلام بناتے ہو؟

اسلام کا منشور انسانیت اور دستورِ ہند:

محترم سامعین! نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آخری حج کے موقع پر جو خطبہ دیا، اسے دنیا آج ''چارٹر آف ہیومینٹی''، یعنی انسانیت کا منشور کہتی ہے۔ ایک مشہور انگریز محقق نے اس خطبے کا ترجمہ کیا اور لکھا کہ اقوام متحدہ (UNO) کے چارٹر میں جتنے آرٹیکل اور حقوق بیان کیے گئے ہیں، وہ صرف ۲۳ ہیں؛ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس خطبے میں جو انسانیت کا منشور پیش کیا گیا، اس میں ۵۶ دفعات موجود تھیں، اور وہ بھی آج سے تقریباً چودہ سو سال پہلے، جب دنیا میں انسانی حقوق کا تصور بھی موجود نہ تھا۔ تصور کیجیے! اُس وقت مکہ مکرمہ میں ایک لاکھ سے زیادہ انسان موجود تھے اور سب کے سامنے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ: انسان سب برابر ہیں، کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، کسی عربی کو عجمی پر کوئی برتری نہیں، سب انسان آدم کی اولاد ہیں۔ ہمارے ہندوستان کے آئین میں بھی انہی اصولوں کو جگہ دی گئی ہے۔ مساوات، آزادی، انصاف اور انسانی برابری، یہ سب وہ اصول ہیں جو سب سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو عطا کیے اور آج دنیا کے آئین اور منشور انہی تعلیمات کی جھلک ہیں۔

اسلام کے پیغامِ حریت کا عملی نمونہ:

انسائیکلو پیڈیا آف بریٹانیکا میں لکھا ہے کہ دنیا میں سب سے پہلے آزادی کا تصور فرانس کے انقلاب کے وقت سامنے آیا؛ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سے چودہ سو سال پہلے اسلام نے آزادی اور مساوات کا عملی درس دیا۔ حضرت عمر فاروقؓ کا وہ تاریخی جملہ آج بھی انسانی آزادی کا منشور ہے کہ: ''اللہ نے لوگوں کو آزاد پیدا کیا ہے، تم کون ہو جو انہیں غلام بناتے ہو؟'' اسلام نے نہ صرف یہ اعلان کیا بلکہ اس پر عمل کر کے دکھایا۔ حضرت بلال حبشیؓ، جو حبشہ کے رہنے والے اور رنگ کے اعتبار سے کالے تھے، اسلام نے انہیں وہ عزت عطا کی کہ خلیفۂ وقت حضرت عمر فاروقؓ جیسے عظیم رہنما ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو جاتے اور کہتے: ''یا بلال! انت سیدُنا و مولانا'' اے بلال! آپ ہمارے سردار ہیں، آپ ہمارے آقا ہیں۔

فتح مکہ کے دن جب بیت اللہ پر اذان دینے کا موقع آیا تو رسول اکرم ﷺ نے انہی بلالؓ کو مقرر فرمایا۔ قریش کے کچھ متکبر سرداروں نے دل میں کہا: کیا یہ ممکن ہے کہ ایک حبشی، ایک کالا شخص، اللہ کے گھر کی چھت پر کھڑا ہو کر اذان دے؟ کاش ہم اس دن سے پہلے مر جاتے! لیکن نبی اکرم ﷺ نے حضرت بلالؓ کو کھڑا کر کے اعلان فرمایا کہ اسلام میں اونچ نیچ نہیں ہے، سب انسان برابر ہیں۔ دوستو! آزادی کی سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے کہ انسان اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھے، اسلام نے اس غرور کو توڑا اور دنیا کو بتایا کہ اصل عزت تقویٰ میں ہے، رنگ، نسل یا قومیت میں نہیں۔

سب انسان برابر؛ اصل فضیلت تقویٰ میں ہے:

محترم سامعین! میں نے آپ کے سامنے قرآنِ کریم کی جو آیت تلاوت کی، اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتے ہیں: اے انسانو! ہم نے تم سب کو ایک ماں اور ایک باپ سے پیدا کیا، یعنی سب کے والد حضرت آدمؑ اور سب کی والدہ حضرت حوّاؑ ہیں، اس لیے رنگ، نسل، ذات یا علاقے کی بنیاد پر کسی کو دوسرے پر کوئی برتری نہیں ہے، اسی حقیقت کو رسول اکرم ﷺ نے حدیث شریف میں واضح فرمایا: ''أیُّها النَّاسُ، إنَّ ربَّکم واحدٌ'' اے لوگو! تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ جدید سائنس نے بھی اسی سچائی کی تصدیق کی، امور یونیورسٹی (Amor university) میں مختلف قوموں اور ملکوں کے انسانوں کے DNA ٹیسٹ کیے گئے، تحقیق کے بعد یہ ثابت ہوا کہ دنیا کے تمام انسانوں کا سلسلہ ایک ہی ماں اور باپ تک پہنچتا ہے، اور وہ ماں ایشیائی (Asian) نسل سے تعلق رکھتی ہیں، یعنی حضرت حوّاؑ۔ دوستو! نبی اکرم ﷺ نے ہمیں یہی تعلیم دی کہ اصل عزت رنگ، نسل یا قومیت میں نہیں بلکہ تقویٰ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: کسی عربی کو عجمی پر، کسی گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں، ''إلا بالتقوی'' سوائے تقویٰ کے؛ لہٰذا کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ دوسرے کو حقیر سمجھے یا اپنے کو بڑا جانے۔ برتری کا معیار صرف اور صرف نیک اعمال اور پرہیزگاری ہے۔

آج کے بچے، کل کے معمارِ وطن:

دوستو اور بزرگو! ۲۶ رجنوری ہمیں یہ سبق دیتی ہے کہ مسلمانو! اس ملک کی آزادی میں تم نے حصہ لیا، اور اس ملک کے دستور و آئین بنانے میں بھی تمہارا کردار رہا ہے؛ لہٰذا ضروری ہے کہ تم ملک کو آگے بڑھانے میں بھی بھرپور حصہ لو، ہمارے ملک کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں کا سکون اور چین دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتا، آپ ہمارے افریقہ سے آئے ہوئے بھائیوں سے پوچھ لیجیے، یا انگلینڈ، کینیڈا اور دوسرے ممالک میں رہنے والوں سے سن لیجیے کہ زندگی جینے کا جو لطف اس ملک میں ہے، وہ کہیں اور میسر نہیں؛ لیکن افسوس! کچھ چیزیں ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ پروفیسر صاحب نے درست کہا کہ ہمارے ملک میں کوئی کام بغیر رشوت کے نہیں ہوتا، عوام کو ستایا جاتا ہے اور لوگ اپنی ڈیوٹی صحیح طریقے سے انجام نہیں دیتے، سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کہاں سے آتے ہیں؟ یہی ہمارے اسکولوں کے طلبہ ہیں جو کل سرکاری و غیر سرکاری دفتروں، بینکوں، فیکٹریوں اور کارخانوں میں جا کر بیٹھتے ہیں، اس لیے اس وقت سب سے بڑی ضرورت یہ ہے کہ ہمارے پاس اچھے اساتذہ ہوں جو بچوں کو عمدہ اخلاق سکھائیں اور انہیں ملک کے لیے مفید شہری بنائیں۔ دوستو! یہی بچے سب سے قیمتی سرمایہ (Raw Material) ہیں، چھوٹی چھوٹی پرائمری، ہائی اسکول اور سیکنڈری اسکولیں ہی وہ کارخانے ہیں جہاں سے یہ سرمایہ تیار ہوتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم اپنے اسکولوں کی عزت کریں، ان کا احترام کریں، اور بچوں کی بہتر تربیت کا اہتمام کریں۔ ملک کو آگے بڑھانے کے لیے جن کمزوریوں نے ہمیں پیچھے کیا ہے، ان کو دور کریں۔ اور سب سے بڑھ کر، اس ملک کے دستور کی حفاظت کریں جو بظاہر اسباب کے درجے میں تمام انسانوں کی حفاظت کا ذمہ دار ہے۔

اجتماعی کوشش ہی کامیابی کی ضمانت:

دوستو اور بزرگو! ۲۶ رجنوری کا دن ہمیں یہ عہد کرنے کی دعوت دیتا ہے کہ اس ملک کے تمام باشندوں کو زندگی کی بنیادی ضروریات میسر ہوں، اور ہماری طرف سے اس کے لیے

بھرپور کوشش ہونی چاہیے۔ ہم میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق ملک اور معاشرے کے لیے خدمت کرے۔ مجھے خوشی ہے کہ آج کے اس پروگرام میں آپ حضرات نے اپنے بچوں کو اس احساس سے روشناس کرایا، بچوں کی زبان سے جب یہ عہد سننے کو ملے گا تو کل یہ بچے بڑے ہو کر ملک کی فکر کریں گے۔ وہ سوچیں گے کہ ہم اپنے ملک کے باشندے ہیں اور اس کی ترقی کے لیے ہمیں کیا کردار ادا کرنا چاہیے۔ یاد رکھیے! یہ کوشش اسی وقت کامیاب ہوگی جب سب مل کر ایک ساتھ آگے بڑھیں گے۔ تب ہی ہمارا ملک ترقی کرے گا اور عزت و سربلندی حاصل کرے گا۔

دوستو اور بزرگو! ایک بادشاہ نے اپنے ملک کے لوگوں سے کہا کہ یہ جو بڑا حوض ہے، صبح تک اسے دودھ سے بھرا ہوا ہونا چاہیے، ہر شخص نے دل میں سوچا کہ میں اکیلا ایک گلاس پانی ڈال دوں گا تو اس سے کیا فرق پڑے گا؟ لیکن صبح جب بادشاہ آیا تو دیکھا کہ پورا حوض دودھ کے بجائے پانی سے بھرا ہوا ہے، یہی آج ہمارے ملک کی حالت ہے، ہر جگہ کرپشن اور بدعنوانی نے ملک کو نقصان پہنچایا ہے، اگر ہر شخص یہ سوچے کہ میری ذرا سی بددیانتی سے کیا فرق پڑے گا، تو پھر پورا نظام بگڑ جاتا ہے۔ پروفیسر صاحب نے بالکل صحیح کہا کہ جاپانی ہوں یا چینی، ان کو اپنی زبان پر فخر ہے، اپنے ملک پر فخر ہے۔ اس کے برعکس ہم انگریزی زبان پر مرعوب ہو چکے ہیں۔ آپ یورپ کے کسی بھی ملک میں چلے جائیں (انگلینڈ کے علاوہ) اور وہاں کسی سے انگریزی میں بات کریں، تو وہ اچھی طرح جواب نہیں دیتا بلکہ چاہتا ہے کہ آپ اس کی زبان میں بات کریں، یہی ترقی یافتہ قوموں کا راز ہے۔ جاپان نے پورا تعلیمی و صنعتی نظام امریکہ سے لیا؛ لیکن زبان اپنی ہی رکھی تاکہ ان کے بچوں کو مادری زبان میں جلدی سمجھ آسکے اور ملک ترقی کرے۔ مگر افسوس! آج ہم انگریزی کی دوڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ دوستو! زبان اور کلچر اپنی جگہ اہم ہیں، لیکن اصل چیز علم ہے، زبان تو محض ایک سہارا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم سائنس، ریاضی اور انگریزی بھی سیکھیں لیکن اپنی زبان کی اہمیت اور ملک کی ترقی کو

ہر حال میں مقدم رکھیں۔ آخر میں اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ کہی سنی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میں آپ سب کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ آپ نے محنت کی، کوشش کی، اور اس پروگرام کو کامیاب بنایا۔ اسکول کے پرنسپل، اساتذہ، انتظامیہ، گاؤں کے تمام حضرات اور بچے بچیاں سب شریک ہوئے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے اس بیٹھنے کو قبول فرمائے اور ہمیں ان باتوں پر عمل کی توفیق عطا کرے۔ آمین یارب العالمین!

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۲۹)

خداوندقدوس کے قوانین اور U.C.C انسانی قانون میں فرق

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على اله و اصحابه اجمعين. اما بعد!

قال الله تبارك و تعالى في الكلام المجيد و الفرقان الحميد.

اعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم ○ بسم الله الرحمٰن الرحيم

اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ؕ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (اعراف:۱۵۷)

صدق الله العظيم و صدق رسوله النبي الكريم و نحن على ذلك لمن الشاهدين و الشاكرين و الحمد لله رب العالمين.

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! میں نے ابھی آپ کے سامنے قرآنِ پاک کی ایک آیت تلاوت کی ہے، اس آیت میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے جناب نبی اکرم ﷺ کی مختلف صفات کا ذکر فرمایا ہے، عام طور پر ان آیات کو سیرتِ نبوی کے عنوان سے بیان کیا جاتا ہے، لیکن میرا مقصد اس وقت تفصیلاً سیرت بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ میرا مقصود یہ ہے کہ ان آیات میں جو چند بنیادی صفات رسول اللہ ﷺ کی بیان کی گئی ہیں، اُن پر روشنی ڈالی جائے، ساتھ ہی یہ بھی سمجھایا جائے کہ آپ ﷺ کی لائی ہوئی شریعت اور آپ کے

لائے ہوئے دین کی جو عظمت اور اہمیت اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمائی ہے، وہ ہماری زندگی میں کس طرح رہنمائی کرتی ہے۔

حضرت آدمؑ سے محمد ﷺ تک شریعت کا تسلسل:

پہلے اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ وہ صحابہ کرامؓ جناب نبی اکرم ﷺ کے دین کی اتباع کرتے ہیں، اُن پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اگلی ہی آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا کا ذکر آتا ہے، جہاں انہوں نے بنی اسرائیل کے لیے رحمت اور سکون کی دعا کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ رحمت اُن لوگوں کے لیے ہے جن میں مخصوص صفات ہوں، اور سب سے پہلی صفت یہی بیان کی: ''اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ'' وہ لوگ جو نبی امی ﷺ کی پیروی کریں۔ اس کے بعد قرآن نے نبی اکرم ﷺ کی صفات بیان کیں کہ وہ وہی نبی ہیں جن کا ذکر تورات اور انجیل میں موجود ہے۔ یعنی سابقہ آسمانی کتابیں خود رسول اللہ ﷺ کے آنے کی بشارت دیتی تھیں۔ اس سے اشارہ ملتا ہے کہ وہ شریعت جس کی ابتدا سیدنا آدمؑ کے ذریعے ہوئی، اور جس کو حضرت نوحؑ کے ذریعے تکمیلی شکل دی گئی، وہی شریعت دراصل رسول اللہ ﷺ پر مکمل کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَا وَصّٰی بِهٖ نُوْحًا'' (شوریٰ: ۱۳) ہم نے وہی دین تمہارے لیے مشروع کیا جس کی وصیت نوحؑ کو کی گئی تھی، اسی طرح اللہ پاک نے تورات کے بارے میں فرمایا: ''اِنَّاۤ اَنْزَلْنَا التَّوْرٰىةَ فِیْهَا هُدًی وَّنُوْرٌ ۚ یَحْكُمُ بِهَا النَّبِیُّوْنَ'' (مائدہ: ۴۴) ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور نور تھا، اور انبیاء کرام اسی کے ذریعے فیصلے کیا کرتے تھے۔ یوں اللہ تعالیٰ نے بتلایا کہ موسیٰؑ کو دی گئی شریعت ہو یا عیسیٰؑ پر نازل ہونے والی انجیل، ان سب میں نبی آخر الزمان ﷺ کا ذکر خیر موجود ہے اور پھر آپ ﷺ پر جو قرآن نازل کیا گیا، وہ صرف ایک نئی وحی نہیں بلکہ ''مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ'' پچھلی کتابوں کی بھی تصدیق اور حفاظت کا ذریعہ ہے۔ یہ ہے رسول اللہ ﷺ اور آپ کی لائی ہوئی شریعت کی اصل فضیلت۔

فوجداری احکام کا تسلسل:

پچھلی شریعتوں کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے جن احکام کے ساتھ مزین فرمایا تھا، انہی کے بارے میں اللہ پاک ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ ان تمام شریعتوں کے جامع اور جمع کرنے والے ہیں۔ یعنی پچھلی تمام شریعتوں کی بنیادی تعلیمات کو بھی آپ ﷺ کی شریعت کا حصہ بنا دیا گیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کے درمیان جو بنیادی باتیں مستند اور متفقہ تھیں، وہ سب نبی آخر الزمان ﷺ کے ذریعے دوبارہ بھیجی گئیں، چنانچہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''وَ كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيْهَآ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ'' (مائدہ:۴۵) ہم نے تورات میں یہ حکم لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان ہوگی۔ یہی حکم تورات میں تھا، لیکن جب قرآن نے اسی کو اپنی آیات کی شکل میں ذکر فرمایا تو یہ قیامت تک کے لیے قرآن کا حصہ بن گیا۔ یوں یہ آیت اسلامی فوجداری نظام کو بھی واضح کرتی ہے اور انسانی فوجداری قانون کو بھی ایک ابدی بنیاد عطا کرتی ہے۔ پس اصل حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شریعت تمام پچھلی شریعتوں کا خلاصہ اور نچوڑ ہے، اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی تعلیمات کا جامع مجموعہ ہے۔

خیر کے سفیر اور شر کے روکنے والے:

اس کے بعد اللہ پاک نے آگے فرمایا: ''يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ'' نبی اکرم ﷺ کی ایک بڑی صفت یہ ہے کہ آپ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور ہر قسم کی برائی سے روکتے ہیں۔ انسانی زندگی میں جو برائیاں پیدا ہوسکتی ہیں، چاہے وہ انسانی نفس کے تقاضوں سے آئیں یا شیطانی وسوسوں کے ذریعے، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، معاملات سے، یا معاشرت سے، ہر شعبۂ حیات میں آپ ﷺ نے انسانیت کو ان تمام برائیوں سے روکا ہے۔ گویا دنیا کی ہر بھلائی اور خیر آپ ﷺ کی تعلیمات میں شامل ہے، اور کوئی ایسی اچھی چیز باقی نہیں رہی جسے آپ نے بیان نہ کیا ہو۔ اسی لیے پہلے فرمایا گیا:

''یَأۡمُرُهُمۡ بِالۡمَعۡرُوۡفِ'' ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ کے معیار کے مطابق بھلی اور اچھی ہے، نبی اکرم ﷺ نے اس کا حکم دیا اور اس کی پیروی کرنے کی تلقین کی۔ اور پھر فرمایا: ''وَيَنۡهٰهُمۡ عَنِ الۡمُنۡكَرِ'' کائنات میں جو بھی برائیاں پیدا ہو سکتی ہیں چاہے وہ پہلے زمانے میں تھیں یا قیامت تک نئی شکلوں میں آتی رہیں گی، سب سے روکنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کو بھیجا گیا۔ یوں آپ ﷺ کی بعثت دراصل خیر کے ابلاغ اور شر کے انسداد کی ایک کامل و جامع دعوت ہے۔

زندگی کی سمت متعین کرنے والا نظام:

اور مزید وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ'' نبی اکرم ﷺ لوگوں کے لیے تمام پاکیزہ اور طیب چیزوں کو حلال قرار دیتے ہیں، ''وَيُحَرِّمُ عَلَيۡهِمُ الۡخَبٰٓئِثَ'' اور تمام گندی اور ناپاک چیزوں کو حرام فرماتے ہیں۔ اس طرح انسانیت کو یہ واضح پیغام دیا گیا کہ جو چیزیں انسان کے لیے مفید، پاکیزہ اور صحت و روحانیت کے اعتبار سے بہتر ہیں، وہ اسلام میں حلال ہیں۔ اور جو چیزیں نقصان دہ، گندی اور ناپاک ہیں، وہ شریعت میں حرام ہیں۔ یوں ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی خصوصیات کو بیان فرمایا ہے، آپ ﷺ کا منصبِ نبوت یہی ہے کہ پاک اور نیک چیزوں کی اجازت دیں اور ہر برائی اور خباثت سے روکتے رہیں، یہ فرضِ منصبی نہ صرف آپ کی بعثت کا مقصد ہے بلکہ قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کے لیے شریعت کی یہ بنیادی خصوصیات رہنمائی کرتی رہیں گی۔

خودساختہ پابندیاں اور انکارِ فطرت:

آگے اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَيَضَعُ عَنۡهُمۡ اِصۡرَهُمۡ وَالۡاَغۡلٰلَ الَّتِىۡ كَانَتۡ عَلَيۡهِمۡ ؕ'' نبی اکرم ﷺ ان تمام بوجھوں اور پابندیوں کو ہٹا دیتے ہیں جو پچھلی امتوں نے اپنی خواہشات اور رسم و رواج سے اپنے اوپر مسلط کر لیے تھے۔ قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا: ''وَرَهۡبَانِيَّةَ ابۡتَدَعُوۡهَا مَا كَتَبۡنٰهَا عَلَيۡهِمۡ'' (حدید:۲۷) عیسائیوں نے سنیاسی اور

جوگی زندگی اختیار کر لی، شادی بیاہ اور معاشرتی زندگی سے کٹ کر پہاڑوں اور غاروں میں جا بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے انہیں اس کا حکم نہیں دیا تھا، یہ انہوں نے اپنی طرف سے گڑھ لیا؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تو حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے ذریعے خاندان اور معاشرتی نظام قائم فرمایا تاکہ انسانیت اسی سے پروان چڑھے۔

اسی طرح دوسری طرف اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بھی برا کہا جو جانوروں کی طرح زندگی گزارتے ہیں: ''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ '' (محمد: ۱۲) جو کافر ہیں وہ محض دنیاوی لذتوں میں لگے رہتے ہیں، حلال وحرام کی کوئی پرواہ نہیں کرتے، اور بے حیائی کی زندگی گزارتے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان دونوں انتہاؤں سے روکا: نہ سنیاسی پن اور غیر فطری پابندیاں، اور نہ جانوروں کی طرح آزاد اور بے حیاء زندگی۔ یہودیوں نے جب ظلم اور نافرمانیاں کیں تو ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان پر کچھ طیب چیزوں کو بھی حرام کر دیا: ''فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ '' (نساء: ۱۶۰) لیکن نبی اکرم ﷺ کو اس کائنات میں بھیجا گیا تاکہ یہ سب بوجھ ہٹا دیے جائیں۔ آپ ﷺ کو ''رحمت للعالمین'' بنا کر بھیجا گیا تاکہ انسانیت کو ان غیر ضروری مذہبی، سماجی اور سیاسی بوجھوں سے نجات ملے اور دین اپنی اصل فطری اور آسان صورت میں قائم ہو۔

انبیاء کی تعلیمات کا جامع پیکج:

اور مزید اعلان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ارشاد فرمایا: ''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ '' (مائدہ: ۳) آج کے دن میں نے تمہارے لیے دین کو مکمل کر دیا، اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا اور تمہارے لیے اسلام کو بحیثیت دین پسند فرما لیا۔ یعنی اسلام ایک ایسا کامل نظامِ حیات ہے جس میں انبیاء کرام علیہم السلام کی تمام تعلیمات کا نچوڑ موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ اسی مکمل اور جامع پیکج کو لے کر مبعوث ہوئے تاکہ قیامت تک انسانیت اس سے رہنمائی لے سکے۔ پھر فرمایا: ''فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ

وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ '' کامیاب وہ لوگ ہیں جو اس نبی ﷺ پر ایمان لائیں، آپ کی تعظیم وتوقیر کریں، آپ کی نصرت کریں اور اس نور یعنی قرآن کی پیروی کریں جو آپ کے ساتھ نازل کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے آخر میں فیصلہ کن انداز میں فرمایا: ''اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝'' یہی لوگ کامیاب ہیں! یعنی اصل کامیابی اسی میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لایا جائے، آپ کے بتائے ہوئے ہر طریقے کو کامل یقین کے ساتھ اپنایا جائے، اور جن چیزوں سے آپ نے روکا ہے ان سے بچا جائے؛ کیونکہ ان چیزوں میں سراسر ناکامی، نقصان اور پریشانی ہے، جبکہ آپ ﷺ کی ہدایت پر عمل میں سراپا کامیابی اور فلاح ہے۔

رہنمائی کا ابدی چراغ:

دوستو اور بزرگو! ان سب باتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک ایسی پاکیزہ شریعت عطا فرمائی اور اس کے لیے ایک ایسے پاک نبی ﷺ کو بھیجا جن کی زندگی ہمارے لیے عملی نمونہ ہے۔ قرآن کریم نے صاف اعلان کیا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ '' (احزاب:۲۱) یقیناً تمہارے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ یہ بات صرف حضور اکرم ﷺ کے بارے میں کہی گئی، حضرت موسیٰؑ یا حضرت عیسیٰؑ یا کسی دوسرے نبی کی سیرت کے بارے میں نہیں۔ اس کی حکمت یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پچھلے انبیاء کی زندگیوں کو تاریخ میں محفوظ نہیں رکھا، اور نہ ہی یہ اللہ کا منشا تھا۔ لیکن نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کی سیرت اور آپ کی تعلیمات کا ایک ایک پہلو محفوظ کیا گیا۔ قرآن وحدیث میں آپ کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے جزئیات بھی محفوظ ہیں تاکہ قیامت تک آنے والی انسانیت کے لیے آپ ﷺ کی سیرت عملی رہنمائی کا ذریعہ بنے۔

سنتِ نبوی کے تحفظ کی تاریخ ساز محنتیں:

امتِ مسلمہ نے جنابِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور ارشادات کو محفوظ رکھنے کے لیے بے مثال محنت اور قربانیاں پیش کیں، جب ہم محدثین کی ان عظیم خدمات پر نظر ڈالتے ہیں

تو حیرت ہوتی ہے۔ ایک فرانسیسی اور اسی طرح ایک جرمن مستشرق لکھتے ہیں کہ میں نے تاریخ میں یہ انوکھی حقیقت دیکھی کہ ایک شخصیت کی زندگی کو محفوظ رکھنے کے لیے چار لاکھ انسانوں نے محنتیں کیں۔ یعنی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال، افعال اور ارشادات کو جمع کرنے کے لیے امتِ مسلمہ میں چار لاکھ افراد نے دورِ اوّل میں (یعنی صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور تبع تابعینؒ کے ادوار میں) سخت مشقتیں برداشت کیں۔ سیرتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک ایک پہلو کو اس طرح محفوظ کیا گیا کہ معمولی سا شبہ بھی پیدا ہوا تو فوراً دوسری روایت سے موازنہ کیا گیا، دوسرے محدثین سے پوچھا گیا اور تحقیق کے بعد اسے درست شکل میں محفوظ کیا گیا۔

آپ اندازہ لگائیے! امام بخاری رحمہ اللہ ایک حدیث لینے کے لیے دور دراز کا سفر کر کے ایک شخص کے پاس پہنچے۔ اُس دور کا سفر معمولی نہیں تھا، سردی، گرمی، بارش، دریا، جنگل؛ سبھی مشکلات کا سامنا کر کے یا تو پیدل یا اونٹ پر سفر کیا جاتا تھا، جب امام بخاریؒ وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ وہ شخص اپنے جانور کو بلانے کے لیے دامن پھیلائے ہوئے ہے۔ جانور یہ سمجھ رہا تھا کہ شاید دامن میں کھانے کے لیے کچھ ہے، لیکن دراصل دامن بالکل خالی تھا۔ یہ منظر دیکھ کر امام بخاریؒ فوراً واپس پلٹ آئے اور فرمایا: جو شخص اپنے جانور کو بلانے کے لیے بھی جھوٹ کا سہارا لے سکتا ہے، اس سے یہ خطرہ ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث میں بھی جھوٹ بول دے، حالانکہ وہ شخص جھوٹا نہ تھا، یہ تو ایک عام سا طریقہ تھا جانور کو بلانے کا، لیکن امام بخاریؒ نے اس چھوٹی سی بات کو بھی گوارا نہ کیا۔ سوچیے! اتنی محنت، اتنا لمبا سفر طے کیا، مگر محض ایک معمولی شائبے کی بنیاد پر حدیث لینے سے انکار کر دیا۔ یہی وہ معیارِ تحقیق اور احتیاط ہے جس کے نتیجے میں آج ہمارے پاس صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتبِ حدیث محفوظ شکل میں موجود ہیں۔ یہ محض امام بخاریؒ ہی نہیں، بلکہ چار لاکھ سے زیادہ ایسے علماء اور حفاظ تھے جنہوں نے اپنی زندگیاں اسی مقصد کے لیے وقف کر دیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک ایک سنت اور ایک ایک فرمان بغیر کسی شک و شبہے کے امت تک پہنچے۔ یہی وجہ ہے کہ جرمن مستشرق اسپنگر

نے لکھا کہ: محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روایات کو محفوظ کرنے کے لیے جن لاکھوں انسانوں نے محنتیں کیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی اپنی زندگیاں بھی محفوظ کر دیں۔ اسی محنت کا نتیجہ ہے کہ آج ہمیں اُن چار لاکھ انسانوں کی ایک ایک تفصیل معلوم ہے کہ وہ کہاں پیدا ہوئے، کن سے حدیث لی، اور کن شاگردوں نے اُن سے روایت آگے منتقل کی، اسی کو فنِ اسماء الرجال کہا جاتا ہے۔ گویا جنہوں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور احادیث کو محفوظ کرنے کا بیڑا اٹھایا، اللہ تعالیٰ نے ان کی زندگیوں کو بھی ہمیشہ کے لیے تاریخ میں محفوظ فرما دیا۔

ملک میں اٹھائے جانے والے مسائل اور مسلمانوں کا امتحان:

دوستو اور بزرگو! دنیا کے کسی مذہب اور کسی ملت کے پاس ایسا محفوظ دین نہیں ہے جیسا اللہ پاک نے ہمیں عطا فرمایا ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ'' میں نے اپنی نعمت تم پر مکمل کر دی۔ اسی نعمت کی تکمیل کا نتیجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ایک کامل دین عطا فرمایا۔ اور پھر چیلنج کے طور پر فرمایا: ''لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ'' تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات ہی بہترین نمونہ ہے۔ دیکھ لیجیے! دنیا کے کسی اور نبی یا کسی اور ہستی کی سیرت مکمل طور پر محفوظ نہیں، صرف اور صرف ہمارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت محفوظ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا غیبی انتظام ہے تاکہ قیامت تک انسانیت کو صحیح رہنمائی ملتی رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو دین دیا اُس میں حلال کو واضح کر دیا، حرام کو صاف صاف بتا دیا۔ میں یہ ساری تمہید اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ ہمارے ملک میں آئے دن کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ کھڑا کر دیا جاتا ہے، کبھی تین طلاق کا مسئلہ اٹھایا جاتا ہے، کبھی حلالہ کا، کبھی ایک سے زیادہ عورتوں سے نکاح کا۔ یہ سب مسائل سپریم کورٹ میں کیسوں کی شکل میں پڑے رہتے ہیں، اور اکثر اس کی بنیاد کسی مسلمان لڑکی کو بنا دیا جاتا ہے جسے تیار کر کے عدالتوں میں پیش کیا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ اسی بنیاد پر پہلے بھی تین طلاق کا مسئلہ سپریم کورٹ اور حکومت کی طرف سے زیر بحث لایا گیا۔

یونیفارم سول کوڈ (U.C.C) کا چیلنج اور رہنما اصول:

ابھی اس وقت ایک اور اعلان کیا گیا ہے کہ ہندوستان کے آئین میں آرٹیکل ۲۵ سے ۲۹ تک مائنوریٹی کو یہ گارنٹی دی گئی ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ کر سکیں، اپنی تعلیم اور کلچر کی حفاظت کر سکیں، اپنے تعلیمی ادارے، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کر سکیں، اور اپنی تہذیب وثقافت کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکیں۔ یہ سب کچھ آئینِ ہند میں بنیادی حقوق (Fundamental Rights) کے طور پر درج ہے۔اس دستور میں ایک اور حصہ ہے جسے رہنما اصول کہا جاتا ہے، ان ہی اصولوں کی روشنی میں آئین کی دفعہ ۴۴ میں یہ لکھا گیا ہے کہ آہستہ آہستہ ہندوستان کی حکومت کو کوشش کرنی چاہیے کہ پورے ملک کے تمام شہریوں کے لیے ایک ہی قسم کا قانون بنایا جائے۔اسی کو یکساں سول کوڈ (Uniform Civil Code) کہا جاتا ہے۔

دفعہ ۴۴/اور مذہبی آزادی کے درمیان تضاد:

جب اس مسئلے پر بحث ہوئی اور آئین کی دفعہ ۴۴ تیار کی جارہی تھی، آزادی کے بعد ملک کا دستور تشکیل پارہا تھا، ۲۶ جنوری ۱۹۵۰ کو جب یہ مکمل ہوکر نافذ ہوا، تو اُس سے پہلے دستور کمیٹی میں پانچ چھ بڑے بڑے مسلمان وکلاء اور جج صاحبان موجود تھے، انہوں نے ڈاکٹر امبیڈکر صاحب سے یہ اعتراض کیا کہ دفعہ ۴۴/اور دفعات ۲۵ سے ۲۹ کے درمیان تضاد ہے۔دفعات ۲۵ سے ۲۹ صاف طور پر کہتی ہیں کہ ہر مذہب کے ماننے والوں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے، اس کی تبلیغ کرنے اور اپنے تعلیمی وثقافتی ادارے قائم کرنے کا حق حاصل ہے۔جبکہ دفعہ ۴۴ یہ کہتی ہے کہ آہستہ آہستہ پورے ملک میں ایک ہی قانون، یعنی یکساں سول کوڈ نافذ کیا جائے، اس پر ڈاکٹر امبیڈکر صاحب نے وضاحت کی کہ یہ صرف رہنما اصول (Directive Principles) ہیں، جو لوگوں کی مرضی کے ساتھ اور وقت کے تقاضے کے مطابق نافذ ہو سکتے ہیں، زبردستی نہیں؛ لیکن بہرحال یہ دفعہ آئین میں شامل کر لی گئی۔اسی کو بنیاد بنا کر پچھلی حکومتوں (کانگریس) نے بھی بعض مسائل کھڑے کیے، اور موجودہ حکومت

نے بھی اسی دفعہ کے حوالے سے کچھ نئے مسائل اُٹھائے ہیں۔

سیاسی مقاصد اور مذہبی معاملات:

محترم حضرات! آج جو مسئلہ ہمارے سامنے ہے وہ دو پہلو رکھتا ہے، ایک تو وزیر اعظم کا اعلان ہے، جو کہ ظاہر ہے ایک سیاسی اعلان ہے، آنے والے الیکشن جیتنے کے پیشِ نظر کیا گیا ہے۔ ہمیں ایسی سیاسی باتوں کو سمجھنا ضرور ہے، لیکن ان میں الجھنا نہیں ہے۔ دوسری طرف ایک اور معاملہ ہے: لاء کمیشن، جو اس ملک میں حکومت اور پارلیمنٹ کو قانونی مشورہ دیتا ہے، اس نے عوام سے رائے مانگی ہے کہ کیا آپ یکساں سول کوڈ (U.C.C) چاہتے ہیں یا نہیں؟ یہ اس لیے سنگین مسئلہ ہے کہ یکساں سول کوڈ کا براہِ راست تعلق مسلمانوں کے پرائیویٹ اور خاندانی مسائل سے ہے۔ نکاح وطلاق، وراثت، بچوں کو گود لینے، وقف، بخشش، ایلاء اور ظہار جیسے مسائل اس کے دائرے میں آجاتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے بہت سے نوجوانوں کو ان بنیادی اسلامی اصطلاحات کا بھی علم نہیں کہ ایلاء کس کو کہتے ہیں؟ ظہار کیا ہے؟ طلاق کی کتنی قسمیں ہیں؟ شادی تو سب کر لیتے ہیں، مگر اپنی شریعت کے ان اصولوں سے ناواقف رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت جو کچھ کرنا چاہے کرے، اصل خطرہ اس وقت ہوتا ہے جب کوئی قوم اپنی تہذیب اور اپنے کلچر پر خود عمل نہ کرے۔ جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لائی ہوئی یہ شریعت محض چند احکام نہیں بلکہ انسانیت کے لیے بہترین نظامِ حیات ہے۔ یورپ کے قانون دانوں نے بھی لکھا ہے کہ اگر دنیا کے لیے سب سے بہترین قانون ہے تو وہ قرآن کریم کا قانون ہے۔ کیوں نہ ہو! یہ اللہ ربّ العزت کا کلام ہے، جو خالق ہے، مالک ہے، ہماری کمزوریوں اور مشکلات کو جاننے والا ہے، اسی لیے شریعت کے اندر بے شمار آسانیاں رکھی گئیں۔ قرآن کہتا ہے: ''وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ط'' (حج:۷۸) اللہ نے تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی۔ رمضان میں اگر بیماری آجائے تو فرمایا: ''فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ط'' (بقرہ:۱۸۴) دوسرے دنوں میں قضا کر لو۔ سفر میں آسانی دے دی،

پانی نہ ہو تو تیمم کی اجازت دے دی۔ الغرض شریعت نے ہر مسئلے میں اصول اور ضابطے مقرر کیے ہیں، مگر آسانی کے ساتھ۔

شریعت کی سہولتیں اور ہماری لاعلمی:

دوستو اور بزرگو! اصل بات یہ ہے کہ جو شریعت اللہ تعالیٰ نے ہمیں عطا فرمائی ہے، اگر ہم اپنے نکاح اور طلاق کے مسائل، وراثت کے مسائل اور دیگر خانگی معاملات کو قرآن وحدیث کی روشنی میں خود حل نہیں کریں گے، تو ہمارا نوجوان ان مسائل سے جاہل ہی رہے گا، اسے یہ بھی معلوم نہ ہوگا کہ بیوی کو طلاق کس طرح دی جائے۔ نتیجہ یہ کہ ذرا سی بات پر فوراً تین طلاق دے دیتا ہے، اور بعد میں پوچھتا ہے کہ مسئلہ کیا ہے؟ حالانکہ طلاق کی کئی قسمیں ہیں: طلاقِ صریح، طلاقِ کنایہ، طلاقِ بائن وغیرہ، لیکن افسوس کہ ہمیں ان کا علم نہیں۔ ہم دنیا بھر کی معلومات حاصل کرتے ہیں، مگر شادی جیسے اہم معاملے کے بارے میں نہیں جانتے کہ یہ قرآن وحدیث کی روشنی میں ایمان کی بنیاد پر انجام پاتا ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح اور طلاق کے واضح مسائل ہمیں بتلائے ہیں، لیکن ہم ان سے غافل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے طلاق کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے:

''**أبغض الحلال الى الله تعالىٰ الطلاق**'' (ابو داود: کتاب الطلاق، باب فی کراھیۃ الطلاق) اللہ کے نزدیک سب سے ناپسندیدہ مباح چیز طلاق ہے، اس کے باوجود مجبوری کی صورت میں یہ جائز ہے، مگر اس کے بھی طریقے ہیں۔ قرآن نے ترتیب بتلائی ہے: اگر ناچاقی ہو تو پہلے سمجھاؤ، پھر بستر الگ کرو، پھر تنبیہ کرو، پھر دونوں خاندانوں کے معتبر افراد بیٹھ کر صلح کی کوشش کریں، اگر یہ سب تدابیر ناکام ہو جائیں تو ایک طلاق دی جا سکتی ہے، وہ بھی طلاقِ احسن یا طلاقِ سنت کے طریقے پر۔ یہ ہے قرآن کا بتایا ہوا طریقہ؛ لیکن آج ہمارا نوجوان یہ سمجھتا ہے کہ جب تک تین طلاق نہ دی جائے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی۔ پھر ایک اور بڑی گمراہی سامنے آتی ہے جسے حلالہ کہتے ہیں۔ جب ہم خود ان مسائل کو نہیں جانیں گے، نہ ان پر عمل کریں گے، تو دوسری قومیں ہم پر اعتراض کیوں نہ کریں؟ وہ تو دیکھ رہی ہیں کہ ایک مسلمان شوہر اپنی بیوی کو شریعت کے مطابق

طلاق نہیں دیتا، اور چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوبت کورٹ اور وکیلوں تک پہنچتی ہے، جہاں نفقے اور خرچ کے نام پر مقدمے لمبے اور پیچیدہ ہو جاتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ ہم شریعت کو صرف نماز پڑھنے تک محدود سمجھتے ہیں، حالانکہ قرآن نے عبادات کو مختصر اور معاملات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔ میاں بیوی کے تعلقات ہوں، دو افراد کے حقوق ہوں، جماعتوں کے درمیان ہو یا بین الاقوامی مسائل ہر جگہ قرآن نے واضح ہدایات دی ہیں۔ اور پھر نبی کریم ﷺ نے اپنی عملی زندگی کے ذریعے ہمیں ان کا نمونہ بھی دکھا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص ؓ کی مثال دیکھ لیجیے۔ وہ بڑے عبادت گزار صحابی تھے، مگر بیوی کے حقوق ادا نہ کر پا رہے تھے، والد نے حضور ﷺ سے شکایت کی۔ آپ ﷺ نے عبداللہ ؓ کو بلایا اور ان کی عبادتوں کو کم کروایا، اور یہ فرمایا: ''إِنَّ لِزَوْجِكَ عَلَيْكَ حَقًّا'' تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، رشتہ داروں کا تم پر حق ہے، اور دنیاوی کام کا بھی تم پر حق ہے۔ (بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب قوله تعالیٰ: فاقرءوا ما تیسر منه، مسلم: کتاب الصیام، باب النهی عن صوم الدهر) یہی توازن شریعت کا حسن ہے۔ جس طرح نماز میں سہولت رکھی گئی، روزے میں بیمار اور مسافر کے لیے رعایت دی گئی، اسی طرح نکاح، طلاق اور وراثت کے مسائل میں بھی آسانیاں ہیں۔ اور وہ ذات جس نے ہمیں پیدا کیا، وہی ہمیں یہ احکام دے رہی ہے، تاکہ ہم ان پر عمل کر کے دنیا و آخرت میں کامیاب ہوں۔

قانونی شعور کے ساتھ دین کی پاسبانی:

اس لیے مسلم پرسنل لا کی طرف سے ہمیں یہ ہدایت دی گئی ہے مسلمانوں کے تمام فرقے - دیوبندی، بریلوی، جماعتِ اسلامی، اہلِ حدیث، شیعہ، سنی - جتنے بھی ہیں، ان سب کی ایک مشترکہ جماعت ہے، جو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے وجود میں آئی ہے۔ اس جماعت کی طرف سے اعلان کیا گیا ہے کہ جب لا کمیشن نے عوام سے یہ سوال کیا ہے کہ آپ یونیفارم سول کوڈ کے حق میں ہیں یا نہیں؟ تو اس کا جواب Yes یا No کی صورت میں دینا ہے۔ دوستو! آج اس کی آخری تاریخ ہے۔ کل کے بعد موقع ختم ہو جائے گا، اس لیے اگر کسی

نے ابھی تک اپنی رائے درج نہیں کی ہے، تو وہ آج جمعہ کے بعد لازمی طور پر یہ عمل کر لے، کئی دنوں سے جمعیت علماء اور مسلم پرسنل لا بورڈ کی طرف سے موبائل ایپ کے ذریعے اس کی وضاحت کی گئی ہے، اب بھی وقت ہے کہ ہم سب اپنے دین کی حفاظت کے لیے اعلان کریں کہ ہمیں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لایا ہوا طریقہ پسند ہے، دوسروں کا طریقہ پسند نہیں ہے۔ ''NO UCC'' کا مطلب یہ ہے کہ میں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کو مانتا ہوں، دوسروں کی تعلیم کو نہیں۔ جس نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اتنی مشقت کے ساتھ یہ دین ہم تک پہنچایا، ہمارے لیے فرض ہے کہ ہم ان کی لائی ہوئی شریعت کی حفاظت کریں۔ سوچئے! کل حوضِ کوثر پر کیا جواب دیں گے؟ اور محشر کے میدان میں جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوچھیں گے کہ اتنی چھوٹی سی بات بھی تم سے نہ ہوسکی؟ شریعت پر عمل میں سستی ہوئی، لیکن جب شریعت پر عمل کرنے میں رکاوٹ ڈالنے والے سامنے آئے تو تم نے کیا کوشش کی؟ کون سی تدبیر اختیار کی؟ آج موبائل پر لوگ دو دو، تین تین گھنٹے بیٹھ جاتے ہیں، بلکہ بعض تو پورا دن لگا دیتے ہیں؛ لیکن یہ کام دو منٹ سے زیادہ کا نہیں ہے۔ اللہ پاک ہمیں توفیق دے کہ ہم دین کو مقدم رکھیں، اور اپنے حق میں یہ واضح اعلان درج کرائیں۔ یاد رکھیں! مسلمانوں کو اس ملک میں سیاسی شعور کے ساتھ رہنا ہے، سڑکوں پر نہیں اترنا ہے۔ یہ جمہوری ملک ہے، یہاں قانون کا نظام ہے۔ جب لا کمیشن نے ہم سے پوچھا ہے تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اپنی رائے پیش کریں اور اعلان کریں کہ اس ملک کی حفاظت میں ہم بھی ذمہ دار ہیں، اگر ملک کو اس طرح تقسیم کیا گیا تو یہ کبھی ایک نہیں ہوسکے گا۔ اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ ہمیں کہی سنی باتوں پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۳۰)

دولہا دلہن کے حقوق اور ذمہ داریاں

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاَنْکِحُوا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ وَالصّٰلِحِیْنَ مِنْ عِبَادِکُمْ وَاِمَآئِکُمْ ط اِنْ یَّکُوْنُوْا فُقَرَآءَ یُغْنِہِمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ط وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿۳۲﴾ (نور:۳۲)

وقال النبی ﷺ: مَن يَضْمَن لي ما بيْنَ لَحْيَيْهِ وما بيْنَ رِجْلَيْهِ، أَضْمَنْ له الجَنَّةَ. (بخاری: کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان)

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم ونحن على ذلك لمن الشاهدين والشاكرين والحمدلله رب العالمين.

فرد، خاندان اور سماج کی بنیاد:

محترم ومکرم علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج کی ہماری یہ مجلس نکاح کی مجلس ہے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کو بیویوں اور اولاد والا بنایا۔ سماجی زندگی میں تجرد اور سنیاسی طرزِ حیات کو اسلام نے پسند نہیں فرمایا، جن لوگوں نے رہبانیت اختیار کی، اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ہم نے ان پر یہ لازم نہیں کیا تھا، یہ انہوں نے اپنی طرف سے اللہ کی رضامندی کے خیال سے کیا؛ لیکن اللہ تعالیٰ نے خود قرآن کریم میں واضح فرمایا: ”وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً ط“ (رعد:۳۸) اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے آپ

سے پہلے بھی بہت سے رسول بھیجے اور ہم نے ان کو بھی بیویوں اور اولاد والا بنایا۔ قرآن کریم کی یہ تعلیم ہمیں بتاتی ہے کہ انسان سماجی زندگی کا فرد ہے، خاندان افراد سے بنتے ہیں، اور انہی افراد سے سماج اور سوسائٹی کا وجود ہوتا ہے۔ اسی لیے اسلامی شریعت نے نہ صرف فرد کا خیال رکھا ہے بلکہ پورے سماج اور سوسائٹی کے حقوق وتقاضوں کو بھی مدنظر رکھا ہے۔

دوستو اور بزرگو! ہم سب ایمانی زندگی گزار رہے ہیں، ہمارے معاشرے میں دن رات شادی بیاہ ہوتے رہتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ہماری سماجی زندگیوں میں کون سی وہ کمزوریاں اور خامیاں ہیں جن کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو رہا ہے؟

زبان اور نفس کی حفاظت پر جنت کی ضمانت:

محترم حضرات! میں نے آپ کے سامنے وہ روایت پڑھی ہے جس میں جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: جو شخص دو چیزوں کی گارنٹی دے دے، میں اس کو جنت کی گارنٹی دیتا ہوں۔ پہلی چیز ہے: ''**ما بین لحییہ**'' دو جبڑوں کے درمیان زبان۔ جو اپنی زبان کی حفاظت کرے اور اسے امانت داری کے ساتھ صرف حق اور بھلائی کی جگہ پر استعمال کرے۔ دوسری چیز ہے: ''**ما بین رجلیہ**'' (بخاری: کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان) دو پیروں کے درمیان کی چیز یعنی شرمگاہ کی حفاظت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان دونوں کا ایک ساتھ ذکر فرمایا۔ جب ہم اپنے معاشرے اور سماج پر غور کرتے ہیں تو پاتے ہیں کہ زیادہ تر جھگڑے، فتنے، اور ایک دوسرے کے حقوق غصب کرنے کی بنیاد یہی دو چیزیں بنتی ہیں۔ پہلی چیز زبان ہے۔ یاد رکھیے! یہی وہ زبان ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جیسی عظیم ہستی، جن کا مقام نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد سب سے بلند ہے، جن کے بارے میں قرآن نے فرمایا: ''ثَانِیَ اثْنَیْنِ'' (وہ دو میں سے دوسرے تھے جو غار میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی تھے)، وہ بھی اپنی زبان کو پکڑ کر کہا کرتے تھے کہ یہی زبان انسان کو ہلاکت میں ڈال دیتی ہے۔ ''**حصائد السنتھم**'' یعنی زبان کی کاشت ہی ساری بربادیوں کا سبب بن جاتی ہے۔ پس دوستو! ہماری سماجی زندگی میں

سب سے بڑا مسئلہ زبان کا ہے۔ ہمارے دن رات کے جھگڑے، غیبتیں، چغلیاں، اور ایک دوسرے کی باتیں ادھر سے ادھر پہنچانا، یہ سب اسی زبان کے غلط استعمال کا نتیجہ ہیں۔

ذمہ داری ادا کرو، حق اللہ سے مانگو:

محترم حضرات! سب سے بڑا مسئلہ جس کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو متوجہ فرمایا وہ یہ ہے کہ ہم حقوق ادا کرنے والے بنیں، نہ کہ صرف حقوق وصول کرنے والے۔ آج دنیا میں یورپ نے جو نظام پھیلایا، اس کی بنیاد یہی ہے کہ ہر انسان اپنے حقوق مانگنے کے لیے کھڑا ہوا۔ انہوں نے یونینز (Unions) بنائیں، تحریکیں چلائیں، کمیونزم جیسے بڑے نظام وجود میں آئے تاکہ سرمایہ دارانہ نظام کا مقابلہ کیا جاسکے؛ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں بھی جب سیکولرزم اور آزادی کا رنگ شامل ہوا تو ہر شخص صرف اپنے حقوق مانگنے لگا، بلکہ حقوق سے بھی زیادہ لینے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو نصیحت فرمائی۔ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! اگر ہمارے حکمران اور ذمہ دار اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کریں تو ہم کیا کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تم اپنی ذمہ داری پوری کرو، اور اپنے حقوق اللہ سے مانگو۔ (مسلم: کتاب الامارۃ، باب وجوب الوفاء ببیعۃ الخلفاء) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بہت بڑے فتنے کو ابتدا ہی میں روک دیا، اگر انسان اپنی مرضی سے اپنی زبان اور ہاتھ کھول دے، ہر ایک اپنے حقوق کا صرف دنیا میں مطالبہ کرے اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل ہو جائے تو پھر نظم ونسق ختم ہو جائے گا، نتیجہ یہ ہوگا کہ ہر شخص اپنی من مانی کرے گا اور کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہوگا۔

ازدواجی زندگی کا امتحان؛ بیٹی بھی ہماری، بہو بھی ہماری:

محترم حضرات! آج دنیا کے نظام میں جو بگاڑ آیا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کو چھوڑ دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف عالمی سطح پر نظام درہم برہم ہوا بلکہ ہمارے آپسی تعلقات اور گھریلو زندگی میں بھی بگاڑ پیدا ہو گیا ہے،

ہماری اولاد دنیوی تعلیم حاصل کرتی ہے، دینی تعلیم بھی سیکھتی ہے، کاروبار کو سمجھتی ہے، اور ایجوکیشن میں آگے بڑھتی ہے، چند سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد ملازمت میں جاتی ہے، لیکن اصل امتحان تو اس کے بعد شروع ہوتا ہے جب نکاح کے بعد ایک عورت کو پوری زندگی ایک مرد کے ساتھ یا ایک مرد کو ایک عورت کے ساتھ گزارنا ہوتا ہے، ہماری بیٹی کو ایک اجنبی گھر میں جانا پڑتا ہے، جہاں اسے ایک نئی زندگی گزارنی ہوتی ہے، اسی طرح ایک اجنبی گھر کی لڑکی ہمارے گھر میں آتی ہے اور ہمارے خاندان کا حصہ بنتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ ہم اس کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ جب اپنی بیٹی کو دوسرے گھر بھیجتے ہیں تو ہماری کتنی امیدیں اور توقعات ہوتی ہیں؛ لیکن جب کسی دوسرے کی بیٹی ہمارے گھر میں آتی ہے تو کیا ہم بھی اسی محبت اور اسی خیال کے ساتھ اسے قبول کرتے ہیں یا نہیں؟ افسوس! آج ہماری گھریلو لڑائیوں کی جڑ یہی ہے کہ ہم سب حقوق کا مطالبہ کرنے والے بن گئے ہیں، لیکن حقوق ادا کرنے والے بننے کو بھول گئے ہیں۔

اسلام میں مرد وعورت کے حقوق کا توازن:

محترم حضرات! پہلے زمانے میں ہمارے بڑے بوڑھے جب سماج میں کوئی جھگڑا ہوتا تو صلح کی کوشش کرتے اور فریقین کے اختلاف کو دور کرنے میں کردار ادا کرتے۔ قرآن کریم نے بھی اس کی ترتیب بتائی ہے، سب سے پہلے شوہر کو مخاطب کیا اور فرمایا: ''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ'' مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ قوام کا مطلب یہ نہیں کہ مرد کو بڑا یا افضل قرار دیا گیا ہے، بلکہ اس کا مطلب ذمہ داری ہے، نگرانی ہے۔ اسی لیے قرآن نے یہ نہیں فرمایا کہ مرد کو عورت پر فضیلت ہے بلکہ فرمایا: ''بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ط'' (نساء: ۳۴) ایک کو دوسرے پر کچھ پہلوؤں میں فضیلت دی گئی ہے، اور مرد کو یہ فضیلت دی گئی ہے کہ وہ عورت پر اپنا مال خرچ کرتا ہے، یہ ایک عجیب حقیقت ہے کہ آج دنیا میں بیلنس ختم ہو رہا ہے۔ مرد بھی کما رہا ہے اور عورت بھی کما رہی ہے، پھر ایک دوسرے کے حقوق کا توازن بگڑ جاتا ہے۔ عورت یہ سوچتی ہے کہ اگر مرد کما رہا ہے تو میں بھی کما رہی ہوں، اس لیے میرے اوپر کوئی

انحصار نہ کرے، حالانکہ شریعت نے بنیادی حکم دیا ہے کہ عورت کے نفقہ اور خرچے کی ذمہ داری مرد پر ہے۔ حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم فرماتے ہیں کہ یورپ کی بہت سی عورتیں اسلام میں داخل ہوئیں اور ٹائم میگزین نے اس پر ایک تفصیلی آرٹیکل بھی شائع کیا، ان عورتوں نے کہا کہ ہمیں یورپ کے نظام نے بیوقوف بنایا، یہ کہہ کر کہ اسلام عورت پر ظلم کرتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام عورت کو کمانے کی کوئی ذمہ داری نہیں دیتا، بلکہ اس کی اصل ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پانچ وقت نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عصمت کی حفاظت کرے اور شوہر کی اطاعت کرے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''**إذا صلّتِ المرأةُ خَمْسَها و صامتْ شهرَها و حصَّنتْ فرْجَها و أطاعت بعلَها دخَلتْ مِن أيِّ أبوابِ الجنّةِ شاءتْ**'' جب عورت اپنی پانچ وقت کی نماز پڑھے، رمضان کے روزے رکھے، اپنی عصمت کی حفاظت کرے اور شوہر کی اطاعت کرے تو وہ جنت کے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔ (صحیح ابن حبان: کتاب النکاح، باب ذکر ایجاب الجنة للمرأة اذا اطاعت زوجها مع اقامة الفرائض لله) یہ عورت کا اصل مقام اور شریعت کی عطا کردہ عظیم فضیلت ہے۔

صدیق اکبرؓ اور نیک عورتیں؛ جنت کے مہمانِ خاص:

دوستو اور بزرگو! حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا: یارسول اللہ! جنت کے آٹھ دروازے ہیں، کیا کوئی ایسا بھی خوش نصیب ہوگا جس کو ان سب دروازوں سے داخل ہونے کی اجازت ملے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر! وہ تم ہو۔ (بخاری: کتاب الصوم، باب الریان للصائمین) تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنت کے آٹھوں دروازے کھول دیے جائیں گے، اور تم ان میں سے جس دروازے سے چاہو، داخل ہو جاؤ گے۔ یہ عظیم مقام صدیق اکبرؓ کو عطا ہوا؛ لیکن ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عورتوں کو بھی یہ بشارت دی کہ جب وہ اپنے شوہروں کے حقوق اور اللہ تعالیٰ کے حقوق کو صحیح طور پر ادا کریں گی تو قیامت کے دن ان سے کہا جائے گا: جنت کے جس دروازے سے چاہو

داخل ہو جاؤ۔یعنی مردوں میں صدیق اکبرؓ کو یہ اعزاز ملا اور عورتوں میں ہر وہ خاتون اس سعادت کی حقدار ہوگی جو اللہ پاک اور اپنے شوہر کے حقوق ادا کرنے میں وفاداری اور اخلاص اختیار کرے گی۔ یہ عورت کے بلند مقام کی سب سے بڑی دلیل ہے۔

گھریلو نزاعات کا قرآنی حل:

دوستو اور بزرگو! قرآن کریم نے ازدواجی مسائل کے حل کی نہایت حکیمانہ ترتیب بیان فرمائی ہے۔ اگر میاں بیوی کے درمیان کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے تو سب سے پہلے دونوں کو چاہیے کہ خود آپس میں حل کریں، شوہر ادب سے سمجھائے، اگر ضرورت ہو تو بستر الگ کر لے، اور اصلاح کی کوشش کرے؛ لیکن اگر ان تدابیر سے مسئلہ حل نہ ہو تو پھر قرآن نے فرمایا: ''فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ ''(نساء:۳۵) مرد کے قریبی رشتہ دار اور عورت کے قریبی رشتہ دار دونوں بیٹھ کر صلح کی کوشش کریں۔ یہ بھی ایک لطیف نکتہ ہے کہ قرآن نے قریبی رشتہ داروں کو حکم بنایا، دور کے نہیں؛ کیونکہ قریبی رشتہ دار میں محبت بھی ہوتی ہے، وہ گھر کی بات باہر نہیں پھیلائے گا اور دل سے فتنے کو دبانے کی کوشش کرے گا، اس کے برعکس آج کل یہ حالت ہے کہ اگر کسی سے کوئی بات کہہ دو تو وہ گھر پہنچنے سے پہلے پورے سماج میں مشہور ہو جاتی ہے؛ حالانکہ حدیث شریف میں فرمایا گیا: ''المستشار مؤتمن'' (ابوداود: کتاب الادب، باب فی المشورۃ) جس سے مشورہ لیا جائے وہ امانت دار ہوتا ہے۔ قرآن نے مزید فرمایا: ''اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ۭ '' اگر یہ دونوں رشتہ دار سچی نیت سے صلح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ضرور ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا فرما دیں گے؛ لیکن اگر نیت میں اخلاص نہ ہو، بظاہر اصلاح کے لیے جائیں مگر دل میں بگاڑ پیدا کرنے کا ارادہ ہو تو پھر نتیجہ فساد ہی نکلے گا۔ یہ قرآن کی وہ نفسیاتی رہنمائی ہے جو ہمارے دلوں کے چور دروازوں کو بھی کھول دیتی ہے۔ نکاح کوئی وقتی معاہدہ نہیں بلکہ پوری زندگی کا ساتھ ہے، ہماری بیٹیاں کچھ سال دنیاوی تعلیم پڑھ کر نوکری کرتی ہیں، لیکن اصل میں انہیں ساری زندگی شوہر کے ساتھ

گزارنی ہے، اسی طرح شوہر کو بھی بیوی کے ساتھ پوری عمر رہنا ہے، اسی لیے اسلام نے نکاح کو ہمیشہ کے لیے قرار دیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وقتی نکاح (متعہ) کو حرام فرمایا کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ پہلے دن ہی سے میاں بیوی یہ نیت کریں کہ ہم موت تک ایک دوسرے کے ساتھ رہیں گے۔ یہی اسلام کی لطافت اور عظیم سوچ ہے۔

گھر کی وفاداری سے ایمان کی وفاداری تک:

حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں ایک نوجوان دلہن سے بھی عبرت حاصل کرنی چاہیے، وہ صرف نکاح کے دو جملے ''ایجاب وقبول'' کہہ کر اپنی پوری زندگی ایک نئے گھر کے سپرد کر دیتی ہے، اپنی خوشیاں اور غم اس گھر کی خوشیوں اور غموں سے وابستہ کر لیتی ہے، بیس بائیس سال اپنے ماں باپ کے گھر گزارنے کے بعد ایک اجنبی گھر کو اپنا گھر سمجھتی ہے، وہاں کی خوشی کو اپنی خوشی اور وہاں کے غم کو اپنا غم بنا لیتی ہے۔ حضرت فرماتے ہیں کہ ہم نے بھی ایک جملہ پڑھا ہے: ''لا إله إلا الله'' جیسے نکاح میں دو گواہ اور وکیل رضامندی کے اظہار کے بعد اجازت لیتے ہیں، ایسے ہی ہم نے بھی اس کلمے کے ذریعے اللہ تعالیٰ سے بندگی کا عہد کیا ہے۔ اب ہمیں بھی چاہیے کہ اس کلمے کی لاج رکھیں، جیسا کہ ایک دلہن اپنے گھر کی لاج رکھتی ہے۔ وہ اپنے شوہر اور گھر کی وفاداری نبھاتی ہے، تو ہمیں بھی اللہ تعالیٰ کے احکامات پر چل کر اس کلمے کی وفاداری نبھانی چاہیے۔

اسلامی تربیت بمقابلہ مغربی بے راہ روی:

دوستو اور بزرگو! قرآن کریم نے نکاح، طلاق اور سماجی زندگی کے مسائل نہایت صاف اور واضح انداز میں بیان فرمائے ہیں، اگر ان پر عمل نہ کیا جائے تو اس کے نقصانات ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں۔ یہ اتنا کھلا ہوا پیغام ہے کہ آج یورپ میں نکاح کا بندھن ٹوٹ چکا ہے، ان کی گاڑی پٹری سے اتر چکی ہے، اور وہاں کے سماجی تعلقات بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ لڑکا اور لڑکی چند دن کے لیے ساتھ رہتے ہیں، اپنی خواہش اور شہوت پوری کرتے ہیں اور پھر ایک

دوسرے سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اسی کو حدیث شریف میں فرمایا گیا: ''إن اللہ لا یحب الذوّاقین و لا الذوّاقات'' (مسند بزار: رقم: ۳۰۶۶) اللہ تعالیٰ ان مردوں اور عورتوں کو پسند نہیں کرتا جو صرف چکھنے کے لیے رشتہ بناتے اور توڑتے رہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں آئے دن خبریں آتی ہیں کہ چھوٹے چھوٹے بچے اسکول میں اپنے استاد کو قتل کر دیتے ہیں یا اپنے ہم جماعتوں پر گولی چلا دیتے ہیں، جب تحقیق کی گئی تو پتہ چلا کہ یہ وہی بچے ہیں جن کا کوئی باپ اور کوئی ماں نہیں، ناجائز تعلقات سے پیدا ہوئے اور پھر حکومت نے ان کی پرورش کی، ایسے بچے یا تو بہت بزدل ہوتے ہیں یا انتہائی سخت دل؛ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے گھر کا نظام ایسا بنایا ہے کہ بچہ ماں کی نرمی اور باپ کی سختی کے درمیان پروان چڑھے، دادا، دادی اور خاندان کا ماحول بچے کی شخصیت کو متوازن بناتا ہے۔ یورپ کے ان بچوں کو نہ ماں کی مامتا ملی، نہ باپ کی شفقت، نتیجہ یہ کہ وہ محبت سے خالی دل کے ساتھ بڑے ہوئے، یہی بچے بعد میں ظلم و جبر کے راستے پر چلتے ہیں۔ آج دنیا میں جو سفاک فوجی گروہ اور جابرانہ حکومتیں سامنے آئی ہیں، ان کے پس منظر میں یہی بے سہارا بچے ہیں جنہیں بچپن میں اخلاق و آداب سکھانے والا کوئی نہ تھا، اس کے برعکس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھایا کہ بچے کی تربیت کی ذمہ داری باپ پر ہے، بلکہ پیدائش سے پہلے سے ہی اس کی بنیاد رکھی جاتی ہے، یہی اسلامی معاشرت کی حکمت ہے جو انسان کو بہترین فرد اور سماج کو بہترین معاشرہ بناتی ہے۔

اسلام میں اولاد کی پرورش کی اہمیت اور اجر:

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بچہ جب ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو ماں اور باپ کی کمائی، ان کی سوچ اور ان کا طرزِ عمل اس بچے پر اثر انداز ہوتا ہے، بچہ انہی کی سوچ کے مطابق پیدا ہوتا ہے۔ امام غزالیؒ نے یہ حقیقت آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے بیان کی، اور آج کے یورپ کے بڑے محققین نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ جب سے روح پھونکی جاتی ہے، اس کے بعد سے بچہ ماں کے پیٹ میں جتنے دن رہتا ہے، اس دوران وہ اخلاقیات اور

تربیت کی کئی بنیادیں اندر ہی سے سیکھ لیتا ہے، حالانکہ وہ شعور نہیں رکھتا، یہی وجہ ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتو اسلام نے اس کی ابتدائی تربیت کے واضح اصول دیے، اس کا اچھا نام رکھا جائے، اس کی تحنیک کروائی جائے، یہ معمولی باتیں نہیں بلکہ باپ کو اپنی ذمہ داری کا احساس دلایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی فکر کرے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بچے ہو یا بچیاں، ان کی تربیت کا بہت بڑا اجر ہے؛ بلکہ بچیوں (ایک ہو، دو ہو یا تین) کی پرورش پر تو خاص فضیلت بیان کی گئی ہے۔ (ابو داود: کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتیماً) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس عورت کا شوہر وفات پا جائے اور وہ اپنی چھوٹی اولاد کی پرورش کے لیے اپنی پوری زندگی لگا دے، دوسروں کے گھروں میں کام کر کے ان کے پیٹ پالتے پالتے اس کے ہاتھ سخت ہو جائیں، ایسی عورت قیامت کے دن جنت میں میرے قریب ہوگی۔ (ابو داود: کتاب الادب، باب فی فضل من عال یتیماً) یہ عورت کی قربانی اور اولاد کی تربیت کی عظمت ہے۔ اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''أنا و کافل الیتیم في الجنة هکذا'' (بخاری: کتاب الادب، باب فضل من یعول یتیماً) اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی شہادت اور درمیانی انگلی کو قریب کر کے دکھایا۔ یعنی میں اور یتیم کی پرورش کرنے والا جنت میں ایسے قریب ہوں گے۔ یہ سب اس لیے ہے کہ اسلام نے اولاد کی تربیت کو سب سے بڑی ذمہ داری قرار دیا۔ جب یتیم کی پرورش کرنے والے کو اتنا اونچا درجہ دیا گیا ہے تو وہ والدین جو اپنی اولاد کی خود پرورش کرتے ہیں، ان کے اجر اور فضیلت کا اندازہ آپ لگا سکتے ہیں!

چھوٹی چھوٹی باتوں سے سماج میں خیر و عافیت:

دوستو اور بزرگو! جب اولاد کی اچھی پرورش کر دی جاتی ہے تو پھر وقت آتا ہے کہ بیٹی کو رخصت کر کے دوسرے گھر بھیجا جائے، اس وقت والدین کی یہ ذمہ داری ہے کہ اسے آدابِ زندگی اور اصول سکھائیں، تاکہ وہ سسرال میں صبر، برداشت اور حسنِ سلوک کے ساتھ رہ سکے، اگر کڑوی کسیلی باتیں بھی آئیں تو انہیں برداشت کرنا سیکھے۔

اسی طرح بیٹے کی تربیت والدین پر لازم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ کی شادی ہوئی تو ان کے والد نے بہو سے حال پوچھا، اس نے کہا: عبداللہ بہت اچھے ہیں، عبادت گزار ہیں، مگر مجھ سے قریب نہیں ہوتے، والد سمجھ گئے کہ بیوی کے حقوق پوری طرح ادا نہیں ہو رہے۔ وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیٹے کی حالت بتلادی، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبداللہؓ کو بلا کر توازن کی تعلیم دی اور فرمایا کہ بیوی کا بھی حق ہے، نفس کا بھی حق ہے، اور اللہ کا بھی حق ہے۔ (مسلم: کتاب الصیام، باب النهی عن صیام الدهر، بخاری: کتاب فضائل القرآن، باب وقول اللہ تعالیٰ: فاقرو اماتیسر منه) اس واقعہ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ والدین کو اپنے بیٹوں پر بھی نظر رکھنی چاہیے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ کیسا سلوک کر رہے ہیں، یہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہی ہیں جو سماج کو صاف، ستھرا اور خیر و عافیت والا بناتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہم سب کو ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین

(۳۱)

تفسیر سورۂ یٰس شریف

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ، وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ علٰی سَیِّدِ الْمُرْسَلِیْنَ، وَ عَلٰی آلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ اَجْمَعِیْن، اما بعد!

قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وتَعَالٰی فِی الْقُرْآنِ الْمَجِیْدِ والْفُرْقَانِ الْحَمِیْدِ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ ○ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْیَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ (یٰس:۱۳)

وقال اللہ تعالیٰ:

وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ ۚ اَحْیَیْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ یَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ (یٰس:۳۳)

وقال اللہ تعالیٰ:

وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِیَ خَلْقَهٗ ؕ قَالَ مَنْ یُّحْیِ الْعِظَامَ وَهِیَ رَمِیْمٌ ﴿۷۸﴾ قُلْ یُحْیِیْهَا الَّذِیْۤ اَنْشَاَهَاۤ اَوَّلَ مَرَّةٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِیْمُ ﴿۷۹﴾ (یٰس:۷۸،۷۹)

صدق اللہ العظیم وصدق رسولہ النبي الکریم ونحن علی ذلك لمن الشاهدین والشاکرین والحمد للہ رب العالمین.

قرآن کا دل اور آخرت کی یاددہانی:

محترم ومکرم حضراتِ علمائے کرام اور ایمان والے بھائیو! آج کی تراویح میں سورۂ یٰس کی تلاوت کی جائے گی۔ یہ وہ سورت ہے جسے بہت سے مسلمان بھائی اور بہنیں اپنا معمول بنا کر روزانہ پڑھتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس سورت کو خاص اہمیت عطا فرمائی ہے، جناب نبی اکرم

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ یٰس ''قرآن کا دل'' ہے۔ (ترمذی: ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل یس) احادیث مبارکہ میں اس کے پڑھنے کی بے شمار فضیلتیں بیان ہوئیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالخصوص یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جو شخص اپنی زندگی کے آخری لمحات میں ہو، اس کے پاس سورۂ یٰس کی تلاوت کی جائے۔ (ابوداود: کتاب الجنائز، باب القراءۃ عندالمیت) اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت کے مضامین دل پر براہِ راست اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس سورت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ دیگر سورتوں کی نسبت یہاں اللہ تعالیٰ کا خطاب زیادہ تر براہِ راست ہے۔ اس میں اللہ کی قدرت کی نشانیاں، گذشتہ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اور تذکیر بایام اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں اور گرفت کے واقعات بڑے بلیغ اور مؤثر انداز میں بیان ہوئے ہیں اور سب سے بڑھ کر اس سورت میں آخرت کے مسئلے کو نہایت اہتمام کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے، تاکہ انسان دنیا کی فانی زندگی سے غافل نہ ہو اور اپنی اصل منزل کی تیاری کرے۔

آخرت کا یقین؛ نیکی کا محرک اور گناہ سے بچاؤ:

دوستو اور بزرگو! توحید اور رسالت کے بعد اگر کوئی چیز انسان کو گناہوں سے بچانے والی ہے تو وہ ہے آخرت کا عقیدہ۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوگئی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور انبیاء کرام علیہم السلام کے ذریعے تعلیمات بھی پہنچ گئیں، لیکن ایک محرک اور ضرورت باقی ہے ایسا عقیدہ جو انسان کو نیکی کی طرف آمادہ کرے، برائی اور گناہ سے روکے۔ یہی ہے ایمان بالآخرہ۔ قرآن کریم نے فرمایا: ''وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝'' (بقرہ: ۴) مومن کی پہچان یہ ہے کہ وہ آخرت پر یقین رکھتا ہے؛ کیونکہ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسان کو رات کی تنہائیوں میں گناہ سے روکتا ہے، یہی وہ عقیدہ ہے جو دل میں تقویٰ کی روشنی پیدا کرتا ہے اور بندے کو اللہ تعالیٰ کی مرضیات پر چلنے پر مجبور کرتا ہے، اسی لیے قرآن کریم نے سورۂ یٰس میں آخرت کے عقیدے کو بار بار ذکر فرمایا، جنت کی نعمتوں اور جہنم کے عذاب کا تفصیل سے تذکرہ کیا، جہنمیوں کے احوال بیان کیے اور جنتیوں کی خوشیوں کا ذکر فرمایا۔ بار بار قیامت کے دن صور پھونکے جانے کا ذکر فرمایا: ''وَنُفِخَ فِي

الصُّوْرِ فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ﴿۵۱﴾'' (یس:۵۱) اور صور پھونکا جائے گا تو یکا یک یہ اپنی قبروں سے نکل کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے روانہ ہو جائیں گے۔ یہ سب کچھ اس لیے کہ انسان آخرت کو سامنے رکھ کر اپنی زندگی گزارے۔

قرآن کے خاص الفاظ؛ انسان کے لیے چیلنج:

دوستو اور بزرگو! جو آیات میں نے آپ کے سامنے تلاوت کیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں دو قسم کی بنیادی دلیلوں سے بات کو واضح فرمایا ہے۔ پہلی آیت ہے: ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ'' اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی تعریف بیان فرمائی: ''یٰسٓ'' یہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک ناموں میں سے ایک ہے۔ اسی طرح ''طٰہٰ'' کے متعلق بھی مفسرین نے یہی بات فرمائی۔ اس کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کا ذکر کیا۔ بعض مفسرین نے یہ بھی فرمایا کہ جتنے بھی حروفِ مقطعات ہیں، ان میں اللہ تعالیٰ نے عرب کے لوگوں کو چیلنج فرمایا ہے۔ یعنی یہ حروف تو وہی ہیں جو تمہاری زبان کے ہیں، الف سے یاء تک یہی حروف ہیں جن سے تم اپنی شاعری اور نثر تخلیق کرتے ہو؛ لیکن انہی حروف کو ہم نے جوڑ کر ایسا کلام بنایا ہے جس کی مثال لانا تمہارے بس میں نہیں، یہی قرآن کریم کا معجزہ ہے؛ چنانچہ اکثر مقامات پر حروفِ مقطعات کے فوراً بعد قرآن کریم کا ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے: ''یٰسٓ﴿۱﴾ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ﴿۲﴾'' ''طٰهٰ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى﴿۲﴾'' ''صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ﴿۱﴾'' امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہ دراصل قرآن کریم کے دلائل اور اس کی صداقت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے، گویا اللہ تعالیٰ نے حروفِ مقطعات کو بھی اپنی حجت کے طور پر پیش فرمایا ہے کہ انہی عام حروف سے ایسا کلام تیار ہوا جو دنیا کی کسی طاقت کے بس کی بات نہیں۔

انبیاء کے قصے اور تذکیر بأیام اللہ:

دوستو! سب سے پہلی بات جو اس سورت میں بیان ہوئی وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا: ''اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ﴿۳﴾'' اے نبی! بے شک آپ ہمارے

بھیجے ہوئے رسولوں میں سے ہیں۔ مشرکین مکہ اعتراض کرتے تھے، لیکن اللہ نے قرآن میں خود گواہی دی کہ آپ ہمارے سچے رسول ہیں۔ آگے قرآن میں مثال کے طور پر ایک قصہ ذکر کیا گیا: ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ'' اکثر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریین (یعنی ان کے شاگرد اور مددگار) کی طرف اشارہ ہے۔ پورے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے تقریباً ۲۵ انبیاء کرام علیہم السلام کے نام لے کر ان کے واقعات بیان فرمائے ہیں، اور تین انبیاء کرام علیہم السلام کے واقعات اشاروں کے ساتھ ذکر کیے ہیں، یوں تقریباً ۲۸ مقامات پر انبیاء کے قصے آئے ہیں۔

ان واقعات کے ذریعے اللہ تعالیٰ ہمیں نصیحت کرتے ہیں، تاکہ ہم پچھلی قوموں کی تاریخ سے سبق حاصل کریں۔ اسی کو قرآن نے کہا ہے: ''وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۵۵'' (ذاریات:۵۵) نصیحت کرو! کیونکہ نصیحت مومنوں کے لیے فائدہ مند ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے اس کو ''تذکیر بأیام اللہ'' کہا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ قوموں کی ترقی اور بربادی کے پیچھے ان کے اعمال کارفرما ہوتے ہیں، اور ان اعمال کے مطابق اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ ان پر فیصلے نافذ فرماتا ہے۔

گذشتہ امتوں کی بربادی اور آج کا انسان:

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی توحید، رسالت اور آخرت کا یقین دلانے کے لیے ایک خاص طریقہ اختیار فرمایا ہے، جسے قرآن کریم ''تذکیر بأیام اللہ'' کہتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا: ''وَذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ ؕ'' (ابراہیم:۵) اپنی قوم کو وہ دن یاد دلاؤ جب اللہ نے ان پر انعام کیا یا جب اللہ کا عذاب آیا۔ قوموں کے عروج وزوال کی داستانیں اسی لیے قرآن میں بار بار بیان کی گئی ہیں تاکہ ہم سبق حاصل کریں۔ بڑی بڑی طاقتور قومیں تکبر کی وجہ سے ملیامیٹ کر دی گئیں۔ قرآن نے فرمایا: ''فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ۝۸'' (حاقہ:۸) کیا تم ان میں سے کسی کو باقی دیکھتے ہو؟ اور سورۂ یٰس میں فرمایا: ''فَاِذَا

هُمْ خٰمِدُوْنَ'' وہ سب بجھا دیے گئے۔ یہاں یہ لطیف نکتہ ہے کہ قرآن یہ بھی کہہ سکتا تھا کہ وہ ختم کر دیے گئے، مگر ''خامدون'' کا لفظ استعمال کیا تا کہ ان کے تکبر اور بڑائی کے دعوے خاک میں ملنے کی کیفیت زیادہ نمایاں ہو۔ اسی طرح سورۂ حجر میں فرمایا: ''فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ۝۷۹'' (حجر:۷۹) ہم نے ان سے بدلہ لیا اور ان کی بستیاں آج عام شاہراہ پر ہیں۔ مکہ کے قافلے جب شام اور یمن کے سفر پر جاتے تو انہی کھنڈرات کے پاس سے گزرتے۔ یہی وہ سفر تھے جنہیں قرآن نے کہا: ''رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ۝۲'' (قریش:۲)؛ لیکن افسوس! ''يَمُرُّوْنَ عَلَيْهَا وَهُمْ عَنْهَا مُعْرِضُوْنَ ۝۱۰۵'' (یوسف:۱۰۵) لوگ وہاں سے گزرتے ہیں اور کوئی عبرت نہیں پکڑتے۔ سورۂ یٰس اسی لیے ہمیں بار بار آخرت اور اللہ کی نشانیاں یاد دلاتی ہے۔ اس میں ایک اہم قصہ اصحاب القریۃ کا ذکر ہے۔ ''وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ ۘ اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ ۝۱۳'' (یس:۱۳) مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ انطاکیہ (جو آج شام اور ترکی کے بارڈر پر ہے) میں پیش آیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ان کے دو حواری وہاں پہنچے اور لوگوں کو اللہ کا پیغام سنایا، مگر انہوں نے ان کی بات نہ مانی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تیسرے پیغمبر کو بھیجا، تب بھی انکار کر دیا۔ قرآن نے فرمایا: ''اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ ۝۱۴'' (یس:۱۴) ہم نے پہلے دو بھیجے، پھر ان کو جھٹلایا گیا تو ہم نے تیسرے کے ذریعے ان کی مدد کی۔ یہ سب واقعات ہمیں یہی سکھانے کے لیے ہیں کہ اگر نصیحت کو نظر انداز کیا جائے، تو دلوں پر مہر لگ جاتی ہے، آنکھیں دیکھ کر بھی عبرت نہیں لیتیں اور کان سن کر بھی سبق نہیں پکڑتے۔ اس لیے قرآن ہمیں بیدار کرنے کے لیے ان قوموں کی کہانیاں دہراتا ہے۔

انبیاء کی بے غرض دعوت اور حبیب نجّار کا ایمان:

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اِنَّا تَطَيَّرْنَا بِكُمْ ۚ'' (یس:۱۸) جب بھی کوئی نبی اپنی قوم کو دعوت دیتا ہے تو آغاز میں ماحول ناپسندیدہ اور مخالف ہوتا ہے، سماج کفر و شرک میں

ڈوبا ہوا ہوتا ہے، اور ایسے حالات میں انبیاء کرام علیہم السلام جب اللہ کا پیغام پہنچاتے ہیں تو دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔ ایک جماعت وہ جو اللہ کے نبی کی بات کو مان لیتی ہے، اور دوسری وہ جو پرانے رسم ورواج اور باطل پر ڈٹی رہتی ہے۔ قومیں انبیاء سے کہتی ہیں: تمہاری نحوست کی وجہ سے ہم پر مصیبت آئی ہے۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا اور دوسرے انبیاء کو بھی کہا گیا، مگر انبیاء علیہم السلام نے جواب دیا کہ نحوست ہماری نہیں بلکہ تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے کہ اللہ کا عذاب آیا۔ ایسے موقع پر قرآن کہتا ہے: ''وَجَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِیْنَةِ رَجُلٌ یَّسْعٰی'' ایک شخص بستی کے دور دراز کونے سے دوڑتا ہوا آیا اور بولا: ''یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ ۙ﴿۲۰﴾'' (یس:۲۰) اے میری قوم! ان رسولوں کی پیروی کرو۔ پھر اس نے دو بڑی باتیں بتائیں: پہلی یہ کہ نبی اور ان کے نائبین بے غرض ہو کر دعوت دیتے ہیں، جیسا کہ فرمایا: ''اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُكُمْ اَجْرًا'' (یس:۲۱) وہ تم سے کوئی بدلہ یا دنیاوی مفاد نہیں چاہتے۔ یہی پیغام دوسرے انبیاء نے بھی دیا: ''وَمَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلٰی رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ﴿۱۰۹﴾'' (شعراء:۱۰۹)۔ دوسری بات یہ کہ وہ خود ہدایت یافتہ ہیں: ''وَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ'' (یس:۲۱) ان کا راستہ بالکل سیدھا اور مطمئن ہے۔ اس سے ہمیں سبق ملتا ہے کہ دین کی دعوت ہمیشہ بے غرض ہو کر دی جائے، اور داعی کے دل میں یہ یقین ہو کہ میں خود اس راہ پر قائم ہوں۔ قرآن نے یہی اصول بیان کیا: ''قُلْ هٰذِهٖ سَبِیْلِیْۤ اَدْعُوْۤا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰی بَصِیْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ ؕ'' (یوسف:۱۰۸) یہ دعوت نہ سرداری کی محتاج ہے، نہ دولت کی۔ حبیب نجارؒ ایک مزدور تھے، بڑھئی کا کام کرتے تھے، مگر ایمان اور اخلاص میں سب سے آگے نکل گئے۔ قرآن نے بتایا کہ اللہ کی ہدایت کبھی بڑے سرداروں یا مالداروں کی میراث نہیں رہی، یہی اعتراض مشرکینِ مکہ نے کیا: ''وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ ﴿۳۱﴾'' (زخرف:۳۱) یہ قرآن مکہ یا طائف کے کسی بڑے سردار پر کیوں نہ اتارا گیا؟ مگر اللہ نے فرمایا: ''اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ؕ'' (انعام:۱۲۴) اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اپنی رسالت کہاں

رکھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ انسان اپنی حقیقت میں جاہل ہے، اسے اپنے ہی پیٹ کے کھانے پینے کی کیفیت کا پورا علم نہیں، اپنی آنکھ کے نیچے کی چیز تک نہیں دیکھ سکتا، ہزاروں لاکھوں معاملات سے بے خبر رہتا ہے۔ پھر اے انسان! تو اللہ کی رسالت کا فیصلہ کرے گا؟ جب کہ تو تو اپنی معیشت کا نظام بھی نہیں سنبھال سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا: ''نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَعِيشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'' (زخرف:۳۲) یعنی دنیا کی روزی بھی ہم ہی نے لوگوں کے درمیان تقسیم کی ہے۔ تو معیشت کی تقسیم بھی اللہ کے اختیار میں ہے اور رسالت کی تقسیم بھی اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔ یہ دونوں فیصلے بندے کے اختیار سے باہر ہیں۔

زندگی کی ابتدا سے شکر گزاری تک:

دوستو اور بزرگو! اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی دعوت میں دو پہلو واضح فرمائے: ایک طرف تذکیر بأیام اللہ یعنی پچھلی قوموں کے حالات یاد دلائے، اور دوسری طرف تذکیر بأنعام اللہ یعنی اللہ کی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ پچھلے جمعہ سورۂ نحل میں آپ نے اللہ کے انعامات سنے تھے، اور آج سورۂ یٰس میں بھی اللہ تعالیٰ نے انہی نعمتوں کو دوسرے انداز میں بیان فرمایا: ''وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾'' (یس:۳۳) اسی طرح حبیب نجّار نے اپنی قوم کو سمجھایا: ''وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۲﴾'' (یس:۲۲) مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس اللہ کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا اور جس کی طرف تمہیں لوٹ کر جانا ہے؟ یہی پیغام سورۂ کہف میں بھی دیا گیا کہ دو آدمیوں کے واقعے میں ایک نے اپنے باغ اور مال پر غرور کیا تو دوسرے نے اسے کہا: ''اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ﴿۳۷﴾'' (کہف:۳۷) کیا تو اس اللہ کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے بنایا اور پھر پورا انسان بنایا؟ دوستو! اللہ تعالیٰ نے انسان کو یاد دلایا کہ کبھی تو ماں کے پیٹ میں نو مہینے تک ایک ناقابلِ ذکر چیز تھا، پھر اللہ نے تجھے دنیا میں نکالا، علم دیا، عقل دی، شعور دیا۔ جیسا کہ فرمایا: ''وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ

اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ﴿۷۸﴾'' (نحل:۷۸) تم ماں کے پیٹ سے ننگے پیدا ہوئے، کچھ ساتھ نہ لائے تھے۔ نہ علم، نہ طاقت، نہ مال سب کچھ اللہ نے تمہیں بعد میں دیا۔ آنکھیں، کان اور دل سب اللہ کی عطا ہیں۔ یہ انعامات اللہ نے ہمیں یاد دلائے، اور یہی حبیب نجّار اپنی قوم کو یاد کرا رہے تھے۔

دوستو اور بزرگو! قرآن ہمیں نہ صرف نصیحت کرتا ہے بلکہ دعوت کا اسلوب بھی سکھاتا ہے۔ نافرمان لوگوں سے گفتگو کرتے وقت انبیاء کرام نے فلسفیانہ یا پیچیدہ دلائل نہیں دیے بلکہ فطرت کی سادہ اور عملی دلیلیں پیش کیں، وہ دلیلیں جو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے، اسی لیے سورۂ یٰس میں اللہ تعالیٰ نے قدرت کی یہ نشانیاں بیان فرمائیں تاکہ بندہ غور کرے اور شکر گزار بنے۔

حافظ ابن کثیرؒ کی مثال؛ لومڑی اور زمین سے سبق:

دوستو اور بزرگو! حبیب نجّار نے اپنی قوم سے کہا: '' وَمَا لِيَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِيْ فَطَرَنِيْ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ﴿۲۲﴾'' مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں اس اللہ کی عبادت نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا، حالانکہ سب کو آخر کار اسی کی طرف جانا ہے۔ یہی اصل حقیقت ہے، پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور پلٹنا بھی اسی کی طرف ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کو سمجھانے کے لیے ایک مثال بیان فرمائی: یہ صرف سمجھانے کے لیے ہے کہ ایک لومڑی نے زمین سے قرض لیا، مدت پوری ہوئی تو زمین نے کہا: میرا قرض واپس کرو۔ اب لومڑی بھاگ رہی ہے، لیکن جدھر بھی جائے گی زمین ہی ہوگی، اگر کسی گہرے گڑھے میں جا کر چھپے گی، تو وہ بھی زمین ہی ہوگی، زمین پھر کہے گی: میرا قرض دو۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اے انسان! تیرا حال بھی ایسا ہی ہے۔ جہاں بھی بھاگے گا، لوٹنا اسی اللہ کی طرف ہے۔

آخرت کی یاد؛ انسان کو گناہ سے روکنے والی اصل قوت:

اسی حقیقت کو قرآن نے یوں بیان کیا: '' يَقُوْلُ الْاِنْسَانُ يَوْمَىِٕذٍ اَيْنَ الْمَفَرُّ﴿۱۰﴾'' (قیامہ:۱۰) اس دن انسان کہے گا: کہاں بھاگنے کی جگہ ہے؟ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاِلَيْهِ

تُرْجَعُونَ'' تم سب کو اسی کی طرف لوٹنا ہے۔ ایک مؤمن مسلمان کو جب کوئی چیز گم ہو جاتی ہے تو وہ بھی یہی کہتا ہے: ''إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ'' یہ چیز گم ہوگئی، لیکن مجھے بھی کل اللہ کی طرف لوٹنا ہے۔ دوستو اور بزرگو! یہ عقیدہ ہی اصل سرمایہ ہے، آخرت کا یقین انسان کے دل میں پختہ ہو تو وہ نہ صرف خود سنبھلتا ہے بلکہ دوسروں کو بھی دعوت دیتا ہے، دنیا کے کیمرے، لائٹیں، پولیس یا حفاظتی انتظامات انسان کو گناہ سے نہیں روک سکتے، اگر روک سکتے تو سپر پاور ملکوں میں بڑے بڑے حادثات اور جرائم کبھی نہ ہوتے، اصل روکنے والی چیز ہے اللہ کا ڈر اور آخرت کا خوف۔ یہی خوف انسان کو رات کی تنہائیوں میں بھی گناہ سے بچاتا ہے۔

اللہ پاک کی حاضری کو مدنظر رکھیں:

دوستو اور بزرگو! ایمان یہی ہے کہ بندہ ہمیشہ یہ سمجھے کہ اللہ ہر وقت دیکھ رہا ہے۔ ایک واقعہ ہے کہ ماں نے بیٹی سے کہا: دودھ میں پانی ملا دو، بیٹی نے جواب دیا: ماں! عمرؓ تو نہیں دیکھ رہے، لیکن اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ اسی طرح ایک مرتبہ حضرت عمر فاروقؓ نے ایک چرواہے سے کہا: یہ بکری مجھے بیچ دو، چرواہے نے کہا: یہ تو میرے مالک کی ہے، حضرت عمرؓ نے آزمانے کے لیے کہا: مالک کو کہہ دینا کہ بکری کھو گئی تھی، اس چرواہے نے فوراً جواب دیا: ''فَأَيْنَ اللّٰهُ؟'' اللہ کہاں ہے؟ یہ ہے آخرت کا خوف، جو ایک سچے بندے کے دل میں ہوتا ہے۔ یہی ڈر حبیب نجّارؒ نے بھی اپنی قوم کو سمجھایا، مگر ان کی قوم نے ان کی بات نہ مانی، کتنے مخلص تھے، لیکن روایتوں میں آتا ہے کہ ان کو پتھر مار مار کر شہید کر دیا گیا۔ (تفسیر ابن کثیر: سورۃ یٰس) آج جسے موب لنچنگ کہا جاتا ہے، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، یہ ظلم انبیاء کرامؑ کے متبعین کے ساتھ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ حضرت شعیبؑ اور ان کی قوم کے جملے صاف بتاتے ہیں کہ یہ رویہ پرانا ہے، مگر اللہ تعالیٰ نے بھی صاف اعلان فرمایا کہ تم جو کچھ کرتے ہو کرو، لیکن یاد رکھو! تیرہواں پونہ پارہ جہاں ختم ہوتا ہے اور چودھواں پارہ جہاں شروع ہوتا ہے، وہاں اللہ نے فرمایا: اب ہمارا بھی اپنا انتظام ہے، انبیاء اور رسل، اور ان کے نائبین کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔

جنت کی خوشخبری اور قوم کی فکر:

دوستو اور بزرگو! جب اس مخلص بندے کو شہید کر دیا گیا تو فوراً اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ ط'' جا، جنت میں داخل ہو جا۔ یعنی برزخ کی جنت میں اللہ پاک نے اسے پہنچا دیا۔ وہاں جنت کی نعمتیں دیکھنے کے بعد بھی اس کے دل میں اپنی قوم کے لیے کتنی تڑپ تھی! وہ کہہ رہا تھا: ''يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝'' (یس:۲۶) کاش! میری قوم جان لیتی کہ ایمان کی صرف چند گھڑیاں گزارنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو کر ہمیشہ کی جنت مجھے مل گئی۔ دوستو! یہ کتنا بڑا اخلاص ہے کہ جنت میں پہنچنے کے بعد بھی اپنی قوم کی بھلائی کی فکر دل میں باقی ہے، یہی کیفیت صحابہ کرامؓ کی بھی تھی، جب وہ بڑی دردناک انداز میں شہید ہوئے تو انہوں نے چاہا کہ کاش! ہمارا پیغام رسول اللہ ﷺ تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا پیغام قرآن کی آیات میں نازل فرمایا: ''يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝'' (آل عمران:۱۷۱) یہاں تک کہ کچھ مفسرین نے لکھا کہ شروع میں ہمیں لگا یہ آیات منسوخ ہو گئی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے یہ پیغام پہنچا دیا کہ جنت کی نعمتیں ہمیں حاصل ہوئیں اور ہمارا رب اپنے وعدے میں سچا ہے۔ قرآن مزید کہتا ہے: ''وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ط'' جنت والے جہنمیوں کو پکاریں گے: ہمارے رب نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا پایا، کیا تمہارے رب کا وعدہ بھی پورا ہوا؟ یہ ہے وہ حقیقت جسے قرآن نے تذکیر بأیام اللہ کے انداز میں بیان فرمایا یعنی امتوں کے عروج و زوال اور مخلص بندوں کے انجام کی مثالیں دے کر انسان کو جگایا اور آخرت کا یقین دلایا۔

خشک زمین سے سرسبز کھیت تک؛ انسان کی زندگی کا آئینہ:

دوستو اور بزرگو! اللہ تعالیٰ اپنی نعمتوں کا ذکر کرتے ہیں، وہ نعمتیں جو ہم اور آپ رات دن اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، لیکن ان پر غور نہیں کرتے۔ اللہ پاک فرماتے ہیں: ''وَاٰيَةٌ لَّهُمُ

الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ ۚ اَحْيَيْنٰهَا وَاَخْرَجْنَا مِنْهَا حَبًّا فَمِنْهُ يَاْكُلُوْنَ ﴿۳۳﴾ ''سوچیے! زمین بالکل خشک ہوجاتی ہے، گرمی کے دنوں میں دراڑیں پڑ جاتی ہیں، بنجر اور ویران ہوجاتی ہے۔ پھر جب اللہ کی طرف سے بارش برستی ہے تو یہی زمین سبزہ اگلتی ہے، سرسبز وشاداب ہوجاتی ہے، ایک چھوٹا سا بیج انسان ڈالتا ہے، وہ مٹی کے ڈھیر تلے سے باریک سی کونپل نکال دیتا ہے، اتنی باریک کہ ایک بچہ بھی اسے مسل دے تو ٹوٹ جائے، لیکن وہی کونپل اللہ کے حکم سے سخت مٹی کو پھاڑ کر اوپر آتی ہے، یہ کس کی قدرت ہے؟ یہ وہی ہے جس کے بارے میں قرآن کہتا ہے: ''اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ۭ '' پھر دیکھو! ایک بیج سے درخت بنتا ہے، اس درخت کے پھل میں دوبارہ گٹھلی رکھ دی گئی تاکہ انسان محروم نہ رہے، اگر یہ سلسلہ نہ ہوتا تو اناج اور غلہ کبھی پیدا نہ ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایک اور مثال دے کر فرمایا: ''مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۭ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۱﴾ '' (بقرہ:۲۶۱) جو لوگ اللہ کے راستے میں خرچ کرتے ہیں ان کی مثال اس دانے جیسی ہے جو سات بالیاں اُگائے، ہر بالی میں سو دانے ہوں، اور اللہ جس کے لیے چاہے کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔ دوستو! اللہ تعالیٰ اس آیت کے ذریعے ہمیں سمجھا رہے ہیں کہ اے انسان! غور کر: زمین کبھی خشک ہوتی ہے، پھر تر وتازہ ہوتی ہے، پھر دوبارہ خشک ہوجاتی ہے۔ اسی طرح تیری زندگی ہے: تو بچپن میں ہے، پھر جوان ہوگا، پھر بڑھاپا آئے گا، اور آخر کار تجھے بھی اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے۔

کائنات کا دقیق انتظام:

اللہ تعالیٰ نے سورج اور چاند کی مثال بیان فرمائی۔ ارشاد ہے: 'وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۳۸﴾ '' (یس:۳۸) سورج اپنے مقررہ راستے پر چل رہا ہے۔ آج سائنس یہ کہتی ہے کہ سورج ہم سے تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کی دوری پر ہے، اور یہی مناسب فاصلہ ہے جس پر زمین کا نظام قائم ہے، زمین اپنے محور پر گردش کرتی

ہے، اور یہ محور بھی سیدھا نہیں بلکہ کچھ جھکا ہوا ہے۔ یہی جھکاؤ موسموں کی تبدیلی کا باعث ہے، اگر زمین بالکل سیدھی ہوتی تو کچھ ممالک پر ہمیشہ سخت گرمی اور کچھ پر ہمیشہ شدید سردی رہتی۔ قرآن نے ان حقائق کی طرف اشارہ کیا، اور سائنس نے ریسرچ کے بعد ان کو کھولا؛ لیکن ایمان کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ سائنس کائنات کے نظام کو بیان تو کرتی ہے، مگر یہ نہیں بتاسکتی کہ یہ نظام اتنا منظم کیوں ہے، ہر سیکنڈ اور ہر لمحہ بغیر فرق کے کیسے چل رہا ہے، یہ اس ربّ کریم کا بنایا ہوا نظام ہے، جس نے فرمایا: ''وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰'' (یس:۴۰) ہر چیز اپنے اپنے مدار میں تیر رہی ہے۔ ذرا سوچئے! اگر سورج اپنی موجودہ جگہ سے آدھا بھی قریب آجائے تو ساری دنیا جل کر خاک ہوجائے اور اگر دُور ہوجائے تو اتنی سردی چھا جائے کہ ہر چیز جم کر ختم ہوجائے۔ یہ کامل توازن کس نے رکھا؟ یہ سب اسی ربّ کی قدرت ہے جس نے رات اور دن کو بھی ایک دوسرے کے پیچھے چلنے والا بنایا۔ ارشاد ہے: ''لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَآ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۭ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ۝۴۰'' (یس: ۴۰) نہ سورج چاند سے آگے نکل سکتا ہے اور نہ رات دن پر غالب آسکتی ہے، بلکہ سب اپنے اپنے نظام میں چل رہے ہیں۔ چاند کی منزلوں کو دیکھئے! کبھی بالکل گول، کبھی آدھا، اور کبھی بالکل پتلا سا جیسے کٹی ہوئی ٹہنی یا ناخن کا ٹکڑا۔ یہ سب نشانیاں ہیں اللہ تعالیٰ کی قدرت کی، جو انسان کو یاد دہانی دلاتی ہیں کہ یہ نظام خود بخود نہیں چل رہا بلکہ ایک ربّ ہے جو سب کچھ چلا رہا ہے۔

بوسیدہ ہڈی اور حیاتِ نو کا پیغام:

پھر آخر میں اللہ تعالیٰ نے ایک مثال ذکر فرمائی۔ ایک مشرک نے پرانی بوسیدہ ہڈی ہاتھ میں لی، اس کو ریزہ ریزہ کرکے اپنے ہاتھ میں مسل دیا اور مذاق کے انداز میں کہا: ''مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ۝۷۸'' (یس:۷۸) یہ بوسیدہ ہڈی جو میں نے بھوسہ کردی ہے، اس کو دوبارہ کون زندہ کرے گا؟ اللہ رب العزت نے جواب دیا: ''قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمُۨ۝۷۹'' اے نبی! کہہ دو کہ اسے وہی زندہ کرے گا جس نے اسے

پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا، اور وہ ہر مخلوق کو پیدا کرنے کا پورا علم رکھتا ہے۔

دوستو اور بزرگو! یہ ہے اللہ کی قدرت۔ وہی ذات ہے جو پہلی بار عدم سے وجود میں لانے پر قادر ہے، تو دوبارہ پیدا کرنا اس کے لیے کیوں مشکل ہوگا؟ وہی اپنی قدرت اور انعامات کے ساتھ اپنی ساری مخلوق پر احسان فرما رہا ہے۔ یہ یٰس شریف کے عظیم مضامین ہیں جن میں توحید، رسالت اور آخرت کے دلائل بڑے ہی مؤثر انداز میں بیان کیے گئے ہیں، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں ان مضامین کو سمجھنے، دل سے سننے اور اپنی عملی زندگی میں ان پر عمل کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین یارب العالمین۔

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ